مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفات روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں۔

(جلد ہشتم)

(حصہ دوم)

تحقیق و تعلیق

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجموعہ

رسائل امام شاہ ولی اللہؒ

التفہیمات الٰہیہ، البدور البازغہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے واردات قلبی، مکاشفات روحانی، اسلامی احکام، معاشرتی مسائل، مصطلحات علوم اسلامی کا شاہکار نمونہ اور علوم الٰہیات کا نادر خزینہ ہیں۔

(جلد ہشتم)

(حصہ دوم)

تحقیق و تعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

... ... ولی اللہ ... ٹیوٹ، نئی دہلی

نام کتاب : مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد ہشتم
مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
قیمت : 300
سن اشاعت : دسمبر ۲۰۱۵ء
تعداد : 500
کمپوزنگ : ریاض احمد
آئی ایس بی این : 978-93-84153-04-2
ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکا نگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکا نگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

Title : Majmua Rasail-e-Imam Shah Waliullah-VIII
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition : December 2015
Price : Rs.300/-
ISBN : 978-93-84153-04-2
Composing : Riyaz Ahmed

Published by

Shah Waliullah Institute
Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 011-26953430, Mob.9811740661
website : www.shahwaliullah.com
Email : shahwaliullah_institute@yahoo.in

فہرستِ کتب

مقدمہ

شیخ الاسلام حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ اٹھارویں صدی عیسوی کی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ آپ فی الحقیقت حجۃ اللہ فی الارض اور آیۃ من آیات اللہ ہیں۔ برصغیر میں تحریک رجوع الی القرآن والحدیث، اصلاح ودعوت اور اسلامی علوم وفنون کے احیاو تجدید کی تاریخ پر آپ نے بڑے گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ آپ نے امت کی اصلاح وتربیت کے لیے جو الہامی نقشہ اور لائحۂ عمل مرتب ومدون کیا تھا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس میں رنگ بھرے، اس کے نقوش وخطوط اور اثرات صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی زندہ وتابندہ ہیں اور آئندہ بھی مشعل راہ رہیں گے۔ آپ نے مختلف علمی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ آپ کے علمی وتجدیدی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع الاطراف ہے۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد امت میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی جامعیت، ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی حامل رہی ہو۔

حضرت شاہ صاحب ایک کثیر التصانیف مصنف اور عظیم مفکر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں حجۃ اللہ البالغہ تصنیف کی جو برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور بطور حوالہ پیش کی جاتی ہے۔ وہیں التفہیمات الالٰہیۃ جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو تصوف کے اسرار ورموز اور احکام شریعت کے مسائل ومقاصد پر محیط ہے۔

التفہیمات الالٰہیۃ، حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی معرکۃ الآرا کتابوں میں ایک منفرد واچھوتی کتاب ہے، جس میں شاہ صاحب چند سطریں عربی میں تو چند سطریں فارسی میں اور

چند صفحات عربی میں تو چند صفحات فارسی میں لکھ دیتے ہیں اور اسی رنگ و آہنگ میں پوری کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ جس کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے بلکہ متنوع موضوعات پر محیط ہے۔ دراصل یہ نادر کتاب حضرت شاہ صاحب کے قلبی واردات اور روحانی مشاہدات کا شاہکار نمونہ ہے۔ جس میں قرآنی آیات واحادیث کی تشریح، محدثین وفقہائے امت کے آثار و اقوال کی توضیح، مکاشفات ورویا کی تعبیر اور مصطلحات تصوف کی تفہیم و تلمیع پیش کی گئی ہے۔

گاہ بگاہ اسلامی احکام وعقائد پر عائد اعتراضات واشکالات کا مدلل و مفصل جواب بھی دیا گیا ہے اور فرق باطلہ کی تردید بھی کی گئی ہے۔

التفہیمات الالٰھیۃ کی دونوں جلدوں میں کل ۳۲۰ تفہیمات ہیں۔ ان میں سے ہر تفہیم میں قرآن وحدیث، فقہ وکلام اور تصوف واحسان کے کسی نہ کسی مغلق وادق مسئلہ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے اور حضرت امام شاہ ولی اللہ کا قلم گوہر بار اور معارف آگاہ، حکمت و معرفت کے موتی بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تفہیمات، فلسفۂ الٰہیات اور مصطلحات تصوف کی عقدہ کشائی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

التفہیمات الالٰھیۃ کی دونوں جلدیں پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں علامہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی نگرانی میں المجلس العلمی ڈابھیل، سورت، گجرات سے شائع ہوئی تھیں۔ جب یہ اساتذۂ کرام تلامذہ شیخ اور مشائخ حدیث دارالعلوم دیوبند میں بعض امور پر اختلاف پیدا ہوجانے کی وجہ سے ڈابھیل چلے گئے تھے اور اس وقت جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے دارالعلوم ثانی کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ آج بھی اس جامعہ کا شمار گجرات کے اہم مدارس میں ہوتا ہے جس کے موجودہ مہتمم مولانا احمد بزرگ صاحب ہیں جن کے دادا حضرت مولانا احمد بزرگ صاحبؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے ان ہی کی دعوت پر شاہ صاحب ڈابھیل گئے تھے۔ مولانا موسیٰ افریقی صاحب بھی اس کے محرک تھے جو شاہ صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب موجودہ مہتمم جن سے میری ملاقات

مولانا معزالدین قاسمی صاحب کے دسترخوان پر ہوئی تھی، ان کے ہمراہ مولانا مفتی ابوبکر پٹنی صاحب بھی تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کے رفقائے کار نے التفھیمات الالھٰیۃ کے دستیاب مختلف مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے وتقابل کے بعد صحیح ترین نسخہ تیار کیا تھا اور صحت متن کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔

اس المجلس العلمی ڈابھیل سے سب سے پہلے الخیرالکثیر شائع ہوئی تھی، جب کہ مقدمہ میں فاضل ناشر کی طرف سے البدور البازغہ اور تفہیمات الٰہیہ کو شائع کرنے کا عزم وارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری سکریٹری المجلس العلمی ڈابھیل لکھتے ہیں:

قد کنا وعدنا فی اواخر مقدمة "الخیر الکثیر" ان نطبع المولفات الاخر المهمة لشیخ الاسلام الشاه ولی الله المحدث دهلوی قدس سره وقدذکر نا بخصوص فی هذالذیل اسماء الکتابین الجلیلین له "البدور البازغه" و"التفهیمات الالهٰیة" وهما من اعظم تالیفاته النادرة واجلها قدراً واکمل تصنیفاته الباهرة واتمهانفعاً.

''ہم نے "الخیر الکثیر" کے مقدمہ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کی دوسری مہتم بالشان تالیفات بھی شائع کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہم نے شاہ صاحب کی دو اہم ترین کتابوں البدور البازغة اور التفهیمات الالهیة کا ذکر کیا تھا، کہ یہ دونوں کتابیں آپ کی عظیم و نادر ترین کتابیں ہیں۔ قدر و منزلت کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ اور کامل ترین نیز نفع کے اعتبار سے مکمل ترین ہیں۔''

اس کے بعد مولانا محمد احمد رضا بجنوری التفهیمات الالھٰیۃ کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے وتقابل کے بعد صحیح ترین و مستند ترین نسخہ مرتب و مدون کرنے سے متعلق کلمۃ الناشر میں لکھتے ہیں:

توجهنا الى" التفهيمات الالٰهية"
وقاسينا فى جمع عدة نسخ منها،
والنسخ التى اعتمدنا عليها فى هذه
المطبوعه، النسخة الخطية فى مكتبة
مظاهر العلوم "السهارنفورية، وهذه
نسخة كاملة جيدة النسق والترتيب
عندنا، ولذا قد وضعنا ترتيب نسختنا
فى الاكثر على ترتيبها بحسب التقديم
والتاخير فى التفهيمات. ثم النسخة
الخطية لصديقنا المحترم مولانا
نورالحق الاستاذ فى كلية الالسنة
المشرقية ببلدة لاهور (الهند) وهى
نسخة حسنة الخط جيدة الضبط،
استفدنا منها كثيراً فى تصحيح
نسختنا ولكنها ناقصة، ليس فيها
شطر من الكتاب ثم النسخة الخطية
فى مكتبة "الجامعه الانكليزية
الاسلاميه" ببلدة على گره (الهند)
وهى نسخة كاملة جيدة النسخ
والضبط ايضًا والنسخة الخطية
الاخرىٰ ايضاً فى تلك المكتبة ،
وهذه النسخة وان كانت ناقصة ، لها
اهمية خاصة من حيث انها اقدم النسخ
التى وجدنا هاالان واصحها عندنا،

''پھر ہم نے التفهيمات الالٰهية پر کام
شروع کیااوراس کے نسخے جمع کرنے لگے۔
اس سلسلہ میں ہم نے سب سے زیادہ اس قلمی
نسخہ پر اعتماد کیا ہے جو مظاہر العلوم سہارنپور
کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ہمارے
نزدیک نسق وترتیب کے لحاظ سے سب سے
بہتر ہے۔اس لئے ہم نے اپنے نسخہ کی ترتیب
یعنی تفہیمات کی تقدیم و تاخیر میں اسی کی
ترتیب کو بنیاد بنایا ہے۔اس کے بعد ہم نے
صدیق محترم مولانا نورالحق استاذ كلية السنة
المشرقية لاہور کے قلمی نسخہ کو بھی پیش نظر
رکھا۔ یہ نسخہ خوشخط ہے۔ ہم نے اپنے نسخہ کی
تصحیح میں اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے
لیکن یہ نسخہ ناقص ہے کہ اس میں کتاب کا ایک
حصہ موجود ہی نہیں ہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی
گڑھ کی لائبریری والے قلمی نسخہ کو سامنے رکھا،
یہ نسخہ نسخ وضبط میں سب سے بہتر اور کامل
ہے۔ ہمارے سامنے لائبریری کا دوسرا قلمی
نسخہ بھی رہا ہے جو اگرچہ ناقص ہے پھر بھی اس
کی اس حیثیت سے بڑی اہمیت ہے کہ اب
تک ہمیں جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں،
ہمارے نزدیک ان میں یہ سب سے قدیم
اور سب سے زیادہ صحیح نسخہ ہے۔ اس کے
حاشیہ پر شیخ محمد عمر بن حضرت الشیخ محمد عمر بن

وان عليها تحريراً (في صورة حاشية مختصرة) بيد الشيخ محمد عمر بن حضرة الشيخ مولانا محمد اسمعيل الشهيد الدهلوى قد سره وقدقابلنا نسختنا بهاتين النسختين كليهما ايضا من الاول الى الاخر"

حضرت الشیخ مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی قدس سرہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ ہم نے ان دونوں نسخوں کو شروع سے آخر تک اپنے لئے بنیاد بنایا ہے۔"

(صفحه ۲ كلمة الناشر)

ان مخطوطات کے علاوہ التفہیمات الالٰہیة کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی لائبریرین رضا لائبریری رام پور لکھتے ہیں:

"مخطوطہ نمبر ۳۱۶۸ التفہیمات الالھیہ، فن سلوک
ورق ۱۵۷، بسطر ۲۶، سائز ۲۰+۳۲، خط نستعلیق، زمانہ بارھویں صدی ہجری
مصنف کے عہد کی نہایت اہم کاپی ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کے واردات قلبی و وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔"

امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات
ص ۱۹۶ مطبوعہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ مرتبہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی۔

اس کے علاوہ اس کے قلمی نسخے کہاں کہاں ہیں۔ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک نسخہ غالبًا ماسکو میں بھی موجود ہے۔ میرے لیے سر دست التفہیمات الالٰہیة کے دستیاب مخطوطات کا موازنہ و تقابل کرنا مشکل ہے۔ البتہ جب میں اس مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی تحقیق و تدوین اور اشاعت سے فارغ ہو جاؤں گا تو پھر حضرت شاہ ولی اللہ کی عربی و فارسی کتابوں کو ان کے مخطوطات عربی و فارسی سے موازنہ و تقابل کے بعد صحیح ترین نسخے تیار کر کے شائع کروں گا۔ انشاء اللہ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کی مطبوعہ کتابوں کو کمالِ صحت اور تحقیق متون کے ساتھ از سرِ نو شائع کرنا شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی منصوبوں میں شامل ہے۔

التفهيمات الالٰهية مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کا نسخہ میرے پیش نظر ہے، جو دو جلدوں میں ہے اور اسی مطبوعہ نسخہ ڈابھیل کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، جس کے شروع میں خطبۂ افتتاحیہ ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ شیخ نور اللہ پھلتی ثم بڑھانوی کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے حضرت شاہ صاحب سے علوم تصوف کے اکتساب کے لیے پر صعوبت سفر کیا تھا اور حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کیا تھا: جو آپ کے اجل تلامذہ میں تھے، جن کے نام حضرت شاہ صاحب کے ۲۹ مکتوبات ہیں۔ ان میں زیادہ تر مکتوبات مسائل تصوف پر ہیں۔

التفهيمات کے خطبۂ افتتاحیہ کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے شیخ نور اللہ بڑھانوی کا انتخاب، اشارہ غیبی کی بنیاد پر کیا تھا اور اس میں ان کے والد کا روحانی تصرف بھی شامل رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالٰهية میں شیخ نور اللہ پھلتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے۔

اور ''اخينا الفاضل اللبيب الكامل الحبيب الشيخ نور اللہ بن معين الدين البهلتی'' لکھا ہے، اس کے بعد ایک مکاشفہ کا بھی ذکر کیا ہے'' چنانچہ لکھتے ہیں۔

ثم بعد ذالک انا جالس عند قبر سيدى الوالد صاحب الكرامات الجزيلة والمقامات الجليلة المنوه به فى اعلى السطور ضاعف الله له الاجور اذ لوحت روحه الكريمة تلويحاً روحا نيا تأ مرنى ان القن صاحبى المذكور ملاحظة التهليل على النمط المعتبر عند السادة النقشبندية سقاهم ربهم من السلسبيل ففالحته بها من غير ان يسبق منه	''اس کے بعد جب ایک روز میں اپنے والد صاحب کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جو بڑے صاحب کرامات اور قدر و منزلت کے حامل تھے۔ (اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے و درجات مزید بلند فرمائے) ان کی روح نے اشارہ کیا کہ میں اخی مذکور کو نقشبندی بزرگوں کے نزدیک معتبر و مستند قرار دی جانے والی تسبیحات و وظائف کی تلقین کروں۔ چنانچہ میں نے اس کی طلب کے بغیر اس کو ان امور کی تلقین کا سلسلہ شروع کر دیا جو مجھے

الطلب والسوال حيث كنت على	میرے بزرگوں کی ہدایات ورہنمائی کے طور
بصيرة من تلويحات اكابر الرجال	پر معلوم ہیں۔اور یہ میرے والد قدس اللہ سرہ
فكان ذلك ببركة نفسه.	کی برکت کا نتیجہ تھا کہ اس میدان میں اس کو
	سہولتیں ملتی چلی گئیں۔"

حضرت شاہ صاحب جہاں متبحر عالم دین اور بلند پایہ صوفی کامل ہیں۔ وہاں عربی و فارسی کے صاحب اسلوب ادیب وشاعر بھی ہیں۔آپ ان دونوں زبانوں پر یکساں طور پر عبور وکمال رکھتے ہیں۔آپ نے شیخ نوراللہ پھلتی کے بارے میں دوشعر بھی کہے ہیں:

لقد بلوتک فی سلم و فی عتب

فما وجدتک الاخالص الذهب

میں نے تمہیں عیش وآرام اور سختی و پریشانی ہر میدان میں آزمایا اور پرکھا تو میں نے تمہیں خالص سونے جیسا ہی پایا:

ولم تسم بنورالله الا لانه

عما قليل تكون النورفارتقب

اور تمہارا نام صرف اس لیے نوراللہ نہیں رکھا گیا کہ نور تھوڑا ہے بلکہ اس کو بڑھاتے رہو۔

حضرت شاہ صاحب نے التفهيمات الالهية کے خطبۂ افتتاحیہ میں جس طرح شیخ نوراللہ پھلتی کا ذکر کیا ہے،اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب دراصل حضرت شیخ نوراللہ پھلتی کی روحانی تعلیم وتربیت کے لیے لکھی گئی ہے۔اوراس کا سبب تصنیف شیخ نوراللہ کی ذات ستودہ صفات ہی ہے۔جس کے لیے غیبی اشارات کئے گئے ہیں۔جو آپ کے اوپر حضرت والد صاحب کی قبر پر معتکف ہونے کے دوران منکشف ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے تفہیم اول میں تین عظیم امور کی تفصیل بیان کی ہے،جن کی طرف رسولوں اور نبیوں نے دعوت دی ہے اور یہی کار نبوت اور بار نبوت ہیں جو انبیاورسل کے خاتم اور آخری رسول حضرت ذی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اصلاح کے لیے علما مصلحین کے سپرد ہوئے ہیں۔اوراب یہی رجال کار اور اصحاب دعوت،مسئول وذمہ دار ہیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اما بعد فیقول خادم العلماء والصوفیه والمتمسک باذیالهم العلمیة ولی اللّٰه بن عبدالرحیم عاملهما اللّٰه بفضله العظیم ان من اجل نعم اللّٰه تعالیٰ التی لا یستطیع العباد شکرها ان بعث الانبیاء مترجمین عن الغیب لیهلک من هلک عن بینة ویحی من حی عن بینة ثم جعل لهم ورثة یقومون بعلمهم بین الناس و یحیون سننهم و یدعون الی رشدهم هادین الی طرق التقرب الی اللّٰه تعالیٰ ومعظم مادعت الی اقامة الرسل امور ثلاثة تصحیح العقائد فی المبدا والمعاد والمجازاة وغیرها وقد تکفل بهٰذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شکر اللّٰه تعالیٰ مساعیهم و (۲)تصحیح العمل فی الطاعات المقربة والا رتفاقات الضروریة علی وفق السنة وتکفل بهذا الفن فقها إلامة فهدی اللّٰه بهم کثیر ین واقام بهم فرقة عوجا و (۳) تصحیح الاخلاص والاحسان الذین هما اصلاً للدین الحنیفی الذی ارتضاه اللّٰه لعباده (صفحہ۱۱التفهیمات)

علما وصوفیا کا خادم اوران کی اعلیٰ روایات کا حامل ولی اللہ بن عبدالرحیم عاملهما اللّٰه بفضله العظیم . کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے جن کا بندے شکر ادا نہیں کر سکتے، یہ بھی ہے کہ اس نے ان انبیا کو مبعوث فرمایا جو غیب کی ترجمانی کی رہنمائی کرنے والے ہیں، تا کہ واضح دلائل کے سامنے آجانے کے کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کی راہوں بعد جس کو ہلاک ہونا ہے، اس کو ہلاک کر دے اور جس کو حیات نو حاصل کرنی ہو، اس کو حیات نو عطا کر دے۔ پھر ان کے ایسے وارث بنائے جو لوگوں کے درمیان ان کے علوم وروایات کے علم بلند کرتے ہیں، اور ان کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں، اور ان کو رشد وہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور رسولوں کی تعلیمات وروایات کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان میں تین امور عظیم ہیں (۱) مبدا و معاد اور مجازاة وغیرہ کے سلسلہ میں عقائد کی تصحیح۔ اس فن کی ذمہ داری علماء میں سے اہل اصول نے سنبھالی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں و مساعی کو کامیاب فرمائے (۲) سنت کے مطابق

متقبول طاعات اور ضروری فوائد والے
عمل کی تصحیح، اس فن کی ذمہ داری فقہائے
امت نے سنبھالی۔ چنانچہ اللہ نے ان
کے ذریعہ بیشمار لوگوں کو ہدایت عطا
فرمائی۔ اور ان کے ذریعہ راہ راست پر
چلنے والے فرقہ کو قائم فرمایا۔ (۳) اور
اخلاص و احسان کی تصحیح جو کہ اس دین
حنیف کے اصول و بنیاد ہیں جس کو اللہ
نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔

التفهیمات الالهیة کے مندرجات میں خلافت ظاہرہ وباطنہ، عارف کا حال، کامل کے اوصاف، لاہوت وجبروت کی حقیقت، وجدان، انواع مکاسب، احکام ظاہرہ میں انبیاء ورسولوں کے درمیان فرق، ذات باری میں غور وفکر اور عجیب خطاب، حضور پر درود بھیجنے کے فائدہ کے انکار کا جواب، شیخ عبدالقادر جیلانی کے قول ''حنفیہ مرجیہ ہیں'' کے معنی، خوابوں کی تعبیر، باری تعالیٰ کا فیض، ایمان اور اس کی صفات کا بیان، شرح صدر کی حقیقت، رحمٰن کی تجلی، ابداع کی حقیقت، اوقات کی تاثیر، ذات الٰہی کا عکس، پردوں کا اصول، علم طلسمات، مقدس دائرہ، علم اور معلوم کا اتحاد، توجیہ حنفیی، نبوت اور فطرت، اقطاب مرشدین کا ذکر، فرد اور قطب، معارف جلیلہ کا ذکر وثبوت اور وجود کے درمیان فرق، ازل کا معنی، پوشیدہ معارف، مخلوقات میں کواکب کی تاثیر، حلول سرمدی، توکل کا مقام، عقائد حق، کلی اور جزئی، ملاء اعلیٰ کی حقیقت، حظیرۃ القدس، تجلی کی اصناف، ختم نبوت، اس کا راز، حکمت وعصمت اور سیادت کا راز، فنا النفس، حدوث عالم، محدث اور مقرب، صحابہ کی قسمیں اور علم تکوین کے اہم مباحث ومسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت ہی اہم مباحث شامل ہیں۔ جن کا ذکر یہاں طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے **التفهیمات الالهیة** میں قرآن وحدیث کی آیات،

صحابہ، صحابیات کے اقوال وآثار، فقہائے امت اور صوفیا ومشائخ طریقت کے فرمودات وآراء سے استشہاد واستدلال کئے ہیں، جن لوگوں کے کتاب مین حوالے منقول ہیں، ان میں حضرت جنید بغدادی، حضرت سفیان ثوری، حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ ابن عربی، شیخ امیر سید کلال، امام معروف کرخی، شیخ شہاب الدین نقشبندی، شیخ بہاءالدین زکریا، شیخ عفیف الدین تلمسانی، شیخ امام غزالی، شیخ صدر العالم، عبدالوہاب شعرانی، جاراللہ زمخشری، جنائی معتزولی، جلال الدین سیوطی، ابو ہاشم، شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ رفیع الدین، خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ نوراللہ بڑہانوی ثم پھلتی اور شیخ محمد عاشق پھلتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے ان مباحث کو بڑے وجدانی، والہامی اسلوب میں لکھا ہے، اوران کا فلسفیانہ ومنطقیانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اوران مسائل کا اتنی گہرائی سے جائزہ لیا ہے کہ ان کی گہرائی تک عام قارئین کے لئے پہنچنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میں نے حضرت شاہ صاحب کی زیر تذکرہ کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کو بار بار پڑھا ہے۔ تاہم میں یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ میں نے ان کی کتابوں کو کما حقہ سمجھ لیا ہے اوران کے بیان کردہ مطلب ومقصد کو پورے طور پر اخذ کرلیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحب کا اسلوب بیان عام فہم اور بامحاورہ ہوتا ہے۔ البتہ بعض فلسفیانہ اور منطقیانہ مباحث میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات ضرور استعمال کرتے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے ان کی دوسری کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ان کی وضع کردہ اصطلاحات کو سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ چونکہ حضرت شاہ کا معمول ہے کہ وہ اپنی کسی نہ کسی کتاب میں اپنی وضع کردہ اصطلاحات کی تشریح وتوضیح ضرور کرتے ہیں اور دوسری جگہ ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے صرف ان کا ترجمہ کافی نہ ہوگا اور جن مترجمین نے ان کی تشریح وتوضیح کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے، انہوں نے دھوکہ کھایا ہے۔

تفہیمات کے آخر میں وصیت نامہ اور مختلف طبقات کے نام خطابات ہیں جو بڑے ہی موثر اور عبرت انگیز ہیں؟ حضرت شاہ صاحب صاحب نسبت بزرگ اور تصوف کے قائل

تھے، لیکن آپ نے متصوفین اور اپنے عہد کے نام نہاد مشائخ سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا ہے اور ان سے بیعت نہ کرنے کی وصیت کی ہے۔

آنست کہ دست در دست مشائخ این زمان ہرگز نباید داد و بیعت باایشاں نباید کرد و بغلو عام مغرور نباید بود و نہ بکرامات زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیہ را بحقیقت اعتباری نیست و کرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند۔

(صفحہ ۲۴۰ التفہیمات)

"یہ ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھوں میں ہاتھ ہرگز نہ دیا جائے، اور ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ غلو عام سے اور نہ ہی کرامات سے دھوکا کھائیں، اس لیے کہ اکثر غلو عام رسم کی وجہ سے ہے۔ اور امور رسمیہ کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے تمام کرامات فروش الا ماشاء اللہ طلسمات و فریب کو کرامات سمجھتے ہیں۔"

حضرت شاہ صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی متصوفین و نام نہاد مشائخ کی مخالفت اور تصوف میں درآئی بے اعتدالیوں اور غیر اسلامی طریقوں پر تنقید ملتی ہے۔ جس کے ثبوت میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، البتہ حضرت شاہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے متعلق ایک بات واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب اپنے افکار و نظریات میں بالکل منفرد ہیں، اور انہیں کسی مخصوص حلقہ اور مخصوص موضوع و میدان میں محصور و مقید کرنا نہ صرف غیر مناسب بات ہے بلکہ شاہ عدم شناسی بھی ہے۔

میں حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب ایک مخصوص سوچ و فکر کے آدمی ہیں، ان کو اسی رنگ و آہنگ اور ذوق و مذاق میں دیکھنے پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور ان کی شخصیت کو کسی مخصوص مسلکی گروہ میں رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اور عجلت و جلدی بازی میں ان کی کسی کتاب یا کسی عبارت کے بارے میں یہ بدگمانی بھی نہیں کرنی چاہیے کہ یہ کتاب یا عبارت الحاقی ہے۔

میں التفہیمات الالھیۃ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل کے حال ہی میں کیے گئے اردو ترجمہ کے مطالعہ اور ترتیب و تقدیم میں مصروف تھا کہ ایک صاحب کی ایک تحریر نظر سے

گزری کہ التفہیمات الالٰھیۃ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل میں ایک عبارت کے ذیل میں ایک لفظ الحاقی ہے اور کسی مخطوطہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ مخطوطات کی ایڈیٹنگ میں اس طرح کے امکانات ہوئے ہیں۔ اور ہو سکتے ہیں، مجھے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں التفہیمات الالٰھیۃ کے اردو ترجمہ (جو برصغیر ہندو پاک میں پہلی مرتبہ ہوا ہے) کی پروف ریڈنگ اور تنقیح میں اتنا مصروف تھا کہ مطبوعہ التفہیمات الالٰھیۃ ڈابھیل کا موازنہ و تقابل مخطوطات التفہیمات الالٰھیۃ سے نہ کر سکا۔ اس لیے سردست میرے لیے کسی تحریر کی تردید یا تائید مناسب نہیں ہے۔ البتہ التفہیمات الالٰھیۃ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا صاحب کے اہتمام و نگرانی میں دستیاب مختلف مخطوطات کو سامنے رکھ کر التفہیمات الالٰھیۃ کا یہ مستند نسخہ تیار کیا گیا تھا، جن کی دیانتداری و امانت اور تقوی و طہارت پر پورا پورا اعتماد و بھروسہ ہے۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی علمی خیانت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ والعلم عند اللہ۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے سردست شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دستیاب تمام رسائل و کتب کو مجموعۂ رسائل شاہ ولی اللہ کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کے تحت اب تک ۶ شائع ہو چکے ہیں۔

ان مجموعہ رسائل کی اشاعت و طباعت کے بعد شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تمام عربی و فارسی کتابوں کو ان کے دستیاب مخطوطات (قلمی نسخوں) کے موازنے و تقابل کے بعد صحیح ترین اور مستند ترین نسخے تیار کرنے اور شائع کرنے کا جامع منصوبہ ہے۔ جس کے لیے ابھی سے عربی و فارسی کتابوں کے مخطوطات جمع کئے جا رہے ہیں اور ایک حد تک ان پر کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ اہل علم سے اس سلسلہ میں علمی تعاون کی درخواست ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے اپنے طویل المیعاد جامع منصوبہ کے تحت امام شاہ ولی اللہ کی تمام عربی و فارسی کتابوں اور رسالوں کے دستیاب اردو تراجم کو تحقیق و تنقیح اور تقدیم و حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا جامع منصوبہ بنایا

ہے۔ جس کے تحت مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی ساتویں جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور اس کی آٹھویں جلد بھی جلد پہنچنے والی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بیشتر عربی و فارسی کتابوں کے اردو تراجم ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کی بعض اہم عربی و فارسی کتابوں کے ابھی اردو تراجم نہیں ہو سکے ہیں، ان میں ایک اہم و معرکۃ الآرا کتاب التفہیمات الالٰھیۃ بھی ہے یہ کتاب جیسا کہ شروع ہی میں بیان کیا گیا پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں المجلس العلمی ڈابھیل گجرات سے شائع ہوئی تھی اور مدینہ برقی پریس بجنور یوپی میں چھپی تھی، اس کے بعد پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی نے سندھ پاکستان سے شائع کی تھی۔ میرے سامنے المجلس العلمی ڈابھیل گجرات کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ ہے۔ پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کا ترتیب دیا ہوا نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا ہے۔

حیرت ہے کہ عرصہ دراز بیت جانے کے باوجود کسی صاحب علم وفضل نے التفہیمات الالٰھیۃ کا اردو ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کے اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ علامہ انور شاہ کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید محمد احمد رضا بجنوری صاحب مقیم ڈابھیل کے دور مسعود میں ہو جاتا تو زیادہ معیاری و مستند ہوتا، لیکن ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ التفہیمات الالٰہیہ اور البدور البازغہ یہ دونوں کتابیں المجلس العلمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھیں، اور حضرت انور شاہ صاحب کشمیری کی نگرانی میں ہوئی تھیں۔ یہاں ایک وضاحت طلب بات یہ ہے کہ التفہیمات اور البدور کے متون ان کے متعدد مخطوطات کو پیش نظر رکھ کر مرتب و مدون کیا گیا ہے اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ان مضامین وتفہیمات کے ذیلی عنوانات ناشر فاضل اور مرتب علام کی جانب سے لگائے گئے ہیں اور یہ عنوانات اصل مخطوطات تفہیمات، بدور میں موجود نہیں ہیں۔ شروع میں خود میرا ارادہ ہوا تھا کہ ان اضافی عنوانات کو حذف کردوں اور مصنف کے ہی اصل متون ہی پر اکتفا کروں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اضافی عنوانات متون کے مطالب ومفاہیم کی تفہیم اور تعبیر میں بڑے معاون ومددگار ہیں۔ اس

کے پیش نظر ان اضافی عنوانوں کو باقی رکھا۔

قارئین سے التماس ہے کہ ابواب وفصول کے ان ذیلی عنوانات کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے قائم کردہ عنوانات تصور نہ کریں اور ناشر اوّل کی جانب سے متعین کردہ عنوانات ہی خیال فرمائیں۔

آمدم بر سر مطلب! مولانا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز جو اردو وعربی زبان کے ادیب وشاعر ہیں اور ایک طویل عرصہ تک دوحہ قطر میں رہے ہیں۔ ایک دن غریب خانہ پر تشریف لائے اور مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی مطبوعہ جلدیں طلب فرمائیں۔ میں نے ان کی خدمت میں یہ تمام جلدیں پیش کر دیں تو بہت خوش ہوئے اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی کاوشوں کو سراہا۔ جو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے لئے یقیناً اعزاز وافتخار کی بات ہے۔

اس کے بعد ایک دن مجھے اپنے در دولت پر طلب فرمایا اور میرے سامنے التفہیمات الالٰہیہ کی دونوں جلدوں کا اردو ترجمہ رکھ دیا اور فرمایا کہ انہیں آپ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کر دیں۔ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے ان کا اردو ترجمہ کیا اور میں نے ان پر نظر ثانی کی ہے۔ میں نے کہا کہ جب مولانا عقیدت اللہ قاسمی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور آپ نے نظر ثانی کی ہے تو مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اردو ترجمہ اچھا ہی ہوگا۔ مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب نے یہ کہتے ہوئے ترجمہ میرے حوالہ کر دیا کہ پھر بھی دیکھ لیں۔

میں آپ کی ہدایت کے مطابق یہ اردو ترجمہ گھر لے آیا۔ ترجمہ کچھ دنوں تک یوں ہی رکھا رہا۔ میں عدیم الفرستی کی وجہ سے اس کو دیکھ نہ سکا۔ کچھ دن بعد ترجمہ کو دیکھا تو التفهيمات الالهية کا اردو ترجمہ پسند آیا۔ بڑا سلیس وشگفتہ اور بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں سے برصغیر ہندوپاک کے اصحاب علم ودانش کی جانب سے برابر مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ اس نادر ونایاب کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں ہونا چاہیے تاکہ عوام وخواص اس کتاب کے اسرار ورموز اور مقاصد شریعت سے واقف ہوسکیں۔

مجھے خوشی ہے کہ مولانا ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی صاحب اور مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب نے غیر معمولی کدوکاوش کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ التفہیمات الالٰہیہ کا یہ اردو ترجمہ بلند پایہ ومعیاری ہے اور یہ اس نئی صدی کا تحفۂ بیش قیمت ہے جو اہل علم ودانش کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل دوسری کتاب البدور البازغہ ہے، جو حضرت شاہ صاحب کی اہم کتابوں میں شامل ہے۔ جس کے متعلق خود حضرت شاہ صاحب البدور البازغہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

> ''اما بعد! بندۂ عاجز ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو اپنے لطف وکرم سے نوازے) عرض کرتا ہے کہ زیرِ تالیف کتاب ان تفہیماتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے جو خدائے مہربان کے فیضانِ عنایت سے پہلے میرے دل پر القا ہوئیں، پھر وہاں سے زبان اور پھر سرانگشت (پوروں) پر (تحریر وقلم کی صورت میں) ظاہر ہوئیں اور عصرِ حاضر (کی استدلالی ذہنیت) کا تقاضا ہوا کہ ان کو برہان ودلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس کا نام ''البدور البازغہ'' رکھا ہے جو ایک مقدمہ اور تین مقالوں پر مشتمل ہے۔''

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں اسلام اور اسلامی ملک کے نظریۂ اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور اخلاقیات سے بحث کی ہے۔ حضرت شاہ صاحب اسلامی معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا سرچشمہ انسان کی ذات کو مانتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ انسان کے فطری تقاضے اجتماعی زندگی ہی میں پورے ہو سکتے ہیں۔

جماعتیں کس طرح تشکیل میں آتی ہیں، اور اس کے فطری تقاضے کیا ہوتے ہیں، الگ الگ فصل میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ماہر اقتصادیات اور ماہر عمرانیات بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں اقتصادی اور عمرانیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ جو اقتصادیات اور عمرانیات کے اسکالروں کے لیے نہایت ہی مفید کتاب ہے۔

اس میں خطبۂ افتتاحیہ کے علاوہ تین مقالات ہیں، اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ کے اندر مندرجہ ذیل قابلِ ذکر مباحث ہیں، مبحثِ وجود، جواہر اور اعراض کا امتزاج، انسان کی صورتِ نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضے۔

اس کے پہلے مقالہ میں ۲۳ فصول ہیں، ان فصول میں نسمہ کی حقیقت، حکمت کی تعریف، ارتفاقات چارگانہ کے حقائق پر مجمل بحث، ارتفاق اول، ارتفاق ثانی، ارتفاق ثالث، اور ارتفاق رابع کے مباحث بڑے اہم ہیں۔ (شاہ صاحب کے نزدیک ارتفاق تدبیر منزل کے معنی میں ہیں)۔ اور حضرت شاہ صاحب نے ارتفاق کو ایک اقتصادی فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

کھانے کے آداب، زینت وزیبائش، آداب لطافت، مکان ومسکن، سفر، نشست و برخاست اور چلنے پھرنے کے آداب، صنفی تعلقات کے آداب، مرض کے آداب، تدبیر منزل، مرد اور عورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں اختلاف اور اس کے فائدے، مدارج معیشت میں اختلاف فطری امر ہے، ازدواج کی ضروریات اور آداب ان فصول میں حقوق وآداب برائے آقا وغلام، فنِ معاملات، اصول کسب، اہم ذرائع معاش، اختلاف مکاسب کے وجوہ، مبادلات وتبرعات، عقد مزارعت، عقد مضاربت۔

امام المسلمین کے فرائض، امام کے اخلاق سبعہ، امامت کے آداب، امیر کی سیرت وکردار، تعلیم وتربیت کی قسمیں، معلم کے اوصاف حمیدہ۔

متولی ونقیب کے آداب وفرائض، امام کے معاون، معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط، امام کے سات معاون۔

وزیر اعظم، سپہ سالار اعظم، امیر البحر، قاضی القضاۃ، شیخ الاسلام، حکیم وطبیب، ناظر خانہ، معاونین پر کڑی نظر رکھنا، امام کے فرائض میں ہے وغیرہ اہم مباحث ہیں۔

مقالہ ثانی میں معرفت باری تعالیٰ کا بیان، حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں، خدا شناسی بذریعہ عقل معاشی، اللہ تعالیٰ کے اسماو صفات کا اجمالی اثبات، اسمائے حسنیٰ کی تشریح، ایمان بالقدر کے ثبوت، شرک کی حقیقت، تحریف کی حقیقت۔

تیسرے مقالہ میں ملتوں اور شریعتوں کا بیان، ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب، ملت حنیفیہ کی حقیقت، علم تشریع اور اس کے قوانین، تدابیر اصلاح، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد اور دمنِ اسلام کے اصول وغیرہ مباحث زیر بحث آئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے البدور البازغہ میں گاہ بگاہ تصوف اور الٰہیات کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب بھی دراصل تفہیمات الٰہیہ کے جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ان دونوں کتابوں کے مسائل بڑی حد تک مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بارے میں عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب کے وارداتِ قلبی اور مشاہدات روحانی کی عکاس ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو مطالعہ کرنے والے اصحابِ علم اس نقطۂ نظر کو واضح طور پر محسوس کریں گے یہی وجہ ہے کہ میں نے ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ ہی شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے اردو مترجم ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب ہیں، ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن صاحب کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے لیکن ان کی ترجمہ نگاری اور شاہ شناسی سے انداز ہوتا ہے کہ یہ عربی اور فارسی زبان کے ماہر اور فکر ولی اللّٰہی سے تعلق رکھنے والے صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ جنھوں نے بڑا سلیس اور عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ یہ بھی صاحب نظر دانشور اور عالم معلوم ہوتے ہیں، اللہ ان کی خدماتِ علمی کو قبول فرمائے۔ یہ کتاب ادارہ مطبوعات اردو بازار لاہور سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور میرے پیش نظر نسخۂ لاہور ہی ہے۔ جسے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب پاکستان سے لائے تھے، میں نے حضرت مولانا کاندھلوی صاحب سے کچھ دنوں کے لیے مستعار لی ہے۔ مولانا نورالحسن کاندھلوی صاحب میرے کرم فرما اور فکرِ ولی اللّٰہی کے ماہر عالم دین ہیں۔ اور ان کے ذاتی کتب خانے میں حضرت شاہ صاحب کی تمام نایاب کتابیں موجود ہیں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں کہ آپ از راہ کرم شاہ

صاحب سے متعلق کتابیں عنایت فرماتے ہیں۔میں نے اپنے مقدمے کے شروع میں لکھا ہے کہ المجلس العلمی ڈابھیل سے حضرت شاہ صاحب کی تفہیمات الٰہیہ اور الخیر الکثیر شائع ہوئی تھیں۔اور اسی مجلس علمی نے البدور البازغہ کو بھی مولانا محمد انور شاہ کشمیری اور ان کے رفقا وتلامذہ کی نگرانی میں شائع کی تھی اور شاہ صاحب کے تلامذہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی،مولانا بدرِعالم میرٹھی،مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی،مولانا سعید احمد اکبرآبادی،اور مولانا سید احمد رضا بجنوری وغیرہ تھے۔میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان حضرات نے شاہ صاحب کی ان کتابوں کی تحقیق و ترتیب اور اشاعت میں ضرور دلچسپی لی ہوگی۔میں یہاں ایک وضاحت حسب سابق کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ **التفهيمات الالٰهية** کی طرح البدور البازغہ میں بھی فاضل ناشر اول نے فہرست سازی اور عنوان سازی کی ہے،اور یہ فہرست مضامین اصل مخطوطہ میں موجود نہیں ہے۔اس فہرست مضامین کو حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ اور ناشر اوّل ہی کی طرف منسوب کیا جائے لیکن چونکہ یہ اضافی عنوانات البدور البازغہ کے مفاہیم ومطالب کی افہام وتفہیم میں بے حد مفید ہیں،اس کے پیش نظر ان اضافی عنوانات کو برقرار رکھا گیا ہے۔امید ہے کہ قارئین حضرات دورانِ مطالعہ اس فرق کو ملحوظ رکھیں گے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست مولانا محمد افتخار حسین مدنی شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب کشمیری گیٹ کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی تصحیح اور پروف ریڈنگ میں خاص مدد کی ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔

عطاالرحمٰن قاسمی

چیرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی

التفہیمات الالٰہیہ

(جلد دوم)

تصنیف:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ

مولانا عقیدت اللہ قاسمی

نظر ثانی:

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز

تحقیق و تعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

فہرست (جلد دوم)

۲۳۱- تفہیم:

مقطعات کے معانی

کیا ہم تمہیں مقطعات کے معانی نہ سکھائیں۔ جاننا چاہیے کہ حوامیم (حٰمٓ) لوامیم (الٓمٓ) طواسیم (طٰسٓ وطٰسٓمٓ) اور لوامیر (الٓمٓرٰ) کے درمیان مذکور فرق امور اعتباریہ کے مشابہ ہے۔ لیکن اس کا ایسا اثر ہے جو خارج میں اپنی حق داری کے مدعی ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حوامیم وہ کلام ہے جو اجمال پر مبنی ہے۔ اور لوامیم بھی ان کے مشابہ ہیں۔ البتہ یہ وہ کلام ہیں جو تفصیل پر مبنی ہیں۔ اور لوامیر شرور کی منزلوں میں اسماء متجددہ کے علوم ہیں۔ اور طواسیم ان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ عین کی استعداد کے مطابق ہیں۔ غیر کے نہیں۔ اور میں نے الٓمٓرٰ کو لوامیم میں دیکھا اور ساتوں طوال مفصل ان لوامیم سے نہیں ہیں، نہ عتاق اول (پہلی آزاد) ہیں نہ مفصل اور احزاب ونور ہیں۔

۲۳۲- تفہیم:

تواجد کے بعض احوال کا بیان

صبا من حمی لیلیٰ یظل طفوح
فمن جذب ذاک الروح روحی تروح

''لیلیٰ کی چہار دیواری سے میری محبت جوش مارتی ہے، اس روح کے جذب سے میری روح رخصت ہورہی ہے۔''

ولا حت بوجھی من معالم دمعتی
لنص احادیث الغرام شروح

''میرا چہرہ میرے آنسوؤں کے نشانوں سے چمک اٹھا، شوق کی احادیث کی نص کے لیے شرحیں ہیں۔''

فدمع المشوق الصب ھاتک سترہ
متی ستر الاشواق فھو یبوح

''شوق کے آنسو بہانا ان کا پردہ کھولنا ہے، شوق پر پردہ ڈالا تو وہ ظاہر ہوگیا۔''

وإن كنتم العذال وجدا فوجهه
عليه علامات السقام تلوح

''اور اگر تم وجد وجنون پر ملامت کرنے والے ہو، تو اس کے چہرہ پر بیماری کی علامتیں چمکتی ہیں۔''

عليه يعاليل السحاب حزينة
عليه مشاكيل الرعود تنوح

''اس کے اوپر تہ بہ تہ بادل غمزدہ ہیں، اس کے اوپر بچوں کو گم کرنے والی گرج نوحہ کرتی ہیں۔''

كان الليالي السود فيه محدة
بها من تها ليک المشوق جروح

''اس میں سیاہ راتیں تیز ہیں، ان میں شوق کی ہلاکتوں سے زخم ہیں۔''

وشق تباشير الصباح جيوبها
عليها اصيلاً للدماء سنوح

''صبح کے نور نے اس کا سینہ چاک کر دیا، اس پر خون کے لیے شام کے وقت علامات وحادثات ہیں۔''

۲۳۳۔تفہیم:

نبی کی صفت اور اس کے شریعت لانے کا راز

نبی وہ شخص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ مخلوق کے لیے شریعت کے احکام پہنچانے والا بنا کر اور ان پر اس کی نبوت کے اقرار اور اس کی طاعت کو لازم قرار دے کر مبعوث کرتا ہے۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ جب ان کے لیے نوافل، فرائض اور ملکوت کے قرب مکمل ہوجاتے ہیں، اور ان کے لیے قربتیں ایک ہوجاتی ہیں، اور کمال کا دورہ حاصل ہوجاتا ہے، اور ان کا نسب اور ان کے ملکات فنا ہوجاتے ہیں تو قرب ملکوت میں ان کے نسمہ کے کمال کی ان کے

لیے تجلی ہوتی ہے تب ان پر شریعت نازل ہوتی ہے۔اور اس کا تحمل نسمہ میں ہوتا ہے، اور حکمت میں بھی بخشش کی جاتی ہے، پھر قرب فرائض میں اور پھر قرب ملکوت میں ہوتی ہے۔ اور یہ دوارائے ہیں جن میں تقلید نہیں ہوتی۔ پھر ہم نے ان کی تعبیر کی، پھر جب ہم دورۂ کمال میں پہنچ گئے تو اس نے اپنا لباس صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہنا۔اور ہم نے نقص کی چہار دیواری دیکھی اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا لیکن ہم داخل نہیں ہو سکے۔اور اس کے دروازے پر ملک عرب کے کچھ لوگ تھے جو داخل ہونے سے منع کر رہے تھے۔اس لیے ہم اس میں داخل نہیں ہوئے۔حتیٰ کہ سید عربی نے اجازت دی اور ہمیں داخل کرنے اور ہمارے ساتھ عزت واکرام سے پیش آنے کا حکم دیا۔اور اس مسئلہ میں لوگوں کے کئی مذہب ہیں۔مگر ان میں سے صرف وہی حق ہے جو ہم نے تمہیں سکھایا ہے۔اس کو پہچان لو۔

کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میری اطاعت کرو، جب تک کہ اس کی طاعت حق کی طاعت میں فنا نہ ہو جائے، اور جب تک کہ اس کا ارشاد عام نہ ہو جائے، اور یہ قرب ملکوت سے ہے۔اور جب تک اس کے علوم، علوم نسمیہ میں نہ اتر جائیں۔اور یہ نسمہ کی تجلی سے ہے۔اور اس لیے تم ان علوم کو دیکھو گے جن کو رسولوں نے پوری طرح لوگوں کو نسمیہ لازم کیا۔اور قربتوں میں کوئی ایسا پوشیدہ مقام نہیں ہے جس تک پہنچنا کسی کے لیے جائز نہ ہو، سوائے اس مقام کے جس کی شان اعلیٰ اور برہان اعظم ہے۔ چنانچہ اب یہ متحقق ہو گیا کہ مذاہب مشہورہ کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے مختص ہیں کہ فرشتوں کو ان کی طرف بھیجا گیا یا شریعت سازی اس کے لیے اصل ہے۔اس کا حق ایسا نہیں (جیسا کہ مشہور ہے)

۲۳۴-**تفہیم:**

ختم نبوت اور اس کا راز

اللہ تعالیٰ کی سنت اس کی مخلوق کے سلسلہ میں یہ ہے کہ جب کسی نے درجہ کو مکمل کر لیا اور اس کی انتہا کو پہنچ گیا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس تک اس راستہ سے پہنچے۔اور اس کی انتہا پر قائم ہو جائے۔اور وہ عجیب الشان کے راز کے لیے ہے۔اور وہ یہ ہے کہ افاضۂ ایجادیہ بدئیہ جس طرح مفاض کی تشخیص کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس میں اس کے غیر کا شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا،

اسی طرح افاضۂ تکمیلیہ عودیہ، کمال کی تشخیص اور اس پر مفاض کے تشخص کا اس کمال کے لحاظ سے تقاضہ کرتی ہے۔ اس راستہ سے جان لو کہ وہ فیض جو اللہ اپنے کسی بندہ کو عطا فرماتا ہے، وہ کبھی بھی آدم سے اس آخری آدمی تک جو قیامت کے قریب پایا جائے گا، پیدا نہیں ہوا۔ ہم نے یہ بات اس وقت واضح طور پر بتادی تھی جب قرب ملکوت میں ان تمام کمالات کو جمع کیا تھا، اور نشاۃ عودیہ اعتبار سے مقدم ہے۔ چنانچہ انبیاء ایک کے بعد ایک کمال کو ختم کرتے رہے اور جو ان کے بعد ہے وہ صرف اس کے ایک شعبہ میں قائم ہوتا ہے۔ خواہ اس کے تابع ہو یا دوسرے کمال میں۔ حتیٰ کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پائے گئے تو آخری درجہ قائم ہوگیا۔ اور وہاں سے وہ نشاتیں پیدا ہوئیں۔ جن کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس دورہ کو ختم کرنے والے ہوگئے۔ اس لیے آپ صلوات اللہ علیہ وسلامہ کے بعد کسی نبی کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔

۲۳۵۔ تفہیم:

انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ اور پانچ قربتوں سے مقربین کے درمیان واسطہ ہونے کے معنی

اللہ سبحانہ اور ان پانچ قربتوں میں سے کسی ایک سے مقربین کے درمیان انبیاء کے واسطہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ان پر کمال کا فیضان کرنے والے ہوتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان کی قربت اور توجہ کی سمت وہ ہے جس سے اس نبی کے کمال کی اصناف سے عود کے وقت تشخص ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ توسط کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک مجازی سے مشابہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ متقرب جب اس قرب کے لحاظ سے اللہ سبحانہ کی طرف متوجہ ہوا تو یہ حرکت اور یہ توجہ اس دورہ سے اس نقطہ پر واقع ہوگئی جو مطلقاً سب سے بعید ہے اور اس سے ایک نبی کی حقیقت عود کے اعتبار سے متعین ہوئی۔ اور توسط کی یہ نوع نہ تحقق سے متصادم ہوتی ہے اور نہ ہی نبوت سے۔ اور اس قسم سے انبیاء ایک نبی کے تابع ہوتے تھے۔ جیسے بنی اسرائیل کے انبیاء موسیٰ علیہ وعلیہم السلام کے تابع تھے۔

اور دوسرا معنیٰ حقیقی کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ متقرب کمال سے اپنا حصہ صرف نبی اور اس تجلی کے باطن سے لیتا ہے جو اس کے سینہ سے ظاہر ہوئی۔ اور یہ صحابہ کے

ساتھ مختص ہے۔ اس لیے کہ اس کمال کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور یہ اصحاب دورۃ الایمان اور شرح صدر کے ساتھ خاص ہے۔ اور ان دونوں کے بعد صرف تحقیق ہے۔ اور رسول اس کام کے لیے مبعوث نہیں کیے گئے کہ وہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان قرب نوافل میں اور اس کے بعد واسطہ ہوں۔ بلکہ وہ اپنے کمال کے قبیل سے اس لیے مبعوث کیے گئے کہ لوگوں کو طبیعت کی تاریکیوں سے نور ایمان اور شرح صدر کی طرف نکالیں، جس سے وہ جنت میں داخل ہو جائیں۔

۲۳۶- تفہیم:

اللہ سبحانہ سے نسمہ کی معرفت کی غایت کا بیان

اللہ سبحانہ سے نسمہ کی معرفت کی غایت تسبیح یعنی اس کی طرف توجہ ہے، ادراک اور وجدان سے نہیں بلکہ اس بنیاد پر کہ وہ اس سے اعلیٰ و بالاتر ہے کہ کوئی اس کا احاطہ کرے۔ اور یہ علم تنزیہی غیر آلی ہے۔ صرف اس امر کی مستحق ہے کہ اس کو تسبیح کا عنوان دیا جائے اور یہ درجہ انسان وغیرہ بہائم، پرندوں اور درندوں کو عام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول سبح للہ ما فی السموات والأرض "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسان ان کے درمیان بلا شبہ صفات کے اثبات سے خاص ہے۔ یعنی وہ سننے والا ہے، لیکن ہماری طرح نہیں، دیکھنے والا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، جاننے والا، لیکن ہمارے علم کی طرح نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول "فسبح بحمد ربک" میں اسی طرف اشارہ ہے۔ حاصل یہ کہ مغفرت تامہ اس طرح مل جاتی ہے کہ دورۂ ایمان میں ذکر سبحان اللہ وبحمدہ اور استغفر اللہ واتوب إلیہ ہے۔ اور یہ دونوں لفظ انسانی شر کے دفاع کی طرف اشارے ہیں۔ اور اعوذ باللہ بھی اسی کی طرف اشارہ ہے اور اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف راغب ہوتے ہیں اور آپ علیہ السلام سے منقول صبح وشام کی دعائیں، اس دورہ میں کافی ہوتی ہیں۔ اور اس طرح فرض اور مسنون صلوات وصدقات اور روزے اور حج تصفیہ کی قوس (کمان یا نصف دائرہ) پورا کرتے ہیں۔ اور تزکیہ کے قوس میں اخلاق سیئہ، کبائر، بدعات، سیئات اور زبان وقلب کی

آفات شامل ہیں۔جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۳۷-تفہیم:

مذہب حق

ہمارے نزدیک مذہب حق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دوروں، دورۂ ایمان اور دورۂ شرح کے اعتبار سے زیادہ فصیح ہیں۔اور ان دونوں کے علاوہ سے کنایہ کیا ہے۔ جہاں تک ان دونوں کا تعلق ہے تو مجتہدین کے اجتہاد، عبادت کرنے والوں کی عبادت اور اہل تصوف کے تصور کی کسی آمیزش کے بغیر ان دونوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا واجب ہے، بلکہ آپ علیہ السلام سے جو کچھ نقل ہوا ہے، خالص اس میں اقتداء کریں۔اور ان دونوں میں کسی قسم کا دخل کرنا تحریف ہے۔جہاں تک دوسرے دوائر کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں فصاحت ناممکن ہے کہ ان کے بارے میں اظہار گونگا پن اور بیان ابہام ہے۔اس لیے آپ علیہ السلام نے ان سے سکوت اختیار فرمایا۔اور اس کو سالک کی حالت کے حوالہ کر دیا۔

۲۳۸-تفہیم:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملت ابراہیمی میں ہونے کی تحقیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی میں ہیں۔اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ایک یہ کہ شرع میں ان کی ملت پر ہیں۔اور آیت میں یہی مراد ہے اور اس وجہ سے ہم نے الخیر الکثیر میں کہا ہے کہ انبیاء کی عادات کا شریعت سازی میں دخل ہے۔اور یہ کہ تشریع میں توارث کا دخل ہے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت آپ کے جد امجد ابراہیم کی شریعت ہے۔اور دوسرے یہ کہ قربتوں میں ان کی ملت پر ہیں۔اور ہم نے خیر کثیر میں خزلنۃ الانبیاء میں جو کہا ہے، اس سے یہی مراد ہے۔اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقت کی شرح ہے۔چنانچہ آپ کے کمالات ان کی تفصیل ہیں۔

۲۳۹-تفہیم:

سلوک کے معنی

اہل اللہ کے طائفہ کے نزدیک یہ امر ہے کہ سلوک اس علم میں چلنے سے عبارت ہے جو کیف کا مقولہ ہے، جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم نے الخیر الکثیر میں جو تمہید بتائی ہے، اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ علم قرب حقیقت کے لیے لازم ہے۔

۲۴۰-تفہیم:

رسول اللہؐ کے ارشاد نحن احق بالشک من ابراھیم کی شرح

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم کے مقابلے میں شک کے ہم زیادہ حقدار ہیں جو کہ انہوں نے کہا تھا رب ارنی کیف تحی الموتی "اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو کس طرح زندہ کرے گا۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اولم تؤمن "کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟" انہوں نے عرض کیا: بلی ولکن لیطمئن قلبی "ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" اور آپ نے فرمایا: اللہ لوط پر رحم فرمائے وہ کسی مضبوط سہارے کی پناہ چاہتے تھے۔ اور اگر میں کسی قید خانہ میں اتنی طویل مدت رہتا جیسا کہ حضرت یوسف رہے تھے، تو بادشاہ کے قاصد کے بلاوے پر چلا آتا۔ (بخاری) یہ علم یقین کے درجات میں سے ہے، پھر اطمینان ہے۔ چنانچہ جس طرح یقین کے مقابلہ میں شک کا نام دیا جاتا ہے، اسی طرح اطمینان کے مقابلہ میں بھی شک بولا جاتا ہے۔ اور اس شک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی خلجان پیدا کیا کہ وہ صاحب اقربیہ و اجمال تھے۔ اس طرح کہ ان کو علم و حکمت خالص نہیں ہوتے تھے۔ اور تم ان کے حق میں قرب نوافل، قرب وجود اور قرب فرائض نہیں پاؤ گے۔ اور یہ شک ان نقاط کے بعد پیدا ہوتا ہے جن میں احاطہ کرنے والا فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ امثال اور عین کے جمع کرنے سے پوری طرح مطمئن ہوئے تو جو ان کے بعد ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فإن کنت فی شک "اگر تمہیں کوئی شک ہے۔" ولکن فی صدرک حرج "اور

تمہارے دل میں کوئی جھجک نہ ہونی چاہیے۔" اور اس میں ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے تعجب کا اظہار اور ان کے نفس کی تسکین ہے۔ اور لوط علیہ السلام کی تمنا میں شدید خواہش ہے کہ ان کے پاس کوئی قوت ہوتی یا وہ کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے لیتے۔ اور اس میں اللہ کی طرف سے ذمہ داری دینے میں ڈھیل پر ان کے دل کی تنگی ہے۔ تو آپ علیہ السلام نے اس لفظ سے ان کے اس فعل پر تعریض کی اور فرمایا اللہ لوط پر رحم فرمائے وہ یاوی یعنی ایوا کی تمنا کرر ہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے تمنی کی جگہ لیت کا صیغہ استعمال کیا۔ اور اس طرح کی باتیں محاوروں میں بکثرت ہوتی ہیں۔ جیسے "وخرقوا له بنين وبنات" اور "جعلوا له اندادا" چنانچہ علمهم اياه على وجه ان کے آپ کو ایک طرح سے جاننے کی جگہ جعل خارجی کا صیغہ استعمال کیا۔ اور اس تاخیر کی طرف اشارہ کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حتى اذا استيئس الرسل یہاں تک کہ جب رسول مایوس ہو گئے حالانکہ انبیاء اور ان کے طریقہ پر چلنے والے صرف اس وقت مایوس ہوا کرتے ہیں جب تولی سبب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی ہمت اور کسب کی انتہا تولی کا انتظار اور نگرانی ہے۔ اور جب لوط نے دیکھا کہ تولی میں تاخیر ہو رہی ہے تو تمنا کی کہ کوئی ایسا سبب بن جائے۔ اور وہ بغیر تولی کے ایمان لے آئیں۔ جبکہ ان کا حال ایسا نہیں تھا۔ اور قید خانہ میں طویل مدت تک رہنے سے دل کو اضطراب ہوتا ہے اور اس پر صبر نہیں ہوتا۔ لیکن جب یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ تولی ان کے لیے برأت کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے تو انہوں نے خود کو مزید حبس میں روک لیا اور صبر سے کام لیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل پر ان کی مدح وستائش کی۔ اور ان کے مقابلہ میں تواضع سے کام لیا کہ فرمایا اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو اس کی طاقت نہ رکھ پاتا۔

۲۴۱—**تفہیم:**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت اور اس کی سب سے اہم وجہ—وجہ الوجیہ

بہت سے اللہ والوں کے نزدیک یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت

میں تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ مسئلہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا۔ یعنی تجلی اول کی طرف فطری طور پر لوٹ گیا۔ اور عین صرف اسم کی مثالوں کی ایک قسم ہے۔ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے، حتیٰ کہ ان کے نزدیک یہ ثابت ہوا کہ اس عین کے لیے اس کی حقیقت میں اتحاد ہے۔ چنانچہ جس نے تجلی اول سے اپنا حصہ لیا تو لامحالہ اس نے اس عین سے لیا اور ہم نے حکمت سے اس کا کچھ ذائقہ چکھ لیا۔

اور جب ہم قرب ملکوت میں پہنچ گئے اور کمالات پوری طرح حاصل ہو گئے تو ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بھائی، رسولوں کے ساتھ مخلوق کو دعوت دینے اور رسالت کی تبلیغ سے متعلق کمالات سے شریعت سازی وغیرہ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اور تمام کمالات خالص جو بندہ سے اخذ کرتے ہیں، اللہ سبحانہ کی ذات کی طرف منتہی ہوتے ہیں، تو امر متحقق ہو گیا اور ظاہر ہو گیا کہ انجاس یا فیضان کے اجرا کی دو قسمیں ہیں۔

ایک انجاس مقدس اسمائی، وہ بغیر مادہ کے ہوتا ہے۔ یہاں ایک صورت ہوتی ہے جس کا فیضان فقط اس کی شرح کرنے والے اسم سے ہوتا ہے تو جس کی حقیقت دوسرے کی حقیقت سے اعلیٰ و اتم ہوتی ہے، اس کے ذریعہ اس پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے انجاس اعیان، اس حقیقت سے کہ اسماء منتہی ہو جائیں تو یہ مادہ میں صورت کے نقش ہونے کے مانند ہے اور جس کے سلسلہ میں ہم مادہ کو بطور کفایہ استعمال کرتے ہیں، وہ اس اسم کی وسعت رکھتا ہے، جس کا ارادہ کیا جاتا ہے اور جس کا کفایہ ہم صورت خصوصی سے کرتے ہیں۔ وہ الحی القیوم وغیرہ اسماء کی مانند ہے اور جب اسم مادہ میں نقش ہو جاتا ہے تو جو امر مادہ کے مناسب ہوتا ہے، اس کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اور اس کی صفا پر باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ مادہ کے لیے مناسب صورت سے مخلوط ہوتا ہے جو کہ عین ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اس کی طرف کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کی عین کی حکایت ہوتی ہے اور سبیل راستہ کے سوا کوئی تشبیہ بھی نہیں ہوتی۔ اور تشبیہ و حکایت دونوں تکون (ہو جانا) ہیں اور اس لیے ان کو اعیان کہا جاتا ہے۔ اور ان کا مرتبہ اسماء کے مرتبہ سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ عین کے کمالات اور ان کے فروع کے اصول جن سے ان کی صورت اور ان کا مادہ متعلق ہوتے

ہیں، وہ سب اس اسم سے فیضان حاصل کرتے ہیں جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ البتہ قرب نوافل میں واسطوں کا اسقاط اور اللہ سبحانہ کی ذات میں ان کا فنا اور ان کے حقائق کی طرف جو ہر نفس کے انکسار کی طرف سب کا لوٹنا ثابت ہوتا ہے، اس وقت یہ گمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن معرفت سابقہ کلیہ تامہ وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کے اخوان اور اقران میں تفصیل کے سلسلہ میں حق یہ ہے کہ اس سبیل تکونی کے حقوق ضائع نہیں کئے جاتے۔ اور کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تشبیہ تکونی کے مطابق نصیب تام اور حظ وافر لیا۔ چنانچہ آپ کو قرآن دیا گیا، اور آپ کی دعوت ثقلین کے لیے عام ہوئی، اور اس پر نبیوں نے مہر لگائی، اور آپ نے اپنی امت کی شفاعت کی۔ اور آدم اور ان کے بعد والے آپ کے جھنڈے تلے آئے۔ اور بالجملہ کمالات عودیہ سابقہ تامہ نے آپ کو ان کے درجہ کے اوپر فضیلت کا درجہ دیا۔ اور یہ معرفت انبیاء اور رسولوں کے درمیان متداول ہے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فضیلت دیتے ہیں۔ یہ ہم نے ان سے اخذ کیا ہے۔

۲۴۲۔ تفہیم:

اوصیا اور مجددین کے درجات کا تفاوت

تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اوصیا اور مجددین درجات قرب کے کسی ایک درجہ پر نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کا چہرہ دورۂ ایمان یا شرح صدر کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اس کا قلب وصایہ یا مجددیہ کی طرف پھرتا ہے۔ اور کچھ وہ ہیں کہ ان کا چہرہ اور قلب دونوں وصایہ مجددیہ کی طرف ہوتے ہیں۔ اور اکثر صحابہ کاملین اسی طریقہ پر تھے۔ یعنی ان کے چہرے وایمان کے مقابل، اور ان کے قلوب کمال کی نوع آخر کی طرف ہوتے تھے۔ اور جن لوگوں کو تم اس درجہ پر دیکھتے ہو، اہل علم وفضیلت میں سے وہ عنقریب تقریباً پچاس افراد ہو جائیں گے۔ اور ان میں اکثر مہاجرین اولین ہیں۔ اور جو ان سے احسان کے ساتھ بعد میں ملے ہیں، ان کا ٹھکانہ اور ماوی ایمان کے دو دورے اور شرح صدر ہوتا ہے، لیکن وہ صحت اور استقامت کی وضع پر ہوتے ہیں، اور تحقیق کے ساتھ تشبیہ ان کے غیر میں کبھی بھی متحقق نہیں

ہوتی اور وہ اس سیدھی (مستقیم) وضع میں سب سے زیادہ حق ہوتا ہے۔

۲۴۳۔تفہیم:

فائدہ تکوینیہ جلیلہ

کیا تیری معرفت کے کان کے سوراخ میں یہ بات نہیں گونجی کہ حیوان کے مزاج کے حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست میں مختلف طبقات ہیں۔ان میں سب سے بارد نوع کے لیے مزاج سے محدود وزن ہے۔اس پر اس کے تمام افراد وارد ہوتے ہیں۔اس کے لیے ابتدا ہے، اور اس کے لیے انتہا ہے۔ان دونوں سے اس کی نوع متعین ہوتی ہے، اور ان دونوں پر اس کی ہیئت، صورت، افعال واخلاق متفرع ہوتے ہیں۔تو جب گرم اسباب اس کی گرمی پر منعقد ہوتے ہیں تو وہ اس وزن سے نہیں نکلتے۔بلکہ ممکن ہے کہ اس انتہا کو پہنچ جائیں جو حرارت کے قریب ہے۔اور اس طرح گرم مزاج کو ٹھنڈے اسباب کا انعقاد اس کی تبرید تک نہیں پہنچتا۔بلکہ اس غایت تک پہنچتا ہے جو برودت کے قریب ہے۔

اور اس معرفت پر احوال عین کو قیاس کرو کہ وہ اگرچہ مستقلۃ الحقیقت اور صافیۃ الہیئت ہوتے ہیں۔وہ مطلق عین کی طبیعتوں اور اسم مرید کے استفاضہ سے نہیں نکلتے۔

اور اس پر مجددین اور اوصیا کے احوال کو قیاس کرو کہ صحابہ کا زمانہ چونکہ دورۂ ایمان کا زمانہ تھا۔ان میں سے اوصیا اور مجددین اس دورہ سے نہیں نکلے۔یہی معاملہ زمانہ شرح صدر، زمانہ قرب نوافل اور زمانہ حکمت کا ہے۔یہاں تک کہ وہ ہمارے اس زمانہ تک منتہی ہوگئے جس میں باقی تمام کمالات جمع ہوگئے۔اور منع کر دیا کہ اس سے وسیع وکشادہ پایا جائے۔

رم آہو بمیاں برزدہ دامانی را

”ہرنوں کے گلہ نے دامن کو درمیان سے پھاڑ دیا ہے۔“

۲۴۴۔تفہیم:

قرب ملکوت میں تمام کمالات عطا کیے گئے

میں اللہ عزوجل کی حمد کس زبان سے کروں، اور کس لفظ سے اس کی ثنا بیان کروں کہ

اس نے قرب ملکوت میں تمام کمالات مجھے عطا کیے ہیں۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرة

لسانا لما استوفیت واجب حمده

''اگر میرے ہر بال کی جڑ میں ایک زبان ہوتی، تو بھی میں اس کی حمد کے تعلق سے جو واجب ہے اس کو پورا نہیں کر پاتا۔''

اور یہ کمال صرف علم کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ تحقیق اور تلون رنگ میں رنگے جانے کے لحاظ سے بھی ہے۔ اور اس نے مجھے جو پہلی شئے عطا کی، وہ آسمان اور زمین کا علم قضا اور علم تدابیر ہے۔ چنانچہ مجھے ملائکہ میں سے مقربین کے رنگ میں رنگ دیا، اور میں نے خود کو ملک کے اندر قوت تصرف میں پایا اور ان میں سے بعض امور بالفعل واقع ہوئے۔ جب ہمارے اس سفر میں حیلے وتدابیر تنگ ہو گئے۔ جس کو فتح الباب کہا جاتا ہے۔

پھر منبع شریعت کے صادق آنے، اور ملائکہ سے حاملین شرع کے صادر ہونے، اور اسباب خارجیہ مترتبہ سے کمال کے اختلاط کی جانب سے ست کی دعا میں علم شرع حاصل ہوا۔ جیسا کہ ہم نے دورۂ حکمت میں شرع کا ذائقہ چکھا۔ پھر ہم نے اس کو قرب فرائض میں سمجھا، پھر مجھے تمام انبیاء کے مقامات حاصل ہوئے۔ چنانچہ ایک دوسرے سے افضل کمالات کو ہم نے منفرد شکل میں اور غیروں سے ممتاز صورت میں جانا۔ اور ان کے علاوہ بھی ہمیں حاصل ہوئے۔ اگرچہ ہم ان کے بیان پر قادر نہیں ہیں، اور اس وقت ہم ان کی تشریعات پر آئے، اور ان کے رنگ میں رنگ گئے۔

پھر مجھے صحابہ، اولیاء اور علماء کے مقامات حاصل ہوئے۔ چنانچہ ہم مقام وصایہ، ارشاد اور مجددیہ وغیرہ پر قائم ہو گئے جن کو بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر ہمیں دوسرے طریق دیئے گئے، جن کی مثالیں احوال ومقامات میں رسول ہیں۔ پھر ہم نے تنگ باغیچہ دیکھا کہ اس کے دروازہ پر عرب کے لوگ تھے جو ہمیں اس میں داخل ہونے سے روک رہے تھے، حتیٰ کی سید عربی نے ہمیں داخل کرنے اور ہماری عزت واکرام کرنے کا حکم دیا، تو ہم اس میں داخل ہوئے اور غیر ملک سے خالی ہوئے۔ اور جان لو کہ ہم نے مقامات کی تعبیر جماعت میں مستغرق ہونے کے

بعد ہی کی ہے۔اور ہفتہ میں یا اس سے زیادہ میں ایک بار اس میں مضمحل ہوئے۔پھر افاقہ ہوا۔
اور ہم نے کسی مقام کی تعبیر تحقیق کے ساتھ اسماء ملائکہ اور اسماء قدیمہ کے ایک دوسرے پر صادق آنے کے بعد ہی کی۔انسان کی نشاۃ اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتی۔

اور ہم نے انبیاء سے مقربین کے اسماء کے ایک دوسرے پر صادق آنے کے سلسلہ میں اور صحابہ واولیاء کے حقائق کے عکس کے سلسلہ میں جو تعبیر کی ہے، وہ اس تقلید کے مشابہ ہے جو ان امور کے علاوہ ہے جن میں صرف تصادق واقع ہوا۔چنانچہ وہ تحقیق تقلیدی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فبهداهم اقتده" ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے بھی مقلد نہیں تھے، بلکہ محقق تھے۔

۲۴۵-تفہیم:

اقتراب میں طریقۂ قویمہ کیا ہے؟

جب ہم تمام کمالات کے رنگ میں رنگ گئے تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ اقتراب میں طریقۂ قویمہ ومستقیمہ وہ ہے جس پر رسول صلوات اللہ علیہم وسلامہ چلے، اور جو مشقت بھری طاعات مثلاً صوم دہر، آخر رات تک کے قیام، ہر دن رات میں ختم قرآن وغیرہ اور اخلاق دقیقہ جیسے اس کی طرف ریا وسمعہ کے دقائق اور قلب وزبان کی آفات سے احیاء وکیمیا ہدایت کرتی ہیں۔دورۂ ایمان میں تمعقات عامہ سے حاصل ہوتا ہے، تو اس میں نفع کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے، جس پر طاعات کی روایت سے صریح احادیث دلالت کریں اور جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاط اور فیاضی نفس وغیرہ کے تعلق سے کوئی نص بیان کی ہو۔

اور اس طرح جو کچھ اشغال قلبیہ اور قوانین سازی اور توکل سے حظ وافر اور تصرفات وبطش شدید سے نصیب کامل کے اخذ میں اہتمام سے قرب نوافل کے دورہ میں تعمقات اولیاء، اتلاف اور احیاء کی صورت میں حاصل ہوتی ہے، وہ طریق سے بچاتا ہے اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے طریق میں دشواری اور کیچڑ ہے۔چنانچہ جس نے بنفسہٖ موخر کیا اور زمین کی طرف مائل ہوا وہ ٹخنوں اور گھٹنوں یا نرخرہ تک کیچڑ میں دھنس گیا۔سعید

و نیک بخت وہ ہے جو طریق اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور مقصود کا احاطہ کرتا ہے، اور تمام رات و دن بنفسہ سفر کرنے میں تیز رفتار سے کام لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اور اس طرح الہیات، تکوینیات اور اقترابات کی جزئیات، تفصیلات اور براہین کے بیان میں حکما کے تعمقات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ ایسے امور ہیں جن کو علم قرار نہیں دیا جاسکتا کہ علم وہ ہے جس کا وجود شرف اور فقدان نقص ہے اور جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے یہ کہہ کر سوال کرتے تھے رب زدنی علما "اے میرے رب مجھے زیادہ علم عطا فرما"۔ اور جس کا وارث اللہ سبحانہ نے انبیاء میں سے اپنے چنیدہ بندوں اور ان کے طریق پر چلنے والوں کو بنایا۔ وہ صرف امور کا ذوق ہے اور ان کا اولاً نسمہ میں پھر کلام میں اتارنا کبھی بھی اختلاف اور سوءِ نظر سے خالی نہیں ہوتا۔ خواہ آدمی زبانً کے لحاظ سے سب سے زیادہ فصیح، فکر و نظر کے اعتبار سے سب سے بڑا نقاد، ادراک کے لحاظ سے سب سے زیادہ ذکی و فہیم اور فطانت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بیدار مغز ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس وجہ سے رسول صلوات اللہ علیہ والسلام نے ان علوم کے تعلق سے سکوت اختیار فرمایا۔ حالانکہ علوم آپ کے نسمہ میں اس طرح اتر گئے تھے جیسے درخت کے تنوں اور پتوں میں پانی اتر جاتا ہے۔

اور ہم صریح طور پر یہ بھی جان گئے کہ رسول جب اپنے کمال کو پورا کر لیتے ہیں تو کسی بھی ضرورت سے اس تشریع کی طرف بہاؤ کرتے ہیں جو نسمہ کے کمالات سے ہے اور وہ عجیب شان والا راز ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے اسم کے اطلاق اور اس کے ملائکہ کے اسماء پر صادق آنے اور ان کے نسب کی فنا اور ان کے اضافات اس تدبیر کے ساتھ ان کے کمال سے مخلوط ہوتے ہیں جو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوئی۔ اور قضا جو نظام عالم میں پختہ ہے اور جس کو فرشتوں کا صدور جمال بخشتا ہے جو درجہ بدرجہ گھیرے ہوئے اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا مخلوق کی طرف بھیجنا لوگوں کو طبیعت کی تاریکی سے ایمان کے نور کی طرف نکالنے کی مصلحت کے تحت ہوتا ہے تاکہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں اور حیات ابدی میں کامیاب ہو جائیں۔

اور یہ مصلحت ان مصالح عالم کے مشابہ ہوتی ہے جن کی بنیاد خیرات پر ہوتی ہے۔

چنانچہ ان کے علوم نسمیہ دورۂ کمال میں نقش ہو جاتے ہیں۔ ان کے اوپر شرع عام لازم نازل ہوتی ہے۔ اور بالجملہ تشریع کمالات نسمہ میں اس کی سلطان ہوتی ہے اور دورات آخر غیر مشروعہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے سلطان کے تحت نہیں ہوتے۔

اور اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جب آدمی اس امر سے بیٹھ جاتا ہے، جس کی اولیاء پیروی کرتے ہیں تو اس میں اصلاً کوئی گناہ نہیں ہوتا، نہ کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی عتاب یا عقاب۔ اور یہ کہ انبیاء کا توسط کمالات اور ان کے استبداد میں ان کی تحقیق کے منافی نہیں ہوتا۔ ہاں انبیاء کی صحبت ان کمالات میں فائدہ دیتی ہے جن کی تفصیل ہم نے بیان کی ہے۔ یہ صحبت کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس شخص کی صحبت جو ان کے طریق پر ہوتا ہے، اس کا فائدہ دیتی ہے۔

اور جان لو کہ شرع کی قدر اس وقت کم نہیں ہوتی جب دورۂ ایمان کے ماسوا شامل نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ اقترابات اس وقت ضائع نہیں ہوتے جب تشریع ان میں شامل نہیں ہوتی، کہ ہر نشاۃ کے لیے ایک حکم ہوتا ہے، نہ ایک سے تعداد میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے تجاوز کرتا ہے۔ اچھی طرح تدبر سے کام لو کہ مسئلہ بہت عمیق ہے۔

۲۴۶- تفہیم:

عالم عناصر میں کواکب کی تاثیر ہے یا نہیں؟

حکماء ربانی اور عامۃ الناس سب کا اتفاق ہے کہ عالم عناصر میں کواکب کی تاثیر ہوتی ہے۔ البتہ حکماء کے نزدیک یہ تاثیر ان خاصیات کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ سبحانہ نے ہر شئے میں ودیعت کی ہیں۔ جیسے آگ میں حرارت اور پانی میں برودت، تاثیر کی صفت سے عالم میں امر منزہ کے سرایت کرنے سے نہیں ہوتی ہے۔ ہاں ان کے علاوہ کے نزدیک تسخیر کی صفت سے منزہ ان کی حقیقت کے سرایت کرنے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ حکماء کے نزدیک اس کی مثال اس آگ کی سی ہے جس میں گرمی پائی جاتی ہے۔ جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں اس نشاۃ دنیوی سے ہوتی ہیں۔

اور اس میں راز یہ ہے کہ جس کو تم دریافت کر سکتے ہو کہ اگر تم عالموں اور جہانوں کے مدمقابل کو اور انسان کبیر کے فی نفسہ اتصال کو جانتے ہو اور اس کی مثال دوسروں کے نزدیک قضا جیسی ہے کہ کسی شئے کے لیے کہا کُن ہو جا، فکان ہو گیا۔ بغیر کسی مدمقابل اور بغیر اتصال کے بلکہ اس عالم محسوس میں تسخیر کی صفت سے وصف الٰہی کے سرایت کرنے سے ہو گئی۔ اسی طرح اولیاء کی ہمتوں کا مسئلہ ہے کہ حکماء ان کو عالموں اور جہانوں کے مدمقابل اور انسان کبیر کے اتصال پر رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک نفس ناطقہ اس عالم محسوس کی ایک شئے ہے جو قضاء کلی کی تشخیص کے لیے اس طرح تیار کرتی ہے جیسے نشاۃ کے خواص تیار کرتے ہیں۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ منبع قدر سے ماخوذ امر صرف وجہ کلی عام پر ہوتا ہے پھر تشخیص معدات کے اعتبار سے ہوتی ہے، اور یہ کہ اولیاء کے نفوس پر جب شعاع الٰہی تسخیر کی صفت سے ضرب لگاتی ہے تو اس کی نشاۃ میں قوت واضحہ قوی ہو جاتی ہے اور عام لوگ اس طرح جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے جیسے ہم جانتے ہیں۔ وہ ان کو تاثیر قدسی پر رکھتے ہیں اور اسی طرح طیرہ (نحوست، بدفالی)، کھوپڑی، مرض کا متعدی ہونا سب حکماء کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہیں۔ لیکن نسمہ جب ان علوم سے تنگ ہو گئی اور اس کے اوپر سے ہر تاثیر بغیر فصل کے تاثیر قدسی ہو گئی اور نسمہ میں شرع آ گئی تو یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک شمار کیے گئے۔

اور اسی طرح جب ہم شریعت کی زبان میں کلام کرتے ہیں تو یہ حکم لگاتے ہیں کہ نجوم، طیرہ، عدوی، ماہ صفر، اللہ سبحانہ کے علاوہ کی عبادت اور اس کے سوا سے استعانت اور اللہ کے علاوہ کے لیے نذر اور ایمان، سب اللہ کے ساتھ شرک ہیں۔ پھر جب عوام نے ہم سے ان کی تاثیرات کے بارے میں کہا تو ہم نے انہیں جواب دیا کہ کیا شراب میں بدن کی صحت کی تاثیر نہیں ہے، پھر بھی وہ حرام ہے جیسا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے جواب دیا کہ پہلے کو کس نے چھوت لگائی؟ جس نے اول یعنی تاثیر قدسی سے تجاوز کیا تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اول و ثانی اس کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ البتہ تاثیر عادی میں ہمیں کوئی کلام نہیں ہے۔

اور جس پر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے ان کے آخر تک اتفاق کیا اور جو

احوال، سلوک اور مکاشفات میں ان کے طریق پر ہیں کہ اس عالم میں کوئی تاثیر قدس الٰہی سوائے ان اسماء کے نہیں ہے جو حادث ہیں جن کو مقرب فرشتوں کے صدور اٹھاتے ہیں۔ اور تاثیر عادی جہانوں کے مدمقابل کے حوالہ کردی گئی ہیں۔

۲۴۷- **تفہیم:**

دورۂ کمال کے خصائص کا بیان

دورۂ کمال کے خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ سبحانہ بندوں کے معاملات، ان کے ظاہر کا بھی اور باطن کا بھی ذمہ دار ہو جاتا ہے۔ اور ولایت کا راز اس کے نام کا ملائکہ وغیرہ کے ناموں پر صادق آتا ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی طرف چلایا جاتا ہے جو اس میں اس کی دنیاوی واخروی جزا ہے۔ اور وجاہت کی مانند ہے اور اس کے لیے محبوبیت لازم آتی ہے۔ اور مجھے اس کی بشارت اس وقت دی گئی جب میرے والد صاحب قدس سرہ نے میرا نام ولی اللہ رکھا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے شیخ قطب الدین کو دیکھا تھا کہ ان کو ایک بیٹے کی بشارت دے رہے ہیں۔ اور ان کو اپنے نام کی طرح قطب الدین نام رکھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ لیکن جب میں پیدا ہوا تو والد صاحب اس واقعہ کو بھول گئے۔ اس لیے انہوں نے میرا نام ولی اللہ رکھ دیا، پھر جب ان کو اور دوسرے لوگوں کو یاد آیا جنہوں نے ان سے اس واقعہ کے بارے میں سنا تھا تو میرا یہ نام رکھا۔

اور ان کے خصائص میں سے روحانی اسرار ہیں جو جاگنے اور سونے کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کی اور ان بزرگوں کی سوتے جاگتے رویت جو مر چکے اور یہ حکمت کی مثال ہے۔ اور اس کے خصائص میں سے فناء، نسب اور اضافات اور موافقت خالص ہیں جن میں مخالفت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور یہ عصمت کی مانند ہے۔

تا ز میخانہ دمی نام ونشاں خواہد بود
سر ما خاک درِ پیر مغاں خواہد بود

''جب تک میخانہ کا کوئی نام ونشان باقی رہے گا، ہمارا سر پیر مغاں کے در کی خاک بنا رہے گا۔''

۲۴۸- تفہیم:

دورۂ کمال سے آگے بندہ کیلئے زیادتی قرب کا کوئی درجہ نہیں ہے

جب بندہ اس دورہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے تحقیق پوری ہو جاتی ہے اور ولایت کی نشاۃ میں کسی ایسے درجہ کا تصور نہیں کیا جاتا جو اس سے زیادہ قریب ہو۔ اب اگر عنایت اس کے کمال کے نظام کے ساتھ ان فرشتوں سے ترتب کے لیے اختلاط کی طرف چلتی ہے جو مبنی علی الخیرات ہیں، اور اس دورہ میں نسمہ کے کمالات کی تجلی اور شرع عامہ کے نزول کی طرف چلتی ہے جو کہ لازم ہے، تو یہ خاتم النبیین کے بعد نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کے برعکس ہو۔

اور بالجملہ اس کے بعد صرف نبوت اور اس کے متعلقات کے کمالات ہیں جیسا کہ ہم نے اختلاط کے بارے میں بتایا اور تجلی اور اس کے بعد کمالات عزم ہیں جو مخاصمت و جہاد یا ہجرت اور ملک و سیاست اور ارشاد و ہدایت کے لحاظ سے ہیں، اور ان کے بعد شارح کی شرح اور تعمق تام اور باب نبوت کا بند کرنا ہے۔ اور اس سے کمالات بشر منتہی ہوتے ہیں اور ان کے بعد مقرب ملائکہ کے قضاء عام اور اس تدبیر کے اتارنے میں کمالات ہیں، جو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں، اور لوح پر اطلاع وغیرہ ہیں۔

۲۴۹- تفہیم:

نبوت کے بعد کی بشارتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بشارتوں سے جو نبوت کے بعد باقی رہیں وہ امر مراد لیا ہے جو شرع لازم ہونے سے قبل اسرار وغیرہ سے دورۂ کمال میں آسان ہوتا ہے۔ اور بشارت سے وہ شئے مراد لی ہے جو شرعاً لازم نہ ہو۔ خواہ وہ امر شرعی ہو جیسے عبداللہ بن زید کا خواب اذان کے سلسلہ میں، یا امر شرعی نہ ہو جیسے صحابہ کے خواب جب دوسرے اس کے موافق نہیں تھے، اور برابر ہے کہ صرف اس پر ہو یا نہ ہو۔

۲۵۰- تفہیم:

دورات سبع میں اولیاء اور ان کا حصہ

انبیاء اور سلوک میں ان کی اقتدا کرنے والوں کے طریقہ کی تشریح ان مقامات کا بالترتیب طے کرنا ہے جو ہم نے دورات سبع کے سلسلے میں تمہیں بتائے ہیں۔ پھر یہ جان لو کہ اولیاء کی جولان میں سے کچھ قسمیں ہیں۔ چنانچہ کبھی ان سے ایک دورہ مقدم ہو جاتا ہے اور کبھی موخر۔ اور کبھی دورہ کسی دوسرے کے ساتھ ترکیب پاتا ہے۔ چنانچہ ان کے آثار ان دوروں سے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے شیخ عبدالقادر فنا فی اللہ ہوئے، تو ان کے لیے اللہ سبحانہ کی تجلی ان کے نفس ناطقہ کی ہیئت میں نازل ہوئی، تو وہ نفس پر ایک صورت تھی جیسا کہ نفس ہیولی پر صورت ہوتا ہے۔ اور ان کا نفس اپنی جبلت میں قوی تھا۔ اور اس طرح اس پر نازل ہونے والی ہیئت بھی قوی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے ان اسماء کی طرف ایک طریق تھا جو مقرب ملائکہ کے سینوں میں طلوع ہوئے جیسے وجہ خاص۔ چنانچہ آپ اس میں فنا ہو گئے تو اس کے لیے بطش شدید سے آثار نظام کا جدا ہونا وغیرہ حاصل ہوئے۔ اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قدم حکمت میں راسخ ہو گئے اور آپ کے لیے شرع واضح ہو گئی تو ان کو منبع شریعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح سے وہ شرع دکھائی گئی۔ چنانچہ ان کو اس کی طرف عروج حاصل ہوا اور اس سے وصایہ عطا کئے گئے۔

۲۵۱- تفہیم:

دورۂ کمال کے جزئیات میں سے قرب اعمال

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ دورۂ کمال کے جزئیات میں سے قرب اعمال ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال صالحہ صحیفہ میں قائم ہوتے ہیں، پھر تصادق کے لیے اسم میں تجلی کرتے ہیں، پھر یہ تجلی پوری طرح نسمہ میں رنگ جاتی ہے۔ اور اس قرب پر قبول دعوت، پھر ظہور اشرافات موقوف ہوتے ہیں۔ اور اب میں اس امر کا استصواب کرتا ہوں کہ وہ مراد لیا جائے جو صحیح حدیث میں یہ قرب لفظ نوافل و فرائض سے

وارد ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس پر استعاذہ سے اعاذہ اور قبول دعا متفرع ہوتے ہیں۔

اور جس کو یہ قرب پہنچ گیا اس کو صرف دنیا اور آخرت میں اللہ سبحانہ کے مواخذہ کے خوف کی عصمت ہی باقی رہی۔ جیسا کہ یحییٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں میرے نیچے سے زمین نہ پھٹ جائے۔ اور اس قرب کا نام وسیلہ رکھا جاتا ہے۔ رب العالمین نے فرمایا "وابتغوا إليه الوسيلة" اس قرب کے اعظم اسباب میں سے اسماء سے دعا ہے، اور یہ علم عمیق المأخذ ہے۔

۲۵۲- تفہیم:

بشر کامل کو مقرب ملائکہ پر فضیلت نہیں ہے

اللہ والوں میں سے بہت سوں کے نزدیک یہ خیال واقع ہوا ہے کہ بشر کاملین، مقربین ملائکہ پر فضیلت رکھتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ رجحان یا تو وجوہ قرب میں ہوگا یا اس کے مقادیر میں یا وسائط یا وجہ خاص کے اعتبار سے جو کہ معیت ذاتی یا آثار تسخیر یہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور ملائکہ ان سب میں انسانوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ گمان دو وجہوں سے پیدا ہوا۔

ان میں سے ایک جماعت کو عشق میں محبت کا ہیجان عطا کیا گیا۔ اور انہیں اپنے بعض واقعات سے یہ واضح ہوا کہ ملائکہ کو یہ عطا نہیں کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عشق اور قلق وصول کے متعلق ہونے سے قبل عالم تخلیط کی بدعات میں سے ہیں۔

اور ان میں سے ایک جماعت کو فنا سے قبل قرب معیت عطا کیا گیا اور انہیں اپنے طریق میں ملائکہ میں سے کوئی نہیں ملا۔ ان کے لیے قرب وسائط ہے۔ اور انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ ملائکہ کو قرب معیت سے حظ وافر اور نصیب تام ہے۔ یہ کیسے ہے جبکہ انہیں تمام اقترابات حاصل ہیں۔ اور اگر تم ان کے بارے میں اطلاع پاؤ گے تو حیرت انگیز امر اور شان ظاہر دیکھو گے اور تم ان کے فضل اور ان کے اقترابات پر یقین کر لو گے۔ اور تمہیں امر واضح ہو جائے گا۔ اور اس گمان نے لوگوں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ وہ اس حقیقت سے نابلد رہے کہ انہیں (یعنی انبیاء اور

فرشتوں کو) معیت سے حظ وافر حاصل ہے اور اس سلسلہ میں عوام کا قول ایسا نہیں ہے کہ جس میں کوئی کشش ہو۔ انہوں نے دیکھا کہ ان میں سے بشر کاملین نے اپنے نفسوں کو شرور سے روک لیا۔ اس کے ساتھ جوان کی طبیعت ہے۔ جبکہ ملائکہ کو اپنی مقدس طبیعتوں کی وجہ سے عفت حاصل ہے اور یہ شاعرانہ قول ہے۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول "**فسجد الملائکة کلهم اجمعون**" تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، کو بے محل استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اس کو عنصری و مادی وغیرہ پر عام کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قول **کان من الجن** "وہ جنات میں سے تھا"۔ اور **خلقتنی من نار** "تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے" کی تاویل مشکل ہو گئی تو انہوں نے اس کی وہ تاویل کی جو کبھی کہیں سنی نہیں گئی۔ اور کیا ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو؟ ہمارے پاس تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے **علمه شدید القوی** اور اس کا قول ہے کتنے ہی ہیں جن کو ہم نے پیدا کیا اور عام نہیں کیا۔

۲۵۳- تفہیم:

توحید کی حقیقت جس کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا گیا

جس توحید کے ساتھ انبیاء کو مبعوث کیا گیا وہ ہے جو اسماء متجددہ کے مطابق ہو۔ وہ نہیں جو اسماء ازلیہ کے مطابق ہو۔ جیسا کہ اس پر ولایت کے اکابر نے نص کیا ہے۔ اور توحید اولیاء کی اصطلاح اور انبیاء کے مفہوم کے درمیان مشترک لفظ ہے تو جس نے دونوں امور کو مخلوط کر دیا، اس نے اندھیرے میں تیر چلایا اور وحدۃ الوجود شرک سے بالکل بھی نہیں بچا تا۔

۲۵۴- تفہیم:

یونس علیہ السلام کی اپنی قوم کو بددعا

جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو بددعا دی حالانکہ ان کی دعا صحیفہ میں درج و مطلوب دعا سے ہٹ کر تھی۔ پھر جب قوم نیک وصالح ہو گئی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی، تو تقاضہ یہ ہوا کہ ان کے عمل کو خارج میں نکالا جائے تاکہ اس کے ذیل میں کوئی اثر چھٹا ہوا نہ رہ جائے جو ان کے لیے عیب ہو، تو ان کے لیے زرع وغیرہ کے قصہ میں ان کے عمل کی ہیئت پر تین صورتیں تھیں۔

چنانچہ وہ شر سے پوری طرح پاک ہوگئے، یہ ان کے اوپر اللہ کا خاص کرم تھا۔

۲۵۵-تفہیم:

اس مسخ کا راز جو داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا

اس مسخ کا راز جو کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ان لوگوں میں ہوا جنہوں نے سبت کے سلسلے میں حد سے تجاوز کیا، اور وہ یہ کہ انہوں نے جو عمل کیا، وہ ان کے صحیفوں میں درج ہے۔ اوران کو اپنے گھٹیا اعمال اور حسین اخلاق کے لحاظ سے بندر سے ایک مناسبت تھی۔ چنانچہ ان کے چہروں میں وہی صورت واقع فرمادی۔ کیا ہم نے تمہیں بتایا نہیں کہ صورت ایک عرض ہے۔ چنانچہ اس کا وقوع غیر پر ممکن ہوتا ہے۔

۲۵۶-تفہیم:

دعا کی قبولیت کا واقعہ

ہمارے قریہ پھلت پر راہزنوں نے غلبہ حاصل کرلیا۔ انہوں نے قریہ والوں پر اپنے جانوروں کے ذریعہ چڑھائی کردی اوران کے مال واسباب لوٹ لیے حتی کہ لوگوں کا وہاں رہنا دشوار ہوگیا۔ چنانچہ میں نے اللہ عزوجل سے دعا کی کہ ان سے اس مصیبت کو دور فرمادے۔ تو میرے رب جلالہ نے مجھے الہام فرمایا کہ میں نے ان کو امان میں کردیا۔ میں نے یہ بات اپنے بعض احباب کو لکھ بھیجی۔ چنانچہ وہی ہوا جو الہام کیا گیا تھا۔ والحمد للہ رب العالمین.

۲۵۷-تفہیم:

حق میں بشارت کا خواب

میں نے اپنے بھائی نوراللہ کو بعض ضرورتوں سے سونی پت بھیجا تو وہاں اس کے قیام کی مدت طویل ہوگئی۔ میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ ان کو تمہارے حق میں بشارت کاملہ دی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں اپنے بعض اجلہ اخوان کو خبر دی۔ جب وہ لوٹ کر ہمارے پاس آئے تو میں نے اس بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے امام شہید ناصرالدین محمد کو خواب میں دیکھا کہ گویا وہ ہمارے پاس کھڑے ہوئے

ہیں اور ہم، میں، نور اللہ اور محمد عاشق اپنے سامنے رکھا ہوا کھانا کھا رہے ہیں۔ تو انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور فرمایا کہ جان لو یہ دنیاوی کھانوں میں سے نہیں ہے، اور نہ ہی جنت کے کھانوں میں سے ہے۔ اور اللہ نے اس کو تمہارے لیے مخصوص کیا ہے۔ تو میں نے کہا، ہاں۔ والحمد للہ رب العالمین. اور اسی رات کو خواب کی موافقت اہل سونی پت کے ایک لڑکے نے کی۔

۲۵۸- تفہیم:

حرمین شریفین کا سفر اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مامور ہونا اور بعد میں اس کی تائید ہونا

اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ میں بیت اللہ زادہ شرفا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا رخ کروں۔ اور اس عزم کو میرے دل میں زیادہ قوی اور شدید کر دیا، تو میں نے اس بارے میں اپنے اہل تعلق وقرابت کو بتایا اور یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اقربا کے دلوں میں یہ بات ڈالے گا۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالے گا تو وہ ہمارے اس طویل سفر پر جانے کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔ چاہے کتنے ہی دلائل دیئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہاں تک کہ ہم ان سے الگ ہو گئے تو انہیں معلوم ہوا اور انہوں نے ہمیں اس سلسلہ میں لکھا۔ تب میں نے ان کو لکھا کہ اس کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے اور جو کوئی بھی میرے اس سفر میں رکاوٹ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کرے گا۔ پھر بھی جو میں نے ان کو لکھا، وہ ان کے لیے کافی نہیں ہوا۔ وہ سوار ہو کر ہمارے پاس پہنچے اور ہر طرح کی کوشش اور ہر ممکن سعی وجدوجہد کی۔ اور ہم اطمینان کے ساتھ چلتے رہے۔ چنانچہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکے اور ناکام ہو کر واپس لوٹ گئے۔

اور میرے رب نے مجھے سمجھایا کہ میں تمہارے لیے اس سفر میں آسانیاں پیدا کر دوں گا۔ اور تمہیں بہت کچھ دوں گا اور بڑے احسان کروں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور ہمیں قرب ملکوت وقرب کمال وغیرہ عطا فرمائے جو اس کے بڑے احسانوں، عظیم نعمتوں میں سے ہیں۔ والحمد للہ رب العالمین.

۲۵۹۔تفہیم:

بعض مریدوں کے دل کے حال سے باخبر ہونا

اس سفر کے دوران اللہ سبحانہ نے میرے دل میں یہ القا کیا کہ نور اللہ کا قلب اللہ سبحانہ کی تعظیم کے سلسلہ میں تفریط کی وجہ سے عظیم آفت میں مبتلا ہو گیا ہے۔اس لیے اس کو حکم دو کہ اپنے نفس کا ادراک کرے۔ ورنہ اس کا دین اور دنیا دونوں خراب ہو جائیں گے۔تو میں نے اس پر غیظ وغضب کا اظہار کیا اور میرے رب نے مجھے جو حکم دیا تھا میں نے اس کو بتایا۔تب اس نے بعض وہ باتیں بتائیں جو اس کے دل میں خطرات کے طور پر راسخ ہوگئی تھیں۔تب اللہ سے توبہ کی۔ چنانچہ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔اور اللہ کا اس کی توبہ قبول کرنا میری رعایت سے تھا۔اس لیے میں نے اللہ عزوجل ذوالجلال والاکرام کا شکریہ ادا کیا۔

۲۶۰۔تفہیم:

قبولیت دعا کا واقعہ

ہمیں اس سفر میں اپنے ایک بھائی کی بیماری کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔جس سے میرے دل کو اضطراب ہوا۔ میں نے اپنے ایک بھائی کو ایک گاؤں کی طرف بھیجا کہ اس کے لیے سواری لائے۔ راستہ میں اس کو رات ہوگئی تو میں نے دعا کرنی شروع کی۔ میں کہہ رہا تھا "یا بدیع العجائب، یا بدیع العجائب، یا بدیع العجائب" تو اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ دعا اپنے موقع پر پہنچ گئی ہے اور بند دروازہ کھل گیا ہے۔ میں نے اپنے بھائیوں کو اس کی خبر دی پھر جس کو ہم نے بھیجا تھا وہ ایک بیل لے کر آیا، جب کہ اس وقت یہ آسان نہیں تھا۔

۲۶۱۔تفہیم:

توجہ سے مریض کا شفا پانا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تولیت

میرے رب جل جلالہ نے مجھے سمجھایا کہ تمہارے مریض کی شفا تمہاری توجہ اور

ہمارے تمہیں ذمہ دار بنانے میں ہے۔ کسی کی موت یا کوئی دوسرا ضیاع لازمی ہے حتیٰ کہ مریض کی ہلاکت کا عوض ہو جائے تو مجھے خوف لاحق ہوا اور میں نے کہا الامان. کہ اگر ضروری ہی ہے تو اس سے پریشان خاطری ہوگی۔ پھر واضح ہوا کہ یہ تفہیم گزرے ہوئے امر کے بارے میں تعلیم تھی۔

۲۶۲-تفہیم:

ولی اللہ اور قطب الدین نام رکھنے کی وجہ

میرے والد قدس سرہ فضائل ظاہری و باطنی کے جامع اور ولی عارف تھے۔ ایک بار وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مرقد کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو شیخ نے آپ سے کلام کیا اور ایک بیٹے کی ولادت کی بشارت دی۔ اور حکم دیا کہ اس کا نام ان کے نام پر قطب الدین رکھیں۔ جب میں پیدا ہوا تو اللہ سبحانہ نے یہ بات بھلا دی کہ وہ میرا نام قطب الدین رکھیں۔ انہوں نے میرا نام ولی اللہ رکھ دیا۔ اور یہ اسباب کے انعقاد کی وجہ سے تھا کہ میں صیغہ مفعول سے متولیٰ ہوں پھر انہوں نے میرا نام قطب الدین بھی رکھا۔

۲۶۳-تفہیم:

والدہ کا خواب اور اس کی تعبیر

میری والدہ بارک اللہ فی عمرھا نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب شکل والا پرندہ میرے والد قدس سرہ کی طرف آیا۔ وہ اپنی چونچ میں ایک کاغذ لیے ہوئے تھا۔ جس پر سونے سے اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ پھر دوسرا پرندہ آیا اس کی چونچ میں بھی ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم لو کان النبوۃ بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ممکنا لجعلناک نبیا ولکنھا انقطعت بہ ''اللہ کے نام سے شروع جو رحمن و رحیم ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ممکن ہوتی تو ہم تمہیں نبی بناتے۔ لیکن یہ سلسلہ آپ پر ختم ہو گیا''۔ یہی الفاظ تھے یا ان سے ملتے جلتے معنی تھے۔ اور پہلے پرندہ کی چونچ لال اور اس کا سارا جسم کبوتر کی طرح غبار آلود تھا۔ اور دوسرے کا سارا جسم

طوطے کی طرح ہرا تھا۔ تو میرے والد قدس سرہ نے فرمایا تمہیں اپنے بیٹے کے بارے میں خوشخبری ہے۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ولی ہوگا۔ میری والدہ نے فرمایا اس خواب میں یہ بات میرے علم میں تھی کہ یہ بشارت تمہارے والد کے حق میں ہے۔ والد قدس سرہ نے فرمایا معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہ تمہارے اندر ہے۔ معاملہ میری والدہ پر مشتبہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ تعبیر کا حق جس طرح حکمت کے قوانین تقاضہ کرتے ہیں، یہ ہے کہ پہلا کاغذ میرے والد قدس سرہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ وہ فانی فی اللہ اور اس میں مستغرق تھے۔ جہاں تک اس کے غبار آلود ہونے کا سوال ہے، وہ اس لیے تھا کہ وہ ذکر معارف میں مشغول نہیں تھے۔ اور اس طرح کبوتر اور فاختہ اچھی آواز والے ہوتے ہیں لیکن فصیح آواز نہیں ہوتے، اور جہاں تک دوسرے کاغذ کا سوال ہے تو یہ اس کمال کی طرف اشارہ ہے جو مجھے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کی تشریح القا کے طور پر دی گئی اور اس کے چونچ میں لینے والے کا ہرا رنگ معارف میں فصاحت ہے۔ جیسا کہ طوطا فصیح ہوتا ہے اور اپنی آواز کی تقطیع کرتا ہے، اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں شیر خوار تھا۔ والحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم.

۲۶۴-تفہیم:

انبیا علیہم السلام اس علم کے بارے میں خالص تھے جو ان کی مراد نہیں تھا

انبیاء صلوات اللہ علیہم وسلامہ نے اس علم کے تنقیہ سے چشم پوشی کی جو ان کی مراد نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسماء قدیمہ ازلیہ کی اور ان کی اور زمانہ کے ساتھ اسماء معاصرہ کی تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ حکم عدم میں اس کے حامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام کو ایک ہی درجہ میں رکھا۔ ان کی طرف تمام موجودات کے لحاظ سے نسبت

مستوی کی۔ چنانچہ اللہ عزوجل کے قول سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا: **قل کل من عند اللہ** "تم کہہ دو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔" اور انہوں نے اسماء متجددہ متاخرہ کو ایجاد اور ارشاد کے لحاظ سے دوسرے درجہ میں رکھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل کے قول سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا: **ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیۃ فمن نفسک** "تمہیں جو بھلائی پہنچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی کمائی ہے۔ اور اس کی طرف مومنوں کی مدد اور ان کی ولایت منسوب کی گئیں۔ اور وہ اعیان اور نفوس ناطقہ کے ذکر سے رکے رہے۔ اور انہوں نے نسمہ کے کمالات کو اختیار کیا اور یہ نقشہ بنایا کہ ہر کمال ان کے اوپر استعداد عین یا نفس کی جانب سے امر ذہنی، صرف مستند کو مستعدات کا لحاظ کیے بغیر محض ارادہ مجردہ کی طرف نازل کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک ان کے اسماء، اسماء ملائکہ وغیرہ سے خلط ملط ہو گئے۔ چنانچہ تفصیل حرام ہو گئی اور دو مرتبوں کے علاوہ توحید قائم ہو گئی اور اس طرح وہ عالم تکوین میں ہر تیاری سے رکے رہے۔ اور انہوں نے فعل کو محض ارادہ کی طرف منسوب کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نفسوں کو تمام لوگوں سے ممتاز نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور ان کے اوپر آیتیں جاری کیں۔ جو کسی غیر پر نہیں کیں اور یہی امیت ہے اور اس کے مقابلہ میں جنایت حکما اور وقاحت اولیا آتی ہے۔

اور جب ہمیں دورۂ کمال حاصل ہو گیا تو ہم نے اپنے وجدان کی جانب سے ہر تفصیل سے برأت کا اظہار کر دیا۔ اور اس میں ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ اور ہماری اور ان کی امیت میں فرق یہ ہے کہ ہماری امیت کسب کی ہوئی ہے اور ان کی امیت فطری ہے۔ اور یہ کہ امیت تامہ ہے۔ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے کہ اس کے ساتھ تفصیل کی طرف دیکھیں اور ہماری امیت ناقص ہے۔ ہم اس کے ساتھ تفصیل کی طرف نظر کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اور شاید اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں کمال عطا فرما دیں۔

۲۶۵- تفہیم:

اللہ تعالیٰ وتقدس کی تجلیات کا ذکر

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح نظام عالم کے مطابق یکے بعد دیگرے تجلی فرمائی حتی کہ تمام موجودات وجود میں آ گئیں، اسی طرح ان سے آگے اس کی دوسری تجلی ہیں۔ ان کے مطابق مراتب قرب میں تفاضل واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب نفس ناطقہ کا جوہر ٹوٹ گیا، وہ اس وقت پائی گئیں جب اس عالم کی طرف رحمت وشفقت پائی گئی جن کے طریقے ان کے طریقوں کو ان کے اصولوں کی طرف منسوب ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے لیے نشاۃ اصول کے علاوہ دوسری نشاۃ مکمل ہو گئی۔ پھر جب جذب کی ہوا چلی تو عالم مقدس کی طرف رحمت وشفقت ہوئی اور ان کے اوپر عالم مقدس کے لیے ان کے ہونے کا حکم غالب آ گیا۔ اور ان کے لیے ان کے اصولوں کی طرف وسیع کشادگی پیدا ہو گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا حکم، حکم عین میں مضمحل ہو گیا بلکہ اس کے اوپر کے حکم میں سفیدی پر مضمحل ہوا۔

اور اس انقلاب کی علامتوں میں سے ایک اس کے علم مطابق کی طرف علم مقید میں انقلاب اور توحید اور تقرر کا فنا ہے یا جو کچھ تم اس کو نام دو۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس کے لیے دوسری طرح تجلی ہے۔ یہ تجلی نہ جوہر ہوتی ہے اور نہ ہی عرض۔ بلکہ وہ دونوں اسی عالم سے ہوتی ہیں۔ اور وہ اس کی ملائمت وتازگی اور جگہ کی کشادگی ہے۔ ہاں نفس اس تجلی کے لیے ایک پیمانہ ہوتا ہے اور اس سے متعلق ہوتا ہے۔ اور جب یہ تجلی پوری طرح مکمل ہو گئی تو بندہ کے لیے اللہ سے کلام کرنا اور اللہ کے ساتھ چلنا صحیح ہو گیا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے۔

اور اس تجلی کی مثال آئینہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے جیسی ہے جو مٹی پر ڈال دیا گیا تو اس نے سورج کی نورانیت سے کئی گنا زیادہ اکتساب کیا جس کا تصور ساری زمین کے لیے کیا جاتا ہے۔ اور اس کے واسطہ سے ان اسماء سے لحوق متحقق ہوا جس کو مقرب ملائکہ نے اٹھایا۔ اس سے عالم میں تاثیر اور خرق عادت حق کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔ اور اس حالت کو ہم فنا کا نام دیتے ہیں۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ نفس اللہ سبحانہ کے رنگ میں رنگ گیا۔

اور بالجملہ ان سے مختلف عبارتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض بعض سے زیادہ فصیح ہوتی ہیں۔ اور کبھی ذاتیات کا کشف ہوتا ہے اور کبھی اس تجلی کے لیے معد امر اور لوازم کا بیان کافی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بندہ نص کے لحاظ سے اس امر کی طرف رحمت وشفقت ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس نشاۃ کا حکم غالب آجاتا ہے اور اس لیے تجلی نفس کے قیاس پر اور اس کے مدمقابل ہوتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کا نفس حکم کو واجب قرار نہیں دیتا بلکہ اس میں اس کی نشاۃ علیا کا حکم غالب ہوتا ہے۔ اور نفس اس کے لیے اس کے احکام میں شرح پاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جوہر نفس ہر ممکن طور پر جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے لیے عین اور اس کے اصول روشن ہوتے ہیں۔ پھر اس کے لیے جوہر عین ٹوٹ جاتا ہے اور یہ انکسار دقیق الشان اور عظیم البرہان ہوتا ہے۔ اور اس کے اصولوں کی طرف اس کے راستوں کا انسداد، انسدادِ نفس کی طرح نہیں بلکہ دوسری قسم کا ہوتا ہے۔ اور اس کے عامل کی طرف اس کی رحمت اس کے عامل کی طرف نفس کی رحمت کی مانند نہیں ہوتی۔

اور وہ اس لیے ہے کہ ہیولیٰ وہاں مرید کے اسم کی شعاعیں ہوتی ہیں جو کہ بالفعل افاضہ ہے اور صورت دوسرا اسم الٰہی ہوتا ہے جو کہ تقیید کی طرح مقید ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ نشاۃ ہیولیٰ اور صورت کی جہت سے مقدس ہوتی ہے تو اپنے عامل کی طرف اس کی رحمت بھی مقدس ہوتی ہے۔ وہاں انکسار مقدس ہوتا ہے جس کی تفسیر کرنا اس سے زیادہ واضح طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

پھر جب یہ انکسار واقع ہو جاتا ہے تو اللہ سبحانہ عین کے قیاس پر اور اس کے مدمقابل تجلی فرماتا ہے۔ یہ تجلی من جملہ عالم عین سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی ملائمت وتازگی اور جگہ کی کشادگی پر اس سے زیادہ عالم اقدس ہوتا ہے اور ہم ان تجلیوں کا نام اسماء متجددہ رکھتے ہیں اور ان کا اسماء ہونا ان کے تقدس اور عالم عین پر ان کی برتری کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان کا متجددہ ہونا اس تجلی کے اس کی ہیئت کے حدوث کی وجہ سے ہے جس ہیئت کی وجہ

سے تجلی ہے۔

اور عالم عین کی طرف نسبت کے لحاظ سے اس تجلی کی مثال گمراہی کی طرف نسبت کے لحاظ سے آئینہ کے اس چھوٹے ٹکڑے جیسی ہے جسے اس میں ڈال دیا گیا ہو کہ اگر عین کے ہزار نور ہوں تو بھی اس تجلی کی نورانیت کا ادراک نہیں ہوتا۔ پھر جب یہ تجلی ملائکہ مقربین کی تجلیات پر صادق آتی ہے تو وہ قرب ملکوت ہوتا ہے، پھر جب تصادق مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ بندہ کو اس کے تمام ظاہری و باطنی امور میں ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ پھر جب مصائب اس کی طرف رخ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتے ہیں جیسا ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ میں اور ایوب علیہ السلام کے لیے ان کی بیماری میں ہوا تھا۔ اور جب اللہ تعالیٰ سے اس شدت کے ساتھ دعا کی جو وہ اپنے دل میں پاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ جیسا زکریا علیہ السلام کے لیے ان کے بیٹے کے قصہ میں ہوا۔ اور جیسا عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دستر خوان کے نزول کے وقت ہوا۔ اور وہ اس کے لیے ایسا فعل کرتا ہے جس میں اس کی جزا ہوتی ہے خواہ ظاہراً یا باطناً۔ حالانکہ وہ جانتا بھی نہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کی طرف گئے۔ حالانکہ آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ تولی سے ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ چنانچہ صلح واقع ہوئی اور وہ فتح کے لیے مبدا تھی۔ اور جیسا کہ بدر اور حنین وغیرہ کے وقت ہوا۔ اور لوگ اپنے اعمال کو ہلاکت کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بندہ ان کے عذاب کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اور بالجملہ اس تولی کی قسمیں جو انبیاء کے لیے ظاہر ہوتی ہیں، حد شمار سے زیادہ ہیں، اور وہ ان کو جانتے ہیں جیسا کہ اولیاء سے خرق عادت کی بہت ساری انواع ہوتی ہیں۔

اور ہم قرب اول کے لیے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس میں تجلی فرمائی۔ اور ثانی کے لیے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عین میں تجلی فرمائی۔ اور اول کے بارے میں کہتے ہیں، حق کے آئینہ میں تیرے نفس کی رویت اور ثانی کے بارے میں تیرے نفس کے آئینہ میں حق کی رویت۔ اور ہمارے نزدیک یہ واقع ہوتا ہے کہ وہاں اسماء کا امر واحد ہے، گویا کہ وہ اسم ہادی ہے اور وہ ازلی ابدی ہے۔ لیکن کبھی شکل عین اختیار کرتا ہے اور کبھی شکل

نفس۔ اور اس کی مثال ہوا جیسی ہے کہ وہ اس وقت سے موجود ہے جب سے زمین اور آسمان پیدا کیے گئے۔ پھر وہ مسدس یا مربع برتن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر جب میں جوہر ہوا کی طرف قیاس کرتا ہوں تو کہتا ہوں، وہ اس وقت سے موجود ہے جب آسمان اور زمین کو پیدا کیا گیا تھا۔ اور جب اس کی مسدسیت یا مربعیت کی طرف قیاس کرتا ہوں تو کہتا ہوں کہ فلاں دن حادث ہوئی۔ اور اس طرح یہ اسم ایک اعتبار سے ازلی اور ایک اعتبار سے متجدد ہے۔ اور ہماری زبان میں یہ واقع ہوتا ہے کہ متجدد کے لیے عین کی وسعت سے وسعت ثابت ہوتی ہے۔ اور اس سے ہماری مراد وہ ہوتی ہے جو ہم نے کہا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہ واقع ہوتا ہے کہ جس قدوسیت سے ہر ممکن کامیاب ہوتا ہے، وہ نشاۃ دنیا میں وسیع ہوتا ہے، پھر اس سے تجلی الٰہی ہوتی ہے۔ ولی، ولی ہو جاتا ہے، اور جو صورت الٰہیہ عالم عین میں شامل ہوتی ہے، وہ وسیع ہو جاتی ہے اور رنگ جاتی ہے تو آدمی نبی یا انبیاء کے طریقہ پر کامل ہو جاتا ہے۔ اور ہماری عبارتیں مختلف اور غرض واحد ہوتی ہے۔ تم ہماری عبارتوں سے دھوکہ میں نہ پڑو کہ ہماری نسبت تقریر اول سے رجوع یا اس کو بھولنے کی طرف کرنے لگو۔ بلکہ امر مقدس ہے جس کا اظہار اس سے زیادہ بہتر طریقہ پر ممکن نہیں کہ اس کے لیے عبارتیں وضع کی جائیں۔

۲۶۶-تفهيم:

سالک کے بعض احوال کی مثال

إذا راق في الاكوان شئى لعاشق

إذا غاب من يهواه ليس بصادق

''جب کائنات میں کوئی شئے عاشق کے لیے پسندیدہ ہو جاتی ہے، جب وہ غائب ہو جاتا ہے جو اس کی خواہش کرتا ہے تو صادق نہیں ہوتا۔''

ومـذنـدمنا من نـايـد جمــاله

كعـنقـاء ماالــراوق كان برائق

”اور جب ہم میں سے وہ جس کا جمال مثالی ہے، اس عنقا کی طرح جو پردے کے پیچھے ہے گم ہو گیا تو چمکدار رہا۔“

وما انفكت الإيام حربا فتية
بتنقيص مشتاق مواف موافق

”اور زمانہ ساری زندگی، ایسے مشتاق کی تنقیص میں جنگ میں مشغول رہا جو کہ وفادار موافق ہے۔“

كأن السحاب السود خافت فتونها
احدت على خضر القدود الرشائق

”گویا کہ سیاہ بادلوں کے جنون سے خوفزدہ ہیں، جنہوں نے پھرتیلے ہرے جسموں پر حملہ کیا ہے۔“

ومن نقض ميثاق الربيع تفرست
فناحت على الاوراد ثم الشقائق

”اور موسم ربیع سلماً بہار کے عہد کے ٹوٹنے سے فراست آئی، چنانچہ گلابوں اور گل لالہ پر نوحہ کیا۔“

فعش مانساک الدهر سلماً لاهله
نديما لا قداح نصوحا لشائق

”تو اس طرح زندگی گزار کہ زمانہ تجھے نہ بھولے، اہل زمانہ کے لیے سلامتی بن کر، پیالوں کا ساتھی بن کر اور مشتاق کا ہمدرد بن کر رہ۔“

ومالدين هل تدريه غير نصيحة
وما الغل الا من مناف موافق

”اور کیا تمہیں معلوم ہے ہمدردی کے سوا دین کیا ہے، اور دھوکہ مخالف اور موافق کے سوا کہاں سے آتا ہے۔“

۲۶۷-تفهیم:

بعض احوال دل ربائی کی حکایت

اشم عرف الرضا من نسمة السحر

لعلها کسیت من نشرة العطر

"میں رضا اور خوشنودی کو نسیم سحر سے سونگھتا ہوں، شاید اس کے پھیلنے سے عطر اور خوشبو پھیل گئی۔"

اری نعومة وجه الورد تجذبنی

سری به سره یوماً من العمر

"میں دیکھتا ہوں کہ گلاب کی نرمی مجھے کھینچ رہی ہے، اس نے زندگی میں ایک دن اپنا بھید بتا دیا۔"

والورق ینشد من ورق الهوی غزلاً

فهل محاسنه انبته عن خبر

"اور ہر یل (ورقاء) عشق کے پتوں میں سے غزل گاتی ہے، تو کیا اس کی خوبیوں نے اس کو خبر دار کیا ہے۔"

والبان بان به وجدیریحه

علی هواه له کاسا من الخمر

"اور بان کے درخت سے وارفتگی ظاہر ہوئی جس کی ہوا سے، شوق کو شراب کا پیالہ راحت دیتا ہے۔"

علی هواه یود الناس کل هویٰ

من الملاح ومن شمس ومن قمر

"اس کی تمنا کے اوپر لوگ ہر خواہش کو پسند کریں گے، دریا کی ہوا سے اور سورج اور چاند سے۔"

۲۶۸-تفہیم:

دورۃ الایمان کے ارکان کا بیان اور شرح صدر کے دورہ کے احکام

دورۂ ایمان کے ارکان یقین، توحید، محبت، فنا، توکل، عبادت، ذکر اور ان دوروں سے ماخوذ قدریں ہیں۔ اور یقین یہ ہے کہ ان امور پر بھروسہ کرے جن کا اللہ نے آخرت میں وعدہ کیا ہے۔ جس سے اس کے دنیاوی مصائب آسان ہو جائیں۔ اور توحید یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کی تمام وجوہ عبادت، استعانت، ذکر، ذبح اور تاثیر کے لحاظ سے برات کا اظہار کرے اور ان سب کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ اور محبت یہ ہے کہ جب ہر وہ چیز جس سے وہ لذت حاصل کرتا ہے، کھانے، ازدواجی امور، لباس، اہل وعیال، مال وجاہ وغیرہ اللہ کے غیظ وغضب سے قریب ہو جائیں تو ان کو کمتر جانے اور انہیں ترک کر دے۔ اور فنا یہ ہے کہ تمام کبیرہ گناہوں کو ترک کر دے اور صغیرہ گناہوں پر اصرار سے بچے اور ہر اس لذت سے بچے جس سے اللہ راضی نہ ہوتا ہو اور روش پر قائم رہے۔ اور توکل یہ ہے کہ بدفالی، فساد و بگاڑ، ہامہ بحتاجی اور پستی وہلاکت پر اللہ کے فیصلوں کو غالب قرار دے۔ اور عبادات، نمازیں، روزے اور صدقات وغیرہ واجب اور مسنون ہیں اور ذکر مقررہ اوقات کی دعائیں۔

اور ذکر کے بہت سے ابواب ہیں جیسے نمازیں، اور اس کے بعد اور صبح وشام اور سونے کے وقت، بیدار ہونے کے وقت اور نکلنے اور داخل ہونے کے وقت اور مجلس سے اٹھنے کے وقت، سفر کے وقت اور اس سے واپسی کے وقت اور پریشانی وتکلیف اور مرض کے وقت اور استخارہ کے وقت اور نئی نعمت کے حصول یا استعمال کے وقت جیسے لباس، کھانا، مشروب اور قرآن کی تلاوت اس کے معنی کو سمجھتے ہوئے اور رسول اللہ پر درود اور استغفار۔

اور جب آدمی دورۂ ایمان سے دورۂ شرح صدر کی طرف ترقی کرتا ہے، اس کی توحید افعالی ہو جاتی ہے اور اس کو اسماء کا انکشاف باقی رہ جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ**

یو ایک ''احسان یہ ہے کہ اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' اور انقلاب احوال کی قسموں رجاء، خوف، تجلی، پردہ اور اس کے علاوہ سے ہر خطرہ کے موقع پر اس کے ذکر کے ایثار کی محبت کرے جیسا کہ روایت میں ہے۔ انصار میں سے ایک شخص اپنے باغ کے احاطہ میں نماز پڑھ رہا تھا، اس نے باغ کو دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا، تب چہار دیواری سے نکل گیا۔ اور فنا ذکر و مراقبہ کی لذت کے سوا ہر لذت کو فنا کرنا ہے حتیٰ کہ اس کے باطن کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے مناجات میں بھی لذت نہ رہے۔ اور توکل پوری طرح خود سپردگی ہے کہ جس کی وجہ سے اسباب اور عبادت پر سے بھی بھروسہ اٹھ جائے اور ذکر تمام اوقات میں اس کو یاد رکھنا بلکہ دائمی ذکر قلبی ہے۔ اور یہ دونوں دورے احادیث و آثار سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جو ان سے آگے ہے، ان کا ذکر لپیٹ دیا گیا ہے۔

۲۶۹۔ تفہیم:

مومن صادق اور جس کو دورۂ ایمان صحیح ہو گیا

جس شخص کی اللہ نے شرک، قتل، زنا، چوری، قطع رحمی اور ریا کاری وغیرہ کبیرہ گناہوں اور خواہشات نفسانی کے اتباع، خود رائی، جھوٹ اور بخل وغیرہ مذموم عادتوں سے جو ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں، حفاظت فرمائی، اور نماز، صدقات، روزہ اور دعاؤں وغیرہ طاعات کو طیب نفس و بشاشت خاطر سے ادا کرنے اور حسن خلق، صدق و سچائی اور پاکدامنی کی توفیق دی، اور بدعات سے بچایا تو وہ مومن ہے۔ مجھے اس کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور اس کے لیے دورۂ ایمان صحیح ہو گیا۔ اگرچہ وہ اپنے مال و اسباب اور اہل و عیال میں مشغول رہتا ہو اور اپنی ذات اور اپنے اعزاء کے لیے غصہ کرتا ہو۔ اور خواہ اس کے نفس کے نزدیک لذت کا حصول پسندیدہ ہو۔ اور جن امور میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو ان میں لڑتا جھگڑتا ہو، اور خواہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے فوت ہونے سے روتا اور خواہ دور بینی اور تصرف دشوار ہوتا ہو۔

۲۷۰-تفہیم:

شرح صدر کی بعض جزئیات

شرح صدر کی جزئیات میں سے حال میں ذکا اور تیزی ہے۔اور میں اس سے یہ مراد لیتا ہوں کہ نفس تاثیر کو اس کے علاوہ کے مقابلہ میں زیادہ قبول کرے۔اور اس کی طرف اس قول سے اشارہ کیا گیا ہے جس میں کہتے ہیں فلان مستمع "فلاں بہت توجہ سے سننے والا ہے یا بہت سماع کرنے والا ہے۔اگر تم ان کی کتابوں کو غور سے دیکھو گے تو پاؤ گے کہ ان میں سے بعض سماع کی وجہ سے اچانک مر گئے یا ان کے قلب میں کسی آیت نے اثر کیا تو وہ اچانک مر گیا۔

۲۷۱-تفہیم:

دورۂ حکمت کی بعض جزئیات

دورۂ حکمت کی جزئیات میں سے ازل محض کا ذوق ہے۔اور وہ اسماء وذات سے علم حضوری ہے۔اور ہم نے اس کو الگ سے دورہ قرار نہیں دیا۔اس لیے کہ عین کمال کے اثبات سے درجات کمال ضروری ہیں۔اور اس لیے کہ یہ ذوق حضوری ہے،اس پر زیادتی نہیں ہوتی۔

۲۷۲-تفہیم:

ازل صرف کا ذائقہ دوبار چکھا

میں نے ازل صرف کا ذائقہ دوبار چکھا۔ایک بار ارادہ، رحمت، طول، عظمت، حیات اور ہویۃ صرفہ (خالص ذات) کے طریق سے۔اور ایک بار علم، قدوسیت، سبوحیت اور ذات خالص کے طریق سے۔علم سے میری مراد عودی ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ہمارے لیے اسماء سلبیہ کی طرف صرف تعینات سے ہمارے جدا ہونے کا طریقہ ہے۔چنانچہ اول جو جدا ہوتا ہے اس کی جدا شخصیت باقی رہتی ہے، پھر مضمحل ہوتی ہے، پھر یقین واقع ہوتا ہے کہ جدا مشخص کیا ہے۔پھر برف وقرار آتا ہے کہ وہ اللہ کے علم میں ہمارا وجود ہے۔

۲۷۳—تفهیم:

ازل خالص کے ذوق سے بیمار کا شفا نہ پانا

بیمار ازل خالص کے چکھنے سے شفا کیسے پا سکتا ہے جبکہ یہاں نفس توحید کی مغایرت نہیں ہے؟ گویا کہ وہ اجمالی وجدانی فیض ہے۔ چنانچہ اظہار گونگا پن اور بیان چھپانا ہے۔

۲۷۴—تفہیم:

کمالوں کے جمع کا کمال

یہ جو کہا جاتا ہے کہ کامل وہ ہے جو دونوں کمالوں کو جمع کرتا ہے۔ اور دونوں چشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ پھر اللہ جل سبحانہ اولا اس کے عین میں تجلی فرماتا ہے، ثانیا اس کے نفس میں۔ اور اس مقام پر کئی اصحاب فضیلت انبیاء علیہم السلام پہنچے۔ اور جب یہ کمال شئے کے لیے ثابت ہو جاتا ہے تو نعمت مکمل ہو جاتی ہے اور رحمت عام ہو جاتی ہے۔ اور دونوں باریاں نگہبانی کرتی ہیں۔ اور چشمے شیریں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کبریت احمر، سرخ گندھک سے بھی زیادہ قوی اور تیز مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی مقام اس سے زیادہ عالیشان نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل ہوتی ہے۔ اور وہ فضل عظیم اور فوز جسیم ہے۔ اور یہ کمال بھی دورۂ کمال کے جزئیات سے ہے۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ دورۂ کمال عیب دار عین کی مثالوں پر اسم طالع سے کمال کا نزول ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے سب سے کامل یہ ہے کہ اس کے نفس میں تجلی الٰہی ثابت ہو جائے۔ اور ان میں سے ایک نسمہ کے اضمحلال کی ہیئت ہے، اور ان میں سے ایک نسمہ کی صفائی کی ہیئت ہے۔ اور کبار انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کو جزئیہ اول حاصل ہوتا ہے۔ البتہ کچھ کو دوسرا اور تیسرا ہوتا ہے۔

۲۷۵—تفہیم:

ترمذی میں عدی بن حاتم کی حدیث

ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو خود سے الگ کر دو۔ اور میں نے سنا آپ پڑھ رہے تھے "اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللّٰہ" انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے علاوہ رب بنا لیا۔" آپ نے فرمایا، وہ اپنے احبار و راہبوں کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن وہ جس چیز کو حلال قرار دے دیتے تھے اس کو یہ حلال مان لیتے تھے، اور جس کو وہ حرام قرار دیتے تھے اس کو حرام مان لیتے تھے۔

۲۷٦-تفہیم:

سالکوں کا سلب بحت تک پہنچنا

الا انما ھم للسلوب ظعائن
ومنھم افانین الوجود مبائن

"وہ سلب کے لیے پالکی ہیں، اور ان سے وجود کے انواع و اقسام جدا ہیں۔"

وان انت فتشت المقام وجدتھم
الی السلب سیقوا ثم جاء السکائن

"اور اگر تم قیامگاہ ڈھونڈو گے تو ان کو پاؤ گے، کہ وہ سلب کی طرف ہانک دیئے گئے، پھر سکینت کا دور آیا۔"

ویالیت شعری ھل بسلب ھویة
تعاط وھل للنفی عین تعاین

"کاش میں سمجھ لیتا کہ کیا سلب کو بھی کوئی ماہیت عطا کی جاتی ہے، اور کیا نفی کی بھی آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔"

تغوصت قاموس الوجود مکررا
وتوجت تیجانا وقید الخزائن

"میں نے وجود کے سمندر میں دوبارہ غوطہ لگایا، اور مجھے تاج پہنائے گئے اور خزانے ساتھ لیے گئے۔"

وکنا غضیض العیش والبصر والمحی
قبیح النوی لما امیط الضعائن

''اور ہم زندگی اور نگاہوں میں متواضع رہے، اور بری نیتیں اور گٹھلیاں ختم ہوئیں جبکہ کجاوے والیاں روانہ کردی گئیں۔''

ادیرت کؤوس الصحوصرفا فما بقی
ھناک به الامصون وصائن

''بیداری کے گلاس تصرف کے ساتھ گردش میں لائے گئے، وہاں محفوظ اور متقی لوگوں کے سوا کوئی نہیں بچا۔''

دنونا وھبنا فی الدنو مھابة
وفی العلم اجلال وذو الجھل خائن

''ہم قریب ہوگئے کیونکہ قربت میں ہیبت ہے، اور علم میں بزرگی ہے جبکہ جہالت والا خائن ہے۔''

۲۷۷--تفہیم:

بعثت اور ہجرت کے راز

بعثت کا راز جب نظام مرتب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال قرار دیا گیا تو مصلحت یہ ہوئی کہ لوگوں کو تاریکی سے نور کی طرف نکالا جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منصب پر مقرر کیا گیا اور آپ کا کمال، ملکوت میں تجلی فرماتا تھا، اس لیے جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے حکم دیا گیا۔ اور آپ کے وزن کا راز صرف اسم الہٰی کے لیے عالم سے آپ کی نسبت ہے۔ تو جب اسم، نفس اور نسمہ میں اتر گیا تو ایسا آدمی آیا جس کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔ اور وہ ارشاد کا راز ہے۔ تو اس راز نے قرب کمال میں تجلی فرمائی تو وہ ہزار پر بلکہ سارے عالم پر بھاری ہوگیا۔ ہجرت کا راز یہ ہے کہ جب ابو طالب کی وفات ہوگئی اور مصائب عام ہوگئے تو تولی خالص ہوگیا۔ اہل یثرب میں سے ایک جماعت نے اطاعت اختیار کرلی۔ تب آپ کے دل میں ہجرت کا خیال پیدا کیا گیا۔ رب العالمین نے آپ کی

مراد پوری کی۔ اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ جہاد کا راز یہ ہے کہ جب شمس ارشاد مکمل ہو گیا تو اس سے مخاصمت اور جہاد کے سوتے پھوٹے اور مصلحت عامہ میں تجلی کی۔ اور اسم نے وسعت اختیار کی۔ اور وہ صفات بشریہ میں نازل ہو گیا۔ بدر کا راز اسم الٰہی میں مصلحت میں چلا۔ اور قبائح نے قتل اور قید کا تصور اختیار کیا۔ اللہ کے دشمنوں کو پچھاڑ دیا اور جس دن دونوں گروہ ملے فرقان نازل ہوا۔ اور تولی مختلف صورت میں آیا تو مصلحت مکمل اور نعمت عام ہو گئی۔ فترت وحی کا راز اس کا زمانہ عین کے نمونوں میں اس کے سرایت کرنے کا زمانہ ہے۔ حتیٰ کہ اس کی طرف لوٹا اور خالص ہوا جس سے سریان شروع ہوا۔

جان لو کہ معراج کا راز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات انسانی نے آپ کے بدن مطہر کی ہیئت پر جسم کی شکل اختیار کی۔ اور آپ کے کمالات حیوانیہ نے ہیئت براق پر جسم کی شکل اختیار کی۔ اور اللہ نے آپ کے اوپر اپنی نعمت مکمل کر دی تو آپ کو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہونے والے نظام مرتب سے بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملائکہ سماویہ کے ساتھ مناسبت حاصل ہو گئی۔ تب مناسبت کا حق ادا فرمایا اور ان کی طرف چلایا۔ جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر کا سوال ہے تو وہ آپ کے جسد کمال میں ہوا تھا۔ اور یہ امر اس روایت کے منافی نہیں ہے جو آپ کے بدن مطہر میں شق کے اثر سے متعلق وارد ہوئی ہے۔ اس لیے کہ مثال حوادث خارجیہ کا ایک سبب ہے اور نبی اپنی امت کا اجمال ہیں۔ اس لیے آپ نے فطرت کو اختیار کیا تو آپ کی امت نے بھی فطرت کو اختیار کیا۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کو بھول لاحق ہوئی تو آپ کی ذریت کو بھی بھول لاحق ہو گئی کیونکہ آدم پوری نشاۃ انسانیہ کا اجمال ہیں۔

اور ہم تمہیں اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنے نسمہ میں علوم کا تحمل کیا۔ چنانچہ جب علوم ربانیہ متحقق ہو گئے تو ان علوم سے کلی تشخص ہو گیا۔ اور اس طریق سے نماز اور روزہ کے فرض کرنے کا عقدہ حل ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا توسط شدید معالجہ اور خفیف استحسان کی جانب سے آپ کے ایک نسمہ مطہرہ میں کمال کا عکس ہے۔ اور یہ راز وہ ہے جس نے سوال اور جواب کی شکل اختیار کی۔ اور ان کے

اختلاف میں حکم لگایا کہ معراج خواب میں ہے یا بیداری میں؟ جو ہم نے تمھیں بتایا کہ آپ مجسم کمالات ہیں۔ قنوت کا راز بئر مؤنہ کے قصہ میں ہے۔ اور انبیاء صلوات اللہ علیہم جب وہ امی تھے تو ان کے لیے جائز تھا کہ کسی بھی امر میں اپنی طبیعتوں کے مطابق عجلت سے کام لیں۔ اور وہ اس لیے کہ ان کے نزدیک کوئی خاص اسم تمام اسماء میں مضحل ہے، علیحدہ سے نظر نہیں آتا۔ اور اس لیے کہ تولی کا ایک وزن ہے جس کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ اور ان میں سے کچھ فراخی اور ذہانت میں واقع ہوئے، حتیٰ کہ قرآن نازل ہو گیا۔

۲۷۸۔ تفہیم:

نفس اور عین کی حقیقت

نفس وہ صورت شخصیہ ہے جو اسماء سے ہیولی پر فیضان کرتی ہے۔ اور عین اپنی ہیئت اور وزن پر نفس کا قانون ہے۔ نفس کو عالم تخلیط میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور عام لوگ صرف انواع کے اعیان کا ادراک کرتے ہیں۔ چنانچہ عین نفس سے عام ہے۔ اور تجلی جس پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس تجلی سے زیادہ عام ہے جو نفس پر اعتماد کرتی ہے۔

شیخ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ سرہ نے اپنے قول لکل مرآۃ لها وجهان ومرآتی لها ستة وجوه "ہر آئینہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اور میرے آئینہ کے چھ پہلو ہیں۔" اور انا احفظ المرآة مذ اربعين سنة لم تكذب "میں آئینہ کو چالیس برس سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا" سے یہی تجلی مراد لی ہے جو کہ نفس پر ہے۔ اس کے اکثر ثمرات، اشراف اور بعض اقویا ہیں۔ ان کے لیے تصرف اور تسخیر ہوتے ہیں۔

۲۷۹۔ تفہیم:

اس عالم میں عین کے لیے احکام ہیں جن کو بخت نام دیا جاتا ہے

جان لو کہ اس عالم میں عین کے لیے احکام ہیں جن کو بخت کہا جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جس سے جمہور لوگوں نے تجربہ کیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے معاش میں سعید ہوتے ہیں اور

کچھ شقی، اور کسی کی معاش میں کشادگی ہوتی ہے اور کسی کی معاش میں تنگی۔ اور ان میں کوئی خوش اخلاق ہوتا ہے اور کوئی بداخلاق اور کسی کی طرف احکام اس کے امر کی صلاح کے اعتبار سے جاری ہوتے ہیں۔ کوئی اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ اور کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو محاوروں اور واقعات پر عبور حاصل ہے۔ کوئی اس طرح کی دوسری باتیں کہتا ہے۔ ان تمام احکام میں تاریکی کی تلبیس پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب اللہ سبحانہ عین کے بالمقابل تجلی فرماتا ہے تو یہ حق ہو جاتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان پر اس طرح اعتماد کیا جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین کیا تھا کہ لامحالہ اپنی قوم پر غالب آجائیں گے اور آپ کا دین غالب آجائے گا۔

اور جان لو کہ نفس ناطقہ کے الگ احکام ہوتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ قوی الفہم، زیرک و دانا اور قوی الہمت ہوتے ہیں جبکہ کچھ اس سے کم ہوتے ہیں۔ اور کچھ قوی الاشراف والعقل تو کچھ اس سے کم ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمتیں اور اشرافات کبھی سچی ہوتی ہیں اور کبھی جھوٹی۔ تو بلاشبہ وہ اعتماد کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب اللہ سبحانہ اس پر نفس کے بالمقابل تجلی فرماتا ہے، صدق خالص ہو جاتا ہے۔ بندہ میں حوصلہ اور جرأت بیدار ہو جاتی ہے اور اس کو ہمت و تاثیر عطا کر دی جاتی ہیں۔

۲۸۰- **تفہیم:**

علم حق اور اس کی تفصیل

جان لو! اللہ تم پر رحم فرمائے کہ ہمارے نزدیک علم حق وہ ہے جو حال کے ساتھ مشترک ہو۔ اور قرآن ہمارے نزدیک علوم میں سب سے اعظم، اجل بڑی شان والا، انجل وسیع فراخ و کافی ہے۔ جو حال کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اس میں کچھ وہ ہے جو دورۂ کمال کی شرکت سے نازل ہوا ہے۔ اور علم حکمت، علم موعظت، علم فعل خیرات، علم الٰہیات، علم معاد، علم ذکر و دعوات اور علم مقامات اہل کمال ہے۔ اور اس میں وہ ہے جو نبوت کے ساتھ نازل ہوا وہ علم مخاصمت کفارہ، دنیا و آخرت میں مومنوں اور کفار کے جوابوں کا علم، شرع لازمی کا

علم، علم قضا و محاکمات، علم ترغیب و ترہیب اور علم جہاد و ہجرت ہے اور اس میں وہ ہے جو خلافت کی مشایعت سے نازل ہوا۔ وہ علم ملک ہے، جس کی طرف یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا گیا إنا فتحنا لک فتحاً مبینا "ہم نے تمہیں فتح مبین عطا فرمائی ہے" اور دو افراد کو منقبت عظمت کے ساتھ مختص کیا گیا ہے۔ ایک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اور وہ یہ کہ ان دونوں کی نبوت کو ان کی خلافت میں داخل فرمایا۔ جبکہ یوسف اور داؤد علیہما الصلوٰۃ والتسلیمات کی نبوت کو خلافت میں داخل نہیں فرمایا۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی طرف ملک نہیں بڑھا، سوائے اس کے کہ ریان نے ان کو وزیر بنایا۔ اور نہ ہی داؤد علیہ السلام کی طرف بڑھا، سوائے اس کے کہ جب ان کے ملک کو طالوت نے جالوت کے قتل سے مشروط کیا، کہ ان کو ملک میں شریک کریں گے، اور نہ ہی سلیمان علیہ السلام کی طرف۔ الا یہ کہ ان کو ان کے باپ کا وارث بنایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وورث سلیمان داؤد "اور سلیمان کو داؤد کا وارث بنایا"۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ملک تولی اور ان لوگوں پر منت کے ارادہ سے بڑھا جو زمین میں کمزور پڑ گئے تھے۔ چنانچہ جب ان کو نبی بنایا گیا تو کفار نے مخاصمت سے کام لیا۔ تب اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ اس طرح ان کو ملک حاصل ہوا۔ اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ملک تولی اور اس ارادہ سے بڑھا کہ امت کو قائم کریں گے۔ اور ان کا تزکیہ فرمائیں گے۔ چنانچہ کفار نے پورا زور لگا دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی۔ کفر کو مٹایا جس سے ملک حاصل ہوا۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منقبت اعظم کے ساتھ خاص کیا جس سے بڑی کوئی منقبت نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ کا کمال آپ کی خلافت میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے شریعت کے لیے اس کی شرح میں جو پایا اس میں یہ بھی ہے کہ نماز کو عید اور جمعہ بنایا۔ اور زکوٰۃ کی تمام اقسام مال سے بنائیں کہ بیت المال میں لائی جائیں۔ پھر ان کو محتاجوں، مولفۃ القلوب اور امام، عمال اور اہل اسلام کے ساتھ شرارت اور مکاری کرنے والوں سے مقاتلہ کرنے والوں کو تقسیم کر دیا جائے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی خلافت نبوت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں تھی۔ اگرچہ کمال کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے معجزہ ظاہر کیا تو ملک آپ

کی ملکیت سے نکل گیا۔ چنانچہ ملک شام میں یہی ہوا۔ اور اس حکمت کا ماخذ بہت عمیق ہے۔ اس لئے اس کو غنیمت جانو۔

۲۸۱- تفہیم:

نسمی، نفسی اور عینی آثار کا بیان

تم اس وقت تک حکیم نہیں ہو سکتے جب تک آثار نسمی اور نفسی کو اور ان آثار کو جو مشارکت نفس سے حاصل ہوتے ہیں، نہ جان لو۔ اور نفس شرح صدر کے مقامات ہیں اور آثار عینیہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ جبکہ نسمہ کے شعبے ہیں۔ علم اور وہ حال جس میں کوئی علم نہیں ہے۔ اور تیسرا شعبہ وہ حال ہے جو علم پر جمع ہے اور علم بحت قوی حسیہ ظاہرہ و باطنہ ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس روح کا حامل ہوتا ہے، جو اس کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ اس کے لشکر ہوتے ہیں۔ وہ قوائے طبیعیہ اور ارواح حسیہ سے اس کی طرف نسبت کے لحاظ سے سلطان کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا معدن دماغ ہوتا ہے۔ اور حال بحت قوی الطبیعت اپنے آپ میں مکمل اور غذا جسم کے حوالہ کرنے والا اور امراض کو دفع کرنے والی بنیادوں کا محافظ ہوتا ہے۔ اور اس کی ارواح کا معدن جگر ہوتا ہے۔ اور علم کے ساتھ مخلوط حال قوی المحرک و شجاعت و غیرت ہوتا ہے۔ اور ہم نے جو بیان کیے ہیں، وہ سب نسمہ کے فضائل ہیں۔ یہ علم طبیعی کی نظر ہے۔ پھر شریعت مصطفوی ان میں چلی۔ چنانچہ وہ نتائج برآمد ہوئے جن میں معاد کی صلاح ہے۔ اور بالجملہ کمالات نسمیہ انسان کی اس حالت پر بقا سے عبارت ہیں جس پر اس کی نسمہ کے شعبہ ثالثہ سے تخلیق کی گئی جو شرع کے مطابق ہے۔ اور نفس صورت شخصی ہے جو ہیولی ثالثہ پر فیضان کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ ام القوی، عاملات اور عاقلات ہے۔ جب ان کو ان کے جوہر میں رکھا گیا تو ان کی عقل عرفان و اشراف ہوگئی اور ان کا عمل ہمت اور تاثیر و تسخیر ہوگئی۔

پھر جب اللہ سبحانہ نے ان پر تجلی کی تو ان کے آثار متحقق ہوگئے۔ اور عین قانون کلی مجرد ہے جو اس کے مطابق ارادہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا وجود خارجی اور آثار خارجی ذاتی

واضافی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذاتی تو ظاہر ہیں اور جہاں تک اضافی کا سوال ہے تو کیا ہر موثر متاثر نہیں ہوتا۔ اس میں ایسی خصوصیت ہے جس سے موثر متاثر ہو جاتا ہے۔ اور عین کے لیے اس کے مطابق خصوصیت ہے جس کو عرف عام میں بخت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب حق آ گیا تو یہ آثار حق ہو گئے۔ اور جس نے حقیقت عین کو نہیں سمجھا، وہ حقائق سے بہت زیادہ نابلد ہے، اور فلاسفہ نے ان کو نہیں سمجھا سوائے اس کے کہ یہ انواع کے اعیان کے حقائق سے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے لیے ایسے آثار ہیں جو ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور جنت اور جحیم دونوں اس عین کے لیے محقق ہیں، اور ہر چیز جس کو کرنے والے نے کیا ہے، وہ کسی بھی عالم میں ہو محفوظ ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت ہے جس سے لوگ ناواقف ہیں اور ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور وہ درحقیت علم عودی کی مثال سے عبارت ہے، اور وہ ارادہ کی نشاۃ کے لیے آئینہ ہے، یا کوئی مقام اجمال ہے جو چاہیں آپ کہہ لیں۔ اس سے شعاعیں پیدا ہوئیں۔ تفارق بالذات اور تصادق بالعرض اسماء کی فصل کی طرح ہیں۔ چنانچہ اس کی وسعت ارادہ کی وسعت کی مانند ہوگئی۔ چنانچہ قدیم کلی کی حادث جزئی سے شرح ہوگئی۔ اور وہ ظرف حافظ ہے، پھر عین کا بطن اس سے بھر گیا جو اس کے آثار سے پایا گیا۔ اور آثار نفس اور آثار نسمہ اور اضافیات تحقق اخروی میں محقق ہوئے تو ان میں شامل ان کے خواص ظاہر ہو گئے۔ اور وہ جنت اور جحیم ہیں اور ہمارے لیے دوسری حقیقت ہے جو کہ منبع شریعت ہے۔ اور اسم ہادی سے ہے کہ ہادی حق سے مشابہ ہوتا ہے پھر جب ہدایت نسمہ میں نازل ہوگئی تو وہ فعل خیر ہے۔

۲۸۲-تفہیم:

مجردات کا علم اور اس کی کیفیت

تم عوام سے بحث کرو گے تو دیکھو گے کہ وہ حسائس ظاہرہ یا حس مشترک جو کہ اس کے برابر ہے، کے محسوسات کے سوا کسی کا ادراک نہیں کرتے۔ پھر اگر تم ان سے کہو گے کہ شئے مجرد کا تجریداً علم حاصل کرو تو یہ ان کی طاقت سے باہر ہوگا۔ پھر جب اس سے ترقی ہوگی تو معانی مجردہ تجریداً حاصل ہوں گے۔ جیسے تعظیم، محبت، ڈر خوف اور امید و رجا، بغیر اس کے

کہ زبان سے ان کے بارے میں کچھ کہا جائے یا تخیل کیا جائے تو نفس کسی کیفیت کی طرف جاری ہوتا ہے۔ پھر جاننا چاہیے کہ وہ مدارک نسمہ کی طرف خالص ہو گئے، اور مدارک بدن کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر ایک امران کی مدد کرتا ہے تو علم حضوری از سر نو خالص ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نسمہ کے اس کے مدارک سے جدائیگی کے اوقات ہو جاتے ہیں اور نفس اس علم کے ساتھ مستقل ہو جاتا ہے۔ پھر اگر آدمی مجذوب ہوتا ہے تو اس کا تقرر، تقرر حق میں مضمحل ہو جاتا ہے جس سے وہ لذت حاصل کرتا ہے۔ اور بعد میں صرف اس کے وجود اور جسموں میں ہوتا ہے، پھر ایک امران کی مدد کرتا ہے تو اس کے ادراک سے عین مستقل ہوتا ہے۔ اور علم نفس کو اس کے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اور وہ ذوق ہے۔ پھر اس کے ادراک سے لاہوت مستقل ہوتا ہے۔ اور ارادہ کی سطح وہ ہوتی ہے جس کی تشبیہ ہم نے ہیولی سے دی ہے۔ اور وہ ذوق ازل محض ہے، پھر اس کے بعد کمال ہوتا ہے۔

۲۸۳- تفہیم:

قیامت کے قریب اہل نصرانیت کی طرف سے مسلمانوں پر سخت آزمائشیں آئیں گی

جان لو کہ قیامت کے قریب فتنہ وفساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور ذوق سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ روم مرتد ہو کر کفر کی طرف لوٹ جائے گا۔ اور نصرانیت پھیلائے گا اور دین اسلام مدینہ کی طرف سمٹ جائے گا جیسا کہ اس سے نکلا تھا۔ پھر دوبارہ مہدی کے عہد میں قسطنطنیہ کو فتح کیا جائے گا۔ اس طرح تین علامتیں ظاہر ہوں گی۔ اور روم کے اہل نصرانیت اور ان کے اتحادیوں کی طرف سے قیامت کے قریب مسلمانوں پر شدید آزمائشیں آئیں گی "اعاذنا اللہ سبحانہ" اور کیا میں بتاؤں کہ نصرانیوں نے شوکت کے ساتھ اپنے اس قول کو کیوں مختص کیا کہ انا حزب عیسی بن مریم 'ہم عیسیٰ بن مریم کے گروپ کے لوگ ہیں۔' حالانکہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ اور اسباب عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر مطابق آ گئے۔ چنانچہ باطل کے زمانہ میں ان میں بنیادی کمزوری ظاہر ہو جائے گی۔

۲۸۴- تفہیم:

سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی اقسام کا بیان

سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے لاحق ہونے والی تقسیم ان کی چند قسمیں کرتی ہے۔ اول شریعت کی سنت کا علم۔ اور اس قسم کی تاویل یہ ہے کہ تم علم تجدید کو جان لو۔ اور وہ چند قوانین کی طرف رجوع کرتا ہے جن کی پابندی نشاط میں پوری طرح اور جبہ جبر کی حالت میں کافی حد تک ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ مجھے ثابت ہوا ہے۔ بندوں کے عذروں میں رخصت بھی لازمی ہے کہ دین کی اصل کی طرف دیکھے اور اس پر قائم رہے اور تجدیدات کی طرف دیکھے۔ اور تبدیلی کرلے اور شئے کے دواعی اور اس کے مکملات کی طرف دیکھنا ضروری ہے کہ اگر وہ حرام ہے تو یہ مکروہ ہیں اور اگر وہ واجب ہے تو یہ مندوب ہیں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے امر کی تکمیل اور اس کی تثبیت ہے۔ اور اس کی نعمت کے لیے تیاری ہے۔ چنانچہ وہ ہدایت ہدیۂ صالح ہے۔ اور جس کی طرف اس کے نفس کی وسعت کے لحاظ سے وقار کا فیضان ہوا اور اس کے نفس میں اس کو بڑا کیا تو وہ ہدایت صالح ہے۔ اور جو امر بھی تمہیں تمہارے غیر کی دشمنی اس کی بدخواہی سے گھریلو یا شخصی یا اقلیمی مصلحتوں کے بگاڑ سے روکے اور راہ راست پر غور وخوض کرے تو وہ ہدایت صالح ہے۔ پھر یہ کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر اور نواہی میں حکمتوں اور علتوں کا علم رکھتے ہو۔ اور ان کو ان قوانین کی طرف لوٹاتے ہو، اور حکم اور حدود اور ان میں جو کمزوریاں ہیں، ان کے اظہار میں نبوت علی اھلھا الصلوات کی زبان کو سمجھتے ہو۔

دوسرے مواعظ وحکم اور ترغیب وترہیب کا علم ہے۔ اور اس کی ترغیب وترہیب دو اصلوں کے درمیان چکر لگاتی ہیں کہ اگر عمل بنفسہٖ اصل ہوتا ہے تو دنیا اور آخرت میں اس کے محاسن یا قبائح کو بیان کرتا ہے اور اگر کسی غیر کے لیے تکمیل یا ان آداب سے جن کو اچھا یا قبیح سمجھتا ہے اور ان دونوں کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ نمبر ایک ضرب المثال یا محاورہ جیسے قرآن کے قاری کی مثال لیموں جیسی ہے۔ دوسرے تشبیہ اگرچہ ادنی علاقہ سے ہی ہو، جیسے صلوٰۃ

اشراق والی حدیث۔ تیسرے مدح، فلاں آدمی کیسے اچھے عمل کرنے والا ہے۔ یا جس نے یہ سب کام کئے وہ بہت برا ہے۔ چوتھے ایسے شخص کی حکایت جس نے یہ عمل کیا تو اس کو بخش دیا گیا۔ یا پانچویں خوش بیانی کہ جس نے ایسا اور ایسا کیا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے ایسا اور ایسا کیا وہ جہنم میں جائے گا۔ اور آپ کے مواعظ مثالیں ہیں جو دنیا سے بیزار کرتی اور عمل اور بھلائی کے ساتھ احتساب میں میانہ روی پر ابھارتی ہیں۔ خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اور شر خواہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس علم کا حکم ہمیشہ حسن اخلاق اور نادر تجربات کے اظہار کا ہے۔

تیسرے علم دعوات (دعاؤں) کی تاویل دو اصلوں کے درمیان رہتی ہے۔ ایک ان صیغوں کا عرفان جن کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے۔ اور وہ دس ہیں جیسا کہ ہم نے تمہیں دوسرے مقام پر بتایا ہے۔ اور دوسرے دعا کے اوقات کا عرفان اور وہ بیس ہیں۔ اور بات کے آداب اور احکام کی معرفت کے باب کی تکمیل۔

چوتھے علم مناقب اور ان میں بہتر آدمی کے اندر نجات دینے والی یا ردی صفات کا ادراک اور شاذ و نادر طور پر روحی اور جنت میں اپنا مقام دیکھنا وغیرہ ہے۔

پانچویں فتن و معاد اور ان میں پائے جانے والے امور کا علم ہے اور وہ علم کبیر الشان ہے۔ ہم نے اس کو خاص قرار دیا ہے۔ اور اس کا ذکر الحجۃ البالغہ میں کیا ہے۔ جس میں دیکھنے والوں کے لئے بہت سامان ہے۔

چھٹے علم سیر و تاریخ ہے۔ اور اس کی تاویل یہ ہے کہ تم ان صورتوں کو جان لو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کی ذمہ داری کبھی غزوات میں لی اور کبھی دوسرے واقعات میں۔

ساتویں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اخلاق کا علم ہے۔ اور وہ آپ کے شرح صدر کے آثار اور معجزات جزئیہ اور آپ کے اس نور کے آثار ہیں جو آپ کے نفس کے مدمقابل ہے۔ اور معجزات کلیہ آپ کے اس نور کے آثار ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین کے مقابل ہے۔

۲۸۵- تفہیم:

ہر آدمی کی تخلیق فطرت کی ایک خاص ہیئت پر کی گئی ہے اور اس کو درجۂ کمال بعینہٖ اس میں حاصل ہوتا ہے

حضرت حق تبارک وتعالیٰ نے ہر شخص کی تخلیق ایک خاص ہیئت پر فرمائی ہے۔ اس شخص کی فطرت کی صفائی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اس ہیئت پر قائم رہے۔ اس لیے کہ جو شخص سخاوت اور فیاضی پر پیدا کیا گیا ہے، اس کا کمال یہ ہے کہ فیاضی وسخاوت کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی میں استعمال کرے۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ اسی طرح تھے۔ اور کبھی ایک شخص کی تخلیق حدت اور حرص وبخل پر ہوتی ہے۔ تو اس کا کمال یہ ہے کہ امر معروف اور اشاعت امر اللہ اور اس پر سختی میں حدت سے کام لے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے۔ اور کبھی اس کی ذکاوت وقت ذہن سے موصوف ہوتی ہے، اور اس کا کمال رسوخ فی العلم ہوتا ہے۔ ایسے علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اور کبھی تقلید اور سلامتی ذہن سے متصف ہوتا ہے، اور اس کا کمال صدیقیت ہوتا ہے۔ ایسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اور بالجملہ اللہ کی خلقت میں تبدیلی محال ہے۔ اور ہر شخص کا کمال اس کی جبلت کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔ غالباً طلب کرنے والوں کی نایابی اس سبب سے ہے کہ وہ کسی صفت سے مجبول ناواقف ہوتے ہیں۔ اور اپنے کمال کو دوسری صفت میں طلب کرتے ہیں اور یہ محال ہوتا ہے۔

۲۸۶- تفہیم:

حضرت عمرؓ کا حجر اسود کو استلام اور اسکے بارے میں آپ کا مشہور قول

ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب حجر اسود کا استلام کیا تو فرمایا جان لے کہ تو ایک پتھر ہے، نہ تو کوئی نفع دے سکتا ہے اور نہ ہی ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے استلام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی استلام نہ کرتا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ نفع بھی دیتا ہے اور ضرر بھی پہنچاتا ہے۔ وہ استلام کرنے والے

اور اس کو ترک کرنے والے کے بارے میں شہادت دے گا۔ تو یہ اختلاف مقامات کے اختلاف کی طرف راجع ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا مقام شریعت کی تحریف سے حفاظت کرنا ہے۔ اس لیے آپ نے یہ بات بت پرستوں اور ان کے قبیل کے لوگوں پر رد کرتے ہوئے فرمائی تا کہ سنت کو اس کے غیر محمل میں محمول کرنے سے بچا جائے۔ اور علی رضی اللہ عنہ کا مقام عالم میں پوشیدہ اسرار کی معرفت کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اس لیے آپ نے یہ جان لیا کہ حجر اسود پر ایک ہیئت حیوانیہ فیضان کرتی ہے۔ اور اس کی طرف اس قول سے اشارہ کیا گیا ہے کہ "وہ جنت سے آیا ہے" اس طرح اس ہیئت سے وہ قیامت کے دن انبیاء کی طرح شہادت دینے والا ہوگا۔

۲۸۷- تفہیم:

حضرت ابو بکر و عمر کے امت مرحومہ میں سب سے افضل ہونے کے معنی

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما امت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے افضل ہیں۔ اور فضل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جب انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات کے سینوں میں ارشاد و ہدایت کے لیے تجلی فرمائی تو لامحالہ اس تجلی کے واسطہ سے ان کی امت میں سے حواریوں کے سینوں میں دین کی اقامت اور اس کو چلانے کی تجلی فرمائی۔ اور اس تجلی کا اثر مسلمانوں کی نصرت اور کافروں کو ذلت، رسوائی اور ہلاکت پر ہمت کا جمع کرنا ہے۔ چنانچہ ان کے درمیان فضل اسی معنی کے لحاظ سے ہے کسی اور معنی کے لحاظ سے نہیں ہے۔ اور ہم جب اس حکمت کی تعبیر علم ظاہر والوں کی زبان میں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وارد ہوا ہے۔ سب سے افضل شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ اور اشاعت دین وحق سے زیادہ مکمل نفع کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ دین کا معاملہ صرف اہل الرائے سے مکمل ہوتا ہے۔ ان کی مثال وزراء جیسی ہے کہ سلطنت ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اور وہ امت میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔ اور ان کی شان وزراء جیسی ہوتی ہے کہ وہ قوم میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔ اگرچہ قوم میں ان سے زیادہ علم والے، ان سے زیادہ عقل مند و ذہین اور شریف الاصل ہوتے ہیں۔

۲۸۸- تفہیم:

صحابہ میں سے بشارت کے لیے دس کو مختص کرنے کی وجہ

کیا تم سمجھتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ میں سے بشارت کے لیے دس افراد کو ایک حدیث میں کیوں مختص کیا۔ اور ان میں کون سا امر مشترک و جامع ہے جو کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔ میں کہتا ہوں قریشی اپنے نسب کی نجابت سے نجیب الاصل ہیں، اسلام کے معاملہ میں سخت ہیں، قدیم الاسلام ہیں، انہوں نے رسول اللہ کی طرف اس وقت پیش قدمی کی جب لوگوں نے آپ سے منہ پھیر لیا تھا، اور آپ کا ساتھ دیا، وہ آخری سانس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے رہے حتیٰ کہ کلمۃ اللہ بلند ہو گیا۔ اور امر اللہ غالب آ گیا۔ اس طرح یہ تینوں امر ایسے ہیں جو انہی دس حضرات کے ساتھ خاص ہیں۔ ان کے علاوہ کسی میں نہیں پائے جاتے۔

حمزہ رضی اللہ عنہ نجیب اور قدیم ہونے کے باوجود اس کے غلبہ کے مشاہدہ کے وقت تک باقی نہیں رہے۔ اور عباس رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام نہیں تھے۔ اور عمار و بلال رضی اللہ عنہما کے قدیم الاسلام ہونے اور غلبہ کے مشاہدہ تک رہنے کے باوجود اسلام نے ان میں نجابت والی گرمی پیدا نہیں کی۔

۲۸۹- تفہیم:

مفسرین کے اختلاف کی وجوہ و اسباب

مفسرین کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے جب ان کے اقوال میں غور و فکر کیا اور ان کو گہری نظر سے دیکھا تو ان کو چند اقسام پر مشتمل پایا۔ ان میں ایک قسم غرائب قرآن کی شرح ہے۔ اور اس میں ان کا اختلاف لغت عرب میں تتبع اور ان کے استعمال کی طرف راجع ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص نے کلمہ کی تفسیر اس معنی سے کی جو ان کے محاوروں کے تعلق اور سیاق و سباق کی دلالت سے اس کے نزدیک ثابت ہوا۔ اور ان میں

سے ان کی قرات کا اختلاف بھی ہے جو عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قرآن کے جمع کرنے سے پہلے سے پایا جاتا تھا جو سات حرفوں کے جواز کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اور زیادہ پسندیدہ امر یہ ہے کہ سات حروف جمل متقاربہ سے ایک ہی معنی کی تعبیر ہیں۔ جیسے قل یایھا الکفرون اور قل للذین کفروا اور قل للکافرین اور جیسے قل ہو اللہ احد اور انا الاحد الصمد، الذی لم الد اور قرآن کے جمع کے بعد پر اختلاف فاحش سے جو ملت ہونے سے نکالنے والا ہوتا، دین کی حفاظت کے لیے باقی حروف کے اسقاط پر متفق ہو گئے، جو تلفظ کے اختلاف تفخیم، امالہ، روم اور اشمام کی طرف یا تلفظ کے اس اختلاف کی طرف جو مصحف عثمان میں لکھا گیا۔ اور ان میں ان کا شان نزول میں اختلاف بھی ہے۔

اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ اجتہاد اور استنباط کی وجہ سے ہے۔ اور یہ اس طرح ہے جیسے ہم نے قدیم وحدیث یہود کو دیکھا کہ وہ نسخ کا انکار کرتے ہیں۔ اور آیت ان کے قصوں میں ہمارے یقین کو بڑھانے کے لیے ہے کہ وہ ان کے شر کو دفع کرنے اور مسلمانوں کو اس میلان سے روکنے کی غرض سے جو ان کے کانوں میں شکوک پڑتے ہیں، نازل ہوئی ہے۔ اور جس پر یہ ظاہر ہو گیا، اس کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ آیت میں توجیہہ پائی جائے۔ اور سیاق وسباق کے ملاحظہ کے بعد اس کی شان بیان کی جائے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان متاخرین کی رائے ہو جنہوں نے اصول وسیر اور حدیث کی بنیادیں رکھنے کے بعد ان متقدمین کی رائے سے زیادہ موکد اور مستحکم کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کی جو علوم اور فنون کی بنیاد رکھے جانے سے پہلے تھے۔

اور ان میں سے ان کا نسخ میں اختلاف ہے۔ اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ اجتہاد اور استنباط سے ہے۔ اور اس لیے ائمۃ الاصول نے کہا ہے کہ ان کے قول پر نسخ کے سلسلہ میں سختی سے یقین نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ حال کا واضح ہونا بیان نہ کر دیں۔ اور یہ ظاہر نہ کر دیں کہ پہلی آیتیں فلاں دن اور دوسری فلاں دن نازل ہوئیں۔ جس سے دل پوری طرح مطمئن ہو جائے اور ان کے یہ کہنے کا مطلب کہ یہ آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی یہ [illegible]رت ان تمام امور میں سے ہے جن پر یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

۲۹۰- تفہیم:

حقائق پر مشتمل اشعار بہت ہیں

الا کل شئی ماخلا اللہ زائل

وکل وجود دون مجلاہ باطل

''واضح ہو کہ اللہ کے سوا ہر شئے زائل ہونے والی ہے، اور اس کی شان وعظمت کے سوا ہر وجود باطل ہے۔''

ولیس نظام الرشد دون ظھورہ

یتم ولا نظم التحقق کامل

''اور اس کے ظہور کے بغیر نہ رشد کا نظام مکمل ہوتا ہے، اور نہ ہی تحقق کا نظم کامل ہوتا ہے۔''

تجلی علی الساعیر طورا وتارۃ

علی الطور ثم العین فی العرب مائل

''ساعیر پہاڑ پر تجلی قریب ہوتی ہے اور کبھی طور پر ہوتی ہے، پھر عرب میں عین مشابہ ہوتی ہے۔''

اری کل تنویر بنور کانہ

سماء من الارشاد للخلق شامل

''میں ہر نور کو ایسے نور سے دیکھتا ہوں کہ گویا وہ رشد وہدایت کا آسمان ہے، جو مخلوق کے لیے چھایا ہوا ہے۔''

اذا ما یحاذی الشمس رأسک فی الضحی

فقد فزت بالمقصود والکل حاصل

''جب سورج چاشت کے وقت تمہارے سر کے اوپر آ جاتا ہے، تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہو اور سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔''

يظل به العبد الضعيف مضلعا
ويصبح بحر العلم من هو جاهل

''اس سے کمزور بندہ سایہ پاتا ہے، اور جو جاہل ہوتا ہے وہ بحرالعلوم بن جاتا ہے۔''

كثوب على شكل الليوث نسيجه
يصول كما صال الهوى المتداخل

''اس کپڑے کی طرح جس کی بنائی شیروں کی شکل میں ہے، ایسے چلتا ہے جیسے تیز ہوس حملہ کرتی ہے۔''

فان ذهب الشئى الدخيل بوجهه
فلا لم حيوان ولا لم صائل

''اگر اس چہرے میں داخل ہونے والی شئے جاتی رہے، تو پھر نہ وہاں حیوان رہتا ہے اور نہ ہی حملہ کرنے والا۔''

ولست ارى ركن الركانة دونه
ومالم من امر تجشم عامل

''اور میں نے اس سے زیادہ کوئی وقار نہیں دیکھا، اور پھر کوئی امر ایسا نہیں ہے جس کو کرنے والے نے ایسی مشقت سے کیا ہو۔''

حيانا هدى نورا على العين قائماً
لا سراره متن النسيمة حامل

''ہمیں بطور نور ہدایت زندہ رکھا، عین پر قائم رکھا، پاک روح کا متن اس کے اسرار کا حامل ہے۔''

ولا بد هذا النور ثلج وفسحة
وشرح وافصاح و بالعلم نازل

''اور لازمی طور پر یہ نور خوش کن اور کشادہ ہے، اور شرح ہے اور فصیح ہے اور علم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔''

ولا بد ارهاص لمعناه شارح
وللحق تفسير عن الحيف مائل

''اور لازمی طور پر بنیاد ہے اس کے معنی کا شارح ہے، اور حق کے لیے تفسیر ہے، ظلم وزیادتی سے اعراض کرنے والا ہے۔''

ومن بعده یاتی المسیح فانه
إلی سره یهدی بما قال قائل

''اور اس کے بعد مسیح آئیں گے کہ، کہنے والے نے ان کے راز کی طرف رہنمائی کی ہے۔''

اتانا وهنانا العلوم صنوفها
هنیئا لکم قیدت إلیکم جلائل

''ہر قسم کے علوم ہمارے پاس آئے اور ہمارے لیے مبارک ہوئے، تمہارے لیے مبارک ہوں کہ تمہاری طرف بزرگی اور عظمتوں کو روانہ کر دیا گیا ہے۔''

فثلث اطواد العلوم بساحتی
رسوخ وتاویل وعلم عنابل

''علوم کی تین قسمیں میری کمائی ہیں، علوم یقین، تاویل اور علم عنابل حدیث وروایات۔ (عن بل)''

علمنا بتنجیم وعلم عرافة
وسر من الاسرار للکل ذاهل

''ہمیں علم نجوم اور علم عرافہ سکھایا، جو ہر غافل کے لیے ایک راز ہے۔''

فهمنا لسان الناس فی کل طبقة
إذا دار فیما بین قوم مسائل

''ہم نے ہر طبقہ کے لوگوں کی زبان کو سمجھ لیا، جو قوم کے درمیان مسائل کا دور ہوا۔''

رحلنا وخلفنا العلوم بغربة
تنوح کما ناحت نساء ثواکل

''ہم نے کوچ کیا اور غربت میں ان علوم کو چھوڑ دیا کہ وہ اسی طرح واویلا کرتے ہیں، جیسے وہ عورتیں روتی اور نوحہ کرتی ہیں جن کا بچہ گم ہو جائے۔''

تخلصت جدا من تخاليط ذا الورى

وسرت إلى الرحمن والجودها طل

''میں نے لوگوں کے میل جول سے بالکل تخلیہ اختیار کر لیا، اور رحمٰن کی طرف چلا اور جود و کرم کی بارش ہوئی۔''

ذهبنا إلى اقصى الوجود اعمه

تفوز به كالفاعلات القوابل

''ہم وجود کی انتہا کی طرف گئے جو سب سے زیادہ عام ہے، ہم اس سے ایسے کامیاب ہوئے جیسے بچہ جننے والیاں کامیاب ہوتی ہیں۔''

هو البحر لا قعر ولا ساحل له

احطت به خيرا بما نال نائل

''وہ ایسا سمندر ہے جس کی نہ کوئی تھاہ ہے نہ ہی کنارہ، میں نے اس کا اس طرح بھلائی سے احاطہ کیا جیسے مقصد کو حاصل کرنے والے کرتے ہیں۔''

شهدت تداوير الوجود جميعها

تدور كما دار الرحى المتماثل

''میں نے وجود کے تمام ادوار کو دیکھا، ایسے گھومتے ہیں جیسے جھکی چکی گھومتی ہے۔''

نظرت إلى الشخص الكبير كانه

إذا قيس للشخص الصغير مشاكل

''میں نے بڑے شخص کو ایسا دیکھا، جیسے چھوٹے شخص کی شکلوں پر قیاس کیا جاتا ہے۔''

قوى ثم افعال تكون بحسبها

تحول اياها القوى والهياكل

''قوتوں کے مطابق ہی افعال ہوتے ہیں، انہی کی طرف قوتیں اور ہیکل پلٹتے ہیں۔''

رایت نظاما لیس یعصم سلکۂ
وإن قال بالانفصام والخرق عائل

’’میں نے ایسے نظام کو دیکھا کہ اس کی ڈوری محفوظ نہیں رہتی اگر چہ کہا کہ ٹوٹنا اور جدائی محتاج ہیں۔‘‘

فشافتھا ان العروج متمم
فلا بأس ان کانت ستور وحائل

’’اس کی شفافیت یہ ہے کہ عروج مکمل ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے اگر پردے اور رکاوٹیں ہوں۔‘‘

تربصنا ودارینا الانام بوضعھم
فطابت مراقینا وطاب الشمائل

’’ہم نے انتظار کیا اور مخلوق کے گرد ان کی وضع کے مطابق گھومے، تو ہمارے پیٹ اور جسم اچھے ہو گئیں اور ہماری عادتیں اچھی ہو گئیں۔‘‘

وقال لنا انا ظھرنا بمظھر
فمن لم یطعنا فیه ماھو عادل

’’اور ہم سے کہا ہم نے ایک مظہر کو ظاہر کر دیا، تو اس میں جو ہماری اطاعت نہیں کرتا وہ عادل نہیں ہے۔‘‘

نقوم علی العھد القویم وان نوت
من القلب افزاع ونادت وصائل

’’ہم عہد پختہ پر قائم ہیں، اگر چہ دل سے گھبراہٹ اٹھی، اور جوڑوں نے پکارا۔‘‘

وعندی علوم لا یکاد یقلھا
سماء ولا برو بحر وساحل

’’اور میرے پاس علوم ہیں جن کو، نہ آسمان برداشت کر سکتے ہیں، نہ بحر و بر اور نہ ہی ساحل۔‘‘

ويرجو ولى الله رحمة ربه
وفضلا لانواع العطا هو شامل

"اور ولی اللہ اپنے رب کی رحمت کی اور فضل کی امید رکھتا ہے جس میں مختلف قسم کے عطا شامل ہیں۔"

۲۹۱-تفہیم:

حقیقت اور مجاز کے درمیان مطابقت کا مسئلہ

میں نے خواب میں دیکھا کہ اکابر امراء میں سے ایک شخص مجھ سے حقیقت اور مجاز کے درمیان مطابقت کے سلسلہ میں سوال کر رہا ہے تو میں نے کہا جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ فلاں کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا تو طرفین کے نزدیک اس پر لازم ہے کہ اس میں داخل نہ ہو، نہ پیدل اور نہ ہی کسی سواری پر سوار ہو کر۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ عموم مجاز ہے۔ اور شوافع کہتے ہیں کہ یہ حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت ہے۔ اس سے وہ بہت زیادہ خوش ہوا۔ اور اس خواب کا راز یہ ہے کہ اولیاء اگرچہ کہتے ہیں کہ ہم نے ترقی کر لی اور ہمارے لیے حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت ممتنع نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی بھی اصحاب دولت و ثروت کے گھروں میں قدم نہیں رکھتا۔ اور جو لوگ حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع و مطابقت کو ممنوع قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک امر زیادہ ظاہر ہے۔

۲۹۲-تفہیم:

سالک کی تشویش کے موجبات، ان کی اقسام اور معالجات

سالک کو سلوک کے دوران تشویش لاحق ہوتی ہے۔ کچھ ایسا غم ہوتا ہے جس کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ پریشانی اور تنگ دلی محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے اپنی منزل پر نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تشویش کے اسباب، اس کی اقسام اور علاج کے بارے میں غور و فکر کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یہ حالت یا تو اللہ تعالیٰ

کے بارے میں فنا سے پہلے ہوتی ہے یا فنا کے بعد۔فنا سے میری مراد نفس ناطقہ کا اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ جانا ہے۔جیسا کہ ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں۔

وجہ اول یہ ہے کہ تشویش فنا سے پہلے ہوتی ہے جو اکثر ہوتا ہے۔اس کی چار قسمیں ہیں۔ایسا کبھی محبت اور شوق کے فساد سے ہوتا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ سرمایہ،نشاط اور اس کی بقا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہوتا ہے،کسی غیر میں نہیں۔وہ عروج میں سبب ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس کے انحصار سے فنا متحقق ہوتی ہے۔چنانچہ بعض سالکوں کو ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ریاضت بھاری پڑتی ہے۔بھوک و پیاس لگتی ہے،اور اس ذات کے لیے حبس نفس ہوتا ہے جس سے ایک بار انسیت ہو چکی تھی۔چنانچہ انقباض ہوتا ہے اور اس کو جو شوق و محبت تھا،وہ تشویش اور غم میں بدل جاتا ہے۔اور وہ نہ اس تبدیلی کو محسوس کرتا ہے،نہ اس کے سبب کو۔اور علاج یہ ہے کہ لگام کو ان مباح اشیاء کی طرف ڈھیلی چھوڑ دے جن کی خواہش ہو اور حبس و ریاضت کو اس وقت تک کے لیے چھوڑ دے جب تک کہ نشاط لوٹ نہ آئے۔پھر توحید محبت کی جہت سے نفی و اثبات کی تکرار سے شوق کی تحصیل نئے سرے سے شروع کرے اور نشاط کی حفاظت کرے،اس کو باقی رکھے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر دھیرے دھیرے انحصار کرے،پھر فنا کی راہ اختیار کرے۔

اور کبھی اس میں بقیۃ النفس اور اس کی ظلمات باقی رہتی ہیں اور سالک کے جوہر میں ایسی ذکاوت ہوتی ہے کہ اپنے نفس کے لیے شہوت مخصوص کی طرف میلان مخصوص نہیں پاتا۔لیکن خلودِ نفس کی جانب سے اس کے عالم کی طرف اس کے لیے ظلمت اجمالیہ دیکھنے کے درپے ہوتا ہے اور اس دقیقہ کو نہیں سمجھتا۔چنانچہ حیران و پریشان رہتا ہے۔اور اس کے نفس کو تاریکی ڈھانپ لیتی ہے اور اس پر تاریکی کی طرف سے غم و یاس غالب آجاتی ہے۔اور وہ نہیں جان پاتا۔اور اس کا علاج کسر نفس ہے۔خواہ تزکیہ کے ذریعہ ہو یا تصفیہ کے ذریعہ۔اور جس کے مزاج میں شدت ہو اور اس کی صورت مزاجیہ کی دو تدبیر کرنے والی ہو اور اس کے لیے وہ تزکیہ تلاش کرتا ہے تو ایسے امور چن لیتا ہے جن میں ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔جاہ و مرتبہ کی فنا اور مال کا خاتمہ ہے۔اور اس تلاش کا نصاب یہ ہے کہ اپنے نفس پر سختی

سے کام لے اور اس پر بوجھ ڈالے۔ اور اس کے لیے انقباض اور کراہت محسوس کرے۔ اور جس کی صورت ضعیف ہوگی۔ اس کے مزاج کی اصلاح ہوگی۔ چنانچہ اس کے حق میں بہتر تصفیہ ہے۔ اس لیے کہ یہ ظلمت وتاریکی کمزور ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل نہیں پاتا۔ تو ذکر دائم سے مضمحل کرے اور خلوت اس کی شرائط کے ساتھ کرے۔

اور کبھی سالک کی طبیعت میں تشویش جبن بزدلی وکمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ طول مسافت کو ملاحظہ کرتا ہے اور طریق کے بعد مایوس ہو جاتا ہے۔ اور راس المال کو ترک کر کے اپنے نفس پر فیاضی ونرمی نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے غم میں مبتلا ہوتا ہے جس کا بیان طول کا متقاضی ہے۔ اور علاج یہ ہے کہ اس کی طرف مرغوبات ڈال دیئے جائیں، اور اس سے ایسا وعدہ کیا جائے کہ اس کے مقصود کا حصول جائز ہو، اور امید افزا حکایات سنے۔ اور اپنے حال کو اپنی نظر میں بہتر کرے تاکہ سلوک کی طرف بڑھے، اور اس کے سلسلہ میں جرأت سے کام لے سکے۔

اور کبھی سالک ان لایعنی رسوم اور احادیث اور ان اشیاء میں خلط ملط کر دیتا ہے جو سالک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور نقوش کو نیہ دھیرے دھیرے اس کے ذہن کی لوح میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ محسوس نہیں کرتا۔ پھر جب وہ ایک مقررہ حد پر پہنچ جاتے ہیں تو اجمالاً ان سے اذیت ہوتی ہے۔ اور نقوش کے لیے تفصیل نہیں پاتا جن میں کہ محبت اور شوق پیدا ہوتے ہیں۔ اور علاج یہ ہے کہ عزلت وخلوت کی راہ اختیار کرے اور کسی کی صحبت نہ اختیار کرے اور ذکر دائمی اور خلوت پر دل جمعی سے کام لے تاکہ اس کے سینہ کی لوح میں سستی کم ہو۔ حتیٰ کہ فنا ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے نفس پر تجلی فرمائے۔ تب اس کو کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی۔

اور وجہ ثانی یہ ہے کہ تشویش فنا کے بعد ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بقاء نفس سے ہو اور فنا اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ترتیب واستحکام متحقق ہوتے ہیں۔ چنانچہ برائی بہت بڑھ جاتی ہے اور علاج دشوار ہو جاتا ہے۔ اور ایک شخص نے جس نے میرے نانا قدس سرہ کے دست مبارک پر سلوک کی راہیں طے کی تھیں اور اپنی ساری عمر اس عمل میں صرف کی تھی، مجھ سے بیان کیا کہ وہ رسوم دنیاوی میں مشغول تھا اور صاحب جاہ

و مال تھا، بھائی بند بھی بہت تھے، جن کی محبت میں وہ فریفتہ تھا۔ چنانچہ شوق پیدا کرنے والی بعض تقاریب کی وجہ سے اس کے نفس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی طرف بڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو وقتاً فوقتاً بڑھتا ہی رہا حتیٰ کہ اس پر غالب آ گیا۔ چنانچہ اس کی عنایت ازلی میرے نانا قدس سرہ کی طرف ہوئی۔ تب اس نے ان کے سامنے سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں اور ایک مدت تک اذکار وغیرہ میں مشغول رہا اور وہ دنیاوی مشقتوں، رسوم اور اپنے نفس کے غلبہ، اپنے اعزا و اقرباء کی حمیت وغیرہ آفات دنیاوی کی اس حالت پر قائم رہا۔ تو اس کو یادداشت دائم حاصل ہوئی۔ پھر اس کو عروج حاصل ہوا تو توحید صفائی نے اس پر تجلی کی۔ اور اس پر زبردست غلبہ ہوا۔ پھر اس کو دوسرا عروج واقع ہوا۔ جس سے اس کو وہ قوی ہمت حاصل ہوئی کہ معاملہ اس کی مراد کے خلاف نہیں تھا، تو وہ اپنی ہمت سے بہت خوش ہوا، اور طویل مدت تک اس حالت پر رہا۔ پھر اس کو ایک طویل حادثہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ایک رات وہ قبلہ رو ہو کر بنفسہٖ ذکر میں مشغول تھا کہ اس کو رات کی تاریکی میں ایک وجود نظر آیا۔ اس نے گمان کیا کہ وہ کوئی جن ہے جو اس کو ایذا پہنچائے گا تو اس کو دفع اور زیر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ اسی حالت میں رہا کہ تھوڑی ہمت سے کام لیا اور اس ہمت سے تعلق جوڑا جو اس کے سینہ سے خارج ہوئی تھی تو وہ بڑھتی رہی حتیٰ کہ اس کے دل کو ڈھانپ لیا اور اس کا حال تشویشناک ہو گیا۔ اس کی جمعیت خاطر پوری طرح جاتی رہی۔ چنانچہ وہ حقیر و ذلیل ہو کر رہ گیا۔ تب شیخ کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے پوری کوشش و سعی کی تب اس کو یادداشت حاصل ہوئی اور وہ ہمیشہ متردد رہا۔ پھر جب اس پر نفس غالب آ گیا جس نے اس کو دنیا کی محبت اور فسق بلکہ کفر کا حکم دیا اور جب اس کو مصیبتوں، فقر، اولاد کی موت اور ہم سروں میں ذلیل ہونے وغیرہ امور نے گھیر لیا تو اس کا حال صاف اور اس کا قول و بیان درست ہو گیا۔ اور پہلی حالت میں ضیق قلب تھا۔ جب اس میں شوق و محبت پیدا ہوا۔ اور دوسری میں کمزوری تھی جب اس میں نفس باقی رہا۔ چنانچہ اس کو دونوں میں سے کسی بھی حالت میں کبھی راحت میسر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کو اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا، اور اس کا مال غصب کر لیا گیا، اور وہ اپنے ہم سروں میں ذلیل ہوا۔ رحمہ اللہ و عفی

عنہ. اس طرح یہ فنا کے وقت نفس کی بقا کی مصیبتوں میں سے ایک شئے ہے، اور اس کا علاج وہ ہے جس کی طرف سید امیر کلال نے اپنی تصانیف میں اشارہ کیا ہے جیسے اس کو مارنا وغیرہ۔ اور وہ قدسیہ میں مذکور ہے۔

اور حاصل یہ ہے کہ انجذاب خاطر اور عروج کی طرف میلان کے سلسلہ میں غور وفکر کرے، پھر جب پاوے کہ رسوم، اموال اور اولاد وغیرہ سے علیحدگی کا حکم دیا گیا ہے، حتیٰ کہ اس کو کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ پھر محبت تامہ کی تحصیل کا حکم دیا گیا ہے، پھر کسب میں محنت ومشقت کا حکم دیا گیا ہے۔ تو اس میں اس کو ایسی قوی ذلت ہوگی کہ اس پر اس کا تحمل دشوار ہو جائے گا۔ اور محبت کی تقویت، صناعت مالوف کی تصویر اور اس کو اللہ کے ذکر سے روکنے کے تحمل میں تدبیر سے کام لینا ہوگا۔

۲۹۳۔ تفہیم

اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں

اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں۔ اول مخبر صادق کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مخلوق کی اصلاح ومصلحت اور ان کے عقائد واعمال میں سے شر کو دفع کرنے کے لیے مبعوث فرمایا، جیسے منارہ سے سفر کرنے والے استدلال کرتے ہیں، یا چراغ سے چلنے والے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے کشف۔ چنانچہ فنا، حکمت، قرب فرائض اور مفرد یہ ہر حقیقت کو پوری طرح کھول دیتے ہیں۔ تیسرے برہان۔ چنانچہ ہمارے نزدیک یہ متحقق ہوا ہے کہ ہر امر جو اپنے آپ میں صادق ہے برہان اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اور جو اپنے آپ میں جھوٹا ہے، برہان لازمی طور پر اس کی تکذیب کرتی ہے جو اس کا ادراک نہیں کرتا تو اس کا قصور ہے۔ ان میں سے ہر راستہ دشوار ہے اس لیے کہ صادق کی معرفت مشکل ہوتی ہے۔ اور اگر ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو آپ کی خبر کی تصحیح میں ثقہ راویوں کی نقل سے بغیر کسی وہم کے بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور اس لیے کہ کشف کا دعویٰ حق وباطل ہر ایک کرتا ہے۔ اور آدمی یہ نہیں جانتا کہ اس کے حال سے کیا تجاوز کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے نفس کے لیے علم

عام کے شامل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس طرح نہیں کہ اس کے آگے دوسرا کشف ہے۔ اور اس لیے کہ برہان کا ہم شکل ومشابہ وہم ہوتا ہے۔ اور شکوک وشبہات برہان کے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ حق ہر ایک کے لیے ایسی شریعت نہیں ہے کہ اس کو بغیر محنت ومشقت کے حاصل کرلے، اور ہم میں کامل وہ ہے جو اپنی خبر کی سند خبر دینے والے تک پہنچائے، اور برہان کی صحیح معنی میں تحقیق کردے، اور کشف میں پوری کوشش کرے۔

۲۹۴۔ تفہیم:

ولادت سے قبل کا حال، جب آپ شکم مادر میں تھے اور ولادت کے وقت آپ کی منقبت

میرے والد رضی اللہ عنہ نے میرے اس دنیا میں ظاہر ہونے سے قبل کی میری حالت بیان کی۔ فرمایا تم اپنی ماں کے شکم میں تھے کہ ایک مسکینہ نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے اس کو آدھی روٹی دینے کے لیے کہا۔ تب تم نے کہا حالانکہ تم جنین تھے کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نام سے سوال کرے اس کو آدھی روٹی دی جائے۔ اس طرح تم نے استدراک کرلیا۔ اور اس کو پوری روٹی دلائی۔ اور میرے والد اور ہمارے تمام گھر والوں نے مجھے میرے نانا کے حوالہ سے بتایا کہ انہوں نے کہا جب تم پیدا ہوئے تو میں نے تمہیں اپنی گود میں لیا تو میری نسبت اللہ سے زیادہ ہوگئی۔ میں اس کے رنگ میں رنگ گیا اور ترقی حاصل کی۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہاں سے جاننا چاہیے کہ مفرد کے وجود کا کلمہ اس کے پائے جانے سے پہلے جس شئے کے اوپر سے بھی گزرتا ہے، اسے نفع پہنچاتا ہے اور مفرد کے لیے بیشمار عجائب ہیں۔

۲۹۵۔ تفہیم:

انسان کے اطوار کا مفصل بیان

انسان کے اطوار دورہ کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اول اطوار امام الاعیان ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیوں میں سے ایک تجلی ہے جو افراد انسان کے حقائق پر اجمالی طور پر مشتمل ہوتی ہے اور یہاں کوئی شئے دوسری سے کم تر نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر اس وجود کے لیے جس کو انسان

کہا جاتا ہے، بالقوہ فیاض ہے۔ اس طرح یہاں ہر شئے اپنے وجود مفیض کے ساتھ موجود ہے نہ کہ اپنے نفس کے لیے اپنے وجود سے۔ پھر عین انسانیہ وہ شئے ہے جو اس لیے پائی جائے تا کہ اول کے لیے تفصیل ہو جائے۔ اس لیے نہیں کہ برأسہ مستقل شئے ہو جائے۔ سوائے اس کے کہ یہاں ہر استعداد اپنی دوسری ساتھی سے اجمالی طور پر ممتاز ہے۔ اور وہاں ایک شئے دوسری سے کمتر ہے جو کہ امام کے اجمال کے لیے شرح ہے۔ اس طرح یہ اس اجمال عینی کے لیے شرح ہے، اور وہ اس کے لیے۔

پھر روح ہے اور وہ ایسی شئے ہے جس کا فیصلہ مرتبہ عقلیہ میں کیا گیا ہے اور اس سے میری مراد عرش کے پیچھے ہونا ہے کہ وہ شئے واحد تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس اعلیٰ یا اس اجمال کی تفصیل ہے بلکہ اس لیے کہ فی نفسہٖ شئے ہے۔

اور ہم نے جب حقائق کی تفتیش میں اچھی طرح غور و خوض کیا اور وجود کے وجوہ کے درمیان تمیز کی تو ہر وجود خاص طور سے ناسوت سے بلند وجود ایک کلمہ، ایک توجہ اور ایک صورت میں پائے گئے۔ چنانچہ ہم غور و فکر میں اس وقت تک واقف نہیں ہوتے جب تک کہ اس کلمہ کو جس سے پایا گیا کوئی نام نہ دے دیں۔ اس لیے جان لو کہ کلمۂ روح فی نفسہٖ ہے اور کلمۂ عین امام الاعیان کی شرح ہے۔

پھر وجود مثالی وہ شئے ہے جس کے بارے میں فیصلہ عرش کے خیال اور اس کے واہمہ میں کیا گیا۔ چنانچہ وہاں وہ تمام متعین ہیں جو ناسوت میں صفات، وقائع، کمال ظاہری و باطنی وغیرہ سے لاحق ہیں۔ اور سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ تمام وجود اعتبارات کا احاطہ کر لیتا ہے نہ وجہ اجمالی کی بنیاد پر جیسا کہ روح میں ہوتا ہے۔ اور نہ ہی وجہ تفصیلی کی بنیاد پر جیسا کہ اس کے ناسوت میں ہونے کے وقت ہوتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان متوسط جیسا کہ عالم خیال اس کا تقاضہ کرتا ہے۔

پھر وجود خارجی شکم مادر میں نطفہ کے گوشت کا لوتھڑا بننے کے وقت اور صورت شخصیہ جو اس وقت فیضان کی جاتی ہے، وہ نفس ہے اور اس سے میں، میں اور وہ، وہ متحقق ہوتا ہے۔ یہ انسانیت اور یہ ہوئیت جو دونوں معنی میں تعمیری تجسد سے جدا نہیں ہوتے، کائنات کی

پیدائش کے لائق ہوتے ہیں۔

اور نفس کا پہلا خلیفہ یہی نسمہ ہے اور میں نسمہ سے جسم ہوائی مراد لیتا ہوں۔ جو تکون اخلاق، تدبیر نفس اور ان کے اس میں چلنے سے ہوتے ہیں۔ تو وہ ان میں سریان النفس ہیں۔ جن کو ہم نسمہ کہتے ہیں۔ اور نسمہ کے قوی اور اعضاء ہوتے ہیں اور ان کے امراء ہوتے ہیں اور ہر امیر کے وزیر ہوتے ہیں، جو اس میں اقامت پذیر ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی قوت طبیعت ہے جو جگر میں ہوتی ہے۔ اور اس کے لشکر سارے جسم میں ثابت ہوتے ہیں۔ اور دل و دماغ اس سے مدد حاصل کرتے ہیں، جو طبیعت کی طرف آتا ہے اور طبیعت کی تدبیر غذا کے مطابق ہوتی ہے۔ اور ان کی دوسری قوت ادراک ہوتی ہے جو دماغ میں رہتی ہے، اور وہ علوم میں صاحب حل وعقد ہوتی ہے۔ گویا کہ وہ شہر کی حاکم ہوتی ہے جو اپنے ہر گھر میں ایک معلم کو بھیجتی ہے جو گھر والوں کو خیر اور بھلائی سکھاتا ہے۔ اور تیسری قوت قلب ہے جو گوشت کے مشہور ٹکڑے میں رہتی ہے اور وہ امیر الامراء اور امام اعظم ہوتی ہے۔

جب وہ اپنے دربار میں بیٹھتا ہے تو اس کے وزیر اور قاضی اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو ان میں سے ہر ایک اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس طرح طبیعت کے افعال طب میں جمع، خروج اور صاحب حق کو اس کا حق دینے اور اخلاط کو پیدا کرنے اور امراض کو دور کرنے اور نیند وغیرہ ناموں سے معروف ہیں۔ اور اسی طرح فلسفہ میں ادراک کے افعال قوی باطنہ وظاہرہ کے ناموں سے معروف ہیں کہ قلب کے افعال غضب وارادہ، غم وتکدر کے اظہار اور عشق وغیرہ ہیں۔ پھر بدن ارضی دیکھتا، سنتا اور چھوتا ہے۔ پھر جب آدمی مرجاتا ہے تو نسمہ اس سے جدا ہوجاتی ہے جس میں وہ رہتی ہے اور اس کے لشکر کمزور پڑ جاتے ہیں اور سوائے بادشاہ وزیر اور قاضی کے کوئی باقی نہیں رہتا۔ اور قاضی کبھی بادشاہ پر غالب آجاتا ہے اور کبھی اس پر زمیندار رئیس سردار غالب آجاتا ہے۔

اور جان لو کہ ہر نشاۃ لاحق، سابق سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے افعال اس کے ساتھ تخلیط میں بندہ کے غور وخوض کے مطابق ساتھ رہتے ہیں۔ اور یہ مقام روح ہے۔ پھر اس کے بعد امر مثال کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ افعال حسیہ اس کے ساتھ رہتے ہیں،

اور وہ حشر ہے۔ اور ہمارے نزدیک جہنم حشر کا ایک خطہ ہے اور اسی طرح جنت اس کا ایک خطہ ہے۔ البتہ وہ بہت لطیف اور سب سے زیادہ قریب ہے۔ پھر امر اصحاب کے ساتھ روح کی طرف منتقل ہوتا ہے، پھر عین کی طرف اور پھر امام الاعیان کی طرف۔ اس طرح یہ ایک دورہ ہے، اگر اس کا احاطہ علم کے لحاظ سے کیا جاتا ہے تو انسان حق احاطہ پورا کر لیتا ہے۔

۲۹۶۔ تفہیم:

موت کے بعد واپسی کے واقعات اور ان کی تاویل

میرے والد قدس سرہ نے مجھے بتایا کہ ہمارے پڑوس میں ایک درزی رہتا تھا۔ ایک دن میں نے ارادہ کیا کہ کپڑے کٹا لوں تو میں نے اپنے گھر والوں میں سے ایک آدمی کو اس کے پاس بھیجا تو اسے معلوم ہوا کہ درزی کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے اعزاء واقرباء رو رہے ہیں۔ اور اس کے لیے کفن تیار کر رہے ہیں۔ تو جس کو میں نے بھیجا تھا وہ واپس آیا اور اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بتایا۔ پھر کچھ دن کے بعد جب میں سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لیے جا رہا تھا تو اس کو بازار میں کھڑا ہوا پایا۔ تو میں نے کہا: مجھے تو بتایا گیا تھا کہ تمہارا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ ایسی ہی بات ہے اور میرا عجیب قصہ ہے۔ میں اس کو آپ کے سامنے یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر کسی وقت بیان کروں گا۔ والد صاحب نے کہا کہ میں اس کو چھوڑ کر جامع مسجد کی طرف چلا گیا۔ پھر جب نماز ادا کر کے واپس لوٹا تو وہ میرے گھر آیا اور بتایا کہ جس وقت وہ راستہ میں چل رہا تھا۔ دو آدمی اس کے پاس آئے جو بہت غیظ وغضب میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ وہ ان کپڑوں کا تقاضہ کرنے والے ہیں جو انہوں نے سلائی کے لیے مجھے دیئے تھے۔ اس لیے میں نے کہا بھئی! غصہ دکھانے میں جلدی نہ کرو، میں نے تمہارے کپڑے سی دیئے ہیں۔ اور وہ میرے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان میں سے ایک نے میرے طمانچہ مارا جس سے میں زمین پر گر گیا اور مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ مجھے اس کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کہیں لے جا رہے ہیں تو وہ جہاں بھی لے گئے، میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ ہیں جن کی ہیئت ہم جیسی نہیں

ہے۔ان کا ایک سردار ہے۔ان دونوں نے مجھے اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔اس نے میری طرف دیکھا اور کہا یہ وہ نہیں ہے جس کے بارے میں، میں نے تمہیں حکم دیا تھا۔اس کو وہیں لوٹا دو جہاں یہ تھا۔اس نے بتایا کہ ان دونوں نے مجھے لوٹا دیا۔میں ان کو چھوڑ کر تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ وہ مجھے لے کر اس کے پاس گئے۔میں ان کی طرف پلٹا تو اس نے کہا تو وہی ہے جس نے......لیا تھا۔میں نے کہا اللہ کی قسم! میں نہیں لوٹوں گا۔اس نے کہا بلکہ تو یہ کہے گا کہ وہ خواب وخیال تھا، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔اس کو پکڑو، اٹھاؤ اور گرم لوہے سے جلا دو۔اس نے کہا کہ وہ جلتا ہوا لوہا لے کر آئے اور اس کو میری ران پر رکھ دیا جس سے سخت تکلیف ہوئی، بدبو پیدا ہوئی اور میں بیدار ہو گیا اور لوگ مجھے اٹھا کر میرے گھر لے گئے۔انہوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیئے، وہ مجھے غسل دینے کی تیاری کر رہے تھے۔والد صاحب نے کہا کہ اس نے اپنا ازار پھاڑا اور مجھے جلی ہوئی جگہ دکھائی۔تو میں نے داغ لگانے جیسی ہیئت دیکھی۔اور ہمیں اس قسم کی کچھ اور حکایتیں بھی پہنچی ہیں۔ان میں سے بعض حدیث کی کتابوں میں ہیں۔بعض مشائخ صوفیا کی کتابوں میں اور کچھ عجیب سی باتیں ہمیں اپنے کانوں سے سننے کو ملی ہیں۔ان سب میں موت کے بعد واپسی اور روح قبض کرنے والوں کی غلطی پر متنبہ ہونا مشترک ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ان خبروں کی تاویل یہ ہے کہ یہ سکتہ میں مبتلا ہونے والے لوگ ہیں۔

اور سکتہ میں مبتلا ہونے والے کو کبھی کبھی ظاہری احساسات کے انسداد کے وقت ایسا امر لاحق ہو جاتا ہے۔موت کے بعد کے احوال وعلوم پر وہ اس طرح متنبہ ہوتا ہے جو میت کو اس کی قبر میں پیش آتے ہیں۔اور روح قبض کرنے والے کی غلطی موت کے وقت کی تمثیل اور مبتلا ہونے والے سے اس کے اسباب کا دور کرنا ہے۔اور اس کی روح کا قبض کرنا، پھر اس کا جسم کی پستی میں لوٹنا پھر اس کا صحت مند ہونا اور اس سے اسباب کا دور ہونا۔واللہ اعلم بالصواب۔

۲۹۷—تفہیم:

رونا صرف تین قسم کے لوگوں کو زیب دیتا ہے

میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا وہ ایک شعر گنگنا رہا تھا

جس میں عشق کا بیان تھا اور رو رہا تھا تو میں نے کہا: بھئی! یہ رونا صرف دو افراد کو زیب دیتا ہے۔ ایک وہ جس کو تجلی ذاتی عطا نہ کی گئی ہو۔ دوسرے وہ جس کو یہ تو عطا کی گئی ہو لیکن اس پر باہر سے خطرات کا ازدحام ہو۔ تب میرے والد قدس سرہ نے اس حالت میں کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہا۔ اور ایک تیسرا آدمی بھی ہے جس کو شر کی سختی پیش آئی ہو۔ گویا وہ اس سے یہ مراد لے رہے تھے کہ جس نے اللہ کے دوست کو دشمن بنایا تو اللہ نے اس کو جنگ کی دعوت دی۔ پھر والد صاحب قدس سرہ نے فرمایا جو لوگ ہم سے پہلے گزر گئے ہیں وہ بھی روتے تھے لیکن ان میں سے اکثر عملی تھے۔ اصحاب کشف نہیں تھے، گویا کہ وہ عملی سے اس شخص کو مراد لیتے تھے جس کا کمال عمل ہو اور صاحب کشف سے اس کو مراد لیتے تھے جس کا کمال مکاشفات الٰہیہ اور تجلیات ہوں۔ وللہ الحمد اولاً و آخراً۔

۲۹۸- تفہیم:

یادداشت کے معنیٰ

یادداشت جس کو صوفیا بہت بڑا مانتے ہیں وہ توجہ ہے کہ جو شہود حصولی و حضوری کو اس معنیٰ میں جامع ہو کہ ایک امر بسیط ہے کہ اگر اس کو حصولی کہیں تو درست ہو اور اگر حضوری کہیں تو بھی بجا ہو۔ اور چونکہ اس یادداشت کا ایک دائرہ ہے اور وہ معنیٰ پیدا کرتی ہے اور روشن تر ہوتی ہے۔ اور جوہر نفس ناطقہ اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، وہی بقا ہے۔ تم اس کو کبریت احمر قرار دو۔ اس کے بعد اس تجلی کی ہیئت ہے کہ اس کا نفس اس سے رنگا ہوا، بندہ کی ہمت، اس کے علوم اور اس سے انتساب رکھنے والے تمام امور میں سرایت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ سرایت خوارق عادات کا پیدا ہونا ہے۔ مشائخ جس کام کو کرتے ہیں اور بزرگ جس راہ پر چلتے ہیں، وہ یہی ہے۔ اس میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ جو شخص ابتداء حال میں جب راہ سلوک میں چلنا شروع نہیں کیا تھا، عادات کے راستوں میں قوی الہمت، عظیم الشہامہ، بہت بزرگی اور توانائی و شادمانی والا اور قوی المزاج ہو۔ اس کے احوال و آثار شہامت و بزرگی اور تسلط و غلبہ کے رنگ میں ہوں۔ اگر شروع میں ایسی فطرت نہیں رکھتا تو یہ آثار کہاں سے لائے گا؟

۲۹۹- **تفہیم:**

تجلیات جلالی و جمالی

چوں بدانستی کہ ظل کیستی
فارغی گر مردے وگر زیستی

''جب تم جان گئے کہ کسی کے سائے میں ہو، تو کام سے فارغ ہو جاؤ چاہے مر جاؤ یا زندہ رہو۔''

جب فاعل کے فعل کا مشاہدہ ہو گیا کہ وہ عین جمال ہے تو اس کا ہر فعل دوسرے کا جمال کیا ہو گا، سوائے اس کے کہ ہر جمال کا الگ تماشہ کرتے ہیں کہ جمال دوسرا جلال ہے اور جلال دوسرا جمال ہے۔ جب اس سے ہر فعل حقیقی باب میں آتا ہے تو تازہ ہیئت ہوتی ہے۔ سوائے رویت میں اضمحلال کے۔ ہاں اس سے لطف اندوز ہونے میں گم ہو جانا اور حیران رہنا کوئی کام نہیں ہے۔ رونا دوسری ہیئت ہے اور ہنسنا دوسری ہیئت ہے۔ جب جلالی جلوے ہر طرف سے دل کو گھیر لیتے ہیں، یکسو کر دیتے ہیں، تو ان کے لیے اسباب وصل بیان کیے جا سکتے ہیں، نہ کہ وحشت کے باعث۔

آب نیل است آن بقبطی خوں نمود
قوم موسیٰ را نہ خوں بود آب بود

''وہی نیل کا پانی ہے کہ وہ قبطیوں کے لیے خون، موت کا سامان بن گیا، جبکہ موسیٰؑ کی قوم کے لیے وہ خون نہیں پانی ہی تھا۔''

۳۰۰- **تفہیم:**

وصایت اور مجددیت کے مراتب کا جامع ہونا

فقیر کی طبیعت ان دنوں ان علوم ظاہری کی طرف مائل ہے جن کا چہرہ ظاہر ہے اور پشت باطن۔ اور تم اس کے برعکس ہو۔ اور وہ فردیت وگزر براہ ظاہر وجود ہے۔ باطن میں باطن ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وصایہ اور عکس اسم تشریع ہے۔ حقیقت میں یہ بندہ

باطن میں ضعیف اور ظاہر میں مجددیت ہے۔ ظاہر میں یہ سب ان مراتب میں علی سبیل الاجتماع فقیر کا خاصہ ہے، اور تم اس کی تحقیق میں مایوس ہو کہ تمہارا نسمہ جشن مسرت چھچہ کی طرح نور ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری روح مقام حکمت میں متحقق ہوتی ہے اگر تمہارے کاموں کا انجام تمہارے اجتہادوں کو آگے پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ یہی ہے۔ لیکن انشاءاللہ تعالیٰ ان امور کے اجتماع سے جو ان کا خاصہ ہے بڑا حصہ پائیں گے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

۳۰۱-تفہیم:

مکہ مکرمہ اور ہردوار کے درمیان فرق

مکہ معظمہ اور ہردوار کے درمیان جو کہ کفار کی عبادت گاہ ہے، فرق سے متعلق سوال کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے معبود کے اسم کے مظہر ہونے کے باوجود ممکن کے دو اعتبار ہیں۔ ایک وجود اقصیٰ میں اس کے اضمحلال کا اعتبار ہے اور اس اعتبار سے تمام خیر و شر لازمی طور پر ایک شان الٰہی کے مظہر ہیں۔

لا تنکر الباطل فی طورہ

فانہ بعض ظھوراتہ

''اس کے طور اور طرز میں باطل سے انکار نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ بھی اس کا کوئی مظہر ہوتا ہے۔''

اور دوسرے احکام خاص کے ساتھ حقائق امکانیہ میں سے ہر حقیقت اختصاص کے اعتبار سے ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک وجود خاص و امتیاز کا اثبات اپنے خواص سے ہونا لازم ہے۔ اس لیے کہ جب حالات پختہ و درست ظاہر ہوتے ہیں تو ہر ایک کے وجود کے ظاہر میں ایک فعلیت و تقرر، دوسری فعلیت کے بغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے زنجبیل زنجبیل ہوتا ہے اور کافور، کافور۔ جبکہ ایک کا اثر تسخین (گرم کرنا) ہے اور دوسرے کا اثر تبرید (ٹھنڈا کرنا) ہے۔

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد

موسوی با عیسوی در جنگ شد

''جب بے رنگی، رنگ کی قیدی ہوگئی، موسویت، عیسویت کے ساتھ برسرِ پیکار ہوگئی۔''

اور اس کو وحدت وجود کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس غیریئت و امتیاز کی ایک الگ شان ہے۔ چنانچہ ہر چیز کا وجود اول کے اعتبار سے خیر محض ہے۔ اس میں شر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے خیر کے بعض حقائق آتے ہیں اور بعض شر کے۔ اور شر کی اصل متضاد شئے ہے خاص طور سے دوسری شئے کو۔ درحقیقت حق سبحانہ نے خواص اور طبائع سے اس میں ہر ایک کو ودیعت کیا۔ چنانچہ ہر شر کا ایک وزن و معیار ہے کہ بعض اعتبارات سے اس برائی کی ضد ہے۔ مثلاً زہر انسان کے لیے برائی ہے اور سانپ کے لیے خیر ہے۔ اور اس کے شربت کے مصداق اس کے تحائف میں خاص طور سے انسان کے لیے مزاج کے اعتدال وغیرہ سے کہ ساری تفصیل حالات کی خاص شان ہے۔ اسی طرح جب کلمہ الٰہیہ کا تنزل شرع کی نشاۃ تک پہنچا، اور حلال و حرام پیدا ہوا تو لازمی طور پر اس مقام میں شر پسندی کا ایک معیار ہے۔ اور یہ بات بہت تفصیل طلب ہے۔ بالجملہ ان تمام کا معیار ہے۔ عمل ضد کا بالطبع خاص انسان کی صورت نوعیہ کے خواص کا شرک کی طرح۔ اور اس کی نظیر زہر ہے کہ وہ نوع انسانی کی طبیعت کی ضد ہوتا ہے۔ اور ان میں سے عمل کا اس اسم کے حکم کے مخالف ہونا ہے جو کہ اس عالم کا مدبر ہے۔ اور اس اسم کی تفصیل جو ہر ہزار کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ عالم کی مصلحت کو تمہید فرماتا ہے اور ہر عمل کی خیر یا شر کی موافق یا مخالف نسبت پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوگیا تو اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں۔ سائل نے کہا تھا کہ دونوں عبادت گاہوں کے درمیان وہ فرق جس سے نفس الامر میں ایک کی حقیت اور دوسرے کا بطلان ہو، معلوم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بعینہٖ یہی اعتراض ان دونوں وجھوں میں وارد ہوتا ہے جو احکام خاصہ کے ساتھ ممتاز ہیں جیسے نماز اور زنا اور زہر اور تریاق۔ اس طرح کہ میں کہتا ہوں کہ ہر موجود لازمی طور پر ایک شان الٰہیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان وہ فرق کہ نفس الامر میں ایک کی حقیت اور دوسرے کا بطلان ہو، معلوم نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک وجود میں ہر موجودیت و فعلیت اور تقرر

وتحقق اوراضمحلال میں فرق مطلوب ہے تو ان صفات میں موجودات ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہیں۔ لازمی طور پر تمام حق وباطل موجود ہیں اور وجود میں اشتراک رکھتی ہیں اور اس جہت سے حقیت اور بطلان کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور اگر ہر ایک کے احکام خاصہ میں فرق مطلوب ہے تو ہر موجود لازمی طور پر دوسرے موجود سے ممتاز ہے۔ اور ہر ایک کا حکم دوسرے کے حکم سے ممتاز ہے۔ سائل کو بھی اس اصل کا اعتراف ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ ہاں من حیث الیقین متضاد آثار واحکام کا مظہر ہے۔ چنانچہ جب خواص میں تضاد متحقق ہو گیا تو لازمی طور پر اپنے مخالف کی نسبت سے ایک شر آتی ہے۔ اور شریعت نے جس جگہ بھی نسبت خاص کے اعتبار سے شر پسندی یا خیر ہونے کا اعتبار کیا ہے، وہ نوع انسانی کی صورت ہے یا مربی عالم کے اسم کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ہر دوار جو کہ کفار کی عبادت گاہ ہے، اگر شرک کے شعائر میں سے ہے، اس کی شر پسندی تمام افراد بنی آدم کی نسبت سے متحقق ہے۔ خواہ اس زمانہ میں ہو خواہ گزشتہ زمانہ میں۔ اور لازمی طور پر اثر تحریف ہے۔ اور اگر توحید کے شعائر سے ہے کہ اس سے ملت حنفیہ میں معبود حقیقی سے کعبہ کے مانند اپنے شوق سے حق کا تقاضہ پورا کرتے ہیں۔ کہ اسم الٰہی مدبر عالم ہے۔ شریعت کا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نزول اس اسم عالی کے ظہور کے اسلوب میں کلمۂ حنفیہ ہوا جیسے اسکندر رومی کی دولت کی بلندی وغیرہ۔ جو کہ اقالیم سبعہ کی شہنشاہی ہوتی ہے۔ اور اس اسم عالی کی رضا مندی تمام ملتوں پر اس ملت کو آتی ہے۔ اور اس مسئلہ میں راز یہ ہے کہ ہر ملت کی مصلحتیں ہوتی ہیں جو اس ملت کی روح کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اور جسم اور صورتیں اس ملت کے جسم کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اور چونکہ اسم الٰہی ایک ملت کا تعین چاہتا ہے، اس کی روح کو بھی ایجاد کرتا ہے۔ اور اس کا جسم بھی اور اس کے جسم کا مادہ بھی ایک قوم کے علوم وعادات کے مطابق ہوتے ہیں کہ وضع فلکی کے مطابق ان کی شہرت اور ان کی دولت کے غلبہ کا مقتضی ہو گیا۔ چنانچہ ہر دوار کا بطلان اس مخالفت کی جہت سے جسمانی احکام میں ان امور میں بھی ہے کہ جو ملت کے ظہور کے وقت ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سی باتیں ہیں۔ یہ سطور ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ بالجملہ معرفت سے کہ تمہارے لیے حکم وحدت کا انکشاف ہے۔ حکم کے

انکشاف کے بغیر زیادہ مغرور ہونا خام لوگوں کا کام ہے۔

وکن طفیلیھم علی ادب
فما اری شافعا سوی الادب

''ادب میں ان کا طفیلی ہو جا، کہ میں نے ادب کے سوا کسی کو شفاعت کرنے والا نہیں پایا۔''

۳۰۲-تفہیم:

رحمان کی تجلی کا رابطہ اور اس سے بندہ کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے

با آنکہ نخست قبلہ گاہ من وتست
ہرگز نشود رابطۂ عشق تو سست

''جو میرا اور تیرا پہلا قبلہ گاہ ہے، اس کے ساتھ تیرے، عشق کا رابطہ کبھی سست نہیں ہونا چاہیے۔''

صد جائے کنی گر سبق عشق درست
عشق تو بود درہمہ بایار نخست

''اگر عشق کا سبق سو جگہوں پر درست کرو گے، تو بھی تمہارا عشق دوست کے ساتھ پہلی بار ہی ہو گا۔''

کیا تم جانتے ہو کہ یہ حالت کب میسر آتی ہے؟ جس وقت بندہ رحمٰن کی تجلی کے ساتھ رابطہ قوی کرتا ہے؟ نہیں، نہیں بلکہ جب وحدت کی وجہ سے پردہ ڈال دیا ہو۔

وجوہ إذا ما اسفرت عن جمالھا
اضاء ت لھا الا کوان من کل جانب

''جب چہرے اپنے جمال سے روشنی کرتے ہیں، تو ان کی وجہ سے ہر طرف سے کائنات روشن ہو جاتی ہے۔''

اس وقت وحدت کے تنزل کا ہر نشاۃ میں مشاہدہ کیا اور اس کے نزدیک سب برابر

ہو گئے۔ یہ آدمی اگر فقہ کی تدوین میں یا معارف کی تحریر میں بلکہ اگر دشمنوں سے لڑائی جھگڑے، بحث ومباحثے اور دنیا کی محبت میں پڑ گیا، اس کے حق میں سب کچھ اعتکاف ہے۔ اور کسی غیر کے ساتھ نہیں صرف وحدت کبریٰ کے ساتھ شغل خاص اس کے لیے جلوت وخلوت سب یکساں ہے۔ سوائے اس کے کہ خلوت میں طبقات نسمی وروحی مہذب ہوتے ہیں۔ اور جلوت میں یہ طبقات غیر مہذب رہتے ہیں۔

۳۰۳- تفہیم:

وحدت قصوی اور اس کی وجہ سے مدح کا ہونا

من نیم واللہ یا رامن نیم
جان جانم سرسرم من تن نیم

"میں نہیں ہوں، اللہ کی قسم یار! میں نہیں ہوں، جان میری جان ہے، سر میرا سر ہے، میں جسم نہیں ہوں۔"

اللہ کی قسم! پھر اللہ کی قسم! پھر اللہ کی قسم! میری مدح سرائی کرنے والا وہ ہے جو وحدت قصوی کی ثنا خوانی کرتا ہے، خواہ مجھے پہچانتا ہو یا نہیں۔ اور میرا معتقد وہ ہے کہ جو وحدت قصوی کا معتقد ہو، خواہ وہ مجھے پہچانتا ہو یا نہیں۔ اور میرا منکر وہ ہے جو وحدت قصوی کا منکر ہے۔ بلا کسی تصنع کے کہتا ہوں کہ وہی کیفیت جس کو لوگ اپنی ثنا واعتقاد یا ہجو اور انکار میں پاتے ہیں، وحدت کبریٰ اور ثنا واعتقاد میں اور ان دونوں معنی کی اضداد میں ایک جو کے دانے کے برابر بعینہٖ وہی کیفیت فرق کے بغیر پاتا ہوں۔ جو شخص اس بات کا مدعی ہے کہ وہ خاص اس قالب میں مصروف ہے، میرے نزدیک درخت یا پتھر کی مدح سے زیادہ نہیں ہے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔ اس نکتہ کو لوگ کم ہی سمجھتے ہیں کہ میرے کلام میں اغماض وچشم پوشی نہیں ہے کہ اگر کوئی معتقد پوری طرح اعتقاد رکھتا ہے تو اس اعتقاد سے ذرہ برابر بھی مجھ سے نہیں پھرتا۔ ورنہ استاذ کے چہرہ سے توجہ کے بعد اس کے مناسب حرکات اور تصویروں کی مدح سے پھر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی منکر انکار کرتا ہے تو اس کے انکار سے

بھی مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور نہ ہی اس کے مثل سے۔ 'فتدبر ثم تدبر'. میرے کلام میں کوئی نشہ مستی اغماض وچشم پوشی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مبالغہ ہے۔ جس کی لوگ امید کیا کرتے ہیں، جبکہ عملاً اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور وجود محض وحدت بحتہ اور تقرر صرف اس پر دشوار ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر مجھے پہچانتے اور اعتقاد رکھتے تو بھی مجھ کو نہیں پہچانتے کہ میرا پہچاننا یہ ہے کہ مجھے ہر کمال کے ساتھ جو کہ وجود اور امکان کی حد میں پہچانیں۔ اور اگر کوئی اس طرح نہیں پہچانتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ لازمی طور پر اگر کسی چیز کو پہچانتا ہے تو وہ پہچاننا تمہارا مجھے پہچاننا ہے۔

وکل مغری بمحبوب یدین له

جمیعهم لی وقد دانوا و ما فطنوا

"محبوب پر فریفتہ ہر شخص اس کا قرضدار اور مرہون ہے، وہ سب میرے ہیں اور وہ میرے مرہون منت ہیں مگر سمجھتے نہیں۔"

افسوس کہ فلاں کے ساتھ ہواؤں کے راستے چلے گئے اور زمینوں میں بہہ گئے (برباد ہو گئے)۔

قضت عیون مهات الرمل فی جسدی

ان لیس یبقی له عین ولا اثر

"میرے جسم میں ریگستانی وحشی نیل گایوں کی آنکھوں نے فیصلہ کر دیا، کہ نہ اس کے لیے کوئی آنکھ رہی اور نہ ہی اثر۔"

میرا کبھی کوئی عنوان نہیں ہے یعنی معاملہ کبھی بھی معدوم نہیں تھا خواہ کوئی بھی مصیبت آئی۔

۳۰۴- تفہیم:

ذات وصفات میں فنا اور نفس کا اللہ واحد کی طاعت کو تسلیم کرنا

ہوا اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتی ہے اور خود کو زمین پر دے مارتی ہے۔ اس مٹی سے اپنے لیے ایک گنبد بناتی ہے، یہ گنبد اس ہوا کے جسم کو اپنے اندر گھماتا ہے۔ اور ہوا ہر اس

حرکت کی روح کو جو کہ ظاہری طور پر اس گنبد سے دکھائی دیتی ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہوا سے منسوب ہے۔ اس جگہ مٹی سے پیدا کی ہوئی خاکساری ہے کہ اسماء الٰہیہ کی تجلی کو ریاح اپنے اندر لپیٹ کر اپنے اس خاکدان پر مارتی ہیں۔ اس کو نیکی کرنا یا صنعت سازی کہتے ہیں۔ ان ریاح کے بغیر نہ اس کی کوئی حرکت ہوتی ہے، نہ ہمت، نہ قوت، نہ کوئی شئے اور نہ سکون۔ اگر اس کو کھولتے ہیں تو اس کو کھول کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر اس کو جھوٹ کے ساتھ لاتے ہیں تو اس کو جھوٹ کے ساتھ رکھ نہیں سکتے کہ وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن وہ ظالم ہیں۔ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اگر اس سے کہتے ہیں، تو ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں نہیں ہے تو اس کا جواب پوری طرح خاموشی ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح صاف وشفاف ہے اور نادان بحث ہے۔ ایک جسم ہے زمینی مقہور ہے۔ سفلی طبیعت والا، کام کرنے والا، اپنا کام کرتا ہے۔ یہ بے چارہ کس گنتی میں ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چین بستہ اند

''تیری زلف کا کام مشک افشانی ہے لیکن عاشق لوگ، مصلحت کی وجہ سے تہمت چین کے ہرن کے سر تھوپ دیتے ہیں۔''

یہ بات کمال کے لحاظ سے اس خاکسار، بے اعتبار، نامراد کے نیچے جاتی ہے کہ اس کا حامل اس کا نفس ناطقہ ہے۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ دماغ میں کیا شورش وغوغا رکھتا ہے۔ شاہ نامرادی بے اعتباری کو اختیار کرتی ہے، اس کو خلعت فاخرہ پہناتی ہے، اپنے پہلو میں بٹھاتی ہے، اس کے جمال میں نظر گاڑتی ہے اور آنے والا اس سے راز کی بات کہتا ہے کہ سب کچھ تمہارے اوپر فدا ہے، ہر بال تمہارے عشق سے لبریز ہے، ہر قطرہ کا قوام تمہاری محبت ہے، میرا دل تمہارے لیے۔ میری نظر تمہارے لیے ہے، میری صورت تمہارے لیے ہے اور میری خاطر تمہارے اوپر ہے۔ اس نامرادی کی اس وقت میں مستی اور ناز ہے۔ کس زبان سے کہوں کہ سر سے پیر تک سب کچھ ناز کے اندر ناز ہے اور مستی کے اندر مستی ہے۔ یہاں نامرادی غریبی ہے کہ شاہ وجود خلعت فاخرہ محبوبیہ اس کو پہناتا ہے۔ بر لطف خطاب سے اس کو

مخاطب کرتا ہے۔ اگر اس کا بدن پھٹ جاتا ہے تو اس کی جگہ یہ ہے کہ یہ مستی اس کے حوصلہ میں نہیں ہے۔ لیکن مضائقہ کیا ہے۔

کہ رستم را کشد ہم رخش رستم
رستم کو رستم کا گھوڑا ہی قتل کرتا ہے

میکدہ کا بھکاری ہوں، لیکن مستی کے وقت دیکھ میں فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔ یہ سخن اس کے طبقۂ عینیہ کے مطابق چلتی ہے۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ اس کے دماغ میں کون سی شورشیں ہیں۔ لوہار، تلوار کی اسناد تیار کرتا ہے۔ ایک درہم صاف ڈھالتا ہے پھر ایک دوسرا درہم خراب کر دیتا ہے۔ اور پھر مختلف قسم کے پانیوں میں غوطہ دیتا ہے۔ اس کے بعد نکال لیتا ہے۔ اس کی نمی اور ماہیت اس میں نہیں رہتی۔ ہر نشاۃ کے حکم کو رخصت کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے تو وہی ہے کہ میں نے جو کچھ پیدا کیا تیرے لیے پیدا کیا اور اگر تو نہ ہوتا تو نشاۃ اور اس کے علویوں اور سفلیوں کو پیدا نہیں کرتا۔ تو کتنا حسین اور کتنا جمیل ہے۔ تیرے ذریعہ میری حدادیت، لوہاریت ظاہر ہوئی تو وہ ہے کہ تیرے سوا کوئی محبوب نہیں۔ کوئی کیا جانے اس معمہ کی تعبیر کیا ہے۔

بالب دمساز خود گر جفتمی — ہم چوں نے من گفتنیہا گفتمی
میں اگر اپنے ساتھی کے ساتھ جڑ جاتا — تو بانسری کی طرح باتیں کرتا

تیز آندھی سرخ رنگ زمین پر پھیلاتی ہے تو سب کچھ سرخ ہو جاتا ہے۔ چند فرسخ اور میل کے بعد اس سرخی کو جو اس کے ساتھ رہنے سے اٹھ جاتی ہے، وداع کر کے سیاہ زمین کے اوپر سے گزرتی ہے۔ اور سب کچھ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس سیاہی کو چند میل کے بعد وداع کر دیتی ہے، اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ساری زمین کو پار کر جاتی ہے، پھر دریا پر پہنچتی ہے اور دریا سے بھاگنے والے اجزاء اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور بخارات کی شکل میں نکلتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دونوں یا ایک اپنے دائرہ میں لپٹ جاتے ہیں۔ مبدأ افعال کے سامنے حاضر ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے تیرے اذن سے بحر و بر کا سفر کیا، تیرے امر سے غبار، سبزیاں، انسان اور درخت واجب ہو گئے۔ پھر کتنے مقامات ہیں کہ میں وہاں

سم قاتل ہوگئی اور کتنے مقامات ہیں کہ میں وہاں نسیم شافی ہوگئی۔ اور ان اسفار میں، میں اپنے نفس کے اعتبار سے نہیں تھی، سوائے ہوائے محض کے، جو ایک طور پر اور ایک فن کی شکل میں تھی تو اب تیرا کیا حکم ہے؟ مبدأ فعال فرماتا ہے۔ دوبارہ سفر کرو، اس سے بڑا اور عظیم۔ تو جب تک تیری ہستی کلی طور پر معدوم نہ ہو جائے تحقق نہیں ہوگا اور اگر تو دائرہ وجود میں نہ ہو تو بھی تحقق نہیں ہوگا۔ اس نے کہا میں تیری بندی ہوں۔ تیرا حکم ہے، تو جو کچھ فرمائے گا میں وہ کروں گی۔ اس نے کہا میرے سامنے چاہئے کہ نظر میرے جمال پر رکھ اور کان میری بات پر دھر اور دل کو میرے معنی کے سمجھنے میں لگا۔ اس طرح کہ مبدأ فعال کہے کہ پتھر ہو جا تو پتھر ہو جائے۔ باوجودیکہ خود سے نہیں دیکھتا۔ کوئی چیز پتھر کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ اور اس پر انواع واشخاص کے اسماء بسیط کو قیاس کرو کہ ان کا کوئی نام نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں گوش حال سے سنتا ہے نہ کہ گوش مقال سے۔ یعنی اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ اس کا نام مذکور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تمام انواع واشخاص کا گھیراؤ کرتا ہے تو اس کو فعال پکارتا ہے کہ کیا تو سب کچھ ہوگیا؟ وہ کہتا ہے میں سب کچھ ہوگیا۔ وہ کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ ایک قسم کی ہوا تمام صورتوں میں اس جھوٹ کی خجالت سے اپنے آپ میں لپٹتی ہے اور پوری طرح معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وجود نہیں رہتا۔ سوائے ہیولائے صرف کے جو کہ حال کے لحاظ سے ہوا اور فعلیت کے لحاظ سے ہیولی ہوتا ہے۔ اور اس کا تحقق ہو جاتا ہے۔ سفر طویل وعریض پیش آتا ہے۔ اور اپنے خیال میں ایک جہاں منتظم ہو جاتا ہے۔ وتلک الأمثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون "یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔"

۳۰۵۔ تفہیم:

خاص حالت کا ذکر

اس فقیر کی حالت ایسی ہے جیسی پھینکنے والے کے ہاتھ میں پتھر یا غسل دینے والے کے ہاتھ میں میت کی حالت ہوتی ہے۔ کہ تمام حرکات وسکنات میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں

ہوتا، وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور جس کام میں بھی چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ علم حضوری علم واحد بسیط سے بدل جاتا ہے جو کہ تمام علوم کا جامع اور تحقق وتقرر ہوتا ہے۔ چنانچہ شب وروز کے حوادث کا اختلاف اپنے آپ میں پاتا ہوں۔ اس قصہ کی حقیقت کو پہچانو۔

۳۰۶- **تفہیم:**

وجوہ حق وباطل کا باہم اشتباہ

اے بھائی! جان لو کہ وجود حق، وجود باطل کے ساتھ باہم مشتبہ ہوتا ہے۔ اور وجود حضرت آدم علیہ السلام سے آج تک جو بھی حق ظاہر ہوا ہے ایک جماعت ہر زمانہ میں اس کا انکار کرنے والی رہی ہے کہ کہا گیا ہے **لا یزال الإنسان عدواً لما جھل** "انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوتا ہے۔" لیکن غور وفکر اور تامل کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ جس کو تم دیکھو کہ اپنے علم اور احوال میں متردد ہے، ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور ایک قدم پیچھے ہٹاتا ہے، رشد وہدایت کے ایک یا دو راستوں کو سمجھتا ہے، کوئی بھی شخص جمیع وجوہ کا احاطہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس موقع کے سلسلہ میں روایت ہے کہ تمام وجود کا احاطہ کرنے والا اقترابات ہے۔ اور اس کا احاطہ کسی ایک خاص مقام میں استقرار سے مانع ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا ہر مقام تجلیات برقیہ آنیہ (فوری چمکنے والی تجلی) کا حکم رکھتا ہے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس شخص کا سارے عالم میں مرتبہ صورت عالم میں وحدت صرفہ کے درجات کے مانند ہے۔ اس کے علوم اجمالی تفصیل کے ساتھ بالفعل درخت، پتھر، گھوڑے اور انسان ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے اس کا دل تنگ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اس کے دل کے ایک گوشہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کا دل اس سے لاکھوں گنا زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر یہ شخص اپنے ڈنڈے کو بغل میں دباتا ہے اور اپنے نعرہ کو بلند کرتا ہے تو تمام لوگوں کو غلام بنا لیتا ہے۔ اور تم ان میں سے کسی بھی ایسے شخص کو اس سے قریب

ہوتے نہیں دیکھو گے جو عداوت فی اللہ اور حب فی اللہ رکھتا ہو۔ اگر اس مرتبہ سے جو محبت وعدوات کا مستقر ہے باہر آتے ہیں تو ان کی دشمنی اور محبت ناچیز ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح ہر مقام کا ایک خاص درجہ اور دائرہ ہے۔

ہر سخن وقتے وہر نکتہ مکانی دارد

''ہر بات کا ایک وقت اور ہر نکتہ کا ایک مقام وموقع ہوتا ہے''

چنانچہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہو گے جو وحدت کبریٰ کی طرف خلوت اختیار کر لیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے اور جو کچھ ہے اس کی تفصیل ہے۔ پھر میں وہ نہیں ہوں کہ جو انکار کا ارادہ کروں، اور مجھے قبول سے خوشی ہوتی ہے بلکہ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ تو اگر ساری مخلوق اس امر پر مجتمع ہو جائے کہ مجھ سے محبت کرے تو ان سب میں اس کی استطاعت نہیں ہے۔ تو چاہیے کہ منکر پر نکیر کریں اور محبت کرنے والا مجھ سے محبت کرے۔ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ اور اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تمہارے درمیان اجنبی ہوں، تم مجھے نہیں پہچانتے اور میں وطن سے محبت کرتا ہوں۔ وطن سے محبت کرتا ہوں، صورت کے یہ پردے وحدت کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ورنہ کہاں میں کہاں تم؟

من از کجا غم یاراں ونرد باں ز کجا

''میں کہاں سے ہوں اور دوستوں کے معاملات اور شطرنج کے مہروں کی چوکیاں کہاں سے ہیں۔''

۳۰۷-تفہیم:

سالکوں کی استعداد کا بیان

خدا کی طرف رغبت رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر کی استعداد اتنی نہیں ہوتی کہ حضور مجرد میں اس کے ساتھ تکلیف رکھیں، محبت اور دلبستگی کی خاطر ذکر کے معنی میں اپنا مطمح نظر بنائیں۔ ان کے لیے طریقہ یہ ہے کہ ان کے حق میں صبح وشام کے لیے ذکر کی مقدار مقرر کر دی

جائے۔ مثلاً کہہ دیا جائے کہ رات و دن میں چار ہزار بار کلمہ طیبہ دو تین ماہ تک پڑھیں۔ ان کے لیے یہی مقدار کافی ہے۔ جب ان کا دل اس ذکر سے آرام پانے لگے، تب محبوب اور ہیئت شوقیہ کا ملاحظہ اس کے ساتھ شامل کریں۔ جب یہ بھی مستقر ہو جائے، تو ذکر خفی سکھائیں۔ میں نے دیکھا کہ اکثر سالکوں کا اضطراب اسی میں ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ معنی مجرد و شوق و توحید قسم کی استطاعت رکھتے ہیں لیکن حال کے لحاظ سے ان کی طبیعت سفلیات کی کشاکش میں پڑ جاتی ہے۔ اور اس سبب سے ان کے حال میں عقدہ پڑ جاتا ہے، اور مختلف قسم کے شکوک و ظلمات ان سے سر اٹھاتے ہیں۔ اور بالجملہ جاننا چاہیے کہ لوہاروں کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

۳۰۸- تفہیم:

سالک کے لیے ظاہری وظائف وغیرہ سے کیا واجب ہوتا ہے

سالک کے لیے حضرت حق سبحانہ کے جلال و کبریائی سے تعلق قلب کے باوجود کچھ وظائف ظاہرہ کی پابندی ضروری ہے۔ اس لیے کہ مرد کامل وہ ہے کہ جو طبقہ نفسیہ اور طبقہ نسمیہ ہر ایک سے ایک حصہ حاصل کر کے وجدان کی نظر سے احساس کرے کہ مجذوب خالص کو دار الجزاء میں سالک خالص کی نسبت سے کوئی وقعت و عظمت نہیں ہے۔ ہاں جو کمال اس کے نفس کی ویرانی ہے، وہ چیزے دیگر ہے۔ دار الکسب اور دار الجزا اس کمال کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ نہ قوی نسمیہ سے کسب کیا جاتا ہے اور نہ ہی نسمہ کے افعال پر پاک نفسی تجاوز کرتی ہے۔ اس لیے کہ عارف ایک ایک آدمی کے ساتھ جنگ کے میدان میں ہم رنگ ہوتا ہے اور غنیموں کی تقسیم کے وقت بھی اس کا عرفان ایک الگ ہی شئے ہوتا ہے کہ اس کی جزا نہیں چاہتا۔ بلکہ مطلوب لذاتہ ہوتا ہے۔ تمام وظائف جو ہمارے مختار اختیار کردہ ہیں، تین ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح و شام اور رات کی ایک گھڑی میں استعانت کیا کرو کہ جب تہجد کے لیے اٹھیں، سات یا نو یا گیارہ رکعت پڑھیں۔ پھر سورہ یٰسین یا واقعہ یا یوسف پڑھیں۔ اس کے بعد جو اس کے وقت کے مناسب ہو ادعیہ ماثورہ میں سے کوئی دعا کریں کہ دعا کا وقت سورۃ ملک یا اس کے قریب پڑھنے کے

وقت کے برابر ہو۔ حصن حصین کا، جو وقت کی کسی تخصیص کے بغیر سب سے افضل دعا ہے، مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دل کو تفکر و تعلق میں مشغول کریں۔ جب تک کر سکتے ہوں حتیٰ کہ فجر کا وقت ہو جائے۔ اس کے بعد سو بار کلمۂ طیبہ، سو بار سبحان اللہ و بحمدہ۔ اس کے بعد تعلق قلب سے حق سبحانہ میں مشغول ہوں، یہاں تک کہ آفتاب بلند ہو جائے۔ اس وقت دو رکعت پڑھیں۔ اور آفتاب کے گرم ہونے پر چار رکعتیں پڑھیں۔ تیسرے عشاء کے بعد سو بار لا اله إلا الله ذکر خفی سے بلند اور جہر سے کم آواز میں پڑھیں۔ اس وقت سورۃ ملک یا سبحات (جن سورتوں کے شروع میں لفظ سبحان، سبح یا یسبح وغیرہ آئے ہیں) میں سے کوئی پڑھیں۔ اس کے بعد بستر پر جائیں اور تعوذات پڑھیں۔ اور ہاتھ پر دم کر کے سارے جسم پر پھیریں۔

۳۰۹- تفہیم:

افراد انسانی کے باہمی فرق کا بیان

الحمد لله الذى فتح على قلوب الافراد من عباده علوماً لا يطيقها السموات والارضون واحوالا لا تحيط الاعوام والسنون واسرارا لا تحوم حومها الاوهام والظنون وتدليات منازلات لا يستطيع وصفها الواصفون واستعظمها العارفون واستنكرها الجاهلون لم يزد المحجوبين الابلاء وعناء ولم يزد المحبوبين الإسناء وضياء "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے کچھ بندوں کے دلوں پر ان علوم کے دروازے کھول دیئے جن کی طاقت آسمان اور زمین نہیں رکھتے۔ اور ان احوال کے دروازے کھول دیئے جن کا احاطہ سال و برس نہیں کر پاتے اور ان اسرار کے باب وا کر دیئے جن تک وہم و خیال کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ اور وہ تدلیات قربتیں و درجات عطا فرمائے جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عارفوں نے ان کی عظمتیں بیان کی ہیں جبکہ جاہلوں نے ان کی نکیر کی ہے۔ جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں ان پر صرف آزمائشیں اور مشقتیں زیادہ ہوتی ہیں اور محبوبین پر ضیاء و روشنیاں ہوتی ہیں۔"

ان کی شان جتنی عظیم ہے اور ان کی برہان جتنی قوی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں میں سے بعض افراد کو اس مقام پر ڈھونڈا جس پر وہ زمانہ سے پہلے تھے اور ان کو غیب

کے میدانوں میں اس مقام پر پایا کہ جہاں غیب کے جھاگ تھے جہاں کوئی جگہ اور مقام نہیں تھا۔ اوران کوان کے نفس کے سوا کچھ بھی عطا نہیں فرمایا۔ ان کے لیے نسب ہی کافی ہے کہ جس میں نہ وصل ہے نہ فصل، نہ عدل ہے نہ عدوان اور اس کے ساتھ کوئی معاملہ اس وقت سے ہی نہیں آیا جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا گیا، سوائے اس کے کہ وہ معاملہ انہی کی طرف لوٹتا ہے اور انہی کے گرد گھومتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کا احسان ہے۔ وہ ایسے موتی ہیں کہ ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ان کا کلام بہت دقیق ہے۔ وہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔ وصلی اللہ علی رسولہ سیدنا محمد وآلہ وبارک وسلم، اما بعد. یہ علوم دل کے اوپر ایک ہی بار میں نازل ہوئے اور ان کے مطابق زبانیں کھلیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل، ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم. جان لو کہ افراد انسان اگرچہ انسانیت میں اور جن خواص کا ہم تتبع کر سکتے ہیں، ان میں باہم شریک ہیں لیکن جن باتوں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں باہم شریک ہونے کے باوجود ان کے درمیان بہت سے اختلافات ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف اور متباین ہیں۔

ان میں سے بعض وہ ہیں کہ ان میں صورت نباتیہ کا غلبہ ہوا ہے جس سے ان پر کمالات ناسوتیہ پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ جس سے وہ دوسرے تمام افراد سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ ان میں صورت حیوانیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان پر کمالات حیوانہ حس، حرکت، غضب، شہوت اور بھوک وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ان سے افضل ہوتے ہیں جو ان کے علاوہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن میں صورت انسانیہ کا غلبہ ہوتا ہے جس سے ان میں شجاعت، فیاضی دسخاوت، حکمت اور فصاحت وغیرہ سب مترشح ہوتے ہیں، جن کو ہم نے حجۃ البالغہ میں بیان کیا ہے۔ اور ان میں بعض وہ ہوتے ہیں جن میں صورت شخصیہ کا غلبہ ہوتا ہے، جس پر فنا، بقا، قبض وبسط اور تدلیات عجیبہ مترشح ہوتے ہیں۔ اور ان میں کچھ وہ ہوتے ہیں جن میں صورت عینیہ کے لیے غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے اعیان میں تجلی ہوتی ہے جس سے وحی متحقق ہوتی ہے۔ اور وہاں عظیم امور پیش آتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں صوت مائیہ کا غلبہ ہوتا ہے، ان

سے میری مراد وہ جوہر ہے جو عناصر کی اصل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں صورت عمائیہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس سے میری مراد وہ جوہر ہوتا ہے جو رحموت سے پہلا صادر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اس کو موجود کل بھی کہتے ہیں۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ ہر ایک پر ضرب واحد محمول ہوتی ہے اور موجودات میں سے ہر ایک پر کئی ضربیں ان کے تعدد کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ اس کی طبیعت دونوں امور میں سے کسی سے زائل نہیں ہوتی۔ اور ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں کہ ان میں صورت رحموت کا غلبہ ہوتا ہے اور افراد انسانی میں مبدا سے قرب کے اعتبار سے اس سے اعلیٰ کوئی مقام نہیں ہوتا۔ سوائے خرق عادت اور بلند آواز کے اعتبار کے۔ ان کے علاوہ کتنے ہی لوگ ہیں جو ان امور کے اعتبار سے مکمل ہوتے ہیں۔ اور ان امور کو اور آخر والے تینوں کو ہم اپنی زبان میں اسم فرد اور مائی سے خاص کرتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا کلام حکیم طبیعی کے کلام سے مشابہ ہوتا ہے۔ البتہ طبیعی امر کا اس کے تمام جوانب سے احاطہ کرتا ہے اور یہ اس کے قلب کی جڑ اور اس کی حقیقت کی اصل سے ہے۔ اور ان میں سے عمائی اس پر اس کلام سے زیادہ ہوتا ہے جو حکیم ریاضی کے کلام سے مشابہ ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق ایسا ہی ہے جیسا گزر چکا۔ اور ان میں سے رحمانی اس کلام سے دو فرد زیادہ ہوتا ہے جو حکیم الٰہی کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔

پھر فرد، اشیاء کے حقائق کو صرف انہی حقائق سے جانتا ہے، نہ ان کی صورتوں سے جانتا ہے اور نہ ہی آلات کی مدد سے۔ اس لیے کہ اس کے علوم رحموت یا عما یا ماء سے مترشح ہوتے ہیں۔

اور اگر تم حال میں غور و فکر کرو تو جانو گے کہ اس سے عالم، رحموت یا عماء یا ماء میں سے کوئی جز ہے، اور باقی اجزاء اس علم میں لغو ہیں۔ اس کو کوئی علم مس نہیں کرتا۔ اور نہ ہی وہ سمندر کی فطرت کی طرح ہے۔ اور ہر ایک جو کچھ ہے دہر اور رحموت اور ان کے قریب والوں سے ہے۔ اس پر اشیاء کے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے نفس کے کمالات اور اپنی ذات کے تحولات، اپنی حقیقت کے تلونات ہیں۔ اور کمالات، تحولات اور تلونات کا مغز بعینہ متلون ہے۔ چنانچہ عالم اور معلوم واحد ہیں۔ اس کا علم اس وحدت کے اعتبار سے ہے۔

اب اگر تم کہو کہ جس نے علم حاصل کر لیا تو وہ اس کا حال ہے خواہ وہ فرد ہو یا نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ احکام کی نسبت اس کی طرف جو اس میں غالب ہے، حقیقت ہے۔ اور اس کے علاوہ کی طرف مجاز ہے۔ اور تخیلات شعری کی ایک قسم ہے۔ پھر فردیت کے خواص سے دنیاوی نشاۃ میں لباسوں کا اتارنا ہے۔ پھر وہ ناسوت سے مر جاتے ہیں تو برزخ میں داخل ہوتے ہیں۔ پھر عالم محشر میں لوگوں کو دیکھیں گے کہ ان کا محاسبہ کیا جا رہا ہے اور ان پر مواخذہ کیا جا رہا ہے، پھر جنت میں داخل ہوں گے پھر حظیرۃ القدس میں۔ پھر اللہ کی طرف خاص صورت میں متوجہ ہوں گے، تو اس کے وجہ کریم کا مشاہدہ کریں گے۔ پھر اس موت سے مریں گے جس میں لوگ ان کے شریک ہوں گے۔ اس کی تفصیل صرف وہ ہوتی ہے کہ اس پر ان کا حال مشتمل ہوتا ہے۔ شیخ ابوسعید نے اپنی موت کے وقت اسی کی طرف یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

چیست ازیں خوب تر درهمه آفاق کار
دوست رسد نزد دوست ، یاربنزدیک یار

"سارے آفاق میں اس سے بہتر اور کیا ہے کہ، دوست دوست کے نزدیک پہنچ جائے، یا ریار کے نزدیک۔"

آں همه اندوه بود ویں همه شادی
ایں همه گفتار بودویں همه کردار

"وہ سب رنج وغم تھا یہ سب کچھ خوشی وشادمانی، یہ سب کچھ گفتار تھا اور وہ سب کچھ کردار۔"

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ افراد کی موت کے وقت تجرد اور تنزہ کی طرف شوق ان کی مدد کرتا ہے، تو وہ ان کی موت کا سبب ہو جاتا ہے، اور اکثر ان کی عمریں پچاس سے ساٹھ سال تک ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذکی وذہین اور سخی وفیاض ہوتے ہیں۔ کسی صاحب مذہب پر اس کے مذہب کی نکیر صرف ملت خاصہ کے نظام کے مطابق اور ان کے قلوب کے اعتبار سے کرتے ہیں اور نصوص میں وارد ہونے والے عمومات ان

کا احاطہ نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے درمیان مخصوص ہوتے ہیں۔

اور جان لو کہ جس کے کمال نے روح اعظم سے ترقی کر لی اس کے کمون وحجاب اور بروز وظہور ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ اور روح اعظم سے میری مراد ہر صورت انسانی، حیوانی نباتی یا معدنی کا اجمالی فیض ہے کہ یہ اس اجمالی فیض کی شرح اور تفصیل ہے۔

اور کمون و بروز کی دو قسمیں ہیں: حقیقی اور مجازی۔

مجازی یہ ہے کہ اگر آدمی اس حقیقت عامہ تک پہنچ جاتا ہے جو تمام حقائق پر مشتمل ہوتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ علم کی صورتیں تبدیل ہوگئی ہیں۔ اور اس کے کمالات نے رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ اس میں ہے اور اس سے ہے۔ اور اس مجازی کے بہت سارے شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حقیقت مثال کی شکل اختیار کر لے تو اس کو بعض واقعات میں دیکھا جائے۔ گویا کہ اس نے عالم کو پیدا کیا ہے، پھر اس کو فنا کیا ہے اور اس طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے دل میں یہ محسوس کرے کہ وہ ، وہ ہے جس کی دعا سے طوفان ظاہر ہو گیا۔ اور وہ اس وقت نسل انسانی کی بقا میں منتظم ہے۔ اور وہ ہے جس کی دعا سے فرعون کا غرق ہونا ظاہر ہوا۔ اور اس طرح ایک کے بعد ایک ملت کی اقامت ہوئی۔ اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا نفس حقیقت ہیولانیہ کلیہ کو دیکھے۔ کوئی رہنمائی پانے والا اس کے تقرب کے بغیر راہ نہیں پاتا۔ اور نہ ہی کوئی مدد چاہنے والا اس کی حقیقت سے ہٹ کر مدد چاہتا ہے۔ بلکہ وہ ان واقعات کو پاتا ہے جو زمین کے مشرق ومغرب میں مریدوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور تمام فال اور جفر تمام ہیولانیہ کی حقیقت کی ہانڈی ہیں۔ اور یہ قرب مجازی افراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگ تو فرد بھی نہیں ہوتے۔ ان کمالات کی مثالیں بیہودہ ہوتی ہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ اس کے اوپر یہ کس طرف سے مترشح ہو رہی ہیں۔

اور حقیقی کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اس امر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے کہ احکام ناسوت سے بلند ہو جائے۔ اور وہ ملکوت کے مشابہ ہو جاتا ہے تو لوگ اس کو نہیں دیکھتے، حتیٰ کہ اللہ اس کے ظہور کا فیصلہ فرماتا ہے، خواہ نوع انسانی کی نسل کی

ہلاکت کے بعد ان کے قیام کے لیے یا ملت کے ناپید ہونے کے بعد اس کے قیام کے لیے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ پیش آیا۔ یا حقیقت اجمالیہ الٰہیہ کا ظہور جو آدمی کی حقیقت سے مخلوط ہے۔ وہ کبھی ایک خاص ملت کا منتظم ہوتا ہے۔ اور کبھی آدمی کی حقیقت سے اس کی آل یا متوسلین سے مخلوط ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہور مہدی کی طرف نسبت سے ہے کہ جب نصرانیوں نے ملت اسلامی پر سرکشی کی تو اللہ کی حکمت یہ ہوئی کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے ایک ایسے شخص کو ظاہر کرے جو ان کی سرکشی کا قلع قمع کرنے والا ہو۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ فرد دنیاوی زندگی سے علیحدہ ہو جائے گا، پھر ہر رُخ کی سختی سے جان دے دے گا، پھر جنت میں داخل ہو جائے گا، پھر حظیرۃ القدس کی طرف خالص ہو جائے گا اور کلمہ الٰہیہ باقی رہ جائے گا۔ زمین پر اللہ کے جود وسخا کی بارش ہوگی، پھر کلمہ الٰہیہ اس سے جدا ہو کر صاف حالت میں ملے گا تو اس کی جود وسخا نوع انسانی کی طرف منتقل ہوگی۔ اور یہ کمون و بروز کا سب سے مکمل درجہ ہے۔

اور جان لو کہ دجال اکبر سے نیچے بہت سارے دجال ہیں۔ ان سب کو ایک ہی امر جمع کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے نام کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور خرق عادت امور اور لوگوں میں قبولیت ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور ان کے لیے گردنیں جھکتی ہیں اور وہ ایسے امور کی طرف دعوت دیتے ہیں جو عموم انسانیت کے خلاف ہوتے ہیں جو کہ ملت حنیفہ ہیں۔ اور ان منافع میں عیب جوئی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن پر نظام بشر مبنی ہے۔

ان میں سے کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ زعم رکھتا ہے کہ اس کے دل میں اشراقات، علوم، قتل، ہتک حرمات وحی وعلم ربانی اور ان دونوں کے درمیان پائی جانے والی بہت سی باتوں میں سے شرور انسانیہ کی حقیقت سے مناسبت جبلیہ کی جانب سے کوئی برائی نہیں ہے۔ اور ان میں سے کوئی حلول کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے نفس کو طاغوت بنالیتا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ اور وہ زعم کرتا ہے

کہ وہ امور تدبیری رزق وشفا میں تصرف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے 'ہوجا' اور وہ ہوجاتی ہے۔

اور جو لوگ لذات جسمانی، حب مال، اطاعت، غضب، بخل، معصیت اور اللہ اور اس کے امر کے سلسلہ میں جہل کے ڈھیر وغیرہ میں انہاک کے ساتھ نرم امور میں نافرمانی کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ وہ اللہ کے نام کا ذکر نہیں کرتے، نہ ہی وہ اللہ کی اطاعت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ دجال نہیں فرعون ہیں۔ تو اے طالب! اس امر سے ہوشیار رہو کہ تمہیں دجال اور فرعون اللہ کے راستہ اور ملت حنیفہ سے گمراہ نہ کردیں۔

اور جان لو کہ اعتبار ان کمالات نسمیہ میں سے نہیں ہے جو طبیعت کے مخالف ہونے کے باوجود اسم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اعتبار ان کمالات میں سے ہے جو نفوس پر کسی موقع سے واقع ہوتے ہیں۔ اور ان سے کوئی کمال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ کتنے ہی لوگ ہیں جنہیں حقیقت کے لحاظ سے کمالات نسمیہ میں سے کوئی شئے حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ حیوانی طبیعت کی نرمیوں کی طرف میلان رکھتے ہیں، خواہ ان پر ظاہر امر میں انسانی نرمی اور آدمیوں کے اخلاق غالب آجائیں۔ لیکن یہ کہ اسم سے عاری فرض کیا جاتا ہے جو کہ حیوان غیر ناطق ہوتا ہے۔ اور کتنے لوگ ہیں جو نرمیوں کے حواشی میں گہرائی سے غور وفکر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر جو شعر گوئی میں بہت جید ہو، کاتب جو اپنی کتابت میں جید ہو، حداد لوہار جو اپنے لوہے کے کام میں مستغرق ہو اور نجار بڑھئی جو اپنے لکڑی کے کام میں مستغرق ہوحتی کہ اگر اس کو کھانے پینے، فریضۂ زوجیت کی ادائیگی سے بھی مستغنی سمجھ لیا جائے تو بھی وہ ان کاموں کو نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ اس کا دل ان سے لبریز ہے، اور اس عمل میں درجۂ استحسان حاصل کرنے کے لیے اس کا نفس فنا ہوچکا ہے۔ چنانچہ عرف عام میں کہا جاتا ہے، وہ کتنا ظریف اور کتنا عقلمند ہے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر بھی انسانیت نہیں ہے۔

اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ ان پر صورت جلیلہ الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے جو اپنے کمالات کے ساتھ انسانی صورت میں متفرع ہے، جیسے حیوانیت پر انسانیت کا تفرع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ زیادہ ہوجاتے ہیں اور افراد انسان، انسانیت سے افراط وتفریط میں تجاوز کرجاتے

ہیں تو گھریلو فتنے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں صاحب خانہ موت کی تمنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اگر اس کا نظام تنزلی دو قدم کی برابر بھی جدا ہو جائے تو وہ مر جائے۔ یا زبان درازی یا بیٹے کا گم ہو جانا یا اس جیسے دیگر حالات شہر کے فتنے، راہزنوں، چوراہوں، شہر پر زور و زبردستی سے غلبہ حاصل کرنے والوں اور غاصبوں کے ظہور سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے جھگڑے بڑھتے ہیں اور ہر آدمی اپنے نفس کو بڑھاتا ہے کہ کوئی اس کے اعزاء واقرباء میں سے اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور کسب وکمائی کے فتنے کہ اہل مجد وشرف سے رذیل کمائیوں پیشوں کے امتناع پر رسم منعقد ہو جاتی ہے اور شریف پیشوں کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سلطان سے ملاقات پر موقوف ہوتے ہیں۔ اور اس ملاقات سے نیچے مسابقات مقابلہ آرائی، چھین جھپٹ اور حیلہ بازیاں ہیں۔ چنانچہ مقاصد کے حصول سے پہلے ان حیلوں اور اقلیمی فتنوں میں فنا ہو جاتے ہیں۔ رعایا کے لوگ تلخ کلامی کرنے والوں میں جو اس کے اردگرد نہیں گھومتا اور میٹھا کھانے والوں میں بدل جاتے ہیں جو ایک لحہ کے لیے بھی نہیں چھوڑتے۔ اور بادشاہ ایسے ظالم ساتھیوں کے درمیان ہوتے ہیں جو درندے ہوتے ہیں۔ یا بکواس کرنے والوں میں بدل جاتے ہیں جن کے اوپر بکری پیشاب کرتی ہے۔ اس وقت ہر شہر کو غرق، لوٹ، زمین کے دھنسنے، زلزلوں اور رنج وغم کے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے اور چوتھائی زمین باطل ہو جاتی ہے۔ زمین سخت ہو جاتی ہے، جس میں صرف ملعون لوگ ہی پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہر چھوٹے ویران گاؤں میں اور گاؤں کھنڈروں اور جنگلوں میں بدل جاتے ہیں۔ گویا کہ میں ان کے قیام میں ٹٹو پر سوار ہوں جو ان پر روتا ہے، اور ان کے لیے جلتا ہے، اور اس کے دل میں شعلے بھڑکتے ہیں، ان پر قبیلہ قبیلہ اور گاؤں گاؤں پھرتا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس سے ڈراتا ہے۔ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور ان کو پکارتا ہے کہ رشد وہدایت کی طرف آجاؤ۔ تو وہ اس کی طرف نہیں بڑھتے۔ اس وقت اجتماعی حادث حل ہوتا ہے۔ اور بڑی پکڑ آتی ہے اور گویا کہ میں ایسا آدمی ہوں کہ خاموش رہتا ہوں جس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس کا درخت بلند ہو گیا اس کے ڈنڈے کو بغل میں دبا لیا گیا۔ کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اس کے قریب

ہوتا ہے۔ اور وہ صرف مسخرہ پن اور بکواس کرنے والوں کے فنا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اور لوگ راہ راست پر چلنے والوں اور رہنمائی کرنے والوں کے محتاج ہیں۔ خواہ کسی ایک اقلیم ہی میں کیوں نہ ہوں۔ اور تفصیل کو اللہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور وہ کہاں ہوگا۔

اور گویا کہ میں اس زمانہ میں ہوں جس میں علم کے سوتے خشک ہوگئے اور جہالت کے ہنر بلند ہوگئے۔ تو جس زمانہ میں ہم اس حالت سے دو چار تھے اور اسلام کے مرکز میں کفار کی جانب سے زبردست مصیبت واقع ہوئی، ان کی ملت بہت قوی ہوگئی۔ اس ظلمت کو دور کرنے کے لیے صرف چند اہل علم ورشد کھڑے ہوئے۔ ان کا امام ایک رجل صالح ہوا۔ وہ ان کا دفاع کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ کا کلمہ بلند ہوگیا۔

اور گویا کہ میں ان شاہراہوں میں سے کسی ایک پر تھا جب انہوں نے ایک حیلہ سے کام لیا۔ پھر ان پر ایک زوردار حملہ کیا تو کفر کا سر کچل دیا۔ اور اس کی قوت وغلبہ کو کمزور کر دیا۔ پھر ان کے اوپر فتح وغلبہ حاصل کر لیا۔ تو ان علوم نے بروز وکمون کے ایک شعبہ سے استخراج کیا۔

اور گویا کہ میں آم کے پیڑوں کے درمیان ایک درخت پر ہوں جس کا نظام مکمل ہو چکا ہے تو درخت کی صورت جدا ہوگئی جو اللہ کی طرف راغب ہوگئی۔ پھر خشکی کے جانوروں میں سے کسی حیوان کی صورت کے فیضان کے لیے تیار ہوگئی۔ جیسے نیل گائے یا بہیمت میں اس سے کم، جسم میں اس سے کمزور اور عقل میں زیادہ تیز۔ تو وہ سن کہولت، ادھیڑ عمر کو پہنچا پھر حیوانی بنیادیں جدا ہوگئیں جو اللہ کی طرف راغب ہوئیں۔ پھر صورت انسانی کے فیضان کے لیے تیار ہوئیں۔ اس وقت اللہ نے انسان کو ایجاد کیا جس کے اخلاق انسانی نامکمل تھے اور آثار انسانی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اس کے معنی بہت جلیل القدر اور سریع السیر تھے۔ پھر جب پچاس سال یا اس کے آس پاس کی عمر کو پہنچ گیا تو تجرد کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور اس کا جسم بھاری ہوگیا۔ پھر اس بھاری پن کی وجہ سے مر گیا۔

اور یہ تبدیلیاں تناسخ کے طور پر نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے وجود کے فیضان کے لیے تیاری کے طور پر ہیں۔ اور فیض ہر بار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبتدا ہے۔ اور وہ فیض مثال کے طور پر نفس انسانی ہے۔ چنانچہ اس کے اور تناسخ کے درمیان کتنا بعد ہے۔ اس کا باطل ہونا

عقلی اور نقلی شواہد سے معلوم ہے۔ اور شاید یہی راز ہے جس کی طرف بہت سی قومیں مائل ہو گئیں۔ اور تناسخ کے چکر میں پڑ گئیں۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوئیں اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ اور جان لو کہ اولیاء اللہ کے لیے معاش اور اللہ تعالیٰ سے ان کے قلوب کے تعلق کے سلسلہ میں بہت سے راستے ہیں۔ پھر ان میں سے کچھ کسب کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ اور ہم کسب کرتے ہیں لیکن طلب میں اجمال واختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور کسب صرف وہ ہے جو کسی نہ کسی جہت سے عبادت ہے۔ جیسے غزوہ اور تدریس۔ اب اگر اللہ نے ہمارے اوپر اپنے بندوں کے ہاتھ کشادہ کر دیئے تو ہم کسب سے مستغنی ہو گئے۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو طاعات کی نوافل کی کثرت کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو فرائض اور وظائف پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اپنے زیادہ تر اوقات اللہ کے ساتھ دل کے تعلق میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ہم صرف وہی نقل کرتے ہیں جو مشہور و معتبر کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث وارد ہوئی ہے۔ اور اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کی زیادہ تر کوششیں طاعات کے انوار، حسن اخلاق اور آداب اپنے قلب کی تہذیب پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں کہ ان کی کوششیں توحید کے ذریعہ اپنے باطن کی اور شہود حق کے ذریعہ اپنے مظاہر کی تہذیب سے متعلق رہتی ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ ان کی زیادہ تر کوششیں اجمال اور تعلق بسیط میں اضمحلال سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور ہم طاعات کے انوار اور حسن واقعات سے ایک حصہ نہیں چھوڑتے۔ اور یہ وہ حصہ ہے جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے۔

اور زائد کا ہمارے نزدیک ترک کرنا اور اجمال و تفصیل سب برابر ہے۔ یہ ایک الگ طریقہ ہے۔ اور ہم رخصت کی بجائے عزیمت کے طور پر، جس کا شریعت حکم دیتی ہے اس سے زیادہ شبہات پیدا کرنے میں مشغول نہیں ہوتے۔ چنانچہ جس کو شریعت نے مباح قرار دیا ہے وہ حلال اور مباح ہے۔ اس سے آگے صرف وسوسے ہیں اور ہم فروع میں سے صرف ان امور کو لیتے ہیں جن پر علماء خاص طور سے ان دونوں بڑے فرقوں حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہے۔ خاص طور سے طہارت اور نماز کے سلسلہ میں۔ اب اگر اتفاق نہیں پایا جاتا اور ان کا آپس میں

اختلاف ہوتا ہے تو ہم اسے لیتے ہیں جس کی ظاہر حدیث اور اس کا عرف گواہی دیتی ہے۔

اور ہم علماء میں سے کسی کو رد نہیں کرتے کہ وہ سب حق کے طالب ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی معصومیت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اور خیر وشر کی معرفت کے سلسلہ میں پیمانہ کتاب ہے۔ اس کی واضح تاویل کے مطابق اور معروف سنت ہے۔ نہ علماء کا اجتہاد ہے اور نہ ہی صوفیا کے اقوال ہیں۔ جو اللہ کی کتاب میں تدبر نہیں کرتا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور جو علماء یعنی ان صوفیاء سے جن کو کتاب وسنت سے ایک حصہ حاصل ہے اور ان راسخین فی العلم سے جن کو صوفیت سے ایک حصہ حاصل ہے اور ان محدثین سے جن کو حدیث سے ایک حصہ حاصل ہے یا ان فقہاء سے جنہیں فقہ سے ایک حصہ حاصل ہے، ترک تعلق کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اور جاہل صوفیا اور منکرین تصوف راہزن اور دین کے چور ہیں۔ تم خود کو ان سے بچاؤ۔ **جعلنا اللّٰہ سبحانہ ممن یطیعہ ویتبع رضوانہ ولا یشرک بہ شیئا** "اللہ سبحانہ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں، اور اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے" کہ ہم اس کے ہیں اور اس کے لیے ہیں۔ والسلام

۳۱۰-تفہیم:

گنہگار مومنوں کے احوال

نصوص حکم کرتے ہیں کہ بعض گنہگاروں کو حق سبحانہ معاف فرما دیں گے۔ البتہ جن لوگوں کا معاملہ مشکل ہے حق سبحانہ نے عام لوگوں کے سلسلہ میں اپنے رسول پر نازل فرما دیا۔ اور عارف اور اطاعت گزار دونوں کو اس میں مخاطب فرمایا۔ اس راستہ میں رمز کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جیسا کہ فرمایا: **یعذب من یشاء ویغفر لمن یشاء** "جس کو چاہے عذاب دے اور جس کو چاہے بخش دے۔" عذاب اور مغفرت کا دارومدار مشیت پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن خواص کے لیے اس مسئلہ کی تعلیم کے بعد ایک راز واضح کر دیا جس سے

وہ جانتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے تمام کاروبار لامحالہ مشیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ اسباب کی سببیت ظاہر نہیں فرمائی کہ اگر دنیا میں وہ نہ ہو تو تکلیف ومواخذہ باطل قرار پائے، اور آخرت میں اعمال کے سلسلہ میں حکم لگایا کہ وہ جہنم میں داخلہ کے اسباب ہیں۔ چنانچہ اگر خاص ان کی معافی کا قاعدہ مقرر کر دیں اور ضابطہ بیان کر دیں تو یہ نصوص کے خلاف نہیں ہوگا بلکہ ان کا باطن اور ان کے دماغ کا کشف ہوگا۔ جب یہ تمہید بیان کر دی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ بندہ جو اعمال کرتا ہے، وہ سب اس کے جوارح ونسمہ کی مداخلت سے صادر ہوتے ہیں۔ اور صورت انسانی مجرد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ ایک مثال کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس میں بالذات مداخلت نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ انسانی صورت لباس مثالی میں بدن اور نسمہ میت سے مجرد یا لپٹا ہوا نہ ہو تو اس سے ملا ہوا اور اختلاط میل جول رکھتا ہوگا۔ ایسا میل جول کہ اس کے مطلق تجزیہ کی حالت یاد نہیں ہوگی، اور وہ سب بدنی مطابقت ونرمی اور لذت میں گیا ہوا ہے خواہ دنیا میں، خواہ آخرت میں۔ مثلاً اس کے سامنے حور سے مجامعت اور شراب طہور کا پینا رکھا جائے گا، اور جو اس سے وابستہ رہے گا اس شخص کو اس اچھے عمل کا نفع حاصل ہوگا کہ خواہ زبان سے کہے یا ہاتھ سے کرے۔ اور اس کی پیدائش بھی اعمال سے وابستہ ہے۔ اس کا غضب محض گالی دینا اور مارنا ہے۔ اور اس کی سخاوت محض عطیہ ہے کہ فقیر کے ہاتھ میں رکھ دے۔ اور جب اس حالت سے کچھ بلند ہوتا ہے تو اس کی ہمت نرمی ولذت نسمیہ میں چلی جاتی ہے، خواہ دنیا میں ہو خواہ آخرت میں۔ اس کی لذت نفس کے انبساط سے ہے۔ اگرچہ اس کے شاہد کے حضور کے بغیر ہاتھ آتی ہے۔ اور اس کا غضب محض نفس کا جوش ہے۔ اگرچہ گالی دینے، مارنے اور پھولنے سے رگیں خالی ہوتی ہیں اور اس کی سخاوت نفس کے خرچ کے لیے جوش ہے۔ اگرچہ فقیر قبول نہ کرے۔ اس قوم کو اس موت میں کہ اس کی قوت ادراکیہ میں اس کا خیال کہیں یا وہم نام رکھیں، یہ اعمال واخلاط کہ جو اس کی ہمت کا احاطہ کرنے والے ہیں، ہولناک شکلوں میں پیش کرتے ہیں۔ اور برے اعمال کرنے والوں کو عذاب سے دوچار کرتے ہیں۔ اور اچھی صورتوں میں انہیں انعام سے نوازتے ہیں۔ اور جب عالم برزخ سے گزر کر حشر کے میدان میں جائیں گے تو یہ تمام اعمال

واخلاص مثالی شکل اختیار کر کے سامنے لائے جائیں گے۔ خواہ اس کے حق میں بہتر ہو یا برا ہو۔ ہاں جو قبر کی پیدائش کو اس کے اوپر اور نیچے سے احاطہ کرتا ہے، اور اس طرح حشر کی پیدائش کو اختیار کرتا ہے، اس کو نہ عذاب سے دوچار کیا جاسکتا ہے، نہ انعام سے نوازا جاسکتا ہے کہ اگر عمومی حکم سے وہ مردہ ہیں، تھوڑا سا رنگ پیدا ہوتا ہے، اور پھر دور ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے اور وہ ان لوگوں میں سے ہیں الذین سبقت لھم منا الحسنی اولئک عنھا مبعدون "جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہوگا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔" (الأنبیاء:۱۰۱)

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جسم اور نسمہ سے مردہ ہیں، ان کی موت عملی نہیں بلکہ فقط ایک حالت کی ہے۔ اور وہ ان سب سے گزر چکے ہوں گے۔ اور وحدت کبریٰ کے ساتھ آ کر پھر دیکھتے ہیں، اور ہر نشاۃ کے حکم کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ اکثر لوگ معصوم ہیں۔ خاص طور سے کبیرہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔ اور اگر کچھ گناہ صادر بھی ہو جاتے ہیں تو وہ فوراً ہی استغفار وندامت سے کام لیتے ہیں۔ لامحالہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جماعت کا قصہ ان عام الفاظ میں بیان کر دیا ہے: التائب من الذنب کمن لا ذنب له "گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔" اور ان الفاظ میں بھی بیان کیا: خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیئا "انہوں نے اچھے اور برے دونوں طرح کے ملے جلے عمل کیے۔" یقیناً اللہ اہل بدر کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس لیے فرما دیا: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم "تم جو چاہے عمل کرو میں نے تمہیں بخش دیا۔"

اور جس جماعت کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں السابقون، اصحاب یمین اور اصحاب شمال ہیں۔ ان کی غایت ہمت افعال نسمیہ ہوتے ہیں، ان کا مواخذہ اخلاق ہے۔ اس لیے چاہیے کہ مفردیت سے وابستہ لوگ مغرور نہ ہوں۔ صدیاں گزر گئیں اور زمانے گزر جائیں گے کہ کوئی فرو آئے، کون جانتا ہے کہ وہ کیا ہے، وہ کون ہے جن احوال وتجلیات پر لوگ ناز کرتے ہیں، وہ ان سے بندھے ہوئے بے وقوف ہیں۔ کتنی بیہودہ باتیں مجھ سے صادر ہوئیں، ان سے میرے لیے قیامت قائم کر دی گئی، ان سے ایک اشارہ کیا گیا اور سختی سے

حساب لیا گیا، حتیٰ کہ میں نے سمجھ لیا کہ میں ہلاک ہونے والا ہوں، پھر مجھے بخش دیا گیا کہ میں اپنے نفس کی طرف لوٹ گیا۔ اور میں نے اس تجلی کا مبدا پا لیا۔ اس کے حکم نے میرا احاطہ کر لیا۔ تب میں غفور اور رحیم جیسے اسماء کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ان میں فنا ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ کے علم اور انشراح و انبساط آئے۔ من جملہ ان کے یہ ہے کہ ایک شخص میرے سامنے آیا۔ اور میں اور اہل مجلس ایک مٹھائی کھا رہے تھے۔ تقسیم کرنے والے نے اس کو بھی دی۔ اسی دوران اس شخص کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر یہ شخص اس چیز کو جو اس کے ہاتھ میں ہے، مجھے دے دے تو مجھے یقین ہو جائے کہ وہ اولیاء اللہ میں سے ہے۔ اور اس سے راہ خدا میں استفادہ کروں۔ میں نے دیکھا کہ حضرت ہادی نے اس پر عنایت کی اور اس کے دل میں پیدا ہونے والی بات کو صورت اور معنی کے لحاظ سے میں نے آشکارا دیکھ لیا اور اس پر توجہ و عنایت بھی کی۔ اس سب کے باوجود میں نے اشارہ کیا۔ خود بھی آگے بڑھا اور اس کو ایک لقمہ مٹھائی یا حلوہ کا کھلا دیا۔ حضرت ہادی نے مجھ سے مواخذہ کیا اور جھگڑا دکھایا۔ اور اس اشارے کو جو میں نے اسے کیا، میری دوری کا سبب قرار دیا تو میں نے حقیقت میں پوری طرح التجا کی جو اس کے نزدیک گمراہی و ہدایت میں برابر تھی۔ اور استغفار کیا تو مجھے بخش دیا۔ اور منجملہ ان کے یہ ہے کہ ایک شخص میری ملاقات کے لیے آیا، اس وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ ماحضر اس کو پیش کر دیا جائے اور اس کے رات گزارنے کا انتظام کر دیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس معاملہ کو ضروریات میں شمار کرتا ہے۔ اگر ان امور کو نہ کیا جائے تو اس کا دل ٹوٹ جائے اور وہ مجھ سے قطع تعلق کر لے۔ اور یہ کنارہ کشی اس کے لیے مضر ہوتی۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور ناز کرتا ہوا چلا گیا۔ نہ ماحضر طلب کیا، نہ اس کی خاطر مدارات کی، جب وہ میرے گھر سے اٹھ کر گیا تو میرا احتساب کیا گیا اور مجھ پر عتاب کیا گیا۔ اور مجھ سے کہا گیا۔ اے بے وقوف! یہ ناز نہیں حماقت اور بے وقوفی ہے۔ اس قسم کے اور خطابات دیئے گئے، میں کچھ دیر ٹھہرا رہا، پھر مجھے بخش دیا گیا۔ اس طرح چند واقعات پیش آئے اکثر ایسا ہدایت الی اللہ کے لیے جاذب قلوب کے امر میں ہوا۔

۳۱۱- **تفہیم:**

وحدۃ الوجود اور فلاسفہ، اشراقیین، مشائین اور صوفیا کے مذاہب کی تنقیح

وحدت وجود کے قائل صوفیا اور فلاسفہ اشراقیین دونوں وحدت وجود اور ان کے ممکنات مظاہر اور ان کے تلونات وتقیدات کے ہونے پر متفق ہیں۔البتہ اشراقیین ان کو جزوی قرار دیتے ہیں اور صوفیا ان کو کلیت وجزئیت سے پاک مانتے ہیں۔درحقیقت یہ فقط نزاع لفظی ہے کہ جو جزئی کہتے ہیں، ان کی غرض اثبات تشخص ہے جو کہ عین ذات ہے۔اور ہر اس تقید اور جہت سے غیر مزاحم ہے جس کا وجود، اقصیٰ کا تقاضہ کرتا ہے۔اور جس نے جزئیت سے منزہ قرار دیا ہے۔اس کی غرض وہ جزئیت ہے جو ذات پر تشخص زائد ہوتی ہے۔اور تقیدات وجہات سے مزاحمت کرتی ہے۔ورنہ جو تشخص عین ذات ہے، کوئی بھی صاحب عقل اس کی نفی کو کس طرح جائز قرار دے سکتا ہے۔البتہ یہاں ایک بات باقی رہ گئی اور وہ یہ کہ اشراقیین تعلیات ذات کا نام عقول رکھتے ہیں۔اور تنزلات ذات کو اس لفظ کے ضمن میں تعبیر کرتے ہیں۔اور صوفیاء اسماء وتجلیات کے ضمن میں اگر کوئی جماعت بیان کرتا ہے اور نکتہ دریافت کرتا ہے کہ دوسری جماعت کے ہاتھ میں نہ آئے تو اس کو تدافع نہیں کہا جا سکتا۔مشائین کا ظاہر کلام تغایر کے ساتھ ہے لیکن نظر کی تنقیح وتدقیق کے بعد ان کی غرض بھی وہی مدعا ہے، اس لیے کہ وجود امر انتزاعی ہے۔لامحالہ اس کی خارج میں ایک مطابقت ہے۔اور اس کے انتزاع کا منشا وجود حقیقی کے مطابق ہے۔اور وہ منشا حق کے وجود کے ساتھ اس کی استناد کا انتزاع ہے۔اب میں استناد کو بیان کرتا ہوں کہ وجود حقیقی کے ساتھ اس کی کیا نسبت ہے۔اگر اس وجود کے قلب کی جڑ اور کنہ کی اصل میں استناد داخل نہیں ہوگا تو ممکن نہیں ہوگا اور فی نفسہ باطل ہوگا۔پس تحقیق نتیجہ خیز یہ ہے کہ سب کے وجود کا معلول یہی استناد ہے۔اور کوئی اس وہم میں نہ پڑے کہ ہم اس جگہ اس استناد کو چاہتے ہیں جو معنی اضافی ہے، دو چیزوں کے درمیان۔ نہیں، بلکہ اس استناد کو چاہتے ہیں جو ایک جہت کے تمام ثبوت چاہتا ہے۔اور اس کے اصل معنی جہات واجب وتقیدی سے اس جہت کا ہونا حضرت وجود کے اطلاق سے ہونا اور اس کے

شانوں میں سے ایک شان کا ہونا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس موقع پر اللہ کے لیے ولایت (ولی ہونا) ذمہ دار ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد ان جہتوں کی تفصیل اور بعض کے بعض پر تقدم میں پڑتے ہیں۔ اس کو ایک رخ سے بیان کرتے ہیں اور بقیہ کو مہمل قرار دیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ اثر ماہیت کو وجود سے متصف کرتا ہے اور وجود ممکن میں ماہیت سے زائد ہے۔ اور اس کی مثال سورج کی روشنی سے دیتے ہیں، یہ سب بھی وہی ہے کہ یہ سخن در پردہ معقولات ثانیہ کی بات کرتے ہیں۔ ان پر غالب معقولات ثانیہ اور صورت ذہنیہ کا غور وفکر ہے۔ اور ایسی صورت سے انتساب اور حقائق نفس الامری کی ایسی عبادت سے تعبیر کہ ان کی اصل یہ صورتیں ہیں۔ اس لیے ہم نے تنقیح کی قید اور نظر کی تدقیق بحث کے شروع میں کی ہے۔

۳۱۲- تفهیم:

ہمیشہ حقائق امور پر نظر رکھنا ضروری ہے

جس طرح آدمی لڑکپن میں بعض امور کو مستحسن اور بعض امور کو مکروہ وعیب دار سمجھتا ہے اور جب زیادہ معمر ہو جاتا ہے تو وہ مستحسن اور مکروہ سمجھنا الٹا ہو جاتا ہے۔ اور یہ لڑکپن کا نشہ ہوتا ہے جو اشیاء کی حقیقت کے ادراک میں مانع ہوتا ہے۔ اس طرح نمو کے زمانہ میں کمال کے لحاظ سے بھی بعض اشیاء کو استحسان کی نظر سے اور بعض کو ناپسندیدگی وکراہت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جب معمر تر ہو جاتا ہے تو حقیقت واضح ہوتی ہے۔

وسوف ترىٰ إذا انكشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

''اور تم دیکھ لو گے جب غبار چھٹ جائے گا، کہ تمہارے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔''

مرد وہ ہے جو نشہ میں استغراق کے باوجود نظر اونچی اور دور تک رکھتا ہے اور حقیقت امر کی خبر رکھتا ہے۔

۳۱۳- تفهیم:

مسئلہ ترتیب الاسماء اور مسئلہ تنزلات کے درمیان مطابقت

مسئلہ ترتیب اسماء جس کا ذکر خیر کثیر میں ہوا اور مسئلہ تنزلات جو دیگر مسائل میں

واقع ہے، ان کے درمیان توفیق و مطابقت کے بیان میں ایک حکم یہ ہے کہ حقائق الٰہیہ کا صور امکانیہ میں نفوذ چاہے تشبیہ کے پہلو سے ہی کیوں نہ ہو، ادنیٰ مشابہت سے کھلتا ہے۔ پس رحموت کو جو کچھ اہل میراث سے پہنچتا ہے، افاضہ کے وقت میں ان کے احکام کی تفصیل کو مہمل قرار نہیں دیا جاتا، خواہ وحدت کے گرداب ہی میں کیوں نہ پڑا ہو۔ حجۃ اللہ البالغہ میں تجلیات معنویہ سے برآمد مبادی اولیہ دایجاد کے اصول کی بحث واقع ہوئی ہے۔

۳۱۴- **تفہیم:**

قیام لیل اور ذکر میں اشتغال

قیام لیل اور اپنے باطن کی مسابقت میں رات بھر اور دن کے زیادہ حصوں میں مشغول ہونے کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر کسی وقت خیالات زیادہ ہجوم کریں تو یہ ذکر کرنا چاہیے "سبحان اللّٰہ وبحمدہ، سبحان اللّٰہ" کی ضرب دل پر اس طرح لگائیں کہ 'سب' کی چوٹ دل پر پڑے اور 'حان اللّٰہ' دل میں رکھیں اور 'بحمدہ' کو حق سبحانہ کے نور پر جو کہ عرش کے اوپر ساکن ہے ضرب لگائیں۔ سبحان اللہ صفات محدث سے تنزیہہ ہے اور 'بحمدہٖ' ان حمدوں کا اثبات ہے جو فطرت وجوب کے مناسب ہیں۔ اس ذکر کے درمیان فاصلہ نہ کریں۔ متواتر کریں۔ حتیٰ کہ اپنے اندر انشراح دیکھیں۔ اور اگر اس ذکر کے بعد نور اعظم کا اس طرح خیال کریں جو عرش کے اوپر ساکن ہے کہ اس میں غیب ہونے کا تخیل واقع ہو جائے تو یہ یاس کی نفی، غم واندوہ کو دور کرنے اور انشراح خاطر میں بہت زیادہ مفید ہے۔ اس نور کی حقیقت بہت عجیب ہے۔ بالجملہ حقیقی الٰہیت عالم مثال سے دور نہیں ہے کہ شیخ اکبر نے عرش سے اس کی تکوین مراد لی تھی۔ اس لیے کہ تکوین اس کو مخاطب کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳۱۵- **تفہیم:**

یادداشت کی نسبت اور اس میں فنا ہونا

کشف وکرامات اور علوم مکاشفات سب آنے جانے والے ہیں۔ صبح آتے ہیں اور شام کو چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کھیتی سے سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں اور قبر میں اور اس کے بعد

جوان کا اپنا ہوتا ہے وہ بھی یادداشت ہے اور بس۔ لیکن وہ یادداشت نہیں کہ جو علم حصولی کا شعبہ ہے اور اس کا استحضار ایمان بالغیب ہے کہ جس کا کسب ابتدائے مسلمانی میں کیا گیا ہو بلکہ وہ یاد داشت کہ جو ہر نفس کے انکسار اور توحید میں اضمحلال کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ وہ حضوری ہے نہ حصولی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں میں اس یادداشت میں خود کو گم کر دینا چاہیے۔

بهر صفت که میسر شود بکن جهدی
که خویش راهسر کوی آن نگار کشی

"جو صفت بھی میسر آ جائے اس میں جدوجہد کرو، کہ خود کو اس محبوب کی گلی میں سر کے بل کھینچو۔"

وہ یادداشت درحقیقت بیداری ہے اور تمہاری خبر وہی نقطۂ وجود ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے ہوا۔ جس نے بھی اس نقطہ کے بغیر خدا کو پہچانا اس نے لامحالہ اندھیرے میں تیر چلایا۔

وانی وان خاطبت الف مخاطب
فانت الذی اعنی وانت المخاطب

"میں نے اگرچہ ہزار مخاطبوں کو خطاب کیا، میری مراد تو تم ہی ہو اور تم ہی مخاطب ہو۔"

۳۱۲۔ **تفہیم:**

صبر اور شکر کی حقیقت

شجاع و بہادر کو میدان جنگ میں پہچانا جا سکتا ہے، اور مومن کو کہ جس کی صفت صبار بہت زیادہ صبر کرنے والا اور شکار بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا ہے، مصیبتوں کے ہجوم کے وقت، اس کے علاوہ کہیں نہیں۔ ہر بے سروپا خیال، ایمان وانقیاد فرماں برداری اپنے سر میں پیدا کرتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے إنما الصبر فی الصدمة الاولیٰ 'صبر صرف صدمہ کی پہلی حالت میں ہوتا ہے۔" اور صبر سے مراد صرف جزع وفزع ترک کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس طرح خوش ہونا ہے کہ اگر اس کے حق میں یہ مصیبت نہ آتی اور یہ غم اس کے دل کو نہ پہنچتا تو یقینی بات ہے کہ اس کی جو جزا اب ملنے والی ہے وہ نہ ملتی۔ اگر اس کا دل پژمردہ ہوتا ہے،

جزع وفزع کرتا ہے تو وہ صبر نہیں بلکہ گویا خشک زمین میں سرسبزی پیدا کرنے والا پانی پہنچ گیا ہے اور میٹھے پانی سے پیاسوں کو ہر تازہ تکلیف کو غنیمت جان کر اس سے دقیق ماخذوں کے کچھ پردے اٹھانے میں استعانت طلب کی جاسکتی ہے۔ اے طالب! جب جزع وفزع سے تمہیں کوئی امر پیش آگیا اور تمہارا بدن اور دل اس کے لیے مضطرب ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ ایثار حق، مخلوق سے حق کی طرف بلکہ حق میں فرار میں استعانت کرو۔ اور مخلوق کو ایسی طلاق دے دو جس میں بعد میں رجعت کی گنجائش نہ ہو۔ کہ وہ جدائیوں اور مصیبتوں کو پیش کرنے والا ہے۔ کتنے ہی دوست، دوستوں میں جدائی ڈالنے والے ہیں۔

رفت آنکہ بقبلہ بتاں رو آرم

حرف غم شاں بلوح دل بنگارم

"وہ چلا گیا جو قبلہ میں تھا بلکہ میرے سامنے بت رہ گئے، میں نے ان کے غم کا حرف دل کی لوح پر نقش کرلیا۔"

اللہ سبحانہ نے یہ نکتہ ہمیں یہ کہہ کر سکھایا ما اصاب من مصیبة إلا باذن اللّٰہ ومن یؤمن باللّٰہ یھد قلبہ واللّٰہ بکل شئی علیم "کوئی بھی مصیبت ہو وہ صرف اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔" (التغابن:۱۱) یعنی جو اس مصیبت کے وقت میں اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے دل پر سے بڑے بڑے پردے اٹھا دیتا ہے کہ اگر یہ مصیبت نہ ہوتی تو وہ پردے نہیں اٹھتے۔ اور مصیبت کے وقت ایمان یہ ہے کہ ہر ایک پر حق کو ترجیح دو۔ کسی کی طرف نسبت کے بغیر ایثار مکمل ہوجاتا ہے۔ پھر ایثار صمیم قلب سے اللہ عزوجل کی صنعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بنایا ہے، ان کے ظواہر کو مصائب کا قلع قمع کرتے ہوئے دور کردے گا کہ اللہ کی طرف ان کی پوری طرح رغبت ہوجائے۔

گر نیاید بخوشی سوئے کشاکش آرید

"اگر بخوشی نہیں آتا تو کشمکش کی طرف لے آؤ"

"اور کتنی ہی مراد راحت کی راہ سے دعوت دیتی ہیں تو وہ راحت میں راحت ہوتی

ہے اور وہ پوری طرح راحت ہوتی ہے۔"

اس کو یہ گمان نہ کرو کہ اس کو مصیبتیں نہیں پہنچیں گی بلکہ پہنچیں گی اور وہ مصیبتیں عین راحت ہوں گی۔ اس طرح کہ اس سے اس کی تربیت منقطع ہو جائے گی جس کے لیے ظاہر قول میں کہا گیا ہے کہ وہ مربی ہے۔ گویا کہ وہ اسی سے خوش ہے یا اپنے زمانہ میں شقی ہے۔ مرادوں کے لیے ان کی استعداد کی زبان حق سے کہتا ہے۔

دعوت الی الزیارۃ اهل وذی
ولم اطلب لها احداً سواهم

"میں نے ملاقات کے لیے اپنی محبت والوں کو بلایا، اور اس کے لیے میں نے ان کے سوا کسی کو طلب نہیں کیا۔"

فجاونی الی بیتی کراما
فاهلا للکرام ومن دعاهم

"تو وہ میرے پاس میرے گھر عزت وشرافت کے ساتھ آئے، مبارک ہے عزت وشرافت کے ساتھ آنے والوں کو بھی اور جس کو اس نے بلایا انہیں بھی۔"

۳۱۷-تفہیم:

توحید میں استغراق

حضرت امیر سید کلال ایک مثال بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب تک گیلی مٹی سے بنا ہوا کوزہ خشک نہیں ہو جاتا، وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کو تصرف میں لایا جائے۔ اور کچھ لوگ تو اس کوزہ کو توڑ ہی ڈالتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پھر سے مٹی کو گوندے اور اس میں دوسری مٹی ملائے کہ شاید اس بار خالص اور صاف ستھرا بن جائے۔ بالجملہ اگر کوئی شخص ایک بار توحید میں مستغرق ہو۔ اگرچہ فناء ناقص ہو، اس کو ایک قسم کا قرب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو دوبارہ تصرف میں، جو فنا سے عبارت ہے نہیں لایا جاسکتا۔ الا یہ کہ مال اور اولاد کے قوی ظاہری و باطنی مصائب سے ٹکرا کر طبیعت سے رجوع کے بعد ہو سکتا ہے۔ بالجملہ عود

کی انگیٹھی رجوع کا باعث ہوتی ہے۔

سا طلب بعد الدار عنکم لتقربوا
وتسکب عینای الدموع لتجمداً

''میں تم سے گھر کی دوری طلب کروں گا کہ قریب ہوجاؤ، اور میری آنکھیں آنسو بہاتی ہیں تاکہ خشک ہوجائیں۔''

کوئی بعید نہیں ہے کہ پوری طرح رجوع کے بعد از سرنو شوق پیدا ہوجائے اور اس بار عجز وقصور کے اعتراف کے بعد حضرت وہاب فضل فرمادیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آنکھ میں پانی کا اترنا جب تک مکمل نہ ہوجائے آنکھ کا علاج کرنا غلط ہے۔ اور مکمل ہونے کی علامت عدم یافت یا عدم شوق یافت اور عدم شوق پر عدم تاسف ہونا ہے۔ اس کے بعد از سرنو راہ کا پکڑنا ممکن ہوتا ہے۔

۳۱۸- تفہیم:

اولیا کے سلوک کے لیے سات مقامات

اول یہ راہ اشتغال ہے، پھر زبان وقلب کا کام ہے، اور یہ الف ب ت ہے۔ مقامات میں ان کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ اس کے بعد حق سبحانہ کے ساتھ قلب کے تعلق کا دوام محبت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور اس مرحلہ میں مناسب احوال پیش آتے ہیں۔ جیسے واقعات صالحہ، غلبۂ خوف ورجا اور انس وہیبت وتجلی اور پردہ۔ اس کے بعد توحید فعلی کو کہ ہر فعل انعام، ملامت، منع کرنا اور عطا اور ہر تاثیر وتغیر کہ اپنے آپ میں یا اپنے سے غیر میں دیکھے۔ اس کو حق سبحانہ بوصف شہود وغلبہ رجوع قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد توحید صفاتی ہے۔ حسن وکمال اور ان کی ضدور، میں سے ہر صفت، صفت حق مانی جاتی ہے جو ایک محل اور اس کے آئنوں میں ظاہر ہوتی ہے، اور انہی میں سے صفت وجود وتحقق اور تقرر ہے۔ اس کے بعد توحید ذاتی ہے اور وہ علم حضوری بسیط ہے کہ مدرِک (ر کے کسرہ کے ساتھ یعنی ادراک کرنے والا) اور مدرَک (رَ کے فتحہ کے ساتھ یعنی جس کا ادراک کیا جائے) اور ادراک اس جگہ سب ایک ہوجاتے ہیں۔ نہ ان میں تغایر، غیریت ہوتی ہے نہ کوئی حیرت کا امتیاز اور ماہیت سے

غفلت اور حقیقت الحقائق کا شعور۔اس کے بعد یادداشت ہے،اس معنی میں کہ علم حضوری اور علم حصولی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔اور یہ یادداشت فی الحقیقت تصوف کی زبان میں بیداری اور فطرت وجود کی طرف سے ایک قسط ہے کہ اس ذرہ کی پیدائش میں حسب تقاضہ اس کی استعداد اور تجلی کرتی ہے۔اور اشراق کی زبان میں ماہیت الماہیات کے احکام سے حکمی ہے کہ خاص جزئی صورتوں کے ساتھ مل جاتی ہے۔تم نہیں جانتے کہ انسان کا حکم لکھنا اور ہنسنا ہے۔اور حیوان کا حکم چلنا اور حرکت بالارادہ جداگانہ ہے۔اگرچہ عام لوگ اس میں فرق نہیں کرتے۔ اسی طرح ماہیت الماہیات کا بھی ایک حکم ہے۔ اس کے بعد اس یادداشت میں اضمحلال ہے۔اور اس میں اس طرح گم ہونا ہے کہ نفس ناطقہ ان کی روشنیوں میں چلا جائے۔ یہ سب محض روشنی اور تجلی تجلیات الہیہ ہوجاتی ہیں۔اس کے بعد مخلوق کی طرف نزول ہے۔اس سے میری مراد حق میں حق سے تصرف اور ان روشنیوں کی احکام نسمیہ میں آمیزش ہے۔ ہمت، تاثیر، اشراف اور علم کے لحاظ سے یہ ہے کہ مقامات ہفت گانہ جو اولیاءاللہ کے سلوک کی راہ ہے جس کو دست گیری کی توفیق دیتا ہے، وہ اس راہ پر چلتا ہے، ورنہ کسی ایک یا دو ہی میں رہ جاتا ہے۔اور اسی میں اس کی ساری عمر اور جذب ختم ہوجاتے ہیں اور مخلوق میں رجعت قہقری سے پڑجاتا ہے۔"نعوذ باللہ من الحور بعد الکور" اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ سب ظاہر ہوتے ہیں لیکن ضعیف حالت میں اور اجمال اور یہ ظہور ارادہ ازلیہ ہے۔کسی کو اس میں دخل نہیں ہے۔اور گویا شاعر نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

"سات عشق کے شہر عطار گھومے، اور ہم ابھی تک ایک گلی کے موڑ پر ہی کھڑے ہوئے ہیں۔"

واللہ الموفق ونعم المولی ونعم النصیر.

۳۱۹- **تفہیم:**

وحدت قصوی اور اس کے حامل کے احوال

با آنکہ نخست قبلہ گاہ دل تست
ہرگز نشود رابطہ عشق تو ست

''جس کے ساتھ پہلی ذات تیرے دل کا قبلہ گاہ ہے، اس کے ساتھ تیرے عشق کا رابطہ کبھی سست نہ ہوگا۔''

صد جائے کن گر سبق عشق درست
عشق تو بود درہمہ با یار نخست

''اگر عشق کا سبق سو بار بھی ٹھیک کرو گے، تمہارا عشق ہر حال میں پہلے دوست کے ساتھ ہی رہے گا۔''

کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ اور اس کا کرنے والا کون ہے؟ شخصی وحدت قصوی کو غیب الغیب سے شہادت میں ایک درہم دیتا ہے۔ اس کی مثال اونچے بید کے درختوں کی مانند ہے۔ ہر چند کہ اس کو مٹی، آلودگیوں اور ناپاکیوں میں ملوث اور گندہ کرتے ہیں اور پھر ایک حصہ ڈالتے ہیں وہ بانات (بید) خالص ہوتی ہے۔ اس کی نمی اور ایک رنگ اور چیزیں اس میں رکھو۔ گویا یہ عالم میں بالکل متحقق نہیں ہوتے۔ یا اس کی مثال دریا کے پانی کی طرح ہے کہ کبھی گندگیوں اور آلودگیوں کے اوپر سے گزرتا ہے اور نجس ہو جاتا ہے اور اس کی ساری صفتیں لے لیتا ہے۔ اس کے بعد میلوں زمین کے اوپر سے گزرتا ہے۔ آفتاب سے چمک کر صاف پانی ہو جاتا ہے۔ دھوبیوں کے پاس سے گزرتا ہے تو اس کا رنگ اور بو دوسرا ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد اس کی بو بھی جاتی رہتی ہے۔ یہ شخص اس کی طرف ذات میں فرداً بلند ہوتا ہے کہ جو وحدت میں وصف ہے۔ اس میں ایک بال کے برابر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جو غیر منقسم ہو۔ اور اس نے سیر کی۔ بلکہ وہ چلا اور خط دوری کے گرد گھوما۔ چنانچہ اونچے نقطوں سے جدا ہو گیا حتی کہ کبھی دوبارہ اس کی طرف پہنچ گیا۔ اس شخص کو بعض اوقات اس

حالت کے وصول کا شوق پیدا ہوتا ہے اور کبھی سب چیزوں سے خوش ہوتا ہے جو چیز اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی اس کو طلب کرتا ہے کہ حالت اولیٰ نقد وقت ہے، ایک جو کے برابر تفاوت کے بغیر۔ اور کبھی حق کو باقی رکھنے کو اس سے ملا دیتا ہے۔ گویا کہ آدمی صرف معاشی العقل ہے کہ اس کی نظر اس معاش سے آگے نہیں جاتی۔ کیا تم یاد نہیں کرتے کہ سخن مدرکہ کی ماہیت کی تین قسم قرار دیتے ہیں۔ مخلوطہ، مجرد اور لابشرط۔ اس شخص کو بھی لطافت سے ماہیت سے کم نہیں جان سکتے۔ یہ شخص تمام احوال و مقامات پر ناز کرتا ہے۔

۳۲۰۔ تفہیم:

انبیا اور اولیا سب کو رشد و ہدایت کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان کے مامور ہونے میں فرق ہے

اولیاء کو ارشاد و ہدایت کا حکم دیا جاتا ہے جیسا کہ انبیاء صلوٰات اللہ علیہم کو حکم دیا جاتا ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ عزوجل کی سنت میں لسان کلی کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان الٰہی کا تصور اولاً روح میں اور پھر مثال میں کیا جاتا ہے۔

اور اولیاء کو لسان خاص سے حکم دیا جاتا ہے جو لسان وقت و حال ہوتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ خوف، رجا یا قبض و انبساط میں سے حال الٰہی کا اکتساب کرتا ہے یا اس کے اوپر اللہ کے علوم میں سے کسی علم مثلاً توحید صفات یا کثرت میں ظہور وحدت وغیرہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو نفس ان علوم کا تابعدار ہو جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ جو رقت اور صفائی ہیں، جو ظاہری اور باطنی ریاضتوں کی کثرت سے حاصل ہوتی ہیں، ان کے لیے دراز ہو جاتا ہے۔ خود ان کے شر اور ان کو پسند کرنے سے بچتا ہے کہ وہ جو ہیں سو ہیں۔ اور انہیں توحید اور اضمحلال حاصل ہوتے ہیں۔ پھر یادداشت کا الہام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے سر سے پیر تک اس کو زائل کرنے والا ہے۔ بلکہ وہ بعینہٖ وہی ہے۔

اور بالجملہ ان تینوں قسموں میں سے جو قسم بھی پوری طرح نفس اور کمال کی طبیعت سے مل جاتی ہے، اور ان کے درمیان خاص طور سے اوامر و نواہی اور واقعات و علوم،

اشرافات اور عجیب عجیب خرق عادت پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش کی کیفیت جو ہم نے بیان کی ہے۔ واصلین میں سے یلمعی اور عبقری کے سوا اور ان سب کے نزدیک قدر متیقن کے سوا جو اس از دواج سے پیدا ہوتی ہے۔ کوئی اس سے زیادہ نہیں جان سکتا۔۔

اور اس کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو حدیث السن کم عمر اور بھوکے پیاسے اور لاغر و کمزور تھے، ان کے اندر ان کے جو کمال اور اخلاق تھے، انہوں نے ان سب کو بھلا دیا۔ تب سلطان نے ان کی تربیت کی، ان کو اچھا کھانا کھلایا اور ان کے ساتھ ہر لحاظ سے بھلائی کرتا رہا۔ ان سے کبھی تعرض نہیں کیا اور نہ ان سے کوئی سوال کیا یہاں تک کہ وہ بڑے ہو گئے اور سخت کام کرنے لگے۔ تب ان کو طلب کر کے آزمایا تو ان میں سے کوئی عاقل اور شجاع، فیاض وسخی اور فصیح و پاکباز ثابت ہوا، اس کے اندر اعلیٰ اخلاق اور ریاسات کلیہ کی علامات پائی جاتی تھیں، اور اس پر علم ظاہر ہوئے اور وہ فہم اور گرفت کے لحاظ سے لوگوں میں سب سے زیادہ سخت تھا جو ملک اور عدل کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ اور ان میں سے کوئی ڈرپوک، بزدل، کمزور، بناوٹی و دکھاوے کی محبت کرنے والا اور سخت دل تھا۔ اس کی ہمت خسیس امور کی طرف مائل ہوئی۔ اور ان میں سے کچھ ان دونوں کے درمیان تھے۔

اور جیسے باغ والا درختوں کی پوری طرح دیکھ بھال کرتا ہے تو ان کے ذائقے اور فوائد مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح پرندوں کے بچوں اور اونٹوں اور گھوڑوں کے بچوں کا معاملہ ہے کہ صاحب عقل و دانش دیکھتا ہے کہ تربیت، طبیعت سے میل کھا گئی ہے تو ان کے ملنے سے اوامر و نواہی جزئی پیدا ہوتے ہیں۔ اور نبی کو لسان کلی سے حکم دیا جاتا ہے۔ اگرچہ علت ایک امر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ طبیعت سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ عارف جانتا ہے کہ ہر چیز میں فاعل کا حکم ہوتا ہے، اور دونوں کو قبول کرنے والی مراعات ہیں۔ اور معاملہ ویسا نہیں ہے، جیسا کہ کچھ گمان کرنے والوں نے سمجھا ہے جو شئے کو ظن و تخمین سے لیتے ہیں کہ ریاضت اور بھوک اور قلب کی تطہیر احادیث سے ہے۔ اور اللہ کی طرف جمع خاطر علم الٰہی کا فائدہ دیتی ہے۔ اور مبدأ سے اس کے فیضان کے لیے تیار کرتی ہے، ایسا بالکل نہیں۔ مبدا سے علوم کے فیضان کی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں۔

ایک علم حصولی ہوتا ہے، خواہ اس کو اللہ سے اخذ کیا جائے، پھر وہ، وہ نہیں رہتا، اور دوسرا علم حضوری ہوتا ہے اور یہ صرف توحید میں فنا اور اضمحلال سے حاصل ہوتا ہے۔

۳۲۱-تفہیم:

شیطان کا رسول اللہؐ کی صورت اختیار نہ کرنا اور خوابوں کی حقیقت

کیا تم جانتے ہو کہ شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اختیار نہیں کرتا؟ جان لو کہ خوابوں کی حقیقت مبدأ اعلیٰ سے ایک خاص جہت اور مقررہ ہیئت پر نفس ناطقہ کے مناسب ظاہر ہونا ہے۔ جو علم خاص کے فیضان کا تقاضہ کرتی ہے۔ تو یہ علم متعین ہو جاتا ہے۔ اور خیال میں جمع صورتوں اور دیو قامت شکلوں کو اختیار کرتا ہے۔ تو وہ صورتیں نفس پر پوری طرح حاضر ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان حواس ظاہرہ کے نزدیک ایک واقعہ منتظم ہو جاتا ہے۔ اور حواس باطنہ پر نسمہ کی قبولیت ہے تو علم بڑی بڑی صورتوں کے ساتھ ان کے اور اس کے درمیان صرف ایک جہت کی مناسبت سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آپ کا ارحم الراحمین کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف رحمت کے طور پر مبعوث ہونا، جہنم کی آگ سے نجات کے مقامات کی طرف ان کی ہدایت اور دین داری کی معرفت، حکمت اقترابی، ملی، معاشی، منزلی، گھریلو، معاملاتی اور اقلیمی حکمت کے قیام کے عارف مومن کے نزدیک یہ بری صورت اور فساد بالکل مناسب نہیں ہوتا۔ اس لیے برائی آپ کی شکل اختیار نہیں کرتی سوائے اس کے کہ بیداری کی حالت میں کوئی خیال کیا جائے اور اس کی تصویر ایک امر سے دوسرے امر میں بنتی ہے تو یہ خواب نہیں ہے۔

۳۲۲-تفہیم:

رسول اللہؐ کا ارشا 'اتبعوا غرائب القرآن' اور اس کے معنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غرائب القرآن کا اتباع کرو۔ اور اس کے غرائب اوامر و نواہی ہیں، یا جیسا کہ فرمایا۔ اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ قرآن میں زیادہ تر انبیاء اور کفار کے قصے اور اللہ سبحانہ کی کفار کے ساتھ بعث و بعثت سے ان کے انکار اور اللہ

کی تعظیم، اس کی عبادت اور توحید سے اعراض کے سلسلہ میں دلیل و حجت ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اوامر ونواہی پر جمع ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے جو کچھ آپ کے عمل کی مدح اور آپ کی تقریر کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ اس سب کا امر کیا گیا۔ اور جو کچھ ذم اور نفرت کے سلسلہ میں وارد فرمایا ہے، وہ سب منہی ہے۔ اور جو کچھ کفار کی طرف منسوب کیا ہے جس پر ان کے عقاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی منہی ہے، اور جو کچھ مومنوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس پر ثواب کا ذکر کیا گیا اس کا امر کیا گیا ہے۔ اور یہ سب غرائب القرآن ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں کچھ کہے بغیر ان کو اشارہ سے سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ قاری اس کا انتظار کرتا ہے اور اس کا گمان کرنے والا اس کا انتظار کرتا ہے جیسا کہ پردیسی آدمی جو اپنے وطن میں نہیں ہوتا، مطلوبہ اشیاء کا انتظار کرتا ہے اور اس کا محل معلوم ہے۔

۳۲۳- تفہیم:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد 'وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی إلا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ'

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی إلا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللّٰہ آیاتہ واللّٰہ علیم حکیم** "آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول یا نبی بھیجا اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ بھی خلل اندازیاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔" (الحج: ۵۲)

یہاں ابن عباس نے پڑھا "**من رسول ولا نبی ولا محدث**" اور فرمایا: محدثین میں سے ایک شخص وہ ہے جو شہر کے اس کنارہ سے دوڑتا ہوا آیا اور لقمان اور فرعون کے جادوگر اور آل فرعون کا مومن ہے۔

اللہ تم پر رحم فرمائے، جان لو کہ وحی کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نفس فی

الروع ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نسمہ کے قوی اور علوم کی پیروی کی جائے۔ اور اس کا علم اس اسم کے لیے ہے جو عین عبد پر تجلی کرتا ہے جو کہ نسمہ اور شرائع کے علوم کا نظام ہے۔ چنانچہ اس کو وہ حال ڈھانک دیتا ہے جو احوال طبیعہ جیسے شدید غضب، جس سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اور کثیر جزع وفزع وغیرہ حواس کی غشی اور نسمہ کے احاطہ میں مشابہ ہوتا ہے۔ اور اس کا راز جبروت کی حکایت اور اس پر مطلع ہوتا ہے۔ پھر جب یہ حال منقطع ہو گیا تو نفس میں علوم اور خواطر اجمالیہ کلیہ جیسے بعض رذیل امور سے نفرت کرنا یا بعض فضائل کی طرف رغبت یا نفس کا جاننا اور بعض حالات کی طرف دیکھنا جن کے جزئیات جاری رہنے کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں بندہ یا اس کے اعزاء کے لیے مقدر کیا، اور اس اخیر کو تمنی کہا جاتا ہے۔ اور یہ تمنی فی حد ذاتہ خیر محض اور حق صرف ہے۔ اس لیے کہ وہ وحی ہے جو منبع خیرات سے فیض پہنچانے والی ہے۔ لیکن آدمی کبھی اس حکم کو متعین کرتا ہے اور اس کے تحقق کی صورت اس کا تصور کرتی ہے جو اس پر اس کے حواس کی جانب سے داخل ہونے والے علوم سے اس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ صورت جھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ شیطان کے القا سے اور علم جبروتی کے علم ناسوتی کے ساتھ مل جانے سے ہوتی ہے۔ پھر اس پر کبھی دوبارہ امر منکشف ہوتا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ وہ صورت باطل ہے۔ اور اللہ کے نزدیک تمنی دوسری صورت میں متصور ہوتی ہے۔

اور اس مرحلہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے "إلا إذا تمنى" یعنی جب اس کے دل میں کسی حالت کی طرف دیکھنے کا خیال پیدا کیا گیا۔ چنانچہ اس کا نفس اللہ کی طرف سے رجا اور تمنی کے رنگ میں رنگ گیا۔ اس کا ارشاد ہے "الشیطان فی امنیته" یعنی اس کے ساتھ کسی شئے باطل کو ملایا اور تمنا سے مرکب کیا۔ اور یہ ایک باطل صورت ہے۔ چنانچہ اس کی طرف اس کا وہم چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ اس کو منسوخ کر دیتا ہے جو شیطان القا کرتا ہے، یعنی باطل کو زائل کر دیتا ہے۔ اور اس پر اس امر کو واضح کر دیتا ہے جو حق ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کا حکم لگاتا ہے یعنی اس کے اوپر اس صورت حقہ کو ظاہر کر دیتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔

اور اس کی مثال وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ مکہ سے ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرما رہے ہیں جہاں کھجوروں کے باغ ہیں۔ اور اس ہجرت میں آپ کے دین کی سربلندی اور آپ کی دولت میں ترقی ہوگی۔ تو آپ کا خیال اس طرف گیا کہ وہ یمامہ ہے یا ہجرت (ہجرۃ) ہے۔ تو ایک زمانہ تک آپ کو اس کا یقین رہا۔ پھر اللہ نے آپ کے اوپر واضح فرمایا کہ وہ شہر یثرب ہے۔

اور جو روایت کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام کو آپ کی قوم نے اذیت پہنچائی اور آپ نے نصرت کی خوشی و لذت محسوس کی تو آپ کا خیال طائف کی طرف گیا۔ اس لیے آپ نے اس کی طرف ہجرت فرمائی تو ان سے وہ دیکھا جو آپ کو برا معلوم ہوا۔ پھر بنی کنانہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ان سے بھی وہی دیکھا جو آپ کو برا معلوم ہوا۔ اور آپ اپنے آپ کو مختلف عرب قبائل پر پیش فرماتے تھے۔ اور ان سے مدد طلب فرماتے تھے، اور چاہتے تھے کہ وہ آپ کو اپنے شہر میں رکھ لیں، اور اس میں آپ اپنے دین کی سربلندی کی تمنا فرماتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو انصار کے لیے ظاہر فرمایا۔ ہمارے نزدیک اس آیت کی تفسیر ہے۔ تو اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور حیران و سرگرداں مت پھرو۔

۳۲۴- تفہیم:

قرب کے معنی

ہمارے نزدیک قرب، اللہ تعالیٰ کی ذات کے تعلق سے غفلت دور کرنا ہے۔ جو شیشہ کی طرف دیکھتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے شیشہ اور اس سے آگے کی عرض کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے شیشہ سے آگے اور بالعرض شیشہ کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہ دونوں ہی شیشہ اور اس سے آگے کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن غفلت کو دور کرنے اور بیداری اور شعور اور التفات و توجہ کے تعلق سے دونوں میں فرق ہے۔ اس مثال سے ہمارے قول غفلت دور کرنے کے معنی واضح ہو گئے۔ کیا ذکاوت اور خبردار ہونے اور متنبہ ہونے کی دو قسمیں نہیں ہیں؟ ایک یہ کہ ذکاوت علم میں ہے۔ تو کتنے لوگ ہیں کہ خفی کا ایک لحظہ میں ادراک

کرلیتے ہیں۔اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ جو مقصود کا ادراک تردد، افکار اور تکرار کے بعد کرتے ہیں۔اور دوسرے ذکاوت فی الحال ہے۔تو کتنے ہی لوگ ہیں جب کسی مقصود کی طرف توجہ کر کے بیٹھتے ہیں تو ان کی طرف ارادہ وعزم بڑھ جاتا ہے۔یا نشاط کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ان کی طرف نشاط بڑھ جاتی ہے۔اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے یہ بغیر تکرار کے نہیں ہوتا۔ اور ارتفاع غفلت سے ہماری غرض ارتفاع غفلت فی الحال ہے نہ کہ علم۔تو جس کو ہم نے اس سے مراد لیا ہے وہ تیقظ حالی ہے۔اور اس کے آثار میں سے تیقظ علمی ہے۔اس طرح حقیقت کو سمجھ لو کہ یہ بہت عمیق ہے۔

۳۲۵-تفہیم:

مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت شہود کی تحقیق اور ان دونوں کے درمیان تطبیق

عبد ضعیف احمد، مدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی عفاء اللّٰہ عنہ ووفقہ لما یحبہ ویرضاہ کی طرف سے آفندی اسماعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی اوصلہ اللّٰہ تعالیٰ إلی ما یرجوہ ویتمناہ کے نام- اما بعد: میں تمہارے سامنے اس اللہ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔اور اس کے نبی مصطفیٰ اور آپ کی تمام آل واصحاب پر درود وسلام بھیجتا ہوں۔ مجھے تمہارا خط موصول ہوا جس میں تم نے مجھ سے اس وحدت الوجود کے بارے میں جس کا ذکر شیخ اکبر اور ان کے پیروکاروں نے کیا ہے اور اس وحدت شہود کے بارے میں جس کا ذکر شیخ مجدد نے کیا ہے، سوال کیا ہے اور یہ کہ کیا ان دونوں رضی اللّٰہ تعالیٰ عن الجمیع وارضاھم کے معاملہ میں تطبیق کی جاسکتی ہے؟

میرے بھائیو! رحمکم اللّٰہ تعالیٰ، جان لو کہ ہر زمانہ کا ایک قرن ہوتا ہے۔اور ہر قرن کا ایک علم ہوتا ہے جو اللہ عزوجل کی رحمت کی تقسیم میں ان کو پہنچتا ہے۔اگر تم اس امت مرحومہ کے ابتدائی زمانہ کے احوال کے بارے میں غور وفکر کرو گے جب نہ شرعی علوم مدون ہوئے نہ فنون وادب اور نہ ان میں زیادہ بحثیں ہوئی تھیں، البتہ ان کے سینوں میں حق

کا الہام برابر ہوتا رہا تھا۔ پھر اس کی حکمت کے مطابق ہر دور میں ایک کے بعد ایک علم آتے رہے، اس لحاظ سے تم سے یہ امر مخفی نہ رہے گا۔ اور یہ کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی تقسیم سے ہمارے حصہ میں یہ دیا ہے کہ ہمارے سینوں میں اس امت کے علماء کے علم جمع کر دیئے۔ معقولات بھی اور منقولات و مکشوفات بھی۔ اور ان کو ایک دوسرے سے مطابقت و تطبیق بھی دے دی۔ اور ان کے درمیان اختلاف کو مضمحل کر دیا۔ اور ہر قوم کو اس کے مقام پر قائم کر دیا۔ چنانچہ یہ اصل علم کے فنون و مضامین فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ سب پر صادق آتی ہے۔ **بحمد اللہ و توفیقہ**

اور جان لو کہ حق کی معرفت جیسا کہ خضر علیہ السلام نے فرمایا: **بحر لجی** ''سمندر بے پایاں کی طرح'' ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے، نہ انتہا اور یہ کہ اس کے بارے میں کلام کرنے والے سمندر میں ایک تنکے کو ڈبکی دینے والوں کی طرح ہیں جو سمندر میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتے۔ یا ان چڑیوں کی طرح ہیں جو اپنی ضرورت کے مطابق سمندر میں سے پانی پی لیتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ تو ہر کوئی صرف ایک کمال کے بارے میں بتاتا ہے، دوسرے کے بارے میں نہیں۔ اور صرف ایک جمال کا وصف بیان کرتا ہے، دوسرے جمال کا نہیں۔

وعلى تفنن واصفيه بوصفه

يفنى الزمان وفيه ما لم يوصف

''اور ایک قسم کو بیان کرنے والا اپنے بیان سے گزر جاتا ہے، اور اس زمانہ میں وہ ہوتا ہے جو بیان نہیں کیا جاتا۔''

اور اس طرح کے مواقع پر سننے والوں کی بھی بہت سی جماعتیں ہو جاتی ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ محض اشاروں سے سب کچھ پا لیتے ہیں، اور جس موقع کے بارے میں خبر دی جاتی ہے، اس سے متعلق ہر قول کو اس کے محل پر رکھتے ہیں۔ اور سب اپنی جگہ درست ہوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے عبارتیں مختلف ہوتی ہیں، اشارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، اور پھر بھی اس کی گہرائی میں پہنچنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حیران و پریشان ہی رہتے ہیں۔

اس کی مثال ان نابینا لوگوں جیسی ہے کہ ایک پیڑ کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے اس کو چھوتے ہیں، اس کو چکھتے ہیں، کسی کے ہاتھ میں اس کے پتے آتے ہیں، کسی کے ہاتھ ٹہنی، کوئی پھولوں کو چھوتا ہے تو کوئی پھلوں کو اور کوئی تنے کو، پھر بیٹھ کر بات چیت کرنے لگتے ہیں تو کوئی کہتا ہے درخت ملائم جسم ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ تو خوشبودار لکڑی ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے وہ نرم وملائم ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ تو انتہائی سخت ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے، وہ انتہائی میٹھا ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے وہ انتہائی تلخ وکڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس کا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہوتا۔ ایک کہتا ہے، اس کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے۔ تو دوسرا کہتا ہے، اس میں تو کوئی بو ہی نہیں ہوتی۔

جب ان کی باتوں میں اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ ایک دوسرے کو جھٹلانے لگ گئے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے، اتنے میں ایک آدمی آتا ہے جو نظر و بینائی میں ان سے ممتاز ہے۔ اگرچہ بہت سے اوصاف میں ان سے کم تر ہے۔ وہ لوگوں کی ایک دوسرے سے تعریف کرتا ہے۔ خوش نوائی، قوت برداشت، کمال قوت سماعت، ذوق اور قوت ذائقہ اور قوت لمس کو جانتا سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اصل کے لحاظ سے تم سب کی باتیں صحیح ہیں۔ لیکن یہ جو کہتے ہو کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی صحیح ہے، یہ غلط ہے۔ پھر اس نے ہر بات کی، وجہ بیان کی اور ہر اشارہ کو اس کے مقام پر چسپاں کیا۔

پھر علم ظاہر و باطن کے جامع عارفوں کا کشف صحیح ہوتا ہے۔ اور قدما کے کلام کی توجیہ اور ان کے مقصود کی تعیین میں کچھ غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ ان کی اللہ کی معرفت میں کوئی کمی نہیں کرتی۔ نہ ان کے کمال میں کوئی نقصان کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام کی توجیہ اور اس کے محل کی تعیین کشف کے دائرہ سے خارج ہے۔ یہ اجتہاد اور غور وفکر کا ایک شعبہ ہے، جس میں علماء اور ظاہر ہے کہ عوام بھی، ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اور جان لو کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دو لفظ ہیں، جن کا اطلاق دو الگ الگ جگہوں پر ہوتا ہے، جو کبھی اللہ عزوجل کی طرف چلنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے، اس سالک کا مقام وحدت الوجود ہے، اور اس کا مقام وحدت الشہود ہے، اور یہاں وحدت الوجود کا معنی

حقیقت جامعہ کی معرفت میں استغراق ہے، جس میں عالم اس حیثیت سے تعین کرتا ہے کہ اس سے فرق و امتیاز کے احکام ساقط ہو جاتے ہیں، جن سے خیر و شر کی معرفت کی بنیاد ہے۔ اور شریعت اور عقل اس کے بارے میں خبر دینے والی ہوتی ہیں۔ اس کو اچھی طرح بیان کرتی ہیں اور پوری طرح خبر دیتی ہیں۔ اور یہ وہ مقام ہے جس میں بعض سالک وہیں رہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے چھٹکارا دے دیتے ہیں۔ اور وحدت الشہود کا معنی جمع وتفریق کے احکام میں جمع کرنا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء ایک وجہ سے ایک ہی ہیں۔ اور دوسری وجہ سے بہت ساری ہیں، ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اور یہ مقام پہلے والے سے زیادہ مکمل و اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور یہ وہ اصطلاح ہے جس کو میں نے شیخ آدم بنوری قدس سرہ کے بعض پیروکاروں سے اخذ کیا ہے۔

اور کبھی یہ دونوں لفظ، اشیاء کی حقائق کی معرفت میں استعمال ہوتے ہیں، جو اس کی ماہیت ہے۔ اس لیے انہوں نے حادث کو قدیم سے مربوط کرنے کی ایک وجہ کے طور پر دیکھا، تو لوگوں کے سامنے یہ بات آئی کہ عالم اعراض ہیں۔ جو ایک حقیقت میں مجتمع ہیں۔ جیسے انسان کی صورت اور گھوڑوں کی صورت شمع پر وارد ہوتی ہیں اور طبیعت شمعیہ تمام حالات میں باقی ہے، لیکن شمع کو ان شکلوں کا نام نہیں دیا جاتا۔ سوائے اس صورت کے جو اس پر وارد ہوتی ہے بلکہ وہ صورتیں حقیقت میں وہ شکلیں ہیں۔ لیکن ان کو شمع سے ملانے کے سوا ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

اور دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ بات ہے کہ عالم اسماء کے عکس ہیں۔ اور صفات ان اسماء اور صفات کے لیے عدم کے مقابلہ میں نظر میں نقش ہوتے ہیں۔ جیسے قدرت کے مقابلہ میں عدم ہے، اور وہ عجز ہے۔ چنانچہ جب قدرت کی روشنی کا عکس عجز کے آئینہ میں پڑتا ہے تو قدرت ممکن ہو جاتی ہے۔ اس طرح تمام صفات اور وجود بھی اس اسلوب پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ مذہب اول کو وحدت الوجود اور دوسرے کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

اور ہمارے نزدیک یہ امر ہے کہ کشف میں آنے والی دونوں باتیں صحیح ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شیخ عربی نے یہ نہیں کہا کہ وحدت الشہود کے یہ معنی ہیں، یہ بھول ہے اس لیے کہ شیخ

اوران کے پیروکار بلکہ حکماء بھی یہی کہتے ہیں۔اور وہ یہ کہ تہذیب اور مجازات واستعارات سے تخلیص کے بعد اس قول کا حاصل جو فہم کی دشواری کو واجب کرتی ہے، یہ ہے کہ حقائق امکانیہ ضعیف وناقص ہیں۔اور حقیقت وجو بیہ زیادہ مکمل اور قوی ہیں۔اس طرح ممکن ہوتا ہے کہ حقائق امکانیہ کے لیے یہ کہا جائے کہ وہ عدم ہیں۔ان میں موجودات کی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔اور یہ مخفی نہیں ہے کہ یہ قول متفق علیہ ہے۔اور یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے۔وہ تفصیل کا محتاج ہے۔تو جو تمہارے سامنے بیان کیا جارہا ہے،اس کو شعور ودانش کے ساتھ سنو۔

رحمکم اللہ۔ جان لو کہ پہلی بات جس کو مسلمان سمجھتا ہے اور جو کتاب وسنت کی نصوص سے اس کے سامنے خالص ہو کر آتی ہے، بلکہ ہر صاحب ملت کی طرف خالص ہو کر آتی ہے، یہ ہے کہ حق عزوجل تمام جزئیات کی طرح موجود جزئی ہے۔البتہ وہ قدیم ہے، اور عالم میں موثر ہے،ان کا پیدا کرنے والا اوران کو رزق دینے والا ہے۔اور یہ وہ علم ہے جس کو ہر عاقل ریاضت نفسانی برداشت کیے بغیر یا معقول میں مدد سے پہلے اپنے سینہ میں پاتا ہے۔اور شرع نے جس کو مکلف کیا ہے، وہ انسان ہیں۔اور شرع الٰہی نے لوگوں کو انہی امور کا مکلف بنایا ہے، جو اللہ عزوجل نے ان کی فطرت میں صورت نوعیہ کے لحاظ سے ودیعت کیا ہے۔چاہے وہ شئے جس کا مکلف کیا گیا ہے علم کے اعتبار سے ہو یا عمل کے اعتبار سے۔اور شریعت ان کے مقابلہ میں صرف اس دلیل کو لاتی ہے جس کی طرف ان کی فطرت ہدایت کرتی ہے۔اور وہ ان کے اندر پوشیدہ ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله "اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے"۔(الروم ۳۰)اور رسول اللہ نے فرمایا: کل مولود یولد علی الفطرة "ہر پیدا ہونے والا فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے۔"(الحدیث)

اور یہ معرفت صحیح اور اشارۂ صادق ہے۔اس کا مرجع، حق عزوجل کی ایک تجلی ہے، جو قدیم ہے،اور نفس رحمانی کے قلب میں زمانہ کے تحقق سے پہلے ظاہر ہوگئی۔اور حدوث کی

حدیث آتی ہے، اور وہ اس لیے کہ نفوس بشریہ کے لیے اس کی طرف ویسی ہی کشش ہوتی ہے جیسی لوہے کی کشش مقناطیس کی طرف ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف میلان اس طرح ہوتا ہے جیسے آگ کا میلان اوپر کی طرف۔ اور مٹی کا میلان نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ اور کسی نے کیسی سچی بات کہی ہے۔

لقد صرت مقناطیسنا فقلوبنا

لجذبک إیاھا إلیک تمیل

"تو مقناطیس ہو گیا تو ہمارے دل تمہاری کشش کی وجہ سے تمہاری طرف مائل ہوتے ہیں۔"

تو اللہ عزوجل نے موت کے بعد اس تجلی کی طرف وصول کو لقاء اللہ سے موسوم کیا۔ اور ہر اس امر کو جو انسان کی اس وصول پر مدد کرے، اور اس کے نزدیک اس کا سینہ ٹھنڈا ہو، اس کو طاعت قرار دیا۔ اور ہر اس امر کو جس کو اس سے دور کرے یا اس کے نزدیک اس کے قلب میں قلق واضطراب پیدا ہو، گناہ قرار دیا۔ اور اس معنی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اشارہ کیا **إنکم سترون ربکم عزوجل کما ترون القمر لیلة البدر، لا تضامون فی رؤیته، فان استطعتم ان تغلبوا علی صلوٰة قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا فافعلوا** "تم اپنے رب عزوجل کو اس طرح دیکھو گے جیسے لیلۃ البدر میں چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کی رویت میں تم آپس میں مزاحمت نہیں کرتے۔ تو اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے نماز پر غالب آسکو تو اس کام کو کرلو۔"

اور یہ تجلی خیر وشر کی کسوٹی ہے جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہی وہ تجلی ہے جس پر ۱۹۹ اسماء الٰہیہ کا انطباق ہوتا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت خبر دی تھی جب آپ سے سوال کیا گیا کہ ہمارا رب مخلوق کو پیدا کرنے سے قبل کہاں تھا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ عماء (دھند) میں تھا جس کے اوپر ہوا ہے، اور اس کے نیچے ہوا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کے بارے میں صوفیا نے اپنے اس قول سے خبر دی تھی کہ وجود دو مظہروں میں ظاہر ہوا۔ ایک مظہر واجب جس کی تاثیر قہر وفعل اور تنزہ

ہے۔اور دوسرا مظہر ممکن ہے اس کا تاثر، انفعال، انفعال اور کمزوری ہے۔

اور شیخ محی الدین عربی نے فرمایا: انبیاء اور اولیاء کا ذوق ان کی معرفت میں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں ارادہ متجددہ ہے۔

جس نے اس تجلی کو اس طرح ثابت کر دیا جیسے وہ ہے، تو اس نے اس فطرت کو درست کر دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔اور انبیاء اور اولیاء سے اپنے رب کی معرفت میں مطابق ہو گیا۔اور جس نے اس کو ثابت نہیں کیا۔اس نے فطرت کو غلط کر دیا اور انبیاء اور اولیاء سے اپنے رب کی معرفت میں الگ ہو گیا۔اور ہمیشہ کے لیے زندیق، بے دین ہو گیا۔اور اسی طرح جس نے بھی اس علم کا انکار کیا جو حق تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، اور اس پر تکلیف کو لازم کیا تو وہ زندیق ہے۔

اور اسی طرح علوم فطریہ میں سے جن کا منکر زندیق ہوتا ہے، یہ ہے کہ اشیاء کے حقائق ثابت ہیں، اور اشیاء کے خاص وجود ہیں، جن پر خواص لازم ہوتے ہیں۔جیسے آگ جلاتی ہے، پانی آگ کو بجھاتا ہے، زنجبیل گرم اور کافور سرد ہے۔اور نماز خیر ہے اور زنا شر ہے۔تو جس نے یہ نہیں کہا، اس پر خود اس کے نفس کی طرف سے اس کے نفس پر حجتیں قائم ہو گئیں۔اور اس کو خود اس کے نفس کی طرف سے اس کے نفس پر دلائل نے جھٹلا دیا۔اور وہ لگا تار اقوال و آراء کی غلطیوں کی وجہ سے پستیوں میں گر گیا۔

اور ہم نے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سے یہ پہچان لیا کہ وہ فطرت کے طرز پر زیادتی سے منع کرتا ہے، اور اس کے سوا دوسرے امور میں غور و خوض سے روکتا ہے، الا یہ کہ صوفیاء اس امر کو پہچانتے ہیں کہ نہی عقل اور صورت انسانی پر جاری ہوتی ہے۔اب اگر انسان نے اس میں اپنی عقل کو استعمال کیا، اور اس میں اس لحاظ سے غور و خوض کیا کہ انسان کیا ہے، اس کو اس سے روکا جائے۔لیکن وہ اس طرح غور و خوض کرتے ہیں جو عقل کے طریقہ سے پرے ہے اور جس سے وہ موجود ہیں۔اس سے نہیں کہ جس خصوصیت سے وہ بشر ہیں۔

اور بالجملہ لوگوں نے اس اصل کے احکام کے بعد غور و خوض کیا جس پر دوسرے علم میں ان کی جبلت بنائی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اشیاء معقولہ اور محسوسہ وجود میں مشترک ہیں

اور یہ وہ معنی ہے جس سے یہ اشیاء معدومہ جدا ہوتی ہیں کہ مثلاً کبھی ہم مثلث کا تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ موجود نہیں ہے۔ اور کبھی اس کا تصور کرتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ موجود ہے۔ اور ضروری ہے کہ متصور ثانی متصور اولیٰ سے جدا ہو۔ اور جس سے وہ جدا ہوتا ہے، وہ وجود ہے۔ اور یہ وہ ہے جو ان اشیاء میں قابلیت اور فاعلیت کے لیے مبدا ہوتا ہے۔ اور یہ اشیاء ماہیت میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اور وہ اس وجود اور امور پر خصوصیات زائدہ ہیں۔ جن کو گھوڑے، انسان، گدھے اور اونٹ کا نام دیا جاتا ہے، اور جن کو ہم اپنے نفس میں مقدر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے احکام اور آثار کی مقدار ہے۔

پھر اس وجود کی حقیقت اور ماہیتوں کے ساتھ ان کو شامل کرنے کی کیفیت کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا، تو کہا گیا کہ وجود امر انتزاعی ہے جس سے ماہیتیں متصف ہوتی ہیں۔ اور بنانے والے نے ماہیت کو ماہیت نہیں بنایا اور نہ ہی وجود کو وجود بنایا لیکن ماہیت کو موجود بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قول فی نفسہ سچ اور اپنے وجود کی معرفت میں حصر کے اعتبار سے اور وجود حقیقی کی بحث میں اپنے ذکر کے اعتبار سے غلط ہے کہ ہم لامحالہ اس امر انتزاعی کا ادراک کرتے ہیں جس کو وجود کہتے ہیں۔ اور اس سے ماہیت کی صفت بیان کرتے ہیں۔ اور اس سے متصف ہونا۔ بنانے والے کے بنانے اور اس کے لیے سبب بننے والے کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ بنانے والے نے ماہیت کو بنایا اور اس کو اپنے نفس سے صادر کیا۔ اور اس کے صادر ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے فاعلیت اور قابلیت وغیرہ کے ظہور سے اس کے بعض احوال کی طرف دیکھا تو ان کے سینوں میں اس وقت وہ صورت نقش ہوئی جس کو وجود کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی فی نفسہ قول صادق ہے اور اپنے وجود کی معرفت کے دو اعتبارات سے خطا ہے۔ ہم ان امور کا قطعی طور پر ادراک کرتے ہیں جو خارج میں ممتاز ہیں۔ ہم ان کو اسماء مختلفہ کہتے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اثر ہے جس کو بنانے والے نے بنایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہاں کچھ خاص وجود ہیں جن کو ہم ماہیتوں کا نام دیتے ہیں۔ جو

دوسرے دو وجودوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک وجود وحدانی ہے، جو موجودات کے ہیکلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ وجودات خاصہ پر مقدم ہے۔ اور وجودات خاصہ اس کے بعض عموم کے لیے تنزلات اور تعینات ہیں، جو اس کے اور ماہیات کے درمیان معلوم آئینہ اور مجہول الکیفیت کے ربط سے حاصل ہوتے ہیں، جو اس پھیلے ہوئے وجود اور اس کی صورت علمی کے امور ہیں۔ اور دوسرے وہ وجود ہے جو اجمالی طور پر وجودات خاصہ کے ملاحظہ سے سامنے آتا ہے۔ تو یہ دونوں باتیں کہنے والوں میں سے ہر ایک نے حق بات کہی۔ لیکن اس اکتفا میں غلطی بیمار کو شفا نہیں دیتی اور نہ ہی پیاسے کی پیاس بجھاتی ہے۔

اور وحدت الوجود کے قائل صوفیا نے کہا ہے کہ جو شئے خارج میں ہوتی ہے، اور اس پر آثار خارجی مترتب ہوتے ہیں، وہ اس امر سے خالی نہیں ہوتی کہ خارج میں اس کے حصول میں اور آثار خارجیہ کے اس پر ترتب میں کسی ضمیمہ کے ملانے کے محتاج ہوں یا کسی ضمیمہ کے ملانے کے محتاج نہ ہوں۔ تو اول ممکن ہے اور دوسرا واجب۔ اور ہم نے اپنے ذوق سے یہ ادراک کیا ہے کہ یہ ضمیمہ وہ موجود ہے جو موجودات کے ہیکلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ وہ شئے ہے جو قائم بذاتہ اور مقوم لغیرہ ہے اور فی نفسہ متعین نہیں ہے بلکہ لوگوں کے نزدیک آثار معلومہ کی ایک نوع کے ساتھ مختص ہے۔ لیکن اس کے تنزلات علمی وعینی ہیں۔ اس لیے ان تنزلات سے آثار خاصہ معلومہ کے ساتھ مختص و متعین ہو جاتے ہیں۔

اور اس کی تجلی کے تنزل کے اول مراتب جو اس کے نفس سے اس کے نفس کے لیے شان کلی سے ہوتے ہیں، یقینی طور پر اس سے شان خارج نہیں ہوتی۔ پھر اس کا تنزل علم میں نہ کہ عین میں اس شان کلی کی تفصیلات کی طرف ہوتا ہے۔ پھر اس کا تنزل ان تفصیلات میں عین میں ہوتا ہے جیسا کہ علم میں ہوتا ہے۔

اور ان کے نزدیک ممکنات کے حقائق اعتبارات و امور سے متعلق ذات منکرہ کی صورت ہے۔ پھر جب اس شان سے متعلق بنفسہ معلوم ہو گیا تو وہ ممکن کے لیے حقیقت ہو گئی۔ اور جب اس شان سے متعلق بنفسہ معلوم ہو گیا تو دوسرے ممکن کے لیے حقیقت ہو گئی

اور ممکنات کا وجود ان حقائق میں وجود کا ظہور ہے تو جب ممکن کے وجود کی شرائط جمع ہو گئیں اور اس کے وجود کے مواقع دور ہو گئے تو اس کے لیے نسبت خاصہ حادث ہو گئی جو اس وجود سے مجہول الکیفیت اور معلوم الآنیہ ہے، تو اس حقیقت کے لیے مخصوص آثار کے وجود سے صادر ہوا۔ اور اس نسبت خاص کے واسطہ سے اس کے وجود کا متقاضی ہوا۔ اس وقت کہا جاتا ہے "وجود کو تنزل ہو گیا، اور وہ متعین ہو گیا اور مظہر خاص میں ظاہر ہو گیا۔" اس لیے ظہور کا معنی آثار کی قسم کا اقتضا اس کی تمیز اور تعین ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اور مظہر شئے صورت محتملہ کی وہ صورت ہے جس سے اس کے احکام اور آثار کا تعین اور تعلق ہوا۔

میں کہتا ہوں یہ قول عقلاً و کشفاً صحیح ہے۔ تم جب کہتے ہو کہ معرکہ قتال میں متحقق صرف جسم ہوتا ہے، تو وہی قاتل ہوتا ہے، وہی مقتول، وہی آلہ قتل ہے، وہی سوار اور وہی سواری، وہی زین ہے، وہی تلوار ہے، وہی تیر ہے، وہی کمان، وہی نیزہ، وہی پھینکنے والا ہے، وہی پھینکا جانے والا، وہی مصیبت ہے، وہی مصیبت زدہ، وہی ظالم و غالب ہے اور وہی مغلوب و مظلوم۔ لیکن جسم ان ناموں سے کسی نام کا صرف کسی خاص کیفیت اور خاص معنیٰ میں ہی مستحق ہوتا ہے۔

اور ہم نے جب ان کیفیات کی طرف، قطع نظر ان کے جسم سے ملنے کے، دیکھا تو وہ معدوم تھیں۔ اور ان سے ان کے آثار صادر نہیں ہوئے۔ اور جب ان کی طرف جسم مل گیا تو وہ موجود ہو گیا۔ اور ان سے ان کے آثار صادر ہو گئے۔ اور جسم ان کیفیات کا محل اور ان کا حامل ہے جو وجود خارجی سے پہلے عقل و تقدیر میں ان معانی کے لیے تیار ہو گیا، پھر ان اشیاء کا وجود خارجی ہوتا ہے۔

اگر ان بہت ساری صورتوں کو جسم سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو وہ عدم محض ہیں۔ ان کا کوئی تحقق نہیں ہے۔ صرف موہوم صورت ہوتی ہے۔ اور اگر ضمیمہ کو ملا کر دیکھا جائے جو کہ جسم ہے تو موجود ہوتی ہے۔ پھر جب کبھی جسم تلوار بن گیا اور کبھی نیزہ ہو گیا تو اس کے اسباب وسیع ہو گئے۔ یعنی بڑھئی، لوہار، لکڑی، لوہا، آگ، لوہار کی بھٹی، درہ یا کوڑا، کلہاڑی اور آرا وغیرہ یہاں تک کہ معدوم کے درمیان موہوم حادث ہو گیا جو کہ تلوار اور نیزہ

ہیں، اور موجود کے درمیان جو کہ جسم ہے، نسبت معلوم الانیہ اور مجہول الکیفیۃ ہے۔ اس سے وہ معدوم وجود سے متصف ہوگیا۔ اس وقت تلوار اور نیزہ کے وجود کا معنی معدوم کا وجود سے اس طرح ربط ہونا ہے کہ اس کے لیے موجود سے اسم کا اشتقاق صحیح ہو جائے۔ اور جسم عام ہوگا جو بہت سی صورتوں کا احتمال رکھتا ہو۔ تو جب تلوار بن گئی اور تلوار ہونے کے احکام کاٹنا وغیرہ سے متعلق ہوگئی تو تعین خاص کے ساتھ متعین ہوگئی۔ اور احتمال والی کچھ صورتوں میں ظاہر ہوگئی، تو اس وقت کہا جاتا ہے، مظہر خاص میں ظاہر ہوگئی۔ اور وہ تلوار ہے۔ یہ سارا کلام صحیح ہوگا۔ کوئی سمجھدار اس سے انکار نہیں کرسکتا، سوائے اس کے کہ لفظی بحثیں وضع اور عرف کی طرف لوٹیں، جن کا ہمارے نزدیک کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تو جب تم جسم میں اس قدر کو سمجھ گئے تو یہ بھی سمجھ لو کہ موجود اس سے اولی ہے۔

پھر موجود کا معنی وہ ہے جو وجود سے متصف ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وجود صفت انتزاعی ہے، اس لیے ہم اس صفت انتزاعی کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ کیا اس کے لیے خارج میں منشاء انتزاعی ہے یا وہ بمنزلہ سانپ کے دانتوں یا چھلاوہ کے ہیں۔ بیشک بداہت عقل، اول کا حکم لگاتی ہے۔ اور احتمال ثانی سے منع کرتی ہے تو جب یہ حکم موجود ہوگا تو وہ وجود حقیقی کا حکم ہوگا۔ جو اولی سے انتزاع کا منشا ہے۔

اور جان لو کہ ثبوت وجود سے پہلے ہوتا ہے۔ اس لیے کتنے ہی معدوم ہیں جو ثابت اور متعین ہیں۔ اپنے احکام و آثار کے ساتھ مخصوص ہیں کہ حساب کرنے والا جب اعداد کے مراتب کو سمجھ لیتا ہے تو وہ اس میں طبعی قانون کے مطابق عمل کرتا ہے جو فی نفسہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کو مرتبۂ وجود سے مقدم یا موخر کردے، تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اور یہ وہ ثبوت ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں کہ وہ وجود سے پہلے ہے۔ اور وہ لامحالہ وجود خارجی کے علاوہ ہے۔ اگر غیر وجود ذہنی سے وہ تحقق مراد لیا جائے جو سمجھدار کی سمجھ سے حاصل ہوتا ہے، اور اگر اس سے اس کے علاوہ کچھ اور مراد لیا جائے تو اس کا احتمال ہے کہ وہ حقیقت ہو۔

اور جیسا کہ ہم نے اعداد کے مراتب میں ذکر کیا ہے، یہی حال ہر نوع وجنس کے احکام میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لامحالہ اگر کھجور پایا جاتا ہے تو اس کے پتے ایسے اور ایسے

ہوتے ہیں۔ اور اس کی چھال ایسی اور ایسی ہوتی ہے۔ اور اگر بیری کا درخت پایا جاتا ہے تو اس کے پتے ایسے اور ایسے ہوتے ہیں، اور اس کا پھل ایسا اور ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر قسم سے وہ احکام متعلق ہو گئے جو اس کے ساتھ خاص ہیں، اور اس کے لیے لازم ہیں، خواہ خارج میں پائے جائیں یا نہیں جیسا کہ ہمارے قول میں یہ لازم ہے لو لم یشاء اللّٰہ لم یخلق الخلق "اگر اللہ نہ چاہتا تو مخلوق کو پیدا نہ کرتا۔" صحیح ہے، اگر چہ یہ صورت بالکل بھی متحقق نہیں ہوتی تو یہ تعلق ظاہر ہے۔ اور یہ ملازمہ وجود خارجی سے پہلے نفس الامر میں واقع ہوتا ہے۔ اور جو چیز بھی خارج میں موجود ہے وہ یقینی طور پر ثابت ہے۔ اور ممتنع ثابت نہیں ہے، اس طرح ذہن کی اختراعات جن سے اختراع کا انقطاع منقطع ہوتا ہے، اور اس کا کوئی امام نہیں ہے جس کی اس کے تصور میں عقل اقتدا کرے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور بالجملہ وجود خارجی کا امر ثابت سے الحاق ہوتا ہے تو اس کو موجود کر دیتا ہے۔

اور ہم اس ثبوت اور اس وجود سے بحث کرتے ہیں خواہ ان دونوں کا منبع کچھ بھی ہو۔ تو جو ہمارے نزدیک واقع ہو گیا کہ وجود اس کا منبع ہے اور اس کا مصدر وہ وجود ہے جو موجودات کے ہیکلوں یا نفس رحمانی یا نفس کلیہ پر، ان کو تم جو چاہو کہہ لو، پھیلا ہوا ہے۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

"ہماری عبارتیں مختلف ہیں اور تمہارا حسن واحد ہے، اور ہر ایک اس جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

اور وہ ذات الٰہیہ سے صادر ہے۔ اور یہ کہ ثبوت اس کا منبع ہے جو وجود خارجی سے پہلے عالم عقل میں عالم کے لیے ذات الٰہیہ کا اقتضا ہے۔ اور اس کو صوفیا تنزل علمی کا نام دیتے ہیں اور علم سے مراد اشیاء کی صورتوں کا نقش ہونا نہیں لیتے۔ لیکن وہ اس سے اشیاء کا ایک بار مرتبۂ عقلیہ میں جو قائم بالواجب ہوتا ہے نہ کہ بنفسہ صدور، مراد لیتے ہیں۔ اور اس کو ہم ایک مثال سے بیان کریں گے۔

جب مہر کو پگھلے ہوئے موم میں رکھا جاتا ہے تو اس میں مہر میں لکھے ہوئے حروف نقش

ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ موم میں ظاہر ہونے والے حروف علت فاعلہ ہوتے ہیں اور وہ مہر ہے۔ اور علت قابلہ موم ہے۔ اور وہ ان دونوں کے اجتماع یا ایک کے دوسرے پر انطباق سے پائی جاتی ہے۔ لیکن مہر کے لیے استعداد ہوتی ہے۔ جو اس وقت سے اس میں قائم ہوتی ہے جب سے مہر بنی ہے کہ اگر اس پر کسی چیز کا انطباق کیا جائے، خواہ وہ موم ہو یا مٹی، اس سے اس شے پر حروف کی صورت جاری ہو جاتی ہے۔ تو جو چیز بھی انطباق کے وقت پائی جاتی ہے، وہ اس سے پہلے نفس الامر میں ثابت موم میں قائم ہوگی۔ اس طرح جو چیز بھی زمانہ میں پائی جائے گی وہ ذات الٰہیہ کے ساتھ ثبوت کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ وہ واجب کے لیے کمال اور اس کا مقتضا ہے، قائم ہوگی۔ اور یہی ہے جس کو صوفیا فیض اقدس اور حکماء عقل نام دیتے ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ عقل تمام موجودات خاصہ کو گھیرنے والی ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ حکیم صرف عقول افلاک کو سمجھتا ہے۔ اور وہاں چار اصولوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ذات الٰہیہ، اس سے صادر ہونے والی عقل، اس سے عقل کی شرط اور اس کے واسطہ سے صادر ہونے والا نفس کلیہ، اور وہ ہیولی جو نفس کلیہ کی شرط سے صادر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنے کسی کلام میں کہا ہے۔ "ذات صادر اول کے ساتھ اس موجود کی علت تامہ ہے جو مرتبۂ ثانیہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح ذات پہلی اور دوسری علت تامہ کے ساتھ تیسرا امر ہے۔"

اور جب بھی حس سے مشاہدہ کیا جاتا ہے یا عقل سے ادراک کیا جاتا ہے تو وہ ہیولی اور نفس کے درمیان واقع ہونے والے ملاپ سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے جو کہ نفس سے قریب ہے، اس میں اس کے احکام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس سے وہ مراد ہے جس میں ہیولی کے اکثر احکام ظاہر ہوئے۔ اور ہیولی صرف تشخص ہے۔ تو جب ان اشیاء کے صدور کا وقت آیا اور اس کی علت مکمل ہوگئی تو وجود ذات الٰہیہ کے ساتھ قائم کی جانب سے ثابت ہونے والی استعدادوں کے لحاظ سے ظاہر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قول سے اس معنی کو ظاہر کیا کہ ظاہر وجود باطن کے وجود کے حکم سے ظاہر ہوا۔ اور یہ کہ ظاہر وجود اور باطن وجود کے درمیان نسبت آئینہ واقع ہوئی جو مجہول الکیفیت ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اعیان نے وجود کی بو نہیں سونگھی۔ اور ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس سے جو آثار صادر ہوتے ہیں،

صرف وہ وجود ہیں لیکن وہ باطن وجود کے قانون پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اس قدر وحدت الوجود عقلاً وکشفاً ثابت ہے، اور اس کے گرد اہل عقل ودانش کی تمام جماعتیں گھومتی ہیں۔ تو ان میں سے جو لوگ کہتے ہیں کہ ذوات ذاتیہ میں متحد اور اوصاف میں مختلف ہیں، انہوں یہی معنی مراد لیا ہے۔ اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عالم ہیولی اولی میں متعین ہے اور صورت عامہ جسمیہ اس قاعدہ سے پوری طرح دور نہیں ہوتی اور اس قاعدہ کے مقدمات کا اس حیثیت سے اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا ادراک کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اور ہم نے پیچھے اس قول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شئے کا وجود اس کی حقیقت کا عین ہے۔ اس مسئلہ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور اس طرح کا یہ قول ہے کہ وجود صفت انتزاعیہ ہے جو اس سے نہیں ٹکراتی اور ہر قول کا ایک محمل ہے، جس پر انطباق ہوتا ہے۔

یہاں ایک مشکل مسئلہ باقی رہ گیا جو وحدت الوجود کی قائل جماعت کے لیے بہت دشوار ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ وجود عین ذات واجب ہے یا اس سے ابداع کے طور پر صادر ہوتا ہے۔ اس کے لیے محل نزاع کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ دونوں جماعتوں کا کلام تسامح، برداشت وچشم پوشی سے خالی نہیں ہے۔ تو دونوں قول خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انسان کا حال مختلف اعتبارات کی نسبت سے انسان سے ''شرط لا'' کے ساتھ ہو یا ''شرط شئے'' کے ساتھ اور ''لا بشرط شئے'' کے ساتھ، اس کے اس حال سے مختلف ہے جو اس کے افراد کی نسبت سے ہے۔ چنانچہ ہمیں اس میں شک نہیں ہے کہ حال اولی میں وحدت حقیقت اور کثرت اعتباریہ ہے۔ اور حال ثانیہ میں کثرت حقیقت اور وحدت اعتباریہ ہے۔ اور حال اولی میں انسان کلی ہوتا ہے۔ اور حال ثانیہ اس سے خارج ہوتا ہے۔ تو جب ہم نے شئے کے اپنے مظاہر اور اس کے بعض محتملات میں تعین کے ظہور کے مراتب میں غور وفکر کیا تو اس کو دو درجوں میں پایا۔ ایک وہ درجہ ہے جس سے صدور اور ابداع کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ درجہ جس کو تعین اعتباری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ان کے اقوال موجودات کے ہیکلوں پر پھیلے ہوئے وجود میں مختلف ہیں۔ چنانچہ شیخ صدرالدین قونوی نے اپنی کتاب مفتاح الغیب کے شروع

میں کہا ہے کہ وہ ذات الٰہیہ سے صادر ہوتا ہے۔ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے کہا کہ ذات الٰہیہ اور صادر اول میں فرق اعتباری ہے۔ تو شرح لمعات میں اس بارے میں سوال و جواب پیش کرنے کے بعد کہا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اس ذات کا فیض ممکنات کے حقائق پر پھیلنے اور عموم کی نسبت کے اعتبار سے جاری ہے اور یہ نسبت امور اعتباری ہے۔ اس لیے اس نسبت سے ماخوذ ذات امور اعتباری سے ہوگی اور فی نفسہ امور حقیقیہ سے۔

اور میرے نزدیک مذہب اول حق ہے۔ کیونکہ موجودات خاصہ کا امتیاز احکام اور ان کے فی نفسہ ثبوت میں اجل بدیہیات میں سے ہے۔ چنانچہ جس تنزل سے یہ اشیاء حاصل ہوتی ہیں، لامحالہ وہ منزلہ ثانیہ سے ہے۔ اگرچہ تنزل اور تعین کا اسم اس کو شامل ہوتا ہے۔ ورنہ افراد اور اس کی نوع کے درمیان فرق صرف اعتباری ہوتا ہے، جو اعتبار کے منقطع ہونے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ہر خاص و عام کے درمیان ہوتا ہے یہاں تک کہ معاملہ ذات الٰہیہ تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ نہ کہا جائے کہ صوفیا اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ حقائق امکانیہ وجود کے ساتھ لاحق اعتبارات و اضافات ہیں۔ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ صوفیا یہ کہتے ہیں ''آگ پانی کا غیر ہے، اور وہ دونوں ہوا کا غیر ہیں، اور یہ کہ انسان، گھوڑے کا غیر ہے، اگرچہ وجود ان سب میں شامل ہے۔'' وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس معنی کے اضافات اور اعتبارات مراد لیے ہیں جو اس تغایر سے مزاحم نہیں ہوتے جو احکام کے اختلاف کا منشا ہوتے ہیں۔ اور یہ معنی وہ ہے جس سے یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ کثرت حقیقی ہے اور وحدت اعتباری۔ اس لیے کہ ہم حقیقت کثرت سے صرف احکام کا امتیاز، آثار کا اختلاف اور حقائق کا تغایر مراد لیتے ہیں جو کہ موجودات کے ہیکلوں پر پھیلے ہوئے وجود واحد کی طرف ان سب کے عدم رجوع اور اصل وجود میں ان کے اختلاف کے لیے وجودات خاصہ ہیں۔ ہرگز نہیں، ان کا یہ قول تنزل کے لیے اثبات ہے اور ظہور تنزل کے دونوں درجوں میں سے ایک کے بغیر دوسرے منزلہ کے لیے اثبات نہیں ہے۔

اور صوفیاء نے جو یہ کہا ہے کہ عالم عین حق ہے تو انہوں نے اس سے ان موجودات خاصہ کی نفی مراد لی ہے جو مختلف مراتب کی طرف وجود کے تنزل سے حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ

انہوں نے تنزل اور ظہور کے معنیٰ کا افادہ مراد لیا ہے۔ تو جس طرح معقولی کہتا ہے کہ زید اور عمر ایک ہیں تو وہ اس سے نوع میں مماثلت مراد لیتا ہے، ہر اعتبار سے اتحاد مراد نہیں لیتا۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ انسان اور گھوڑا ایک ہیں تو حیوانیت میں اشتراک مراد لیتا ہے۔ اور جب کہتا ہے کہ شجاع، بہادر اور شیر ایک ہیں تو اس سے شجاعت و بہادری میں مشابہت مراد لیتا ہے۔ اسی طرح جب صوفیا کہتے ہیں کہ عالم عین حق ہے تو پھیلے ہوئے وجود میں پوری طرح عینیت مراد لیتے ہیں۔ اور پھیلے ہوئے وجود کا حق اول جد مجدہ کے ساتھ قیام پوری طرح امتیاز کی نفی نہیں ہے۔ کہنے والے نے کہا ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

"وجود کے ہر مرتبہ کا ایک حکم ہوتا ہے، اگر تم مراتب کا لحاظ نہیں کرتے تو کافر ہو۔"

اور جیسا کہ کہا ہے تنزل سے وہ معنیٰ مراد لیتے ہیں جس میں دونوں مرتبے عام ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرض کرو تم نے حق اول اور اس سے صادر ہونے والے کو ثابت کر دیا تو ضروری ہے کہ وجود اور تحقق میں یہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ موجود نہیں ہے۔ اور نہ اس لیے کہ وہ غیر موجود ہے۔ اور جب وجود میں وہ شامل ہوتا ہے تو کلام اس وجود میں جاری ہوتا ہے۔ اور لازمی امر ہے کہ وہ اول ہے اور یہ کہ وہ تمام مرتبوں میں ہے۔ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ وجود مفروضہ ہے جس کو عقل نے فرض کر لیا ہے جبکہ نفس الامر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سانپ کے دانتوں کے منزلہ میں ہے۔

اور اگر تم تفتیش کا حق ادا کرو گے تو اس مسئلہ کو یہ کہتا ہوا پاؤ گے کہ حادث اور قدیم کے درمیان تعلق صرف منزلۂ ثانیہ ہے۔ جس کو تعین اعتباری سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کو فطرت سلیمہ جو تصدیق پر عظیم الجثہ ہے، حقائق کے تحقق اور ان کے درمیان پائے جانے والے امتیاز سے رد کر دیتی ہے۔ اور فطرت اس مطلق تنزل کو رد نہیں کرتی، جو ابداع اور صدور وغیرہ سے صادق ہے۔ بلکہ اس کی طرف مجبور ہوتی ہے۔ البتہ ان اصولوں یعنی عقل، نفس اور ہیولی میں سے ہر ایک، ایک لحاظ سے دوسرے کا عین ہے اور ایک لحاظ سے غیر۔ اس طرح عقل ایک لحاظ سے عین

نفس ہے جیسا کہ ہم نے انگوٹھی میں قائم نقوش اور موم میں نقش، نقوش کی استعداد کے سلسلہ میں بیان کیا جو اس میں قائم ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح نفس ایک لحاظ سے عین ہیولی ہے۔

اور اس کی ہم ایک مثال اور بیان کرتے ہیں کہ جب تم اپنے نفس میں کسی کا تصور کرتے ہو تو کلیات اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ عقل یہ حکم لگا دیتی ہے کہ اس کا مثل صرف فرد واحد میں پایا جاتا ہے۔ پھر وہ جزئیہ خارج میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نفس اور ہیولی کے درمیان پایا جانے والا فرق اس طرح کا ہوتا ہے جیسا عقل کلی، جس پر عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ وہ فرد واحد میں منحصر ہے اور فرد جزئی کے درمیان ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک تشخص اور تعین کی صورت میں نفس کلیہ کے ظہور کے سوا ہیولی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو یہ اس ظہور کے باوجود ہیولی ہے۔ چنانچہ عارف جب اس عینیت کے بیان کا ارادہ کرتا ہے تو لازم ہوتا ہے کہ اس کو استعمال کرے، جس کا وہم فرق اعتباری سے ہوتا ہے۔ اور بالجملہ وہ کلمۂ حق ہے، جس سے باطل مراد لیا جاتا ہے۔

پھر شیخ مجدد نے اپنے مکتوبات میں کہا ہے کہ خارج میں موجود آٹھ صفات لازمی طور پر خارج میں ذات واجب سے ممتاز ہیں۔ اور ہر صفت کا ایک عدم ہوتا ہے جو اس کے مدمقابل ہوتا ہے۔ تو علم کا ایک عدم ہے اور جو اس کے مدمقابل ہے وہ جہل ہے۔ اور قدرت کا عدم جو اس کے مدمقابل ہوتا ہے عجز ہے۔ اور ان عدموں کا علم حق میں امتیاز ہے۔ تو اس امتیاز سے اسماء صفات کے آئینے اور ان کے انوار کے میدان ہیں تو ممکنات کے حقائق ان اسماء وصفات کے عکس ہیں جو ان کے مدمقابل عدم میں نقش ہیں۔ تو عدم ان ماہیات کے لیے بمنزلہ مادہ کے ہے۔ اور اسماء وصفات کے عکس مادہ میں پائی جانے والی صورت کے درجہ میں ہیں۔

چنانچہ شیخ ابن عربی کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ اسماء اور صفات ہیں جو علم میں ممتاز ہیں۔ اور شیخ مجدد کے نزدیک وہ عدم ہیں جن میں اسماء اور صفات کے انوار کا عکس ہوتا ہے۔ اور وہ عدم اور وہ عکس علم میں ہوتے ہیں۔ لیکن فاعل مختار جل مجدہ جب چاہتا ہے کہ کوئی ماہیت خارج میں پائی جائے تو اس کو وجود ظلی سے متصف کر دیتا ہے تب وہ وجود ظلی

سے خارج میں موجود ہو جاتی ہے۔

اور عالم کے سلسلہ میں ان کے اقوال مختلف ہیں۔ چنانچہ ایک بار کہا کہ وہ خارج میں وجود ظلی کے اعتبار سے موجود ہے۔ اور دوسری جگہ کہا وہ وہم میں موجود ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مرتبہ میں مستحکم کیا تو وہ موہوم مستحکم ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ لفظ حقائق الممکنات کا اطلاق چند معانی پر ہوتا ہے۔ ایک وجودات خاصہ کہ انسان کی ایک حقیقت ہے، اور گھوڑے کی ایک حقیقت ہے، اور گدھے کی ایک حقیقت ہے، اور یہ حقائق خارج میں امور متحققہ ہیں۔ اور اس طرح ممکنات کے حقائق وہ ہیں جن کا تعلق صاحب عقل آدمی اپنے نفس میں ان اسماء کے اطلاق کے وقت قائم کرتا ہے۔ اس کے سوا نہیں۔ اور اس اصل پر ان کا قول کہ ''اشیاء کے حقائق کا وجود ثابت ہے'' خارج ہو جاتا ہے۔

اور دوسرے امور ثابتہ جو حد ذاتہ میں موجود نہیں ہیں، اور نہ ہی معدوم ہیں تو جب یہ وجود ضمیمہ سے مل گیا تو موجود ہو گیا، ورنہ معدوم ہوتا۔ اور اس معنی میں حقائق وہ ہیں جن کو معقولی ماہیات کہتے ہیں۔ البتہ معقولی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے امور ہیں جو نہ موجود ہیں اور نہ ہی معدوم۔ اور ان کا قول ان امور کے ثبوت کے لیے اس حیثیت سے ہے کہ وہ جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ اور نہ ہی ان کے تعلق کو اول اوائل سے سمجھا۔ اور ان کا ثبوت فیض مقدس کے ساتھ ان کے وجود سے پہلے فیض اقدس سے ہے۔ اور وحدت وجود کے قائل صوفی کو ان حقائق ثابتہ اور ایک کے دوسرے سے تعلق اور وجود خارجی سے قبل مرتبہ عقلیہ ایک کے دوسرے سے مقدم ہونے کے بارے میں کشف ہوا، تو اس نے سمجھا کہ ذات مقدس نے اولاً اس کے نفس پر اس طرح تجلی فرمائی کہ خود ان کے نفس کو اور جو اس کے نفس اور اس کے ساتھ قائم اس کے کمال اور مختلف شکل میں ان کے مظاہر کے سامنے آنے کے امکان کو جانا اور ان کا یہ علم تحقیق کے وقت عین اقتضا ہے۔ اور علم سے مراد اشیاء کی صورتوں کا نفسوں میں نقش ہونا نہیں ہے۔

پھر جو مظاہر کلیہ فاعلہ، قاہرہ، مقدسہ کے لیے استعداد ہے ان کو اسماء کہا اور جو مظاہر جزئیہ، منفعلہ، مغلوب اور آلودہ کے لیے استعداد ہو اس کو اعیان ممکنہ کا نام دیا۔ اس اصطلاح کے اعتبار سے ممکنات کے حقائق، حق اول کے نزدیک صورت معلومہ ہیں۔

تیسرے معنی کے لیے ایک تمہیدی مقدمہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں گروپوں میں سے ایک دوسرے پر منطبق ہے تو جو کچھ اسماء میں ہے وہ ممکنات کے حقائق میں ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ ممکنات کے حقائق اور اسماء کے حقائق ان کے نزدیک ایک گروپ انتہائی قوت وکمال میں اور دوسرا انتہائی کمزوری اور نقصان میں مدمقابل ہے اور ضعف بعض ان قوتوں کا عدم ہے جو قوی میں پائے جاتے ہیں۔ اور نقصان بعض ان امور کا عدم ہے جو مکمل میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اصل میں ایک لحاظ سے اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس طرح بلاشبہ وہاں اصل امر دونوں جانبوں میں سے ایک میں بوجہ اتم ثابت ہے۔ جبکہ دوسری جانب میں عدم سے ملا ہوا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ جس نے اس درجہ میں اسماء کے ملانے اور ممکنات کی فرعیت کی تعبیر کا ارادہ کیا، اس کے لیے دو عبارتیں ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق اسماء اور صفات ہیں۔ جو مرتبہ علم میں ممتاز ہیں اور دوسرے یہ کہ ممکنات کے حقائق ان اسماء اور صفات کے عکس ہیں جو اس کے مقابلہ میں عدم میں نقش ہیں۔ اور دونوں عبارتوں میں صرف ایک ضعیف سا فرق ہے جس کا اشیاء کے حقائق کی تحقیق کرنے والوں کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

چوتھے معنی کے لیے بھی ایک مقدمہ کی تمہید کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ صوفیاء اولیٰ کو معشوق کہتے ہیں۔ اور ثانی کو عاشق اور مرتبہ علیا تمام میں ظاہر ہے عشق ہے۔ اور یہ صاحب اللمعات کی اصطلاح ہے۔

پھر یہ کہ معشوق اپنے عاشق کے قریب ہوتا ہے اور اس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اس لیے جس سالک پر اس کا یہ حال غالب ہوتا ہے، اس کو مجذوب، مراد اور محبوب کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ مراتب وجوبیہ کی طرف عنایت نے ان کو اس طرح کھینچا کہ وہ جانتے نہیں تھے تو ان کو اس کی طرف ہدایت کی جس نے ان کو پیدا کیا۔ اور فنا ہونے والوں کا حال یاد دلایا کہ ان کا رب جس نے ان کو پیدا کیا، وہ ان مذموم امور سے پاک و منزہ ہے۔

اور عاشق اپنے معشوق کی طرف ترقی کرتا ہے، اور ریاضات بدنی ونفسانی اور تجرید وجہ روح کے ذریعہ اس کی طرف چلتا ہے۔ چنانچہ جس سالک پر اس کا یہ حال غالب ہوتا ہے، اسے سالک، مرید اور محب کہا جاتا ہے۔ اور کبھی معشوق قریب ہوتا ہے اور عاشق ترقی کرتا ہے تو درمیان میں دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اس سالک کو دونوں جانب کی قربت پیش آتی ہے۔ اس لیے اس کو سالک مجذوب، محب، محبوب اور مرید مراد کہا جاتا ہے۔

اور اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ شخص اکبر کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے اور اس تجلی کے لیے حظیرۃ القدس میں انبساط اور انشراح ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے ملاء اعلیٰ میں عکس اور میدان ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس تجلی پر ننانوے نام منطبق ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس تجلی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً ارادہ ہوتا ہے۔ علم متجدد، رضاء متجدد اور ناراضگی متجدد ہے۔ تو یہ تجلی اپنے دائرہ میں موجود کے ساتھ وہی ہے جس کو وہ معشوق کہتے ہیں۔ اور وہ اس کو معشوق اس لیے کہتے ہیں کہ نفوس بشری اس کی طرف اس طرح کشش رکھتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اور اس کا ذکر ہم نے اس مقالہ کے شروع میں کیا تھا۔ اور اس کی طرف سیر وسلوک ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ وصال ہوتا ہے جس کو صوفیا چاہتے ہیں۔

اور اسباب نفی اس طرف چلتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کا انتخاب چاہتا ہے۔ اور وہ اس کے نفس کی حد سے گزرنے تک جاری رہتا ہے۔ اس سے جس امر کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ اس کو نہیں سمجھتا، اس لیے اس کو مراد کہا جاتا ہے۔ اور اس سے ریاضات بدنیہ اور تجرید وجہ روح کا قصد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتصال ظاہر ہوتا ہے جو اس کی اصل جبلت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو مرید کہا جاتا ہے، اور وہ کبھی حق کی پسند کو محسوس کر لیتا ہے، اور اپنے نفس سے سعی کرتا ہے۔ اور اس کو بہت سے مراحل پیش آتے ہیں، ان میں سے بعض میں اس کی سعی متقدم ہوتی ہے، اور دوسرے بعض میں غیب سے خلاف مرضی ہونا غالب ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دو جہت میں سے ایک حالت میں محسوس کرتا ہے۔ تو دونوں مرتبوں میں جامع اور دونوں مرتبوں میں امام ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کبھی اس پر اس تجلی کی کوئی وجہ غالب ہوتی ہے۔ اور وہ اس وجہ سے مجذوب ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایسے اور ایسے اسم سے متحقق ہو گیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کا رب اسماء کے درمیان سے ایسا اور ایسا اسم ہے۔

اور بالجملہ اعیان ثابتہ میں اس کی استعداد کی اصل کو پہنچاننے والا سمجھتا ہے۔ اور جو اسم اسماء کے درمیان سے اس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت نے رحمٰن کے اسم کو متعین کر دیا اور شیخ مجدد اپنے بہت سے مکتوبات میں اس قول کے معترف ہیں۔

اور بالجملہ یہ قول ''حقائق ممکنات اپنے مدمقابل عدم نقش اسماء کے عکس ہیں''۔ شیخ ابن عربی اور ان کے پیروکاروں کے کلام کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس معنیٰ میں ان کی کتنی ہی تصریحات اور اشارے ہیں۔ اور ہم نے وجہ مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کا قول نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تفصیل ان کی تصریحات اور اشاروں کے بیان میں موجود ہے۔ اور یہ قول کہ ممکنات کے حقائق اس معنی میں اسماء ہیں کہ اسماء وجود سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور طرف مقابل میں ان کا سایہ ہے حتیٰ کہ اعیان ممکنات کہا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں کہ اس کا پہچاننے والا اسماء کا رب ہے اور یہ اس کی حقیقت ہے جو اس کی طرف راجع ہے۔ شیخ مجدد کے کلام کے مخالف نہیں ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کے کلام سے خود ان کے کلام کے خلاف بہت سے دلائل قائم کر دیں۔

شیخ مجدد کے کلام کا محمل یہ ہے کہ انہوں نے شیخ ابن عربی اور ان کے پیروکاروں کے کچھ مقالات پائے، تو ان کو اپنے وجدان کے خلاف پر محمول کیا۔ اور یہ علمی لغزشیں ہیں، کشفی کمزوریاں نہیں ہیں۔ اس طرح کی لغزشوں سے علماء پاک و خالی نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی ان کے مقامات کی بلندی پر ان سے کچھ اثر پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں کوئی چھوٹی موٹی علمی لغزش پائی جائے۔ اور یہ جو ان کا قول ہے کہ آٹھ صفات کے امتیاز کو صوفیا تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے نزدیک عین واجب ہے، وہ اس معنی میں ہے کہ ذات اس کے لیے کافی ہے۔ اور متکلمین کے نزدیک کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس پر دلالت کرے، نہ نقلی اور نہ ہی عقلی۔ جہاں تک اول کا

تعلق ہے تو اس باب کی غایت یہ ہے کہ وہاں ایک ایسی حقیقت ہے جس پر عرف اور لغت کے لحاظ سے سمیع اور علیم وغیرہ کا اطلاق درست ہوتا ہے۔ ان کا صفات متغائر ہونا ہرگز نہیں ہے۔

اور جس نے اپنے نفس کے ساتھ انصاف کیا، اس نے سمجھ لیا کہ لوگ جب صفات کے افعال اور اسماء کا استعمال کرتے ہیں تو وہ صفات کے امتیاز اور اس کی ذات پر اصلاً زیادہ ہونے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ وہ صرف آثار کے صدور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو جو شخص کسی چیز کو دیکھتا ہے کہ وہ حرکت کرتی، چلتی اور احساس کرتی ہے تو ان آثار کی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ یہ زندہ ہے۔ اور اس امر کی طرف التفات نہیں کرتا کہ حیات صفت زائد ہے یا یہ حیوان کے لیے ذاتی ہے، اسی طرح کی فلسفہ کی دوسری دقیق باتیں ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ عقل یہ شہادت دیتی ہے کہ اس کا اس طرح موجود ہونا ہے جس سے یہ آثار صادر ہوں۔ اور وہ صفات کی زیادتی میں منحصر ہیں لیکن جس نے اپنے نفس کے ساتھ انصاف کیا، اس نے سمجھ لیا کہ صفات کا ان اعراض کے منزلہ میں ہونا جو اپنے محل میں ہیں، اور اپنے موصوفات کے ساتھ قائم ہیں، تشبیہ اعظم ہے۔ تو اگر کسی نے کہا کہ یہ اہل سنت کا مذہب ہے تو اس کا قبول کرنا ضروری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اہل سنت وہ اہل قرون ہیں جن کے لیے خیر کی شہادت دی گئی ہے۔

اور ان میں سے کسی سے جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ اس نے صفات کے بارے میں کلام کیا کہ وہ زائد ہیں یا نہیں، اگر زائد ہیں تو کیا وہ امور انتزاعیہ ہیں یا خارجیہ؟ اور یہ متاخرین کا فرقہ ہے جس نے خود ہی یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اہل سنت ہیں۔ تو اس بنیاد پر ان کا یہ قول دین میں بدعت اور اختراع نہیں ہوگی کہ سلف میں یہ بات کسی نے نہیں کہی۔ جبکہ ہم کثیر تعداد میں ہیں اور وہ بہت کم ہیں۔

اور اسی طرح ان کے اقوال کا اختلاف اس امر میں ہے کہ عالم وجود ظلی کے ساتھ موجود خارجی ہے یا موہوم مستحکم ہے، تھوڑے فائدہ والا اختلاف ہے، اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ وجودات خاصہ اس طرح متحقق ہیں کہ ان سے ان کے آثار صادر ہوتے ہیں، خواہ اس تحقق کو وجود خارجی کا نام دیا جائے یا وجود وہمی مستحکم کا۔

اور اگر تم خالص حق کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ ذات الٰہیہ اپنی ماہیت کے لحاظ سے زیادہ واضح ہے کہ وہ خارج میں ہو یا اعیان میں۔ اس لیے کہ خارج نفس رحمانی کا اسم ہے۔ اور اعیان میں اس سے کنایہ ہے۔ ہاں حق کے لئے تجلی عظیم ہے جو خارج میں ہے۔ اور حق کا یہ وصف بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خارج میں ہے یا اس تجلی کی شرط کے ساتھ عماء میں ہے۔

اور اگر تم ان تمام اقوال کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہو تو میں ان میں سے صرف تعبیر کی جہت سے انکار کرتا ہوں یا شئے کے غیر محل میں ذکر کی حیثیت سے۔ ورنہ وہ کہو جس کی طرف صاحب کشف نے اشارہ کیا ہے۔ جس کی اصلاً کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

آٹھ صفات والے قول کے لیے ایک وجہ وجیہ ہے۔ وہ یہ کہ نفس رحمانی کے اوائل میں ذکر کی ایک شکل ہے۔ اور تجلی اعظم کا نام اشاعرہ کے نزدیک صفات رکھا جاتا ہے۔ اور اس لیے انہوں نے ان کا صدور ایجاب سے قرار دیا ہے۔ اور ان کے قدیم ہونے کو زمانہ سے تعبیر کیا ہے۔ الا یہ کہ انہوں نے شئے واحد کے جہات اور اعتبارات کے لحاظ سے مختلف نام رکھے ہیں۔ اور جہات میں کتنے ہی اختلاف لوگوں کے دلوں میں متوجہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس کو حقائق کے اختلاف کے باب سے گمان کرتے ہیں۔ جیسے سفیدی اور سفید وہ دونوں حقیقت میں ایک ہیں۔ الا یہ کہ سفیدی اس کا نام اس حیثیت سے ہے کہ وہ بغیر کسی شرط کے ماخوذ ہے۔ اور ابیض سفید اس کا اس حیثیت سے نام ہے کہ وہ شئے کی شرط کے ساتھ ماخوذ ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس کا نام اس حیثیت سے حیات رکھا ہے کہ وہ ایسی صفت ہے جو بنفسہ اور ممکنات کے حقائق سے علم کی اتباع کرتی ہے، اور علم اس حیثیت سے کہ اس میں حقائق الاشیاء اس کے خارج میں ہونے سے پہلے شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور قدرت اس حیثیت سے کہ اس سے خلق الخلائق جاری ہوتی ہے اور ارادہ اس حیثیت سے کہ وہ تجلی اعظم ہے۔ اس سے متساوی اشیاء میں سے کسی ایک کی تخصیص ظاہر ہوتی ہے۔ اور کلام اس حیثیت سے کہ اس سے انبیاء اور ملائکہ کے قلوب پر وحی نازل ہوتی ہے اور سمع و بصر اس ہیئت سے کہ وہ دکھائی دینے والی اور سنی جانے والی اشیاء کے انکشاف کا مبدا ہے۔

اور اس طرح میرے نزدیک مولانا عبدالرحمٰن جامی کا کلام مسلم ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود حقائق کے میدانوں میں ان کے ملنے کی نفی ہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اس معنیٰ میں وجود حق کے اضافات واعتبارات ہیں کہ وجود اس میں ظاہر ہوا اور اس سے متعین ہوا۔ فرق اعتباری کے معنی میں نہیں۔ اور جب ہم نے جواب مکمل کر دیا تو اب رسالہ کو ختم کرتے ہیں۔ والحمد لله رب العالمين اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين. آمين

۳۲۶-تفهيم:

ایک آدمی کو بیعت وارشاد اور درس وغیرہ کی اجازت

الحمد لله رب العالمين الذى اصطفى من عباده العلماء الراسخين والعباد المخلصين، وجعلهم ورثة الأنبياء والمرسلين، واخذ منهم ميثاقاً ان يهتدوا بهدايتهم فى امر الدنيا والدين. نحمدهٗ ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، واشهد ان لا إله إلا الله وحده لا شريک له، واشهد ان سيدنا محمد اعبده ورسوله، ارسله بالحق بشيرا ونذيراً ،صلى الله عليه وعلى آله واصحابه وبارک وسلم تسليماً كثيراً تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ جس نے اپنے بندوں میں سے پختہ علم والے علماء اور مخلص بندوں کو منتخب کیا اور انہیں انبیاء اور رسولوں کا وارث بنایا۔ اور ان سے یہ عہد لیا کہ دنیا اور دین کے معاملہ میں ان کی ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔ ہم اس کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، اسی سے مدد طلب کرتے ہیں، اور اسی سے مغفرت چاہتے ہیں، اور اپنے نفسوں کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ ہدایت دے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور جس کو وہ گمراہ کردے پھر اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس

کے بندے اوراس کے رسول ہیں۔آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اورڈرانے والا بنا کر بھیجا۔اللہ درود و رحمت فرمائے آپ پر اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر۔اور برکت فرمائے اور پوری طرح سلامتی فرمائے۔اما بعد! عبد ضعیف،اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم تغمدهما الله بفضله الجسیم کہتا ہے کہ اللہ عزوجل نے مولانا محقق وعالم وعلم وزہد اور یقین وتصدیق میں مدقق راسخ پر جو اپنے نام ہی کی طرح بدرالحق ہیں،اور جو اللہ کے پاس ہے،اس کی سچی طلب،حسن جزاء اور سمت صالح وقویم سے کثیر، وافر نعمتیں فرمائیں۔ ان میں سے سب سے جلیل القدر کتاب وسنت کا علم اور دنیا کی آرائشوں میں زہد وقناعت،قویم اور صراط مستقیم کے سلوک میں عزیمت اور عمل میں اخلاص اور علم میں سلامتی ذہن اور اللہ عزوجل سے قلب کے تعلق سے جو کچھ اللہ کے پاس ہے،ان سب میں رغبت صادقہ ہے۔

اور ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر وہ ہے جس کو اللہ نے ان کی طرف اولیاء کرام اور صالحین اخیار کی صحبت سے چلایا۔خاص طور سے شیخ طریقت وامام حقیقت سیدی والدی جن کے اوپر عظیم احوال کا فیضان فرمایا۔اور ان کے ہاتھ پر کرامات کبریٰ ظاہر فرمائیں۔اور جو طریقت اور علم وتقویٰ میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت اور ہمارے شیخ اجل عبدالرحیم بن وجیہ الدین دہلوی اور میرے دادا،میرے والد،میرے بھائی جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے خلق کثیر کو علم وطریقت میں ہدایت فرمائی۔اور شیخ محمد بن عاقل بن ابوالفضل پھلتی جزاهما الله عنا وعن سائر المستفيدين خير الجزاء۔ اور یہ اللہ کی رحمت وہدایت کی علامت ہے جیسا کہ کہا گیا ہے جس نے کامیاب کو نہیں دیکھا،وہ کامیاب نہیں ہوا۔چنانچہ ان دونوں کی صحبت اور خدمت کا شرف ایک طویل زمانہ نے حاصل کیا۔ان کے ذریعہ ادب سیکھا اور بہت سی چیزوں کا علم حاصل کیا۔

اور ان میں سے جلیل القدر وہ ہے جو میرے دل میں ڈالا کہ وہ سنت سنیہ کے داعیوں میں سے ہیں۔اور وہ اس لائق ہیں کہ لوگوں کو تین چیزوں کی دعوت دیں۔عقیدۂ صحیحہ: جس کا استنباط سنت اور عمل قدیم سے ہوا ہے جو صحیح احادیث،پھر ان کی تفسیر اور ان

فقہاء کرام کی، کی ہوئی ان کی شرح سے ماخوذ ہے جو سنت کے زیادہ مطابق ہے۔ اور ظاہر حدیث سے زیادہ قریب ہے اور اس شان واخلاق والوں کے نزدیک عبادت میں ان کا معروف طریقہ جس کو اللہ نے ان کی عادت بنایا یہ ہے کہ وہ صرف مشائخ طریقت سے منقول اشغال کی محنت اور دوام اور ان کے ساتھ صحبت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کے تعلق پر ایثار، محبت اور تعظیم کے معنیٰ میں پابندی کے سوا متحقق نہیں ہوا، یا کم متحقق ہوا۔

تو اب میں ان کو اجازت دیتا ہوں کہ توبہ کی توثیق اور عہد کی تاکید کرتے ہوئے بیعت کریں۔ جیسا کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا۔ اور جس طرح مشائخ صوفیاء نے بیعت کی۔ اور یہ کہ ان اشغال کی تلقین فرمائیں جو ہمیں ہمارے مشائخ نقشبندیہ سے ملے۔ جیسا کہ مجھے میرے والد قدس سرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ روایت کرتے ہوئے، ان کی اجازت دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مبشرات میں دیکھا اور آپ سے بیعت کی۔ اور آپ سے نفی واثبات اخذ کیا۔ اور آپ کی صحبت کے نور سے منور ہوئے۔ اور اس سے مخلوق کو حق کی طرف دعوت کا حکم فرمایا۔ اور مزید سید عبداللہ سے انہوں نے شیخ آدم بنوری سے اور انہوں نے شیخ احمد سرہندی سے روایت کیا۔

اور طریقہ نقشبندیہ شیخ خواجہ محمد باقی سے اور جیلانیہ (سلسلہ قادریہ) اپنے والد شیخ عبدالاحد سرہندی سے، انہوں نے شاہ کمال کیتھلی نیز خلیفہ ابوالقاسم سے، انہوں نے ملا ولی محمد سے، انہوں نے امیر کبیر ابوالجلا سے۔ نیز روحانیت اپنے جد مادری نانا شیخ رفیع الدین سے، انہوں نے اپنے والد قطب العالم سے، انہوں نے نجم الحق سے، انہوں نے شیخ عبدالعزیز سے، انہوں نے قاضی خاں یوسف ناصحی سے، انہوں نے مشائخ چشتیہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے۔ اور میں نے انہیں یہ بھی اجازت دی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک وغیرہ کا درس غور وفکر اور مطالعہ اور شروح اور فن کے اکابر کے کلام کے تتبع کے بعد دیں جیسا کہ مجھے اس کی اجازت میرے والد قدس سرہ نے اپنے سامنے صحیح بخاری سے کتاب العلم پڑھنے کے وقت دی۔ جو ان کی اسناد میر زاہد بروایت مرزا فاضل بروایت شیوخ کثیرہ سے ان میں

ملا یوسف کوسج بھی شامل ہیں۔ اور جیسا کہ مجھے ثابت شدہ ثقہ الحاج محمد افضل نے شیخ عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے، انہوں نے اپنے دادا شیخ احمد سرہندی سے ان اسناد طویل سے اجازت دی جن کے لیے اس ورق میں گنجائش نہیں ہے۔ اور وہ مشکوٰۃ المصابیح اور صحیح بخاری وغیرہ کتب ستہ پر ان کے مقامات میں مذکور ہے۔ اور یہاں میں کہتا ہوں کہ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے تو جس نے ان سے بیعت کی اور ان سے طریقہ اخذ کیا تو گویا اس نے مجھ سے بیعت کی۔ اور جس نے مجھ سے اخذ کیا، اور مجھ سے بیعت کی تو گویا اس نے میرے والد سے بیعت کی۔ اور ان سے اخذ کیا۔ اور جس نے میرے والد قدس سرہ سے بیعت کی اور ان سے اخذ کیا تو گویا اس نے رسول اللہؐ سے بیعت کی اور آپ سے اخذ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إن الذين يبايعونك انما يبايعون اللّٰه، يد اللّٰه فوق أيديهم، فمن نكث فإنما ينكث على نفسه، ومن اوفى بما عاهد عليه اللّٰه فسيؤتيه اجراً عظيماً** "اے نبی! جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ (الفتح: ۱۰)

اور میں ان پر سنت کے لیے حرص اور بدعت سے اجتناب اور دنیا میں زہد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور سلف میں سے علماء اور صوفیا سے ادب و تہذیب اور اخلاق سیکھنے اور اپنے تمام امور میں ان کی سیرت سے اخذ کو لازم کرتا ہوں۔ اور یہ کہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں، اگر شرط کو پورا کریں گے تو یہ ان کے ساتھ میرے گمان کے مطابق ہے۔ اور اگر عہد شکنی کریں گے تو **فسيعلم الذين ظلموا اى منقلب ينقلبون** "جن لوگوں نے ظلم کیا وہ جلدی ہی جان لیں گے کہ کس انجام کی طرف پلٹتے ہیں"۔ **والحمد للّٰه اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً والصلوٰة والسلام على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين.** ہم نے یہ سطور ۲۲ ربیع الاول، بروز دوشنبہ ۱۱۴۲ھ کو لکھیں۔

۳۲۷- تفہیم:

انبیاء واولیاء کے انوار کے ظہور کی صورت

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندہ پر انوار الغیوب کا فیضان کیا، اور اس کو ہر جہت سے خیر کے لیے قانون بنا دیا، سوائے اس کے کہ اس صفت کا ظہور مخلوقات کے اوپر کچھ وقت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انبیاء صلوات اللہ علیہم کے معانی شدت اور مدت کے بعد ظاہر ہوئے۔ یہی معاملہ ان کے اہل کمال ورثاء کا ہے۔ اور کتنے نبی ہیں کہ ان کے انوار ان کے اپنے راستہ پر جانے کے بعد ظاہر ہوئے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روئے زمین کے مشارق ومغارب دکھائے گئے، پھر ان کی کنجیاں عطا کی گئیں، اور آپ سے کہا گیا کہ کسریٰ ہلاک ہو گیا تو آپ کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوا۔ اور یہ کہ قیصر ہلاک ہو گیا تو آپ کے بعد کوئی قیصر بھی نہیں ہوا۔ اور یہ فتوح آپ کے اپنے راستہ پر جانے کے بعد ہی ہوئیں، تو جان لو کہ ہر شئے کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

مدتی این مثنوی تاخیر شد
مدتی بائست تاخون شیر شد

''اس مثنوی میں ایک مدت کی تاخیر ہوگئی، خون کے دودھ بننے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

۳۲۸- تفہیم:

وصایا اپنی اولاد واحباب کے لیے

الحمد للہ ملھم الحکم ومفیض النعم والصلوٰۃ والسلام علی سید العرب والعجم۔ وعلی آلہ وصحبہ اھل الفضل والکرم۔ ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا فیضان کرنے والا ہے۔'' اور صلوٰۃ وسلام ہوں سید العرب والعجم پر اور آپ کی آل واصحاب پر جو اہل فضل وکرم ہیں۔ اما بعد! فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ یہ چند کلمات ہیں کہ اپنی اولاد واحباب کو ان کے ذریعہ وصیت

کرتا ہوں۔ میں نے اس کا نام مقالہ وضیئہ فی النصیحۃ والوصیۃ رکھا ہے۔
حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل وھو الھادی إلی سواء السبیل.

وصیّت اول: یہ فقیر اعتقاد و عمل میں کتاب وسنت پر اور دونوں کی تدبیر میں ہمیشہ مشغول رہنے اور روزانہ دونوں میں سے ایک حصہ پڑھنے پر زور دیتا ہے کہ اگر پڑھنا بس کا نہ ہو تو دونوں میں سے ایک ورق کا ترجمہ سنیں۔ عقائد و مذہب میں قدماء اہل سنت کا طریقہ اختیار کریں اور اسلاف سے جو تفصیل و تحقیق چلی آرہی ہے، اس میں نکتہ چینی نہ کریں۔ اعراض سے کام لیں، اور معقولیوں کے پیدا کردہ شکوک خام کی طرف التفات نہ کریں۔ اور فروع میں علماء محدثین کی پیروی کریں، جو فقہ و حدیث کے جامع ہیں۔ اور تفریعات فقہیہ کو کتاب وسنت پر پیش کریں، جو ان کے مطابق ہو۔ اس کو قبول کریں۔ ورنہ برائیوں کو پس پشت ڈال دیں۔ امت کو کسی بھی وقت اجتہادی امور کو کتاب وسنت پر پیش کرنے سے استغنا نہیں ہے۔ اور فقہاء کی آلودہ باتوں سے کسی عالم کی تقلید کے لیے سند لینا سنت کے تتبع کو ترک کرنا ہے، نہ انہیں سنیں اور نہ ان کی طرف التفات کریں۔ اور اس دور میں قربت خداوندی تلاش کریں۔

وصیّت دیگر: امر بالمعروف کی راہ اختیار کریں۔ چنانچہ اس فقیر کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ فرائض اور کبیرہ گناہوں اور شعائر اسلام میں امر معروف و نہی منکر سے متعلق سختی سے کام لیں۔ اور اس باب میں جس سے بھی تساہل دیکھیں، اس کی صحبت اختیار نہ کریں اور اس کا دشمن ہو جانا چاہیے۔ اور تمام امور میں خصوصاً جن میں سلف یا خلف نے اختلاف کیا ہے، امر معروف و نہی منکر اس حدیث کا پہنچا دینا ہے، اور بس۔ اس میں سختی کرنا مستحسن نہیں ہے۔

وصیّت دیگر یہ ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ ہرگز نہ دیا جائے، اور ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے اور نہ غلو عام سے اور نہ ہی کرامات سے دھوکا کھائیں۔ اس لیے کہ اکثر غلو عام رسم کی وجہ سے ہے۔ اور امور رسمیہ کا حقیقت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے تمام کرامات فروش، الا ماشاء اللہ، طلسمات و فریب کو کرامات سمجھتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زیادہ مشہور زیادتیاں بھلے لوگوں کے

خوارق دلوں پر ہیں۔ اور آئندہ کے واقعات کا انکشاف اور بھلی باتوں اور کشف کے بہت سارے طریقے ہیں۔ ان میں سے علوم نجوم ورمل کے باب میں اٹکل پچو کے طور پر گھمنڈ میں مبتلا نہ ہوں، کہ نجوم میں حکم، تسویۂ بیوت پر موقوف ہے۔ اور رمل کو زائچہ درکار ہے۔ ہم تجربہ کر چکے ہیں کہ فن نجوم کے ماہر کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون سا دقیقہ ہے، اس وقت سے اس کا ذہن نصیب وقسمت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور کواکب کے تمام مواضع وبیوت اور ان کے احکام اس کے دل ودماغ میں صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا کہ تسویۃ البیوت کا صفحہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس طرح فن رمل کا ماہر کبھی اپنے دل میں خود طے کر لیتا ہے کہ فلاں انگشت کو داڑھی قرار دیتا ہے، اور فلاں انگشت کو فلاں شکل مانتا ہے، اور ذہن میں اس کی ایک صورت مقرر کر لیتا ہے کہ ان شکلوں سے کیا بنتا ہے، حتیٰ کہ زائچہ اس کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ اور انہی میں سے اپنی تمام انواع کے ساتھ باب کہانت ہے، کبھی جن کو حاضر کر کے اور کبھی اس کے بغیر۔ اور انہی میں سے باب طلسم ہے کہ کواکب کو ایک صورت میں بند کرتے ہیں۔ اور اس سے بھلائی حاصل کرتے ہیں۔ اعمال جوگ کہ بعض ملاحظات جوگیہ کی اشراف وکشف میں ایک پوری خاصیت ہے۔ جو اس کی تحقیق چاہتا ہے، وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرلے۔ اور کسی کام کی ہمت باندھنا، اور ہولناک شکل میں برآمد ہونا، اور دل کو کسی کے دل پر رکھنا، اور طالب کو مسخر کرنا سب طلسم وفریب کے فنون سے ہیں۔ ان کاموں میں کچھ ملاحظے ہیں جن سے کچھ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ صلاح وفجور، سعادت وشقاوت اور مقبول یا مردود ہونا اس جگہ کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔

اور اس طرح اس حالت میں وجد وشوق اور قلق وتاثیر کا حاضرین میں منشا قوت بہیمیہ کی حدت ہے۔ لہٰذا جس کی قوت بہیمیہ جتنی زیادہ قوی ہو گی اس کا وجد بھی اتنا ہی زیادہ قوی ہو گا۔

ہاں ان اعمال اور احوال کو بعض صالح لوگ بھی نیک نیتی سے کرتے ہیں اور وہ ان کو اس حد تک نہیں گردانتے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ اور بہت سارے سادہ لوح افراد کو ہم نے دیکھا ہے کہ جب ان اعمال کو شیخی میں آکر سیکھتے ہیں تو ان کو عین کرامات سمجھتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری و مسلم و سنن ابوداؤد و ترمذی اور کتب فقہ حنفیہ و شافعیہ کو پڑھیں۔ اور ظاہر سنت پر عمل کی پابندی کریں۔ اگر حق سبحانہ ان کے دل میں شوق صادق پیدا فرمائیں، اور اس راہ کی طلب غالب ہو تو کتاب عوارف، نماز، روزہ و اذکار اور ہر وقت کی مصروفیت کے آداب کو پیش نظر رکھیں، اور رسائل نقشبندیہ سے یادداشت پیدا کرنے کے طریق میں سعی کریں۔ اور اس سلسلہ میں بزرگوں نے ان دونوں بابوں کو واضح شکل میں لکھا ہے کہ کسی مرشد کی تلقین کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جب عبارت کے نور کی کیفیت اور یادداشت کی نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی پابندی کریں۔ اگر اس دوران کسی عزیز کو احساس ہو کہ اس کی صحبت کا نتیجہ جذب ہے۔ اور اس کی صحبت کی تاثیر لوگوں میں اختیار کی جانی چاہیے۔ تو اس کی صحبت اختیار کریں۔ حتیٰ کہ مطلوبہ حالت ملکہ بن جائے۔ اور اس کے بعد ایک گوشہ میں بیٹھ جائے اور اس ملکہ میں مشغول ہو جائے۔ اور اس زمانہ میں الا ماشاء اللہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ تمام اعتبارات سے کمال کا حامل ہو۔ اگر کسی شخص کو ایک لحاظ سے کمال حاصل ہے، تو دوسری وجہ سے خالی ہے۔ چنانچہ اس کمال کو حاصل کر لینا چاہیے اور دوسری چیزوں سے چشم پوشی کرنی چاہیے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر. "جو اچھا ہے وہ لے لو اور گدلے کو چھوڑ دو۔" صوفیاء کی نسبت غنیمت کبریٰ ہے۔ اور ان کی رسوم و روایات کسی کو آزردہ نہیں کرتیں۔ یہ بات بہت سے لوگوں پر گراں گزرتی ہے لیکن میرا کام کہہ دینا ہے۔ اور حسب حال بات کہنی چاہیے اور زید و عمرو کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔

وصیّت دیگر جاننا چاہیے کہ ہمارے اور اہل زمانہ کے درمیان اختلاف ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ اصل مطلوب فنا اور بقا، ہلاکت اور خالی کرنا ہے۔ اور معاش کی مراعات اور طاعات بدنیہ کا قیام کہ شرع الٰہی کے ساتھ وارد ہوئی ہے، اس کے لیے ہے کہ ہر شخص اس اصل کی بجا آوری نہیں کر سکتا۔ 'وما لا یدرک کله لا یترک کله' "جس کل کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اسے پورا بھی نہ چھوڑا جائے۔" اور متکلم کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ جو کچھ شریعت میں وارد ہوا ہے، کوئی چیز مطلوب نہیں ہے۔ اور ہم کہتے ہیں کہ مطلوب انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے سوائے شریعت کے کچھ نہیں ہے۔ اور شارع نے اس اصل کا بیان خاص لوگوں

کے لیے کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوع انسان اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ قوت ملکیہ وبہیمیہ کے درمیان جامع ہے۔ اور اس کی سعادت تقویت ملکیہ میں ہے۔ اور اس کی شقاوت تقویت بہیمیہ میں، اور اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ اس کا نفس اعمال واخلاق کے رنگوں کو قبول کرتا ہے اور اپنی جڑ میں لے آتا ہے۔ اور موت کے بعد اس کو اس طرح مصاحب بناتا ہے کہ اس کا بدن غذا کی کیفیتوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ اور اس لیے تخمہ، بدہضمی اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حظیرۃ القدس سے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور الہام کا القاء اس جگہ سے ہوتا ہے۔ اور جو الہام کے حکم میں ہے سرور اور خوشی کے ملنے سے ہے۔ اگر ان ملائکہ کی نسبت سے ہے جو ملائمت ومناسبت رکھتے ہیں۔ اور اگر تنگی اور وحشت کا ملنا ہے تو ان کی نسبت سے کوئی منافرت حاصل کی ہوگی۔

بالجملہ جب ان کی نوع اس طرح واقع ہوئی ہو کہ اگر ان کے ساتھ گزاریں تو نفسیاتی امراض اکثر افراد کو تکلیف پہنچاتے ہیں، حضرت حق سبحانہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی کارسازی کرتا ہے۔ اور ان کے لیے راہ نجات کی تعیین کرتا ہے۔ اور ترجمان لسان غیب کہ حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں، ان سے ان کو بھیجتا ہے، تاکہ نعمت مکمل ہو جائے۔ اور جو ربوبیت اولاً اس کی ایجاد کی مقتضی ہوتی ہے، اور پھر ان کا ہاتھ پکڑتی ہے، پھر صورت نوعیہ زبان حال سے مبدأ فیاض کے آگے شریعت کی گدائی کرتی ہے، اور اس کا حکم نوع کے تمام افراد کے لیے صورت نوعیہ کے سریان کے حکم سے اس میں لازم ہے اور افراد کی خصوصیت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اور فنا وبقاء اور ہلاکت وغیرہ افراد کی خصوصیت کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ اس لیے کہ بعض افراد تجرد اور علو کی انتہا میں مخلوق ہوتے ہیں۔ اور خدائے تعالیٰ ان کو ان کے راستہ سے دلالت فرماتا ہے، اور یہ ناموس اور دستاویزوں کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس فرد کے حال کی زبان خصوصیت فردیہ کی جہت سے اس کا تقاضہ کرتی ہے۔ اور شارع کا کلام ان معانی پر کبھی بھی محمول نہیں ہے۔ نہ صریحاً نہ اشارۃً۔

ہاں! ایک جماعت ان مطالب کو شارع کا کلام سمجھتی ہے۔ اس طرح کہ جیسے کسی

نے لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سن لیا۔ اور ہر بات کو اپنی سرگزشت پر محمول کر لیا۔ اور اس کو ان کے عرف میں اعتبار کہتے ہیں۔

اور بالجملہ ہلاکت اور عریانیت کے مقامات میں افراط اور ہر کس و ناکس کا اس بیماری میں مبتلا ہونا ملت مصطفویہ میں بہت دشوار ہے۔ اللہ ایسے شخص پر رحم فرمائے جو ان کی گمنامی میں سعی کرتا ہے۔ اگرچہ بعض استعدادات کے لحاظ سے وہ اصل ہوتی ہیں۔ ہر چند کہ یہ بات اس زمانہ کے بہت سے صوفیاء پر بہت گراں گزرتی ہے۔ بہر حال میرا کام کہنا ہے۔ میں اس کے مطابق ہی کہتا ہوں۔ مجھے زید و عمرو سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

وصیت دیگر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حق میں اچھا عقیدہ رکھنا چاہیے، اور ان کے مناقب کے سوا زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ اس مسئلہ میں لوگ دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک طبقہ یہ گمان کرتا ہے کہ ان کے سینے باہم بالکل صاف تھے۔ اور ان کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ یہ صرف وہم ہے، اس لیے کہ ان کے تنازعات کے سلسلہ میں نقل مستفیض و مشہور روایات گواہ ہیں۔ اور نقل مستفیض کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک طبقہ نے جب ان سے یہ چیزیں منسوب دیکھیں، زبان لعن و طعن دراز کر دیں۔ اور ہلاکت میں مبتلا ہو گئے۔

اس فقیر پر یہ ظاہر ہوا ہے کہ اگرچہ صحابہ معصوم نہیں تھے اور ان کے بعض عوام سے ایسی چیزوں کا صدور میں آنا ممکن ہے کہ اگر دوسروں سے وجود میں آئیں تو لعن و طعن اور جرح کا سبب قرار پائیں۔ لیکن ہم ان جیسے لوگوں کے معاملہ میں زبان بند رکھنے کے لیے مامور ہیں۔ اور ان پر طعن و جرح سے ممانعت ایک مصلحت کے تحت تعبداً ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر ان کے سلسلہ میں جرح کا باب کھول دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت منقطع ہو جائے۔ اور روایت کا منقطع ہونا ملت کا انتشار ہے۔ اور جب ہر صحابی سے روایت کی جائے گی، اکثر احادیث مستفیض ہوں گی، اور امت کو ایک لحاظ سے تکلیف ہو گی۔ اور اس نقل کے سلسلہ میں کچھ جرح سے خلل واقع نہیں ہوتا۔

اس فقیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح سے سوال کیا کہ آپ شیعوں کے

بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اہل بیت کی محبت کے مدعی ہیں اور صحابہ کے بارے میں بدگوئی کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام روحانی کے طور پر القا فرمایا کہ ان کا مذہب باطل ہے۔ اور ان کے مذہب کا بطلان لفظ امام سے معلوم ہوتا ہے جب مجھے اس حالت سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام میں غور وفکر کیا۔ معلوم ہوا کہ امام ان کی اصطلاح میں ایسا معصوم ہے جس کی اطاعت مخلوق پر فرض ہے۔ اور وہ امام کے حق میں وحی باطنی تجویز کرتے ہیں۔ تو درحقیقت 'ختم نبوت' کے منکر ہیں۔ اگرچہ زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔ اور جس طرح اچھے لوگوں کے حق میں نیک عقیدہ رکھنا چاہیے، اسی طرح اہل بیت کے حق میں معتقد ہونا چاہیے۔ اور ان کے صالحین کو مزید تعظیم وتخصیص دینی چاہیے کہ **قد جعل الله لكل شئي قدراً** "اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔" (الطلاق:۳)

اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ ائمہ اثنا عشر رضی اللہ عنہم آپس کی رشتہ داریوں سے اقطاب نسبتی ہیں۔ اور تصوف کا رواج ان کے اختتام کے نزدیک پیدا ہوا۔ بہر حال عقیدہ اور شریعت کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے علاوہ حدیث سے نہیں لیا جا سکتا۔

ان کی قطبیت ایک امر باطنی ہے۔ تکلیف شرعی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ہر ایک کی نص اور اشارہ بعد والے پر اس قطبیت کے اعتبار سے ہے۔ اور وہ جن رموز امامت کے بارے میں کہتے ہیں، وہ انہی کی طرف راجع ہیں۔ اور بعض مخلص احباب خود کو ان پر مطلع مانتے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ سے ایک جماعت نے اس بارے میں گہرائی سے غور کیا اور ان کے قول کو دوسرے مقام پر چسپاں کیا۔ **والیه المستعان**۔

وصیّت دیگر: تعلیم علم کا طریقہ جس طرح تجربہ سے محقق ہوا ہے، یہ ہے کہ اولاً صرف ونحو کے مختصر رسائل کا ہر فن کے تین تین یا چار چار رسائل طالب علم کے ذہن کے لحاظ سے درس دیا جائے۔ اس کے بعد ایک کتاب تاریخ یا حکمت عملی کی عربی زبان میں پڑھائی جائے اور اس درمیان تتبع کے طریقہ پر لغت کی کتابیں پڑھائیں۔ اور ان کی مشکلات سے مطلع کریں۔ جب عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت سے موطا پڑھائیں۔ اور اس کو ہرگز ترک نہ کریں کہ اصل علم حدیث ہے۔ اور اس کے

پڑھنے کے بہت فیوض ہیں۔اور ہم نے ان سب کو مسلسل پڑھا ہے۔اس کے بعد قرآن عظیم کا اس طرح درس دیں کہ بغیر تفسیر و ترجمہ صرف قرآن پڑھائیں۔اور جو بات نحو کے حوالہ سے یا شان نزول کے تعلق سے مشکل ہو اس پر توقف کریں۔اور بحث کریں۔اس کے درس سے فراغت کے بعد تفسیر جلالین کو درس کے بقدر پڑھائیں۔اس صورت کو اختیار کرنے میں بہت سارے فیوض ہیں۔اس کے بعد ایک وقت صحیحین وغیرہ سے کتب حدیث اور فقہ وعقائد اور سلوک کی کتابیں اور ایک وقت کتب دانشمندی شرح ملا اور قطبی وغیرہ جہاں تک اللہ توفیق دے۔اور اگر ممکن ہو تو ایک روز مشکوٰۃ اور دوسرے دن شرح طیبی اسی قدر جتنی کہ پہلے دن پڑھائی ہے پڑھائیں، بڑی حد تک نفع بخش ہے۔

وصیّت دیگر: ہم لوگ جانتے ہیں کہ دیار ہندوستان میں ہمارے آباء و اجداد غریب الوطنی میں آئے ہیں، اور عربیت نسب اور عربیت لسان دونوں ہمارے لیے باعث فخر ہیں کہ ہمیں سید الاولین والآخرین اور افضل الانبیاء والمرسلین وفخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے نزدیک قرار دیا جاتا ہے۔اس نعمت عظمیٰ کا شکر یہ ہے کہ بقدر امکان عرب اول کے عادات و رسوم کو جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہے، ہاتھ سے نہ جانے دیں۔اور عجمیوں کی رسوم اور ہندوؤں کی عادات کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیں۔

بغوی نے ابوعثمان النہدی سے نقل کیا ہے کہ ہمارے پاس عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گرامی نامہ عتبہ بن فرقد کے ذریعہ آیا جب ہم آذربائیجان میں تھے **اما بعد فاتزروا وارتدوا وانتعلوا والقوا الخفاف واتقوا السراويلات وعليكم بلباس ابيكم اسماعيل وإياكم والتنعم وزى العجم وعليكم بالشمس فإنها حمام العرب وتمعددوا واخشو شنوا واخشو شبوا واخلو لقوا واعلوا الركب وانزوانزوا وارموا الاغراض وفى رواية وانزوا على ظهور الخيل نزوا**

"یعنی جب اہل عرب جہاد کی خاطر اطراف عجم میں پھیلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ عجمیوں کی رسوم و رواج کو اختیار نہ کرنے لگیں کہ رسوم عرب کو ترک کر دیں۔اس لیے آپ نے ان کو خطوط لکھے کہ ازار بند استعمال کریں۔چادر اوڑھیں اور چپل پہنیں اور

موزوں کو نکالیں۔ اور پاجاموں سے بچیں۔ اور اپنے باپ اسماعیل کے لباس اور پوشاک کو اپنے لیے لازم کریں اور ناز و نعم وعیش و عشرت اور عجمیوں کی پوشاک و وضع و قطع سے خود کو دور رکھیں۔ اور دھوپ میں بیٹھنے کو اپنے لیے لازم کریں، کہ دھوپ عربوں کے لیے حمام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور موٹا کھردرا لباس پہنیں۔ اور سخت محنت و مشقت کی زندگی گزاریں۔ اور پرانے وسادہ لباس پہننے کی عادت بنائیں۔ اور اونٹوں کو مطیع و تابعدار بنائیں۔ اور گھوڑوں پر کود کر سوار ہوں۔ اور تیر اندازی سے نشانہ لگائیں"۔

ہندوؤں کی ایک بری عادت یہ ہے کہ جب کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کو دوسرا شوہر نہیں کرنے دیتے۔ جبکہ یہ عادت عربوں میں کبھی بھی نہیں تھی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ آپ کے زمانہ میں اور نہ ہی آپ کے بعد۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت فرمائے جو اس بری عادت کے پیچھے پڑ جائے اور اگر عام لوگوں میں سے اس کا ختم کرنا ممکن نہ ہو تو خود کو اپنی قوم میں اس عربی روایت کو قائم کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کو برا سمجھے۔ اور دل سے اس کا دشمن ہو کہ نہی منکر کا ادنی ترین درجہ یہی ہے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مہر بہت زیادہ مقرر کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دین و دنیا میں ہمارے لیے شرف آپ ہی پر منتہی ہے، اپنے اہل بیت کا مہر جو کہ بہترین افراد ہیں، بارہ اوقیہ اور نشی مقرر فرمایا تھا جو کہ پانچ سو درہم ہوتا ہے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک خوشی، تقریبات اور بکثرت رسوم میں فضول خرچی ہے۔ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص تقریبات مقرر کی ہیں۔ ان میں سے ولیمہ اور عقیقہ دونوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور دوسری رسوم وروایات کو چھوڑ دینا چاہیے، یا ان کا اہتمام والتزام نہیں کرنا چاہیے۔ اور ہمارے لوگوں کی بری عادتوں میں سے ایک ماتموں، سوئم تیجہ، چہلم، چالیسویں اور ششماہی اور سالانہ فاتحہ میں اسراف ہے۔ اور ان سب کا ابتداء میں عربوں میں کوئی وجود نہیں تھا۔ بہتر یہ ہے کہ میت کے بعد وارثوں سے تین دن کی تعزیت اور انہیں ایک رات دن کھانا کھلانے سے زیادہ کوئی رسم نہ ہو۔ اور تین دن کے بعد خاندان کی عورتیں جمع ہوں اور میت کی خواتین کے کپڑوں میں

خوشبو لگائیں اور اگر بیوی موجود ہے تو وہ عدت گزارنے کے بعد خوشبو لگائے۔

سعید وہ شخص ہے کہ جو عربی زبان کی صرف ونحو اور کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے، اور قرآن وحدیث کا ادراک حاصل کرے، اور فارسی وہندی کی کتابوں اور علم شعر ومعقولات اور جو چیز بھی خوارج نے پیدا کی ہیں، ان سے اشتغال نہ رکھے۔ اور تاریخوں اور بادشاہوں کی وارداتوں اور لوگوں کے جھگڑوں اور تنازعات کا ملاحظہ یہ سب گمراہی در گمراہی ہے۔ اور اگر رسم زمانہ ان میں اشتعال کی مقتضی ہو تو بھی ضروری ہے کہ ان کو علم دنیا جانیں۔ اور ان سے متنفر رہیں۔ اور استغفار وندامت کریں۔ اور ہمارے لیے لازم ہے کہ حرمین محترمین کے لیے جائیں اور اپنے چہروں کو ان کے آستانوں سے ملیں۔ ہماری سعادت اسی میں ہے، اور ہماری شقاوت وبدبختی اس سے اعراض میں ہے۔

وصیّت دیگر: حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے جو عیسیٰ بن مریم سے ملے، وہ ان کو میرا سلام پہنچائے۔ اس فقیر کی پوری آرزو رہی ہے کہ اگر حضرت روح اللہ کا دور پاوے تو یہ سلام پہنچانے والا پہلا شخص میں ہی ہوں۔ اور اگر میں ان کو نہ پاؤں تو اس فقیر بہجت نشان کی اولاد یا اس کے پیروکاروں میں سے جو بھی آں حضرت کا نشان پاوے سلام پہنچانے کی پوری کوشش کرے، تاکہ ہم ان کے آخر کے لشکر اور لشکر محمدیہ میں شامل ہوں۔ والسلام علی من اتبع الهدیٰ.

۳۲۹-تفہیم:

نبی کریم کے مبشرات

مبشرہ نمبر-۱: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ گویا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا، اور آپ مراقب ہیں، اپنی ٹھوڑی اپنے سینہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ تو میرے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مثالی صورتوں کا فیضان ہوا۔ پہلی جسم مخروطی، اس سے اوپر اور اس سے نیچے ہر ایک کے لیے عرض ہے اور اس سے نیچے والا اوپر والے کے مقابلہ میں عرض کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ اور

دوسرے جسم مبطوح (پھیلا ہوا) پیالہ کی طرح گویا اس کے وسط میں لکڑی گاڑی ہوئی ہے۔
اور تیسرے لکڑی زمین پر کھڑی ہوئی ہے، اس کے اوپر پیالہ کی طرح ایک جسم ہے۔

پھر میرے اوپر یہ فیضان ہوا کہ پہلی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے لیے تمثیل ہے کہ وہ نچلے جسمانی اور اوپر والے روحانی مراتب کی تہذیب کا احاطہ کرنے والی ہے۔ اور دوسری سالکین کی نسبت کے لیے تمثیل ہے جن کی نسبت صرف اس میں پھیلی جو نیچے قریب ہے۔ اور تیسری مجذوبوں کی نسبت کی تمثیل ہے جن کی نسبت اس میں کشادہ ہوئی جو اوپر قریب ہے۔

پھر جب میں ان تینوں صورتوں کی مراد کو سمجھ گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اٹھایا، اور میری طرف مسکرائے، اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے، اور بیعت کے لیے اشارہ فرمایا تو میں آگے بڑھا حتیٰ کہ میرے گھٹنے آپ کے گھٹنے سے مل گئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان پکڑے۔ مصافحہ کیا، پھر اپنی ٹھوڑی اپنے سینہ پر رکھی، اور اپنی آنکھیں بند کیں تو میں نے بھی یہی سب کچھ کیا۔ تو میرے قلب پر اس نسبت کا فیضان ہوا، جس کو میں نے سب سے پہلے سمجھا تھا۔

مبشرہ نمبر-۲: جس وقت میں کھنبایت شہر کی مسجد میں عصر کے بعد مراقبہ میں تھا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کریمہ کا مشاہدہ کیا کہ وہ آئی اور مجھے ایک چادر اوڑھائی۔ اس دوران مجھ پر بعض علوم شرعیہ کے دقائق ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر میں بڑھتے رہے۔

مبشرہ نمبر-۳: میں نے خواب میں دیکھا کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے میرے گھر میں نزول فرمایا۔ اور حسن رضی اللہ عنہ کے دست مبارک میں ایک قلم ہے جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ تو انہوں نے اپنا ہاتھ وہ قلم مجھے دینے کے لیے بڑھایا، اور فرمایا یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ پھر اپنا ہاتھ روک لیا اور فرمایا پہلے اس کو حسین ٹھیک کریں گے تو انہوں نے اس کو ٹھیک کر دیا۔ اور انہوں نے وہ مجھے عطا فرما دیا۔ پھر ایک چادر لائی گئی حسین رضی اللہ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا: میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی چادر ہے۔ پھر وہ مجھے اوڑھا دی تو اس دن سے علوم شرعیہ میں تصنیف کے لیے مجھے شرح صدر حاصل ہو گیا۔ والحمد للہ.

مبشرہ نمبر-۴: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر آپ کے اس ارشاد کے معنی کے سلسلہ میں سوال کیا **کنت نبیا و آدم منجدل بین الماء والطین** میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان ایک کیاری میں تھے۔" تو میری روح پر آپ کی روح کریمہ نے اس مثالی صورت میں فیضان فرمایا جو عالم اجسام میں پائی جانے سے پہلے تھی۔ اور یہ کہ اس کا فیضان حضرت مثالی میں اس وقت تھا، جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان ایک جدول کیاری میں تھے۔ اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس حضرت میں ظہور تام تھا۔ اس حدیث میں اس سے ایک تعبیر کی گئی ہے۔ اور اس لیے جب آپ عالم جسمانی میں پائے گئے تو آپ کے ساتھ عالم جسمانی کی طرف قوی مثالی منتقل ہوئے تو علوم سے وہ ظاہر ہوا جو حساب میں نہیں تھا۔

مبشرہ نمبر-۵: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اس ارشاد کے سلسلے میں روحانی طور پر سوال کیا **کان فی عماءٍ ما فوقه هواء وما تحته هواء** "وہ عما (دھند) میں تھا اس کے اوپر ہوا تھی اور اس کے نیچے ہوا تھی۔" آپ نے یہ اس شخص کے جواب میں فرمایا تھا جس نے کہا تھا ہمارا رب مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ تو میری روح پر آپ کی روح کریمہ سے ہیولانی کے بعد اعالی میں نور عظیم کی صورت کا فیضان ہوا۔ اس نے اس سارے بعد کا خطوط شعاعی سے احاطہ کر لیا۔ پھر کہا گیا، یہ نور وہ تجلی ہے جس کی طرف اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بعد ہیولانی وہ عماء اور خطوط شعاعی ہے یہ احاطہ وہ قہر ہے جس کی طرف قول باری تعالیٰ "**هو القاهر فوق عباده**" میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مبشرہ نمبر-۶: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے روحانی طور پر اشارہ فرمایا کہ تمہارے اندر حق کی مراد یہ ہے کہ امت مرحومہ کو تمہارے ساتھ پوری طرح شامل و جمع فرما دے۔

مبشرہ نمبر-۷: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر سوال کیا کہ اسباب کے اختیار کرنے اور ترک کرنے دونوں میں سے میرے لیے کون سا بہتر ہے، تو میری روح پر ان کے اس فیض کا فیضان ہوا کہ اس کے سبب سے میرا قلب اسباب اور اولاد کو رو کر دے۔ پھر کچھ دیر کے بعد امر کا کشف ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ طبیعت اسباب کی طرف اعتماد کرتی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ روح تفویض پر اعتماد کرتی ہے۔

مبشرہ نمبر-۸: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی پر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے راز کے سلسلہ میں روحانی طور پر سوال کیا۔ حالانکہ حضرت علی نسباً تمام صحابہ سے زیادہ اشرف، حکماً ان سے زیادہ اقضیٰ، بہتر فیصلے کرنے والے اور جسمانی اعضاء کے اعتبار سے ان سے زیادہ بہادر ہیں۔ اور ان کے بعد صوفیاء انہی کی طرف انتساب کرتے ہیں، تو میرے قلب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ فیضان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ ظاہر ہے اور دوسری وجہ باطن۔ تو وجہ ظاہر لوگوں میں عدل کی اقامت، ان کی تالیف وجمع اور ظاہر شریعت کی طرف ان کے ارشاد ورہنمائی کی طرف ہے۔ اور شیخین اس سلسلہ میں آپ کے لیے بمنزلہ جوارح کے ہیں۔ اور وجہ باطن فنا وبقا کے مراتب کی طرف ہے۔ اور آپ کے تمام علوم مرویہ وجہ ظاہر سے نکلتے ہیں۔

مبشرہ نمبر-۹: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعوں کے بارے میں روحانی طور پر سوال کیا تو میری طرف وحی کی گئی کہ ان کا مذہب باطل ہے۔ اور ان کے مذہب کے بطلان کو لفظ امام سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اور جب میں اس حالت سے باہر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک امام معصوم ہے۔ اس کی اطاعت فرض کی گئی ہے۔ اس کی طرف وحی باطن کی جاتی ہے۔ اور یہی نبی کے معنی ہیں۔ اس طرح ان کا مذہب ختم نبوت کے انکار کو مستلزم ہے۔ **قبحهم الله تعالیٰ**۔

مبشرہ نمبر-۱۰: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مذاہب اور ان طرق کے بارے میں سوال کیا کہ اس کے نزدیک ان میں سے اخذ کے لئے کون سا اولیٰ اور زیادہ پسندیدہ ہے تو میرے قلب پر یہ فیضان ہوا کہ تمام مذاہب اور طرق برابر ہیں، کسی کو

دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

مبشرہ نمبر-۱۱: میں نے علماء محدثین اپنے علم پر عمل کرنے والوں، اپنی جماعت کی ظاہر طور پر تہذیب کرنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان بہت سے صوفیاء کے مقابلہ میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ پایا جو اپنے آپ کو اپنی جماعت کی باطنی تہذیب کی بنیاد پر افضل قرار دیتے ہیں۔ اور اپنی ظاہری تہذیب کے سلسلہ میں ان علماء کی تفضیل نہیں کرتے۔

مبشرہ نمبر-۱۲: مجھے سخت بھوک لگی تو میں نے اللہ سے دعاء کی کہ اس کو دور کر دے تو میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کریمہ کو دیکھا کہ وہ آسمان سے نازل ہوئی۔ اس کے ساتھ روٹی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا کہ وہ مجھے وہ روٹی کھلائے تو اس نے وہ مجھے عطا کی۔ اس طرح اس دن یا اگلے دن صبح سویرے میری ایک حاجت پوری ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

مبشرہ نمبر-۱۳: ایک رات مجھے پیاس لگی تو ہمارے کسی ساتھی نے اشارہ کیا کہ دودھ کے ایک برتن کی طرف رہنمائی کرے تو میں نے اس کو پی لیا، پھر وضو کیا اور سو گیا تو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو دیکھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا کہ میں وہی ہوں جس نے دودھ بھیجا۔ اور ایک آدمی کے دل میں بات ڈالی۔

۳۳۰-تفہیم:

خطبات کے ذریعہ تفہیم

خطبہ نمبر ۱

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. الحمد للّٰہ الذی تقدس عن مشارکة المخلوقین فهام الاوهام دون الاصابه من حقیقته ساقطة★وتعالیٰ عن مشابهة المحتاجین فایدی الافهام عند تناول ذاله غالطة ★وتلطف عن مناسبة العالمین لعقول العالمین فی بیداء عظمته خابطة ★وتعاظم عن مشاکلة المتحیزین

فمدارک العارفین من اکتناه کنہه قانطة ★لا یصفه الواصفون ولا تبلغه الظنون ولا تدرکه العیون ولا تضبطه ضابطة ★دبرامور ملکه من غیر وزیر ولا مشیر ولا ظهیر ولا نصیر ولا واسطة ★عمت رحمته وتمت رأفته وخرجت من الاحصاء کلماته فکلت لاغیة ولاغطة ★واشهد ان لا إله إلا اللّٰه وحده لا شریک له شهادة لجمیع شوارد السعادة رابطة ★واستغفره من ذنوب الم بها لسان لاغ اوقلب طاغ او یدجانیة ولاقطة ★واشهد ان سیدنا محمد اعبده ورسوله الذی بعثه لیجاهد الذین اعمالهم فی الآخرة حابطة ★ویعلم الناس الکتب والحکمة ویزکیهم ویصلح منهم کل نفس للصالح بالسئی خالطة ★ففعل ما امر به وصدع بالحق حتی ظهر امر اللّٰه بعز کل راضیة وذل کل ساخطة ★صلی اللّٰه علیه وعلی آله واصحابه بعدد کل نفس صبیة اوشابة او شامطة★

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو مخلوقات کی شرکت سے پاک ہے۔ اوہام کی سمجھ اس کی حقیقت تک پہنچنے سے ساقط ہے۔ اور محتاجوں کی مشابہت سے بالاتر ہے۔ چنانچہ عقلوں کے ہاتھ اس کی ذات کو پانے کے وقت غلطی کرنے والے ہیں۔ اور عالموں کی مناسبت سے نرمی کرتا ہے۔ چنانچہ ظالموں کی عقلیں اس کی عظمت کو ظاہر کرنے میں خبط ہو جاتی ہیں۔ اور وہ دائروں میں محدود اشیاء کی مشابہت سے بہت عظیم ہے۔ چنانچہ جن عارفوں نے اس کی حقیقت کا پتہ لگانے کی کوشش کی ان کے احساسات مایوس و ناامید ہو گئے۔ نہ وصف بیان کرنے والے اس کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں، نہ ہی ظن و گمان اس کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں، اور نہ ہی آنکھیں اس کا ادراک کر سکتی ہیں، اور نہ ہی کوئی ضابطہ اس پر غالب آسکتا ہے۔ وہ اپنے امور مملکت بغیر کسی وزیر اور بغیر کسی مشیر کے اور بغیر کسی معاون و محافظ اور بغیر مددگار و معین کے اور بغیر کسی واسطہ کے انجام دیتا ہے۔ اس کی رحمت عام ہے، اس کی مہربانی مکمل ہے اور اس کے کلمات حد شمار سے باہر ہیں۔ چنانچہ تمام بیہودہ اور لغو حسابات تھک گئے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ایسی گواہی جو تمام نادر سعادتوں سے تعلق رکھتی ہے، اور

میں اس سے ان تمام گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جس میں بیہودہ باتیں کرنے والی زبان یا سرکشی کرنے والا دل یا گناہ کرنے والا اور گری پڑی چیزیں اٹھانے والا ہاتھ ملوث ہو۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، جن کو اس نے اس لیے مبعوث کیا تاکہ ان لوگوں سے جہاد کریں جن کے اعمال آخرت میں رائیگاں جائیں گے۔ اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے ذریعہ ہر نفس کی نیکی کی طرف اصلاح کریں جس میں برائی ملی ہوئی ہو۔ چنانچہ آپ نے وہ سب کچھ کیا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور حق کا بالکل اظہار کیا حتیٰ کہ اللہ کا امر ہر راضی ہونے والے کو عزت دے کر اور ہر ناراض ہونے والے کو ذلیل کر کے غالب ہو گیا۔ اللہ رحمت فرمائے آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر، ہر بچہ، جوان یا سفید بالوں والے کے ہر سانس کی تعداد کے برابر۔ اے ابن آدم! کیا تم اپنی دنیا میں محنت ومشقت نہیں کرتے کہ اپنے مالک کے حکم کے بھی خلاف کر ڈالتے ہو؟ کیا ان مشقتوں سے تمہارے ہاتھ کامیابی لگ جاتی ہے۔ فیصلے تمہارے خلاف ہوتے ہیں۔ خوشیاں تمہاری ایڑیوں پر گرتی ہیں اور تمہارے سفید کپڑے داغدار ہوتے ہیں۔ اور تمہاری خواہشات حق کے خلاف تجاوز کرتی ہیں۔ تم مسکین کے ساتھ ترشروئی، نفرت کرنے والے دل اور زیادتی کرنے والے ہاتھوں سے پیش آتے ہو۔ اور اپنے بھائیوں اور پڑوسیوں سے سخت مزاجی، بداخلاقی اور تنگ دستی کے ساتھ رہتے ہو۔ تمہاری سب سے بڑی خواہش ہنہنانے اور دور تک جانے والے گھوڑے اور اونٹ ہوتے ہیں۔ اور تمہارا سب سے بڑا خیال ہوتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ تمہارے پاس بہت مال ودولت ہے۔ اور تم ان حقوق العباد کی پرواہ نہیں کرتے جن کو تم ضائع کرتے اور حقیر سمجھتے ہو۔ اور تم چاہتے ہو کہ اللہ کے دین سے اس طرح خارج ہو جاؤ گویا کہ تم قرامطہ (شیعوں کا ایک غالی فرقہ) میں سے ہو۔ تم اپنے نفس کا روزانہ اس طرح بناؤ سنگار کرتے ہو گویا تم ہمیشہ باقی رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو، جیسا کہ دلہن کا بناؤ سنگار، مشاطہ کرتی ہے۔ جب تم پر خواہش کا مورد ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہو کہ اس پر وارد ہو اور لتھڑ جاؤ۔ اور اگر تمہیں مقامات قرب کی طرف بلایا جاتا ہے تو تمہارے نفس پر کسلان طاری رہتا ہے، نشاط پیدا نہیں

ہوتا۔ ایسا نفس جو اپنے اوقات کو اس وقت ضائع کرتا ہے جب تم محاسن اخلاق کے لیے دیوار بن جاتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ قبریں تاریک، کیڑوں سے بھری، بدبودار، تنگ اور بھینچے والی ہیں؟ کیا تم اس دن کو یاد نہیں کرتے جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوگے؟ نہ تم ان سے چڑھنے کی حالت میں ڈرتے ہو نہ اترنے کی حالت میں۔ کیا تم اس کو قبول نہیں کرتے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ کس نے متوازن اعضاء بنائے اور کس کا ہاتھ تم پر نعمتوں کی بارش کرتا رہتا ہے؟ کیا تم اپنے مالک کے احکام اور جس کا تم نے اس سے عہد کیا اور جس کی تم پر شرط لگائی گئی، ان سب کی محافظت نہیں کرتے؟ ہم اپنے رب سے دعا کرتے ہیں کہ ہم سے ہر شدت کو دور کر دے اور اسے ہم سے زائل کر دے اور مٹا دے۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ اور ہر مشکل و پریشانی میں ہماری مدد فرمائے۔

خطبہ نمبر-۲:

الحمد لله الذی خلق الإنسان وقد اتی علیه حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکوراً ★ فسواه وعدله وعلی کثیر ممن خلق فضله وجعله سمیعا بصیرا ★ ثم هداه السبیل ونصب له الدلیل اما شاکراً واما کفوراً ★ اما الکافرون فاعتدلهم سَلاسل واغلالا وسعیراً ★ یعذبون باصناف العذاب ینادون ویلا ویدعون ثبوراً ★ واما شاکرون فنعمهم وکرمهم ولقهم نضرة وسروراً ★ إن هذا کان لکم جزاء وکان سعیکم مشکوراً ★ فسبحان من بیده ملکوت کل شئی لم یزل ولا یزال علیماً قدیراً ★ واشهد ان لا إله إلا الله وحده لا شریک له واشهد أن محمداً عبده ورسوله بعثه بین یدی الساعة لیکون للعالمین نذیراً ★ واتاه جوامع الکلم ومنابع الحکم ووعده مقاماً محموداً وجعله سراجاً منیراً ★

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے انسان کو پیدا کیا حالانکہ اس پر ایک زمانہ ایسا گزرا تھا کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ پھر اس کو متوازن و مساوی اعضا والا بنایا، اور اس کو معتدل بنایا، اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر اس کو فضیلت دی۔ اور اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ پھر اس کو راہ مستقیم کی طرف ہدایت فرمائی۔ اور اس کے لیے دلیلیں مقرر کیں کہ اب

چاہے شکر کرنے والا بن جائے یا ناشکرا کافر بن جائے۔ تو جو کافر ہیں ان کے لیے زنجیریں اور کھال اتارنے والی بیڑیاں اور گلے میں اٹکنے والی آگ کی لپٹیں تیار کیں۔ ان کو مختلف قسم کے عذاب دیئے جائیں گے۔ وہ ہلاکت کو پکاریں گے، اور موت کی دعا کریں گے۔ اور جو شکر کرنے والے ہوں گے، انہیں نعمتوں سے نوازے گا۔ عزت وتکریم سے سرفراز فرمائے گا، اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا کہ یہ تمہارے لئے جزا ہے۔ اور تمہاری سعی مشکور قابل قدر ٹھہری، قبول کی گئی۔ تو وہ ذات پاک ہے، جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے۔ وہ ہمیشہ ہی علیم وقدیر رہا ہے، اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ آپ کو قیامت سے پہلے مبعوث فرمایا تا کہ سارے عالموں کے لیے نذیر ڈرانے والے ہوں اور آپ کو جوامع الکلم (جامع کلمات) اور منابع الحکم (حکمتوں کے منبع) عطا فرمائے۔ اور آپ سے مقام محمود کا وعدہ فرمایا اور آپ کو سراج منیر روشن چراغ بنایا۔

امابعد: میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور آپ کو اس دن سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں جو سخت مصیبت کا اور انتہائی طویل ہوگا۔ جب ہر نفس کو آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ اور اس سے کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کو کوئی فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔ اور نہ تم کوئی مددگار پاؤ گے۔ جس دن انسان ندامت کا اظہار کرے گا۔ اور ندامت اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ وہ دنیا کی طرف لوٹنا چاہے گا، بہت بعید ہے کہ وہ لوٹ سکے اور اس کے لیے کتاب نکل آئے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔

اے ابن آدم! جو دنیا پر رنجیدہ ہوا، اس کو اللہ کی طرف سے صرف دوری ہی بڑھی، اور دنیا میں صرف سختی اور آخرت میں صرف مشقت برابر نفرت اور دوری ہی ملے گی۔ اے ابن آدم! رزق کے معاملہ میں نرمی سے کام لو کہ رزق تو قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اور حریص محروم رہتا ہے۔ اور حصول کی کوشش میں انتہا کو پہنچنا بدقسمتی ہے۔ اور موت یقینی ہے۔ اور وہ شخص کامیاب ہوا جس نے ظلم کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

اے ابن آدم! خیر حکمت اللہ کی خشیت ہے، اور بہترین غنا قلب کا غنا ہے، اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے، اور تمہیں جو بہترین عطیہ ملا وہ عافیت ہے، اور تمہارا رب قدیر ہے۔ بہترین کلام، اللہ کا کلام ہے، اور سب سے اچھی ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے، بدترین امور بدعات ہیں، جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔ جس میں عہد نہیں، اس کا دین نہیں، اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر اور دیکھنے والا ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے۔ جو کوئی اس دنیا میں جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہشمند ہوتا ہے، اسے ہم یہاں ہی دے دیتے ہیں، جو کچھ بھی اس کو دینا چاہیں۔ پھر اس کی قسمت میں جہنم لکھ دیتے ہیں۔ جسے وہ پائے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے سعی کرتا ہے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور وہ مومن ہو، تو ایسے ہر شخص کی سعی کی قدر کی جائے گی۔ اے اللہ! ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہمارے عیبوں کو مٹا دے، اور ہماری شرمناک باتوں پر پردہ ڈال دے، اور ہمیں ڈر اور خوف سے امن عطا فرما، اور ہمارا مددگار، معین اور محافظ ہو جا، اور ہماری حاجتیں اور ضرورتیں پوری فرما، اور ہمیں آفتوں سے محفوظ فرما، اور ہمارے قرض ادا فرما، اور تو ہی کافی دعا قبول کرنے والا، قریب، جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

خطبہ نمبر-۳:

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جو اپنے جلال و کبریائی میں منفرد ہے۔ اپنی نعمتوں اور نشانیوں میں محمود ہے۔ نہ کوئی اس کے حکم اور فیصلے کو رد کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کے جود و عطا کو منع کرنے والا ہے۔ نہ آنکھیں اس کا ادراک کرتی ہیں، نہ ظن و گمان اس کے مقام کو پہنچتے ہیں، نہ وصف بیان کرنے والے اس کا وصف بیان کرتے ہیں، نہ ہی بھلائی کرنے والے اس کو بدلتے ہیں۔ وہ گناہوں کو بخشنے والا، عیبوں کو چھپانے والا، دلوں کو بدلنے والا، کرب و اضطراب کو فرحت بخش بنانے والا ہے۔ پوشیدہ رازوں سے باخبر ہے۔ دلوں کے پوشیدہ حالوں کو جاننے والا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نعمتیں اور دائرے ہیں۔ اس کی

انگلیوں کے درمیان دل اور قلب وخواطر ہیں۔ مضطر کی بات سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ تکلیف اور ضرر کو دور کرتا ہے۔ ظاہر اور پوشیدہ کو دیکھتا ہے، اور اپنے بندوں کی نیکیوں اور گناہوں کی گنتی کرتا ہے۔ تو جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ رشد و ہدایت سے سرفراز ہوتا ہے اور نجات پاتا ہے۔ اور اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ پھر اللہ کی رضا وخوشنودی اور اس کی رویت عظمٰی حاصل ہوگی۔ اور جو ان کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ منحرف اور گمراہ ہوا۔ اور جلدی ہی بڑی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر نہ مرے گا۔ اور نہ ہی زندہ رہے گا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ علی وکبیر ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بشیر ونذیر ہیں۔ نبی رحمت، شفیع امت ہیں۔ مشکلات والے دن جب سہولت وآسانی نہ ہوگی۔ آپ غموں کو دور کرنے والے ہوں گے۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم. اتنے زیادہ کہ ان کی گنتی علیم وقدیر کے سوا کوئی نہ کر سکے۔

اما بعد! میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے اور خواہشات نفسانی سے بچنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اور تمہیں لذتوں کو جلدی کاٹنے والی موت اور بلا کی یاد دلاتا ہوں۔ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو موت پر یقین رکھتا ہے پھر بھی کیسے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اور مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے کہ جو حساب پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی کیسے مال ودولت جمع کرتا ہے۔ اور مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو صبر پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی وہ کیسے ہنستا ہے۔ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو آخرت اور اس کی نعمتوں پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی کیسے ان سے دور رہتے ہوئے راحت طلب کرتا ہے۔ اور مجھے وہ شخص عجیب لگتا ہے جو دنیا اور اس کے زوال کا یقین رکھتا ہے پھر بھی کیسے اس پر مطمئن رہتا ہے۔ اور مجھے وہ شخص عجیب لگتا ہے جو زبان کا عالم اور قلب کا جاہل ہے، اور وہ شخص بھی جو پانی سے طہارت حاصل کرتا ہے اور دل کو پاک نہیں کرتا۔ اور جو لوگوں کے عیوب تلاش کرنے کا شوق رکھتا ہے، اور اپنے نفس کے عیوب میں اشتغال نہیں رکھتا۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ اللہ اس کے حال سے باخبر ہے پھر بھی وہ کیسے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ وہ مرے گا اور اس سے تنہا حساب لیا جائے گا،

پھر وہ کیسے غیر اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذہین وسمجھدار وہ ہے جس نے اپنے نفس کو کمزور رکھا اور موت کے بعد کے لیے عمل کیا۔ اور عاجز وہ ہے جس نے اپنے نفس کی خواہشات کی اتباع کی، اور اللہ سے تمنا رکھی، اور فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابن آدم! تو خود کو میری عبادت کے لیے فارغ کر لے، میں تیرا سینہ غنی سے بھر دوں گا۔ اور تیرے فقر کا راستہ بند کر دوں گا، اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھوں کو مشغولیتوں سے بھر دوں گا لیکن تیرے فقر کا راستہ بند نہیں کروں گا۔ اور فرمایا آخرت جس کا مقصود ہوگی، اللہ اس کے غنا کو دل میں مقرر کر دے گا۔ اور اس کے بکھرے امور کو جمع کر دے گا۔ اور دنیا اس کے پاس آئے گی، اور وہ ذلیل ہوگی۔ اور جس کا مقصود دنیا ہوگی اللہ اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دے گا۔ اور اس کی چادر پھاڑ دے گا۔ اور اس کے پاس دنیا صرف اتنی ہی آئے گی جتنی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہوگی۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ دنیاوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے پانی، ہم نے اس کو آسمان سے نازل کیا تو اس سے زمین کی نباتات مل گئیں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے پوری خیر کا سوال کرتے ہیں، اس کی جلدی والی کا بھی۔ اور دیر والی کا بھی جس کو ہم جانتے ہیں اس کا بھی اور جس کو نہیں جانتے اس کا بھی۔ اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، شر سے پوری طرح اس کی جلد والی سے بھی اور دیر والی سے بھی۔ جس کو ہم جانتے ہیں، اس سے بھی اور جس کو نہیں جانتے اس سے بھی۔ اے اللہ! ہم تجھ سے اس خیر کا سوال کرتے ہیں جس کا تجھ سے تیرے بندہ اور نبی نے سوال کیا۔ اور اس شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں جس سے تیرے بندے اور نبی نے پناہ مانگی۔ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں، اور اس کا، جو قول یا عمل سے اس کے قریب ہو۔ اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں آگ سے اور جو اس سے قول یا عمل سے قریب ہو۔ اے اللہ! ہماری حاجات پوری فرما۔ اپنی رحمت سے اے ارحم الراحمین۔

خطبہ عید الفطر

اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں

اللہ کے لیے ہیں جو نعمتیں عطا کرنے والا، احسان کرنے والا ہے، قاضی، حاکم، غلبہ والا، بدلہ دینے والا، حساب لینے والا ہے۔ فضل و کرم جود وسخا اور احسان کرنے والا ہے۔ کرم ومغفرت واحسان اور بھلائی کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں ماہ رمضان کے ذریعہ عزت بخشی۔ وہ مہینہ جس میں رحمت اور مغفرت نازل کی گئی۔ وہ مہینہ جس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اسی میں قرآن کا نزول ہوا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اس میں ہمیں قرآن پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی، اور ہمارے لیے روزوں کی ادائیگی اور قیام حتی الامکان بہتر طور پر آسان فرمائے، اور ہمارے لیے تراویح اور تسبیحات کو آسان کیا۔ کیا ہی اچھا ہے وہ بھلائی کرنے والا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے روزہ داروں سے جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا وعدہ فرمایا۔ جس کا نام باب الریان ہے۔ اور ان کے لیے وہ سب کچھ نعمتیں تیار فرمائیں جن کا خیال بھی کسی انسان کے دل میں کبھی نہیں آیا۔ اور روزہ داروں کے منہ کی بو کو اپنے ملائکہ کے نزدیک مشک وزعفران سے زیادہ پسندیدہ وپاکیزہ بنایا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔
تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے رمضان کے روزوں کو سیئات برائیوں کا کفارہ اور جہنم کی آگ سے نجات وآزادی بنایا اور روزہ داروں کا دو فرحتوں سے اکرام کیا۔ ایک فرحت افطار کے وقت اور ایک فرحت رحمٰن سے ملاقات کے وقت۔ اور فرمایا روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزاء دوں گا۔ تو کیا ہی اچھا ہے وہ بلند مقام والا، اللہ سب

سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ ہم اس کی تعریف بیان کرتے ہیں اور وہ ایسا ہے جس کی ہر مقام میں تعریف کی گئی ہے اور ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں، اور ہر زبان سے اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے اور ہم اس سے مدد چاہتے ہیں ہر اس امر میں جس کا وہ معاش اور دین کے سلسلہ میں ہمارے لیے ارادہ فرماتا ہے اور ہم اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں ہر اس معاملہ میں جس میں ہم سے غلطی اور نافرمانی سرزد ہوگئی۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ایسی گواہی جس سے گواہی دینے والا دار رضوان پاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ جہنم کی آگ سے نجات پاتا ہے۔ اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، جو نگہبان اور سب کے ساتھ بھلائی کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔ جن کو اس وقت بھیجا گیا جب دنیا میں کفر کا غلبہ ہوگیا تھا۔ تو آپ نے مخلوق کو توحید اور ایمان کی طرف دعوت دی۔ اور شرک اور سرکشی کی رسیوں کو باطل قرار دیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اے اللہ! نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل واصحاب پر درود وسلام فرما، جو چاندوں کی طرح روشن وتابناک ہیں۔ اور جو آبادیوں اور ویرانوں وجنگلات میں ایک کے بعد ایک رنگ پھیلانے والے ہیں۔

اے لوگو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ تقویٰ حسنات، نیکیوں کی بنیاد اور اعمال کا خلاصہ ہے۔ اور اللہ کی عبادت کرو کہ عبادت برائیوں، سیئات کو دور کرنے والی اور فساد وگمراہی سے روکنے والی ہے۔ کیا تم روزوں کے مہینہ کے فضائل جانتے ہو؟ اور کیا تم نے اس کا ادراک

کرلیا کہ ان دنوں میں تمہارے اوپر روزے کیوں فرض کیے گئے؟ اور کیا تم جانتے ہو کہ یہ مہینہ مہمان ہے؟ پھر تم نے اس کے اکرام کے لیے کیا کیا؟ اور کیا تم نے سمجھا کہ وہ تمہارے پاس سے تم سے راضی ہونے کی حالت میں گیا؟ یا ناراضی کی حالت میں کہ عزیز علام سے تمہاری شکایت کرے؟ ہائے میرا احساس! کوئی اپنے آپ کو کیسے روزہ دار شمار کر لیتا ہے جو دن بھر غیبت کرتا ہے؟ اور بھائیوں کا گوشت کھاتا ہے؟ یا کیسے اپنے آپ کو اعتکاف میں سمجھتا ہے جبکہ اس کا دل ایک جگہ اور جسم دوسری جگہ ہوتا ہے؟ یا اس کی نماز کیسے قبول کی جائے گی، جو نشہ میں غافل ہو؟ خواہشات نفسانی کے سمندروں میں غرق ہے؟ یا اس شخص کا قیام کیسے لکھا جائے گا جس نے اپنے نفس اور دل کو خطاؤں کے راستے میں رات بھر جگایا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایک مہمان جس کے آنے پر ہم نے اس کا احترام نہیں کیا۔ ہمیں افسوس ہے خیر و بھلائی کے اس موسم پر جس سے ہم نے نہ کوئی فائدہ اٹھایا، نہ امیدیں قائم کیں۔ اور نہر فرات پر ندامت کہ ہم نے اس سے وہ پانی نہیں پیا جو ہمیں پیاس میں سکون عطا فرمائے۔ اور حسرت ہے اس رفیق شفیق پر کہ ہم نے اس کو چھوڑ دیا اور وہ چلا گیا۔ الوداع الوداع! اے قلوب کی طہارت کے مہینے! الفراق الفراق! اے گناہوں کے کفارہ کے مہینے الوداع الوداع! اے تراویح اور تسبیحات کے مہینے! الفراق الفراق! اے قندیلوں اور چراغوں کے مہینے! الوداع الوداع! اے معاصی اور سیئات کے کفارہ کے مہینے! الفراق الفراق! اے بر و حسنات کو بڑھانے کے مہینے الوداع الوداع! اے رب العالمین کے سامنے روزہ داروں کے لیے گواہی دینے والے! الفراق الفراق! احسن الخالقین کے سامنے ان کی شفاعت کرنے والے! اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ کے لیے ہر مصیبت سے تعزیت ہے اور ہر اطاعت کا بدل ہے۔ اس لیے اللہ ہی پر یقین رکھو اور اس سے امید رکھو اور جو کچھ فوت ہو گیا اس کا تدارک کرو۔ آنے والے امور کی اصلاح سے اور اللہ سے مغفرت طلب کرو کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ اور اس کے مہلت دینے پر بے فکر ہو کر مت بیٹھو کہ وہ ہمیشہ غالب اور قہار رہا ہے اور رہے گا۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ اور صبر کرنے والوں کو بشارت دو کہ ان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں

إنا لله وإنا إليه راجعون۔ ہم اللہ ہی کے لیے اور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمت ہیں۔ اور وہی ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اور جان لو کہ صدقہ فطر واجب ہے ہر آزاد مسلمان پر جو اپنی ضرورتوں سے زیادہ کے نصاب کا مالک ہو۔ اگر چہ وہ ملکیت بڑھنے والی نہ ہو۔ اس پر ایک سال گزر چکا ہو اپنی طرف سے اپنے بچہ کی طرف سے اور اپنے غلام اور باندی کی طرف سے فی کس نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو، اور اس کی ادائیگی کا افضل ترین وقت عید کے دن فجر کے بعد سے دن چڑھنے سے پہلے ہے، نماز کے لیے جانے تک۔ تو جس نے اس کو ادا کر دیا بہتر ہے۔ ورنہ اس کو اب ادا کر دو، میں تم سے اپنی یہ بات کہتا ہوں۔ اور اللہ عظیم سے استغفار کرتا ہوں۔

خطبہ عید الاضحی

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جو لوگوں کو عدم سے وجود میں لائی اور ان پر احسان عام کیا۔ اور ان میں سے مسلمانوں کو آخرت کی نعمتوں اور جنت میں داخلہ کے لیے خاص کیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے ان کی طرف خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو مقامات عرفان کی ہدایت دے۔ اور ان کو اپنی زبان سے شریعت کے قوانین اور حکمتوں اور قرآن کی تعلیم دے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کی امت اور آپ کے دین کو تمام امتوں اور دینوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان سے بوجھ اور دشواریوں کو دور کر دیا اور ان کو بتوں کی گندگی سے پاک کر دیا۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے قربانی کرنے والوں سے ہر بال کے

بدلہ اپنے فضل واحسان سے ایک نیکی کا وعدہ کیا، اور قربانی کے دن خون بہانے کو سب سے زیادہ پسندیدہ عمل قرار دیا۔ اس نے اس زمین کو قبول کرلیا جہاں یہ عمل واقع ہو۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کی نعمتوں کی گنتی نہیں کی جاسکتی، اگرچہ ہر انسان اپنا سارا زور لگالے اور اس کے ہر بال میں ہزار منہ ہوں اور ہر منہ میں ہزار زبان ہوں۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کی عظمت سے آسمان چٹخنے لگے اور چاند وسورج اس کے حکم کے تابع ہوگئے۔ اور فرشتوں نے اس کے خوف سے تسبیح بیان کی۔ اور اسی کے جلال کے لیے دونوں بھاری مخلوق جھک گئیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کے لیے عظمت اور کبریائی ہے اور نعمتیں اور نشانیاں ہیں۔ اور وہ بہت مہربان ہے، اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے۔ غالب ہے، احسان کرنے والا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ خالص گواہی ہے دل سے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ سب سے افضل ہیں جن کو دلائل اور فرقان کے ساتھ بھیجا گیا۔ اللہ ان پر اور ان کی آل واصحاب پر اس وقت تک رحمتیں فرمائے جب تک زمانہ چلتا ہے اور رنگ بدلتے رہیں۔

اما بعد! میں تمہیں اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اور تمہیں یاد دلاتا ہوں جس حالت میں اللہ کے انبیاء تھے، اللہ کی اطاعت میں جان ومال صرف کرنے میں۔ روایت ہے کہ ابراہیم صلوات اللہ علیہ وسلامہ

کے پاس خواب میں رب العالمین کی طرف سے آنے والا آیا اور آپ کو حکم دیا کہ اپنی سب سے محبوب شے کو ذبح کر کے اللہ کا قرب حاصل کریں جیسا کہ رب عزوجل نے فرمایا: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون. "تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک اپنی پسندیدہ شئے کو خرچ نہ کردو۔" (آل عمران: ۹۲) پھر آپ نے اپنے امر میں ترویہ کے دن سوچ بچار کیا۔ پھر عرفہ کے دن سمجھ لیا کہ مراد ان کے بیٹے کو ذبح کرنا ہے۔ اور یہ ایک پوشیدہ راز ہے۔ چنانچہ اسماعیل کو ذبح کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اور خوش دلی سے قبول کیا۔ اور ان کے بیٹے کی محبت رکاوٹ نہیں بنی۔ اور جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں۔ ان کو اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اسماعیل سے ذکر کیا تو انہوں نے اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور بہتر طور پر تسلیم کرلیا اور مخلص مشتاقین کا یہی طریقہ ہوتا ہے، اور جب چھری ان کے گلے پر رکھی۔ فرشتے ان پر رحمت کرتے ہوئے لرز اٹھے۔ اور ابراہیم نے جس امر کا ان کو حکم دیا گیا تھا، اس سے ہٹ کر کسی اور راہ پر چلنے سے انکار کردیا۔ اور یہی فضل مبین ہے۔

اے اللہ کے بندو! تمہارے لیے لازم ہے کہ گناہوں سے تعلق ختم کرلو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے خود اس پر عمل کرو۔ وقت آگیا ہے کہ اولاً خود علام الغیوب کی طرف رجوع کرو۔ اس کے بعد ہی تمہارا اعتبار کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنی جانیں اللہ کے لیے لڑا دیں اور تم درہموں میں بخل کر رہے ہو۔ انہوں نے اپنے قلوب کو اللہ کے لیے خالص کرلیا اور تم ہر وادی میں گم رہتے ہو۔ انہوں نے تو اپنے حصے اللہ کے لیے فنا کردیئے اور تم اپنے حصوں میں کھوئے ہوئے ہو۔ انہوں نے اللہ کے ماسوئی سب سے برأت کردی اور تم تعلقات کی کڑیوں میں مقید ہو۔ اور اللہ کی طرف سے اس وقت تمہاری فضیحت ہوگی جب تمہارے اسرار کی آزمائش کی جائے گی۔ اور جس کا تم دعویٰ کرتے ہو، اس کا امتحان لیا جائے گا۔ اور تمہیں اس کے سامنے توفیق دی گئی جب تم ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون تھے جیسے تمہیں شروع میں ظاہر کیا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ اور تمہارے کانوں کے پردوں کو اس کے اس قول نے کھٹکھٹایا۔ افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وأنکم إلینا لا ترجعون "کیا

تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا نہیں ہے۔" (المومنون:۱۱۵)

ہر گز نہیں اللہ کی قسم! اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ہلاک ہو جائیں۔ اور اگر ہمارا رب ہمیں نہ بخشے تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جائیں۔ بیشک سب سے اچھا کلام اللہ کا کلام ہے۔ اور سب سے اچھا راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ بہترین تصور عوازم (پختہ ارادے) ہیں اور بدترین امور محدثات بدعات ہیں۔ جس کے لیے امانت نہیں، اس کا ایمان نہیں۔ جس کا عہد نہیں، اس کا دین نہیں۔ اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے۔ "پھر جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم (علیہ السلام) نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی، اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر بچہ کو چھڑا لیا۔" (الصفت:۱۰۳تا۱۰۷) اور جان لو کہ ہر آزاد، مسلم، مقیم، غنی پر واجب ہے کہ وہ عید کی نماز کے بعد تین دن تک قربانی کرے۔ ایک فرد کی طرف سے ایک بکری کافی ہے، اور ایک گائے یا ایک اونٹ سات کی طرف سے کافی ہے۔ اور بکری ایک سال کی۔ گائے دو سال کی اور اونٹ پانچ سال کا کافی ہے۔ یہ سب جائز ہیں اگر پیدائش سے ہی ان کے سینگ نہ نکلے ہوں اور خصی بھی۔ اور اتنا کمزور جائز نہیں کہ جس کی ہڈی میں گودا ہی نہ ہو اور ایسا لنگڑا جو چل نہ سکے اور جس کے ایک تہائی سے زیادہ دونوں کان کٹے ہوئے ہوں یا آنکھ پھوٹی ہوئی ہو۔ اور شہر میں مقیم ہر شخص پر واجب ہے کہ یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق تک ہر فرض نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد ایک بار یہ کہے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا إله إلا الله والله أكبر الله أكبر ولله الحمد "اور میں اپنے لیے اور تم سب کے لیے بھی اور تمام مسلمانوں کے لئے استغفار، مغفرت طلب کرتا ہوں، تم بھی اس سے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگو۔ وہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

☆☆☆

البُدورُ البازغه

امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ

اردو ترجمہ

ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن

نظرثانی

جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی

تحقیق وتعلیق:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

تعریف اس اللہ کی جس نے انسان کو پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل عالم وجود میں اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اور اسے تحصیل معاش اور تدابیر نافعہ کے لیے مقرر کردہ الہامی علوم اور فطری طریقوں سے نوازا۔ اور (اس پر مزید انعام فرمایا کہ) باری تعالیٰ نے اس کو ان باتوں کا بھی الہام فرمایا، جن کے ذریعے وہ بارگاہ الٰہی کا قرب حاصل کر سکے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ان فطری علوم اور موہوبہ الہامات کی بدولت خالق حقیقی نے نوع انسانی کو ابنائے جنس (یعنی دیگر حیوانات) سے ممتاز فرمایا۔ اور اپنی اکثر (بلکہ سب) مخلوقات (ارضی وسماوی) پر اس کو بڑی فضیلت عطا فرمائی۔ باری تعالیٰ نے مزید احسان یہ فرمایا کہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھیجے۔ اور ان کی زبانی انسان کو باتیں یاد دلائیں، جو اس کی فطرت میں ودیعت کر رکھی تھیں۔ اور یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہو چکا تھا۔

میں (ولی اللہ) اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں۔ اور وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بشیر (عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کے اچھے نتائج کا بشارت دینے والا) اور نذیر (عقائد فاسدہ اور اعمال شنیعہ کے انجامِ

بد سے ڈرانے والا) بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات پر اور آپؐ کے آل واصحاب پر اللہ تعالیٰ کے ہزاروں ہزاروں درود وسلام ہوں۔

اما بعد! بندۂ عاجز ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ دونوں باپ بیٹے کو اپنے لطف وکرم سے نوازے) عرض کرتا ہے کہ زیرِ تالیف کتاب ان تفہیماتِ الٰہیہ پر مشتمل ہے جو خدائے مہربان کے فیضانِ عنایت سے پہلے میرے دل پر القا ہوئیں، پھر وہاں سے زبان اور پھر سرانگشت (پوروں) پر (تحریر وقلم کی صورت میں) ظاہر ہوئیں اور عصرِ حاضر (کی استدلالی ذہنیت) کا تقاضا ہوا کہ ان کو برہان ودلیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس کا نام "البدور البازغہ" رکھا ہے جو ایک مقدمہ اور تین مقالوں پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نفع بخش بنا دے۔ اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اور وہی خدائے بلند وبرتر اور قوت وطاقت کا مالک ہے۔ غلطیوں سے بچنے اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق اس کے سہارے سے ملتی ہے۔

فصل:۱

مبحث وجود اور تحقیق انیق

(یہ نظریہ غلط ہے کہ وجود ایک کلی ہے اور وجود اقصیٰ اس کا ایک فرد ہے)

فلاسفہ کے وہم نادان نے جس مفروضے کو درست اور موجب اطمینان سمجھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ "وجود اقصیٰ" (خدائے بزرگ و برتر کا وجود اور ہستی) وجود (ہستی) کا ایک فرد ہے۔ اور جس طرح کوئی "کلی[1]" اپنی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی طرح "وجود اقصیٰ" پر بھی مطلق وجود (بہ حیثیت کلی) حاوی ہے۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ "وجود کا مفہوم ہر چند دوسرے اور کسی مفہوم میں بھی اتنی عمومیت نہیں پائی جاتی، بایں ہمہ "وجود اقصیٰ" نے اس پر بھی اوپر نیچے ہر جانب سے احاطہ کیا ہے۔ اور اس کے لیے اس گھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا ہے۔

ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ "وجود" کو مستقل مفہوم کی حیثیت تب حاصل ہوئی، جب مختلف حقائق کو، جو درحقیقت بے شمار مختلف آثار و نتائج کا مرجع ہیں، مجملاً ملحوظ رکھا گیا۔ جس کے نتیجے میں ہست اور نیست ایک دوسرے سے جدا جدا حقیقتیں نظر آنے لگیں۔ گو ان حقائق کو باہم ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کیا گیا۔ (کیونکہ حقائق کا باہمی امتیاز اجمالی ملاحظہ سے حاصل نہیں ہوسکتا) الغرض "وجود" کا مفہوم حقائق کے مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہونے کے باوجود اس اختلاف کو مجمل طور پر ملحوظ رکھنے سے پیدا ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ جملہ حقائق کا مرجع و مال ایک ہی حقیقت ہے۔ (یعنی حقیقت کبریٰ) اور دوسری تمام

---

[1] (Univrsal)

حقیقتیں اس کے اجمال کی شرح و تفصیل ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام حقیقتیں اس ایک حقیقت کبریٰ میں پوری طرح جذب ہو گئیں تو کیا وجہ ہے کہ مفہوم ''وجود'' جو ان حقائق کی تصریفات، تحویلات، اور اُلٹ پھیر سے پیدا ہوا ہے، اپنے اصل یعنی ''وجود اقصیٰ'' کے مفہوم میں شامل نہ ہو؟

جملہ موجودات بلا واسطہ وجود اقصیٰ کے محتاج ہیں

نیز فلاسفروں کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ ''وجود اقصیٰ'' کو اس لیے محتاج الیہ سمجھا جاتا ہے کہ سلسلۂ امکان کا انصرام و خاتمہ اسی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس سے ایک ہی ہستی (مثلاً عقلِ اوّل) صادر ہو، جس سے ایک اور ہستی (مثلاً انسان) صادر ہو۔ تو اس دوسری ہستی (یعنی انسان) اور وجود اقصیٰ (پروردگار) کے درمیان پہلی ہستی (عقل اوّل) حائل ہو جائے گی۔ اور دوسری ہستی کی تمام ضروریات اور لوازمِ حیات اس پہلی ہستی (عقلِ اوّل) سے وابستہ ہوں گی۔ ''وجود اقصیٰ'' سے اس کا کچھ سروکار باقی نہیں رہے گا۔ درآں حالانکہ اس (پہلی ہستی) کے وجود و بقا کا دار و مدار ''وجود اقصیٰ'' پر ہے۔ نہیں، یہ خیال غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی ممکن کا ظہور خواہ خود بخود ہو، یا اس کو لبادہ وجود پہنا دیا گیا ہو[1] بہر صورت وہ اپنے تمام احتیاجات میں بلا واسطہ ''وجود اقصیٰ'' کا محتاج ہوگا۔ ہاں اس احتیاج کا تعلق ''وجود اقصیٰ'' کے ان شئون عالیہ سے جن کا تصرف تمام کائنات میں جاری وساری ہے کسی ایک شانِ خاص سے ہوتا ہے۔ ذرا غور و فکر سے کام لیجیے، کہ ایک چیز جو دوسروں سے نکل کر مختلف مگر مخصوص آثار و خواص رکھتی ہے، ان دونوں کے بارے میں ہم (ان کے مشترک خواص کے لحاظ سے) کہہ سکتے ہیں کہ وہ دونوں ایک ہیں۔ مگر جب ہم ان دونوں کے مخصوص آثار و خواص کو دیکھتے ہیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ جدا جدا حقیقتیں ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نفی اور اثبات کے احکام کا ظہور نہ ہوتا، اور تمہیں یہ حکم لگانے کا حق نہ ہوتا کہ فلاں یہ نہیں، فلاں وہ نہیں۔ اور نہ ایک کے خواص کی تخصیص دوسرے سے ممکن ہوتی۔ اور اس صورت میں (جب کہ فلاسفروں کے نظریۂ شمولیت کلی کو صحیح مان لیا جائے،

تو) ''وجودِ اقصیٰ'' (خدائے بزرگ و برتر کی ذات) کو مرکب ماننا پڑے گا۔ وہ عالم ترکیب (اور کائنات) سے بالاتر نہیں ہوگا۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے، کہ وہ ایک ''حقیقت کبریٰ'' کثیرالوجود نہیں، یعنی یہ کہ وہ ''واحدِ مطلق'' اور ''وجودِ اقصیٰ'' ہے۔ جس پر کسی دوسری حقیقت کو ماورائیت کے لحاظ سے فوقیت حاصل نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ''وحدت حقیقی'' ایک جامع ترین کلمہ ہے۔ جس کا مفہوم کسی دوسرے کلمہ سے ادا نہیں ہوسکتا، اور نہ کوئی دوسری حقیقت اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اگر اسے اسی حالت پر رکھا جائے اور کسی حیثیت سے مقید نہ کیا جائے تو اس کو کسی حکم کا موضوع (منطقی اصطلاح میں) نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس میں ''یہ ہے'' اور یہ ''نہیں'' تک کی گنجائش نہیں اور کسی کا علم اور کوئی علم اس کے دامنِ ادراک تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ علم درحقیقت تعین کا دوسرا نام ہے، جو مقام ''اطلاق'' کے منافی ہے۔ جس سے ہر دو نقیض مسلوب ہوتے ہیں اور ضدّین سے اس کی نسبت مساوی ہوتی ہے۔

صادرِ اوّل کی تحقیق

اور یہ ''واحد حق'' جس کے کچھ اوصاف ہم نے ذکر کیے ہیں، اس سے صرف ایک ہی شے کا صدور و ظہور ہوسکتا ہے اور وہم (فلاسفہ) جس بات پر مطمئن ہے کہ یہ ''صادرِ اوّل'' حقائق میں سے ایک حقیقت ہے۔ بالکل حقیقت کے برعکس اور غلط ہے، مثلاً یہ کہنا کہ ''الف'' ایک حقیقت ہے اور ''ب'' دوسری حقیقت ہے۔ اور اس ''صادر اوّل'' کا دونوں کے موارِدِ استعمال پر اطلاق ہوتا ہے اور وہ متقابل خواص کے ساتھ تخصیص پاتا ہے، غلط ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہوتا تو اس سے اوپر ایک اور حقیقت ہونی چاہیے تھی، جو متفرق حقیقتوں کی جامع ہو۔ اور ''صادر اوّل'' کی نسبت وہ حقیقت اس بات کی زیادہ مستحق ہوتی کہ ''وحدت کبریٰ'' اور ''وجودِ اقصیٰ'' سے صادر ہو، لیکن ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ ''صادرِ اوّل'' ایک ''انیت''[1] (ہستی)

---

[1] اشراقیہ کے ہاں اشیا جعل بسیط سے ہست ہوتے ہیں اور مشائیہ کے ہاں مرکب کے ذریعہ ان کو لباس وجود پہنایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب ان دونوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

ہے۔ جو بہت سی ہستیوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کو واحد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مطلق ہے۔ (کسی قید کے ساتھ مقید نہیں) اور کوئی دوسری حقیقت، اطلاق اور عدمِ تقیید میں اس کے برابر نہیں بلکہ اس نے دوسرے حقائق پر اوپر نیچے (ہر طرف) سے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اور وہ ''حقیقت قصویٰ'' کا نمونہ ہے۔ اس سے کوئی دوسری ہستی مقابلہ و برابری نہیں کر سکتی۔ اور کسی ہستی کا اس سے بالاتر ہونا تصور میں نہیں آسکتا۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی مثال ہوتی۔ جس کے ذریعہ ان دونوں (صادرِ اوّل، اور حقیقتِ قصویٰ) کے باہمی تعلق کی توضیح کر سکتا۔ اس کی مثال (ناقص) ایسی ہے جیسے ''مطلق شے'' کے عنوان کی نسبت ''شے مطلق'' کی طرف ہو۔ جس میں کسی حیثیت اور لحاظ کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ حتیٰ کہ علم و آگہی اور تسمیہ کی بھی اس کے ساتھ کسی طرح کی نسبت ہو۔

جب ہم ''اِنیۃ اولیٰ (یعنی صادرِ اول یا وجود) اور حقیقت قصویٰ'' کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہستی اول یا صادرِ اول ایک کلمہ ہے جو ایک ہی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر اس کا صدور ہوا ہے۔ اگر اس ایک حیثیت یا اعتبار یا علاقہ سے قطع نظر کیا جائے تو وہ پھر ''صادرِ اوّل'' نہیں ہوگا بلکہ مستقل حقیقت متصور ہوگا۔ مثلاً لفظ ''مِن'' کو ہم صرف اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں ارتباط پیدا کرنے کا سبب ہے۔ اگر اس حیثیت سے قطع نظر کر لی جائے، اور فی نفسہٖ اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کی حرفیت زائل ہو کر وہ اسم بن جائے گا۔ کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ وہ ایک اعتبار یا ایک حیثیت کیا ہے جس کی وجہ سے صادرِ اوّل، صادرِ اوّل کہلایا۔ وہ اعتبار اور ملاحظہ اپنی نظر کو ''حقیقتِ قصویٰ'' تک پہنچانا ہے۔ اور یہ کہ ''صادرِ اوّل'' کے وجود اور ہستی کی حیثیت صرف عنوان کی ہے۔ مقصود بالذات اس کا معنون ہے۔ (یعنی اصل مقصود وہ ہستی ہے جس کا یہ عنوان ہے، لیکن عنوان کو اپنے معنون سے اس قدر اتصال ہے کہ نظر کی دوئی ان میں علیحدگی پیدا نہیں کر سکتی) ''حقیقت قصویٰ'' اور ''صادرِ اول'' کے متعلق تحقیقی بات یہی ہے۔ اندریں صورت اگر اس ''صادرِ اول'' کو اور ان تمام ظہوروں کو جو اس کے طرز پر وجود پذیر ہوں، ہم اپنی طرف سے (اصطلاح صوفیہ) کے مطابق تجلّی سے موسوم کریں۔ یا اس کو اپنی اصطلاح کے مطابق

(اسمائے حسنیٰ میں سے) کسی اسم (پاک) کا نام دیں، تو یقیناً یہ درست ہوگا۔

بعد ازیں اس صادر اول یعنی وجود میں درجہ بدرجہ تنزل واقع ہوتا ہے۔ اور مراتب وجود میں جو ترتیب ہوتی ہے اگرچہ اس کی کنہہ دریافت کرنا بے حد مشکل ہے، لیکن اتنا یقینی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "تجلیات مطلقہ" کی آخری تجلی تمام کائنات اور موجودات عالم کے ظہور میں آنے کا مبدأ اوّل اور سر چشمہ ہے[1]۔ جملہ حقائق کائنات شخص واحد کی طرح ایک ہی نظام میں منسلک ہیں اور سب اقوام عالم تدبیر وحدانی کی معترف ہیں۔

جو حقائق کائنات مشاہدے میں آتے ہیں، یا جن کی مستقل ہستی کو دلیل و برہان سے ثابت کیا گیا ہے، ان کے متعلق یہ خیال کرنا اور اس خیال پر یقین کرنا غلطی ہے کہ ان میں کوئی رابطۂ جامعہ نہیں۔ اور یہ سب کی سب حقیقتیں کسی ایک وحدت کے رشتۂ نظام میں منسلک نہیں۔ برعکس اس کے کائنات کے نظام میں ایسی مستحکم وحدت پائی جاتی ہے، جس کو ہم اس متحد المقصد اور باہم مربوط نظام سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو شخص واحد کے مختلف اعضا اور قویٰ میں موجود و نمایاں ہے اور جس کا مبدأ صرف ایک ہے۔ مثلاً: نباتات میں کسی پودے میں غذا رسانی اور ہضم کا جو نظام (پرورش) ایک ہی روحِ مدبرہ کا مرہونِ منت ہے۔ ممکن نہیں کہ ان کا مجموعی نظام ایک نہ ہو۔ اور اس کو شخص واحد تصور نہ کیا جائے، کیونکہ اس کا صدور ایک ہی کلمہ سے ہوا ہے، جس کو ہم اپنی اصطلاح میں خاتم الاسما کہتے ہیں۔ اور جو ایک کلمہ سے صادر ہوا ہو۔ وہ ایک ہی تو ہوگا۔ اس لیے یہ خیال کرنا سراسر وہم وگمان ہے کہ حقائق کائنات میں کوئی اتصال اور رابطۂ جامعہ نہیں۔ یا وہ ایک ہی نظامِ وحدت میں منسلک نہیں ہیں۔ اس وہم باطل کی مثال بعینہٖ یہ ہے، جس طرح یہ خیال کرنا کہ اجرام سماویہ میں ہر ایک کا نظام حرکت جداگانہ

---

[1] ابن رشد فرماتے ہیں، "الانية في الحقيقة في الموجودات هي معنى ذهني وهو كون الشيئ خارج النفس على ماهو عليه في النفس" (تہافت، ص۲)
دراصل موجودات میں "انیت" ایک معنی ذہنی کو کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز کا خارجی وجود ایسا ہی ہو جیسا وجود اس کا نفس میں ہے۔
امام غزالیؒ فرماتے ہیں: الانية التي هي عبارة عن الوجود غير الماهية مقاصد، ص۳۰)
انیت عبارت ہے وجود سے اور وہ ماہیت کے علاوہ اور حقیقت ہے۔

ہے، اور ادوارِ فلکیہ کا اختلاف کسی ایک نظام کے ماتحت نہیں۔ لیکن جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو یہ خیال خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے کسی کا علم بڑھتا ہے اس کے لیے ازدیادِ یقین کا موجب ہوتا ہے کہ ان سب اجرامِ فلکیہ میں ایک ہی نظام کارفرما ہے۔

دنیا میں کوئی بھی (مہذب و تعلیم یافتہ) قوم ایسی نہیں جس کے علوم میں عالمِ کون ومکان کی وحدتِ نظام، اور تدبیر واحد کا اعتراف (شعوری یا) غیر شعوری طور پر نہ پایا جاتا ہو۔ کیا (قدما فلاسفہ) نہیں کہتے کہ فلک الافلاک جس کے اوپر کوئی دوسرا فلکِ دوّار نہیں۔ اپنی روزانہ حرکت سے تمام دوسرے افلاک کو حرکت میں لاتا ہے۔ اور یہ اس تدبیرِ معنوی کا نتیجہ ہے جو تمام اجرامِ فلکیہ میں جاری وساری ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین میں تغیر وتبدل کے اصل اسباب وہ باہمی اتصالات وروابط ہیں، جو اجرامِ فلکیہ میں پائے جاتے ہیں۔ افلاک کا ہر ایک اتصال اس کرۂ ارض میں جداگانہ انقلاب اور علیحدہ تغیر پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ حتی کہ حوادث یومیہ کی تخلیق انہی افلاکی اتصالات کی بدولت ہوتی ہے، پس فلاسفہ اور اربابِ برہان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جملہ کائنات جو ہمارے مشاہدے اور عقلی تجربے کی زد میں ہے۔ ان سب میں ایک ہی نظام کارفرما ہے۔ اور اس رابطۂ جامعہ کے دائرۂ عمل سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔ فلاسفہ اور اہل معقول کے مقابلہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کے متبعین کا نظریہ زیادہ واضح اور روشن ہے ان کے نزدیک روزمرہ کے حقائق اور واقعاتِ عالم کا ظہور مشیت قاہرہ اور قضا وقدر کی وحدانی تدبیر کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے۔ (سرِ مو تفاوت نہیں) جس طرح حیوانات کے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ میں الرحمٰن ہی نظام وحدانی کا مبدأ ہے

بہرحال اسمائے حسنیٰ میں وہ اسم جو اس نظام وحدانی کا مبدأ ہے اور جس کے بعد اور کوئی اسم

لے شاہ صاحب فلاسفۂ یونان کے نظریۂ عقول عشرہ (جن کے لحاظ سے افلاک تسعہ اور نفوس فلکیہ کا وجودِ عالم عناصر پر مقدم مانا گیا ہے کے مقابلہ پر ایسا نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں تمام کائنات اور عالم مشاہدہ کی نسبت الرحمٰن کی طرف ایک ہی ہو۔

نہیں، وہ "الرحمٰن" ہے۔ میں "الرحمٰن" کی عمومیت اور علوم ومعارف بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عالم بالا واسفل کا تمام فعل وانفعال، تمام حقائق کائنات کا عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونا، اور ہر ایک چیز میں مختلف آثار وخواص کا ودیعت کیا جانا، حتیٰ کہ عالم ارض و سما کے تمام تغیرات اسی اسم پاک کی تجلی ہیں۔ اور اس اسم پاک کی نسبت تمام اجناس وانواع اور اشخاص وافراد سے یکساں ہے۔ اس کے فیضان کی حیثیت ایک کلّی کی ہے جس کو اپنے تمام افراد اور جزئیات سے یکساں نسبت ہے۔ اور اس فیضان کا مبدأ ذات اقدس کی رحمانیت مطلقہ ہے۔ یا اس کے شئون میں سے کوئی شانِ خاص ہے۔ مثلاً ایسے مخصوص اسباب اور علتوں کا جمع ہونا جو انسان کے عدم سے وجود میں آنے کے متقاضی ہوں۔ ہماری اصطلاح میں اسم پاک "الرحمٰن" کے شئون میں سے ایک شانِ خاص کی تجلی کہلائے گا۔ جو در حقیقت رحمانیت مطلقہ کے ضمن میں مضمر تھا۔ اور جس کا ظہور اب انسان کی شکل میں ہوا ہے۔ لیکن یاد رکھو جب تک الرحمٰن کے مفہوم کو مختلف صادرات کے ساتھ نسبت نہ دی جائے۔ اس میں کسی قسم کا تکثر نہیں ہوتا۔

وحد اندر وحدت اندر وحدت است

فعل اور انفعال ہی اس کی شئون میں تکثر پیدا ہونے کا واسطہ ہے۔ جب کسی نوع یا اس کے کسی فرد کے ظہور میں آنے کے مخصصات اور اسباب وعلل فراہم ہوں، تو رحمانیت کا فیضان نازل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں ہوتی[1] اس کے اضافہ میں کسی قسم کا بخل نہیں۔

ہر چہ ہست از شامت ناسازی اندام ما است
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

کیا ایسی ہستی میں بخل کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کا چشمۂ فیض اس حد تک لبریز ہو چکا ہو؟

کائنات میں کارفرما قوتوں کی اقسام اور اسباب ومسببات کا قیام

اور کیا میں تجھے یہ نہ بتاؤں کہ یہ مخصصات (اسباب اور علتیں) کہاں سے پیدا ہوئیں؟ (جواباً عرض یہ ہے کہ) مجموعۂ کائنات کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ اس میں تین قسم کی

---

[1] اذا قضیٰ امراً فانما یقول له کن فیکون (البقرۃ، آیۃ ۱۱۷) آل عمران آیۃ ۴۲، مریم آیت ۳۵) میں اس کی صراحت موجود ہے۔

قوتیں اور ان کے موضوعات اور اجسام واعضا ہوں۔

۱۔ پہلی قسم وہ طبعی قوتیں[1] ہیں جو اس کے مختلف اعضا اور حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ قوائے ادراکیہ[2] ہیں جو موجود کل (کائنات) کی جسمانی قوتوں میں داخلی سریان کے طور پر نہیں بلکہ خارجی (طریان) کے طور پر ودیعت رکھی گئی ہیں۔

۳۔ تیسری قسم وہ الٰہیاتی قوتیں[3] ہیں۔ جو عالم جبروت کی ہستیوں میں ودیعت کی گئی ہیں۔ ان میں سے قضاوقدر بھی ہے۔

جب ان قوتوں نے جداگانہ طور پر ''مستقل ہستی یا وجود'' اختیار کیا، اور جبلّی ہم آغوش اور فطری تلازم کی وجہ سے ان پر ان کے مناسب حال احکام ظاہر ہونے شروع ہوئے، اور ان کے خواص وآثار ایک دوسرے کے اندر داخل مزاج اور ان کے احکام ایک دوسرے کے دائرۂ وجود میں شامل ہونے لگے اس صورت حال میں ان قوتوں کے آثار وخواص میں تصادم اور ٹکراؤ ہوا۔ اور وجود الٰہی نے (جوش رحمت میں آکر) ان پر فیض فرمایا اور انہیں افلاک وعناصر کی صورتوں میں نوازا اور ان میں سے ہر ایک کے لیے جداگانہ احکام مرتب کیے، بعد ازاں افلاک وعناصر کے احکام اور خاصیتوں میں تصادم واتصال کا دور شروع ہوا۔ جس کے نتیجہ میں (باری تعالیٰ کی مہربانی سے موالید (آسمان وزمین کے اندر مخلوقات) معدنیات اور جمادات اور نباتات وحیوانات وغیرہ) کو پیدا کیا گیا۔

جب صوفیائے کرام نے (مقامات سلوک طے کرتے ہوئے) اتنا عروج حاصل کیا، کہ حقیقت مجردہ کا ادراک کرنے لگے، جن کو وہ عالم ارواح (یا عالم اصرار) سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ہم ان کو (اصطلاح شیخ اکبر ابن عربیؒ کے مطابق) ''اعیان'' سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ عالم اسماالٰہی کی تجلیات کا پہلا مرحلۂ تعین ہے۔ اور کائنات کے بالفعل وجود میں آنے کا پہلا مرتبہ ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے (صوفیہ نے) باطنِ وجود میں سلوک کی کوشش کی۔ مگر اس اسم الٰہی کی تجلیات میں انھیں قدم آزمائی نصیب نہ ہوئی۔ اور نہ انھیں وجود

---

[1] (Physical Powers)

[2] (Faclity of Perception)

[3] (Spiritual of Theological Powers)

اقصیٰ (ذات باری تعالیٰ) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی سہل و آسان راہ ملی۔ اس لیے انھوں نے اس کلام سے خاموشی اختیار کی۔ جو اس وقت ہم پیش کر چکے ہیں۔

انھوں نے صرف ان صورتوں کے علم پر اکتفا کیا، جو اللہ تعالیٰ کے علم محیط میں معلوم ہیں۔ اور جن کا وجود اللہ تعالیٰ کے باطنی اسمائے حسنیٰ میں مضمحل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کائنات کے سب اعضا اور حصوں کو انھی اسمائے پاک سے منسوب کیا۔

وللناس فیما یعشقون مذاهب

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

(یہ تو صوفیہ کا حال ہوا) لیکن اشراقیوں[1] کے علوم مشائین[2] کے فتنہ میں گم ہو گئے اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ "دِمنة لم تتكلم من ام اوفى" (کھنڈرات کے غیر واضح آثار) کی مثل بہت کم رہ گیا ہے۔ چونکہ ہم ایک ایسے علم سے بحث کر رہے ہیں، جس کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں، نیز اس کی تفصیل مستقل بحث وکلام اور قطعی دلیل و برہان چاہتی ہے۔ اس لیے سر دست ہم اس سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ ان شاءاللہ ہم کسی دوسرے موقع پر اس کی تشریح کریں گے۔

---

[1] اشراقیہ (Illuminists): نسبته الى الاشراق الذى هو ظهور الانوار العقلية و لمعا فيها وفيضانها بالاشراقات على النفوس عندتجردها) "عالم تجرد میں نفوس انسانی پر انوار عقلیہ کے ظہور وفیضان کے قائل لوگ۔

قطب الدین شیرازی نے مقدمہ شرح حکمة الاشراق میں یہ لکھا ہے: ان الاشراقين لاينتظم امرهم دون سوانح نورية اى لوامع نورية عقلية تكون مبنى الاصل الصحيحة التى هى قواعد الاشراقية۔ اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے محمد علی ابوریان نے اصول الفلسفة الاشراقية ص ۶۲ پر لکھا ہے: ومعنى هذا النص ان المعرفة الاشراقية تقوم على الحدس الذى يربط الذات العارفة بالجواهر النورانية ونسمى بالعلم الحضورى اى حصول العلم بالشئى بدون حصول صورته فى الذهن كعلم زيد لنفسه۔ (المعجم الفلسفى ص ۱۵) دراصل ذات عارفہ کو نورانی جواہر سے علم حضوری کے ذریعہ ہم آغوش کرنے کا الٰہیاتی فلسفہ بہت قدیم ہے۔ کہتے ہیں کہ یونانی فلاسفر افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ قبل مسیح) کا فلسفہ الٰہی ہے۔ جسے شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول نے اپنایا۔ اور انھی سہروردی کی طرف منسوب الٰہیاتی فلسفہ اور مکتب فکر کو "اشراقیہ" کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے پیروکاروں کو اشراقین کہا جاتا ہے۔

[2] مشائینہ: وہ لوگ جو یونانی فلسفی ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح) کے فلسفہ الٰہی کے قائل تھے۔ جنھیں Peripatetics کہا جاتا ہے۔

موجودات کے معرض وجود میں آنے کا دارومدار اسباب وعلل موجبہ پر ہے

روز مرہ کے رونما ہونے والے واقعات وحوادث کے متعلق اس بدیہی نظریہ اور ضروری قضیہ کی تکذیب نہیں کی جاسکتی کہ موجودات عالم میں سے کوئی چیز اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آتی اور نہیں آسکتی جب تک اوپر نیچے (ہر طرف سے) اس کو اسباب اور علل واجبہ اس طرح نہ گھیر لیں، جو اس کے ایجاب وجود کا باعث ہوں۔ اندریں صورت اس ممکن الوجود چیز کا وجود واجب الظہور ہوتا ہے۔ اور وہ تمام اسباب وعلل جو مل کر اس کے ایجاب وجود کا باعث ہوتی ہیں، مجموعی حیثیت سے اس ممکن کے وجود کی علت تامہ ہے۔ یہ معرض وجود میں آئی ہوئی چیز درحقیقت اسی علت تامہ کے مختلف شئون واحوال میں سے ایک شان ہے۔ اور اس کے مخفی کمالات میں سے ایک کمال ہے اور اس کا وجود اس علت تامہ سے کبھی متاخر متراخی نہیں ہوتا، پس ہر موجود (یا واقعہ) اور حادثہ (ہماری اصطلاح میں) حادثۂ یومی کہلاتا ہے۔ اور اجتماع اسباب وعلل کے باعث کمال علل کی حیثیت سے اس کا واجب الوجود قرار پانا اس حادثۂ یومی کا ''سرِّ ظہور'' اور جہت وجود ہے۔

بایں ہمہ ہم یقین کامل اور اعتقاد جازم کے ساتھ کہتے ہیں، کہ اس چیز کو خواہ وہ جوہر ہے یا عرض وجود عطا فرمانے والا ''الرحمٰن'' جل وعلا ہے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ''الف'' کو خاص صورت وجود اور کمال عطا کرتا ہے۔ اور ''ب'' کو بھی انہی کمالات سے نوازتا ہے۔ پھر یہ کہا جائے کہ ''الف'' کو کمالات عطا کرنے والا ''وہاب رحمٰن'' ہے اور ''ب'' کو عطا کرنے والا کوئی اور ہے۔ حاشا وکلا ''وہاب'' (کا مفہوم اتنا محدود نہیں بلکہ وہاب تو وہ ہے جو سب اشیا اور ہستیوں کے کمالات وخواص کے وجود اور ظہور پر قادر وحاوی ہے۔ اور کوئی چیز اس کی رحمت وبخشش کے دائرہ سے باہر نہیں۔[1]

---

[1] بدور بازغہ کی عبارت یہ ہے: وكيف يهب "آ" وهو صورة خاصة لاتكون مندرجة فيها ويكون صورة مندرجة فيها "ب" وهو صورة خاصة اخرى مثلها؟ كلا انما الوهاب هو الذى لا يغادر صورة الالفها وكل مندرج فيه على انه كمال من كمالا تها، اس عبارت میں ذرا ابہام ہے، مترجم نے اس کی تشریح اس طرح کرلی ہے۔

نیز ہم یہ بھی یقین کامل کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگرچہ خدائے وہاب کو فی نفسہ سب اشیا اور موجودات عالم سے یکساں نسبت ہے لیکن ہر ایک چیز کا بعض معین خاصیتوں کے ساتھ مخصوص ہونے اور اس کے جداگانہ امتیازی اوصاف اور کمالات کے ظہور کا انحصار ایک طرف تو اس فطری استعداد و عنصری صلاحیت پر ہے، جو ابتدائے تخلیق کے وقت اس کو بخشی گئی۔ دوسری طرف ان مختلف اوضاع اور ہیئتوں پر ہے۔ جو پیدائش کے بعد اس پر طاری ہوئیں اور تیسری طرف افلاک ثمانیہ کے درمیان موجود (کشش) اتصال سے اس کی ہم آہنگی پر ہے[1]

ان شرائط کے ساتھ یومیہ واقعات وحوادث کے وقوع کو ہم "قضا" کہتے ہیں۔ اس قضا کے بہت سے خدائی احکام ہیں، جنھیں ارباب معقول نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں الٰہیات کے علوم کا ایک اچھا خاصہ حصہ وہ گم کر چکے ہیں۔ مگر انبیائے کرام علیہم السلام کے پیروکاروں نے اپنی تمام توجہ اس علم (دقائق قضا الرحمٰن) پر صرف کی ہے۔ فلاسفہ اور اہل معقول اپنے عقلی استدلال کے ذریعہ قضا کے اجمالی وجود کا اعتراف کر چکے ہیں۔ (یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ عالم اسباب میں تکوین کائنات اور ظہور واقعات میں "قضا" کا بھی ہاتھ ہے) اور پیروکاران انبیا کرام علیہم السلام کو دلائل شرعیہ نے اس بات کے اعتراف پر مجبور کیا ہے کہ یہ تمام تصرف "کلمہ کلیہ" یعنی دستِ قضا کا ہے۔ جس کی حقیقت کا ادراک خدائے رحمٰن جل وعلا کے ہر فیصلے یا قضا میں نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ان دونوں میں سے ہر فریق نے دوسرے فریق کے علم کو بطور اجمال لے لیا ہے۔ اور یہ اجمال بھی ایک ایسے آسان کلمہ میں بیان ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کے نتیجہ میں ان کے مسلک (اور استعداد و احوال) کے مطابق سمجھا دیا گیا ہے۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ علوم کی تحصیل میں اس وقت تک کمزوری نہ دکھاؤ جب تک حقیقت اپنی واضح ترین صورت میں تمہارے سامنے جلوہ گر نہ ہو۔

---

[1] وتحاذی للاتصالات الفلکیۃ کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔

فصل-۲

جواہر واعراض کا امتزاج اور کائنات کا انقسام

کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں کہ طبائع عرضیہ (اعراض) کے وجود وبقا کا مدار طبائع جوہریہ سے پیوستگی اور ہم آغوشی پر ہے۔ چنانچہ (یہ دیکھا گیا ہے کہ) آثار وخواص کا ہر مجموعہ جس میں چند ایک موجودات کا اشتراک ہوتا ہے، لازماً کسی ایسی صورت جوہریہ سے پیوست ومتعلق ہوتا ہے جس میں یہ موجودات متبادل طور پر پائے جاتے ہیں۔

اس اصول کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ عام صورت، صورت جسمیہ ہے۔ اور یہی درحقیقت ان آثار وخواص کا سرچشمہ ہے جو سب اجسام میں مشترک (پائے جاتے) ہیں۔ اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے مثلاً کسی جسم کا کسی شکل وصورت میں ظہور پذیر ہونا، اس کا کسی مکان یا زمان میں مقید ہونا اور کسی مقدار (پیمانہ اور وزن میں محصور ہوکر) ظاہر ہونا۔ (یہ تمام آثار وخواص صورت جسمیہ سے تعلق رکھتے ہیں)۔

اسی (صورت جسمیہ) سے نیچے صورت وہ ہے جو ان آثار وخواص کا مبدأ وسرچشمہ ہے، جو (عناصر میں سے کسی) معیّن عنصر سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ پانی کی ایک مخصوص صورت ہے۔ اور اس کے مخصوص آثار وخواص ہیں۔ یعنی اس کے اندر بہنے، سرد وتر رہنے اور رطوبت کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح آگ کی خاص صورت اور خواص ہے؛ یعنی یہ کہ آگ اوپر کی طرف مائل صعود رہتی ہے۔ حرارت وگرمی رکھتی ہے۔ خشک اور مجفّفِ رطوبات ہے۔ اور چیزوں کو جلاتی ہے، اسی پر باقی سب عناصر اربعہ اور عناصر افلاک کو قیاس کیجئے۔

اس (پہلے اور دوسرے) سے کم نچلے درجہ میں وہ صورت ہے جو ان آثار کا سرچشمہ

ہے جو ایسے اجسام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کی ترکیب وساخت عناصر ارضیہ سے ہوئی ہے۔اوران کے معنویات اور تحولات یعنی مزاج اوراس کے توابع کا مبدأ عناصر فلکیہ ہوں (یعنی کائنات الجو)۔

مندرجہ بالا صورت جسمیہ سے نچلے درجہ میں وہ صورت ہے، جو ان آثار کا سرچشمہ ہے جو جسم نامی کے خواص میں سے ہیں۔یعنی پانی غذا اور وجود بقائے نوع کے لیے توالد و تناسل یا اس قسم کے اور مشابہ آثار، موالید کی جملہ اقسام میں یہ قسم افضل ہے۔

اسی طرح وہ صورت جس کے آثار و خواص کا دائرہ محدود تر ہے، ''حیوان مطلق'' کی ہے، جو حس و حرکت، مشیت و ارادہ، وجدان قلب اور قوت فکر و فیصلہ کی خصوصیات کا حاصل ہے۔اجسام نامیہ میں برتر اور بہترین یہی جسم نامی (حیوان مطلق) ہے۔(یعنی اشجار وغیرہ دیگر نباتات کا درجہ اس سے کم تر ہے)۔

اس (حیوان مطلق) سے اخص و کم تر شامل وہ صورت ہے، جو ان خصوصیات کا مبدأ و سرچشمہ ہے۔جو انسان سے مختص ہیں، یعنی یہ کہ انسان (اپنے جذبات واحساسات، قلبی واردات، اور مافی الضمیر کے اظہار کے لیے) قوت نطق و گویائی رکھتا ہے۔(معلومات کے ذریعہ مجہولات کا علم حاصل کرنے کے لیے) قوت عقل وادراک رکھتا ہے۔(معاشرت اور تہذیب وتمدن کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے) ارتفاق کامل کی تدابیر نافعہ کی جبلی استعداد رکھتا ہے، اور (اپنے خالق و مالک سے) قرب حاصل کرنے کے بہترین طریقوں اور صفات الٰہیہ سے مکمل انصاف کی فطری والہامی قوت رکھتا ہے۔انواع حیوانات میں سب سے اشرف وافضل یہی انسان ہے۔

اور اس سے نچلے درجہ میں وہ صور ہیں جو افراد کے ساتھ مختص ہیں اور وہ نفوس کہلاتے ہیں اور یہ ان خصوصیات کا سرچشمہ ہیں جن سے اشخاص متصف ہوتے ہیں اور جو زید کو زید، عمرو کو عمرو، تم کو تم میں سے متصف و مشخص کرتے ہیں۔بعینہ اس طرح جس طرح انسان کی صورت نوعیہ سے انسان، انسان کہلاتا ہے۔اور جسے حیوانی صورت سے حیوان، حیوان کہلاتا ہے۔

نفوس پر صورتوں کا اطلاق نہ کرنا غلط نظریہ ہے

عام طور پر حکما اس خیال کو قابلِ اعتماد و اطمینان سمجھتے ہیں کہ نفوس پر صورتوں کا اطلاق نہیں ہوتا، مگر یہ بالکل غلط ہے۔ جن قوموں نے ظن وگمان پر یہ نظریہ قائم کیا کہ تمام اجسام طبیعت جوہریہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ان کے درمیان جو افتراق واختلاف پایا جاتا ہے، وہ فقط طبائع عرضیہ کی حیثیت سے ہے۔ گویا کہ یہ مختلف قسم کے رنگ ہیں جو اجسام پر ان کی طبیعت جوہریہ کے اختلاف کے بغیر چڑھا دیے گئے ہیں، اور ان رنگوں کو طبائع عرضیہ سے موسوم کیا گیا۔ اب وہ طبائع جوہریہ طبائع عرضیہ کی طرف مائل رہتی ہیں، اور ان کی تابع فرمان رہتی ہیں یہ کہہ کر ان لوگوں نے حکما کے اصل مذہب کو باطل کر دیا، اب میں تم سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ عام حکما ان لوگوں کے اس نظریہ کو کس دلیل سے ردّ کرتے ہیں؟ یہ کہہ کر ان کے قول ونظریہ کو ردّ کرتے ہیں کہ اس سے کمزور ترین دلیل (سفسطہ) نہیں ہے کہ اس بات کا اعتراف کر لیا جائے کہ حیوان بداہت حسّی کے اقتضا کے مطابق ان مستقل وموجود حقائق میں سے ایک مستقل حقیقت ہے اور پھر ساتھ ہی یہ ادعا (بھی) کیا جائے کہ حیوان کی حیوانیت کا انحصار چند اعراض کے جمع ہونے پر ہے۔ (اور جب وہ اعراض جمع و یکجا ہوئے تو) ان کے حقیقت میں شامل ہوئے بغیر اس مجموعہ کا نام حیوان ہوا۔ (یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟

جس طرح حکما اپنے مخالفوں کے نظریہ کو سفسطہ (یا بودا فلسفہ) سمجھتے ہیں، میں بھی ان (کم فہموں) سے یہ کہوں گا کہ اس سے زیادہ کوئی کمزور ترین دلیل دوسری نہیں ہو سکتی کہ یہ اعتراف کر لیا جائے کہ زید بداہت حسّی کے اقتضا کے مطابق حقائق موجودہ میں سے ایک حقیقت ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ نظریہ قائم کیا جائے کہ زید کی شخصیت کا انحصار چند مشخصات کے جمع ہونے پر ہے۔ جن کے مجموعہ کو زید کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں،) یہ پہلے مفروضے کی طرح تناقض وتضاد پر مبنی خیال ہے)۔

میں تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا صورت جوہریہ کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی شے جو حقیقت ثابتہ ہو مستقل حقیقت کا مالک سمجھا جاتا

ہے اسی طرح صورت عرضیہ کے یہ معنے ہیں کہ کوئی چیز جو مستقل ہستی کی مالک ہے اس صورت عرضیہ کی حامل ہو سکتی ہے۔ لیکن بعینہٖ وہ چیز نہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ میں یہ نہ کہوں کہ زید جو ایک مستقل ہستی ہے اس کی زیدیت بعینہٖ اُس کی صورت جو ہریہ ہے۔

عالم وجود میں جو حقائق ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ صورتیں ہی ہوتی ہیں اور کسی صورت میں بھی دائرۂ صور سے متجاوز و خارج نہیں کیونکہ ''مطلق صورت'' ایک مستقل صورت ہے جس میں یہ استعداد و قابلیت ہے کہ وہ ہر ایک صورت کو جو اس پر طاری ہو، قبول کر سکتی ہے۔ یہی حالت ہر صورت کی اپنے ماتحت صورتوں کے ساتھ ہے کہ وہ انہیں قبول کر کے ماتحت حقائق کو وجود بخشتی ہیں۔ (صورت جسمیہ صورت نامیہ کو قبول کر کے جسم نامی کو وجود بخشتی ہے۔ صورت نامیہ، صورت حیوانیہ کو قبول کر کے حیوان کو وجود میں لاتی ہے۔ صورت حیوانیہ صورت انسانیہ کو قبول کر کے انسان کو وجود میں لاتا ہے۔ اور صورت انسانیہ نفوس کو قبول کر کے افراد کو وجود دیتی ہے)۔

''مطلق صورت'' اور ''ہیولیٰ'' سے امتزاج کا فلسفیانہ نظریہ غلط ہے

کیونکہ جسم میں دوئی نہیں آسکتی

اہل معقول کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ ''مطلق صورت'' ہیولیٰ[۱] سے پیوست ہوتی ہے، اور ہیولیٰ بذات خود کوئی صورت نہیں۔

میری دلیل یہ ہے کہ اشیائے کائنات اور سب اجسام و موجودات کی عام ترین خاصیت اور شامل ترین اثر یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی تشکل[۲]، تحیز، توقیت اور مقدار خاص کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ بس ''مطلق صورت'' جب ہیولیٰ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اس وقت بھی ہیولیٰ کی خاص شکل اور خاص مقدار ہوتی ہے۔ا

---

۱ مقدمہ جرجانی نے تعریفات میں ''ہیولیٰ'' کے معنی یوں لکھے ہیں: ''لفظ یونانی بمعنی الاصل و المادة. وفی الاصطلاح ھی جوھر فی الجسم قابل یعرض لذلك الجسم من الاتصال والانفصال محل للصورتین الجسمیة والنوعیة۔

۲ تشکل Form: تحیز (مکان) Dimension of Space، توقیت (زمان) Time، مقدار (Quantity)۔

وراس کا مخصوص زمان ومکان ہوتا ہے۔اب جب کسی جسم کے اجزا میں باہمی ربط واتصال ٹوٹ جائے یا اندرونی طور پر اس میں کوئی تبدیلی رونما ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ایک خاص مقدار اور خاص وضع کو چھوڑ کر دوسری مقدار اور وضع اختیار کر لی۔اور اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ اس جسم نے انفکاک اجزا اور انفصال داخلی کی وجہ سے مقدار اور وضع کی طبیعت ہی چھوڑ دی ہے اور اس کا تعلق ان میں سے کسی سے نہیں رہا۔حقیقت یہ ہے کہ وہ اتصال جو صورت جسمیہ کے ساتھ پیوست ہے وہ اس انفکاک وانفصال سے زائل نہیں ہوا۔اگر اس کا زوال ممکن ہے تو کسی ایسے انفصال کے ذریعے ہوگا جس کے بعد اتصال کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے اور اتصال کا کوئی فرد بھی باقی نہ رہے لہٰذا اس میں ہر گز شک نہ کرو کہ ایسے انفصال او اتصال کا کوئی وجود نہیں جو صورت جسمیہ کے ساتھ پیوست اتصال کی ضد ہو۔جس میں ایسی دوئی نہیں جس کی بنا پر ہم ایسے ''ہیولیٰ'' کا اثبات کر سکیں جو ہیولیٰ تو ہو لیکن صورت نہ ہو۔وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ ''الرحمٰن'' کی شانوں میں سے کوئی شان ایسی بھی ہے کہ وہ تمثل تو اختیار کر لیتی ہے لیکن وہ صورت نہیں ہوگی؛ غلط کہتا ہے۔اس قسم کی باتوں پر تجھے کان نہیں دھرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ صورت بعینہٖ اس موجود کا نام ہے جو کسی خاص وضع کے ساتھ مقید ہو یا این (مکان) سے تعلق رکھتا ہو۔یا کسی اور عرض (مادّی کیفیت) کے ساتھ ملوث ہوا ہو جو ''وضع'' اور ''این'' کی مزید تخصیصات ہیں۔

درست بات یہ ہے کہ ''تجلی جبروتی'' (مظاہرۂ صفات قاہرہ الوہیت) جو ''الرحمٰن'' سے اس کے فرع کے طور پر ظہور میں آتی ہے وہ ایک ایسا موجود ہے جس میں کسی قسم کی تلویث و آمیزش نہیں۔اور صورت وہ موجود ہے جو کسی عرض کے ساتھ ملوث ہو۔بایں ہمہ وہ سرّ جو ''الرحمٰن'' سے نازل ہوتا ہے وہ تخصیصات لاحقہ کے مطابق دونوں قسموں میں محفوظ ہے۔

البتہ صورتیں بلحاظ شرف وخست ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔اس لیے صورت انسانیہ صورت حیوانیہ سے اشرف ہے۔اور صورت حیوانیہ صورت نامیہ سے افضل ہے۔اور صورتِ نامیہ صورتِ مولّدہ (موالید ثلاثہ یا معدنیات کی صورت) سے بہتر ہے۔(ہر کسی انسانی شخصیت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ) ہر ایک انسان میں صورت مولّدہ، صورت

نامیہ صورت حیوانیہ، صورت انسانیہ اور صورت شخصیہ (ذاتیہ) سب کے سب شیر و شکر بن کر ایک دوسرے میں گھل مل گئی ہیں۔ اور بادی النظر میں یہ ناممکن نظر آتا ہے، کہ کسی بھی صورت کا علیحدہ تحقق ایسا ہو سکے کہ اس کی طرف مستقل اشارہ کیا جا سکے۔ صرف نظر غائر ہی حقیقتِ حال کو ظاہر اور ہر صورت کو اپنے آثار و خواص کے ساتھ دوسری صورتوں سے ممیز کر سکتی ہے۔

موجودات کا ظہور نو اسبابِ اختلاف اور وجوہ اشتراک کی بنا پر فیضان الٰہی سے ہوتا ہے

میں اس وقت تک تجھ سے خوش نہیں ہو سکتا، جب تک ان دونوں مسئلوں (اشتراک واختلافِ موجودات) کی حقیقت اور راز سے آشنا نہ ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس مادہ نے جس میں صورت مولدہ (موالید ثلاثہ کی صورتِ جوہریہ) کے اختیار کرنے کی استعداد و قابلیت تھی، اپنے سب اجزا کے ساتھ جمع ہو کر ایک امتزاجی کیفیت حاصل کر لی۔ اس نے اپنی اس استعداد و قابلیت کے ساتھ "الرحمٰن" کی طرف رجوع کیا۔ جس کے نتیجہ میں (فیضانِ الٰہی اور وجودِ لامتناہی سے) اجتماع شروط اور وجوہ استعداد کی بنا پر اس پر صورتِ مولدہ فائض ہوئی۔ اور اس نئی خلقتِ مزاج کے ساتھ اس کا ظہور ہوا، جس کی خصوصیات وقتاً فوقتاً کارفرما اور ظاہر ہونے لگیں۔ ان کو (بہر صورت) بالذات اسی صورت مولدہ کا اثر و نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ اس صورت کا وجوب فیضان رحمٰن سے اجتماع عناصر اور اس کی استعداد پر منحصر تھا، پھر اس (صورت مولدہ) نے دوسری قابلیت و استعداد حاصل کر لی۔ (ایک بار) پھر اس نے "رحمٰن" کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال پھیلا دیئے، اور خداداد موہوب استعداد اور مکتسب قابلیت کی موجودگی کی بنا پر اس پر حکم صورت نامیہ فائض ہوئی، جس سے زندگی کی ناقص صورت کا ظہور ہوا۔ اس ناقص زندگی سے خاص اثرات ونتائج رونما ہونے لگے۔ جو صرف اسی کی طرف بالذات ارتقا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کا وجود پہلی صورت (صورت مؤلدہ) کی موجودگی پر منحصر ہے۔

ارتقا کی اس دوسری منزل میں رہ کر اس (ناقص صورت نامیہ) نے مزید استعداد اور قابلیت حاصل کرلی۔ پھر "الرحمٰن" کی طرف مڑ گئی۔ (اور فیضان الٰہی سے فیضیاب ہونے کے لیے دستِ سوال پھیلا دیئے)۔ چنانچہ مخصوص شرائط کے اجتماع اور موجود خاص استعداد کی بنا پر (نئی) صورتِ حیوانیہ اس پر فائض ہوئی اور اسے حیات ناقص کی بجائے حیاتِ کامل عطا ہوئی۔ اور اس (نئی زندگی) کے اثرات وقتاً فوقتاً اس سے ظاہر ہونے لگے۔ ان اثرات کو یقیناً اسی صورت حیوانیہ کا بالذات اثر ونتیجہ سمجھا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے وجود کے لیے پہلی (یعنی ناقص صورتِ نامیہ) کا وجود شرط ہے۔

ارتقا کی اس تیسری منزل میں رہ کر اس (کامل صورتِ حیوانیہ) نے مزید استعداد و قابلیت حاصل کرلی، بعدازاں اس نے "الرحمٰن" کی طرف رجوع کیا۔ اور (حسب سابق دامنِ سوالات پھیلا دیا۔ تو مخصوص شرائط کے اجتماع اور اس ترقی یافتہ استعداد و قابلیت کی بنا پر صورت انسانیہ پر فائض ہوئی۔ جس کی وجہ سے اس میں مبدأ (یعنی ذاتِ اقدس) کے ساتھ (تا بحد امکان بشری) تشبہ حاصل کرنے کی جبلّت و استعداد پیدا ہوئی۔ اس استعداد کے مخصوص اثرات اس سے صادر ہوتے رہے، اب ان کی نسبت بالذات اسی صورت انسانیہ کی طرف ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ اثرات درجہ اوّل کے حصول پر مبنی ہوتے ہیں، اسی صورت حال کے پیش نظر اتصال و اشتراک کیوں اور کیسے نہیں ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر (ترقی یافتہ) صورت کا فیضانِ وجود، اسبق (پہلی غیر ترقی یافتہ) صورت کے وجود کی بدولت قائم رکھا ہے۔ اگر پہلی (ابتدائی) صورت کے شروط ظہور میں نہ آتے تو اس دوسری یعنی (آخری درجہ کی) صورت انسانیہ کا ظہور ہی نہ ہوتا اور کوئی وجہ نہیں کہ اس آخری درجہ (اور ترقی یافتہ صورت) کو سب پر تفوق حاصل نہ ہو، کیونکہ (ان میں سے) ہر صورت اپنے سے ترقی یافتہ صورت میں جا کر "الرحمٰن" سے جداگانہ اور نئے کمال سے متصف ہوتی رہی ہے۔

موجودات میں فیضانِ الٰہی اور تفوق کے لیے استعداد ذاتی کی اہمیت

ابھی ٹھہرو، اور ان معانی کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو، جو ان مذکورہ صورتوں میں سے ہر ایک صورت کو (مراتب ارتقا میں یکے بعد دیگرے) حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے نامی کو مولد پر شرف حاصل ہے۔ (اور حیوان کو نامی سے افضل و برتر سمجھا جاتا ہے) اور یہی حالت دوسرے معانی جدیدہ کی ہے۔ جس کے صحیح مفہوم ظاہر کرنے کے لیے ہماری زمینی اور معاشی زبان میں وضع شدہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ ان کی حقیقت خود جلوہ نما ہو جائے۔ البتہ تمثیل (کی کسی قسم) کے ذریعہ اس کی توضیح کی جاسکتی ہے اور سمجھنے والے (کان) اسے سن کر ایک حد تک حقیقت کو پاسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت تک مکمل وصول نہیں ہوتا۔

کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں ہے کہ جب جسم کے اعضا جمع ہو کر ٹھوس شکل اختیار کرلیں، اور ان کے درمیان عمدہ ربط و اتصال پیدا ہو جائے، اور ان کی سطحیں بغیر کسی کجی کے بالکل ہموار ہو جائیں، تو یقیناً یہ جسم صیقل اور شفاف ہوگا۔ جس میں روشنی منعکس ہوگی، اور اشیا کے رنگ و عکس نظر آئیں گے۔ (یہ یاد رکھیے کہ) کثافت (ٹھوس ہونے) ہموار سطح اور اتصال و ربط کے مختلف درجے ہیں۔ (اور انھیں ہر کسی جسم کے صیقل اور شفاف ہونے کے درجوں کا مدار ہے)۔ چنانچہ اشیا میں بعض چیزیں زیادہ ٹھوس یا زیادہ سیدھی، زیادہ مربوط و متصل اور زیادہ صیقل و شفاف ہوتی ہیں۔ اور بعض کم۔ اس لیے ہم ان مختلف مراتب کو وحدات[1] کہتے ہیں۔ (اگر صقالت اور شفافیت بہت معمولی ہے تو یہ) پہلا درجہ ہے، جسے ہم ایک وحدت کہیں گے۔ (اور اگر اس سے بہتر یا دو چند ہے تو یہ) دوسرا درجہ ہے، جس میں دو وحدتیں شامل ہیں۔ اور اس سے زیادہ یعنی سہ چند ہے۔ تو یہ درجۂ ثالث ہے۔ جس میں تین یونٹ شامل ہیں۔ اور (اسی اضافے کے ساتھ) چوتھے درجہ میں چار وحدتیں شامل ہیں۔ اسی پر خدائے رحمٰن جل وعلا کے افاضات خاصہ کو قیاس کرلیجیے۔ کہ اجزائے جوہریہ کے تکاثف، استوا اتصال اور ثقالت میں فرق مراتب کے مطابق کم

---

[1] (Units)

استعداد والے پر کم فیض نازل ہوتا ہے اور جن میں استعداد زیادہ ہوتی ہے اس پر نسبتاً زیادہ فیض نازل ہوتا ہے۔ دراصل یہی اوصاف کثافت وصقالت ہی ہیں۔ جو عالم ابداع (کے معرضِ وجود میں آنے) کے بعد عالم خلق میں افاضہ رحمٰن کے باعث وموجب ہیں۔ کیونکہ عالم ابداع کا یہ خاصہ ہے کہ وہاں سے امور نازل ہوتے ہیں۔ اور عالم خلق کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں سے مجسم، کثیف اور محسوس اشیا کا صعود ہوتا ہے۔ (اور نظام کائنات میں اسی تنزل وصعود کا سلسلہ جاری ہے۔ اور زندگی کے بقا اور استمرار کا انتظام کیا گیا ہے)۔

موجودات عالم کے مراتب کمال اور نوع انسانی کی فضیلت کا راز

الغرض مولدات میں جو کمال ودیعت کیا گیا ہے، وہ ابتدائی درجہ کا کامل ہے یعنی وہ بسیط (غیر منقسم) ہیئت جس سے تعبیر صورت مولدہ کے ذریعے کی جاتی ہے، اس کمال (صورت مولدہ) کے خواص واعراض یہ ہیں کہ آثار کو صورت نوعیہ کی طرف منسوب کیا جائے، نہ کہ اجزائے عنصریہ کی طرف، صورت عنصریہ اجزا سے الگ ہوتی ہے اور اس کے اثر کے طور پر سب اجزا پر متشابہ رنگ اور خاصیت طاری ہوتی ہے۔ (کیونکہ عناصر کے جداگانہ خواص ہوتے ہیں اور جب وہ کسی مرکب کی شکل میں جمع ہو کر ظاہر ہوں تو ان کے آثار وخواص بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی جو آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں سے مرکب ہے اس کے خواص ان کے دونوں عنصروں سے جداگانہ اور مختلف ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری مرکبات ومولدات اور ان کے عناصر ترکیبی کا حال ہے)۔ عوام الناس کا منتہائے نظر ومقصود تو ان مولدات کے یہی ظاہری خواص وآثار ہوتے ہیں اور ان سے ماورا حقائق تک رسائی نہیں رکھتے۔ مگر جو اہل علم وتحقیق ہیں، وہ اگرچہ دوربین نگاہ رکھتے ہیں مگر ان کی (زمینی ومعاشی زبان اتنی فصیح وبلیغ نہیں جو ان حقائق کو بیان کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اس کو مولدات کا کمال خصوصی (یعنی صورت عنصریہ) قرار دیا ہے۔

نباتات اور نامی اشیا کا کمال دوسرے درجے (نسبتاً بلند درجہ کے کمالی اوصاف ہیں۔ جو اوّل الذکر درجہ سے نسبتاً زیادہ ہیں۔ ان نامی اجسام کے آثار وخصوصیات میں (موالید کی صفات کے علاوہ) نمود وبالیدگی، تغذیہ وپرورش، پیدائش مثل اور اس کو خاص

شکل دینا ہے اور افرادِ نوع کے تشخص کو دوسرے اشکال مقادیر اور صورتوں سے تمیز کرنے کا قانون (ان اشکال و مقادیر کے علاوہ جن میں تمام افرادِ نوع مشترک ہیں) اور ان مراتبِ عروج وانحطاط کی رعایت کرنے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو ابتدائے آفرینش سے فنا وزوال کے وقت تک پیش آتے ہیں۔اس (درجۂ تہذیب وتمدن) کو محققین درجۂ ثانیہ کہتے ہیں (جو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ بلند ہے)۔

اسی طرح حیوان کے اندر جو کمال ودیعت رکھا گیا ہے، تیسرے درجہ کا کمال ہے۔ چنانچہ اس درجہ ثالثہ میں (پہلے اور دوسرے درجہ کے کمالات کے آثار کے ساتھ ساتھ یہ (زائد) آثار وخواص بھی پائے جاتے ہیں۔(جن سے نباتات یا نامی اجسام محروم ہیں)۔ حواس ظاہرہ وحواس باطنہ حصول نفع اور دفع ضرر کی طرف انگیخت ، وہ ارادے جذبات اور تصورات وغیرہ جو دل سے صادر ہوتے ہیں، وجدانیات اور قلبی واردات جو نور قلب کے انکسار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں،اس کمال کو محققین نے صورت حیوانیہ سے تعبیر کیا ہے۔

اسی طرح انسان میں جو کمال ودیعت کیا گیا ہے (گزشتہ تین درجوں سے بلندتر) چوتھے درجے کا کمال ہے۔اس کے خواص شرف میں سب سے بالاتر ہیں۔مثلاً انسان میں رای کلی[1] (قضایائے کلیہ کو قائم کرنے اور عقل وذہن سے معلومات کے ذریعہ مجہولات تک پہنچے) اور صورت ناسوتیہ (وجود جسمانی) کے انسلاخ (موت) سے پیشتر مبدأ (ذات اقدس) کے ساتھ بقدر امکان بشری تشبیہ حاصل کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔پھر (ان مذکورہ کمالات کے بعد) ہر فرد میں جو مخصوص آثار وخواص پائے جاتے ہیں، وہ ہر فرد کے ساتھ مختص کمال (نفس) ہے اور یہ درجۂ پنجم کا کمال ہے،خوب سوچ کر ان حقائق کو پہچان لو۔

نامی، حیوانی اور دیگر صورتوں کے مداراتِ وجود

کیا اصحاب علم باللہ (اہل معرفت) نے تجھے یہ بتادیا ہے کہ ہر صورت کے انعقاد (عقیدے) کا مدار کوئی اور شے ہوتی ہے۔اس لیے ہر صورت نامیہ کا مناط ایک قوت نامویہ ہوتی ہے جو مولدہ (جسم عنصری) کی تکمیل کرتی ہے، پھر (قوت نامیہ) کا اکمالی وتکمیلی عمل

---

[1] (Public will)

مدبر وحکمران کی حیثیت سے اس جسم عنصری کے اندر جاری رہتا ہے اور اپنے تصرف خاص سے مختلف غذاؤں کو جمع کر کے انہیں مناسب انداز سے تحلیل کرتی ہے اور انہیں موافق جسم بنا کر جز جسم بناتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ منتہائے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر جب جسم تحلیل ہوتا ہے تو صورت نامیہ بھی فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر صورت کی ہستی اپنے محل کے ساتھ ربط وابستگی پر منحصر رہتی ہے کسی غیر پر نہیں اور ہر ربط وابستگی ایک عقدہ (انعقاد) ہوتی ہے۔ جس کا کوئی مناط ضرور ہوتا ہے اور قاعدہ یہی ہے کہ جہاں مناط باطل ہو جائے، وہاں ''عقدہ'' بھی باقی نہیں رہتا۔ اور جب ''عقدہ'' تحلیل ہو جاتا ہے تو صورت لامحالہ باقی نہیں رہتی۔

صورت حیوانیہ (کی ہم آہنگی وابستگی) کا مناط یہ عمل ہے کہ متولد کے جسم میں نسمہ (روح ہوائی) مکمل ہو اور اس کی قوتیں جسم میں جاری وساری ہوں۔ جسم کی تخلیق صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ روح ہوائی کی جولان گاہ اور اس کے تغذیہ کے لیے کھیتی ہو۔ صورت حیوانیہ کی بقا کا دار ومدار جسم پر قطعاً نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ (جسم) اس (صورت حیوانیہ) کی زینت عروس (اور زیبائش لیلیٰ) کے لیے بمنزلہ اسٹیج کے ہے۔ اس لیے جب جسم فنا ہو جاتا ہے تو صورت حیوانیہ فنا نہیں ہوتی۔ ہاں جب نسمہ (روح ہوائی) تحلیل ہو جاتی ہے تب صورت (حیوانیہ) بھی باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح انسانی صورت (کی وابستگی) کا مناط یہ ہے کہ اس کی شخصیت (ہویت) اتنی مکمل ہو کہ وہ مبادی عالیہ میں جو ''امام الانسان''[1] ہے اس کے لیے شرح بسیط بن سکے، اور اس شخصیت پر امام انسان کے خواص وآثار واضح طور پر ظاہر ہو سکیں، اس لیے جب نسمہ (روح ہوائی) فنا ہو جاتی ہے، تو صورت انسانیہ فنا نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ نسمہ (عام برزخ کے جملہ مدارج سے گزر کر) 'امام الانسان' کے حضور پہنچ جاتی ہے تو فنا ہو جاتی ہے۔

---

[1] امام الانسان سے مراد انسان کے وجود نوعی کا تمثل ہے۔ جو عالم مثال میں اہل کشف کو عیناً نظر آتا ہے۔ اور جو تمام افراد انسانی کا اجمال ہے۔ حدیث معراج اور دیگر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت آدم علیہ السلام کو اس حالت میں دیکھنا کہ اس کی اولاد کی تمام سعید وشقی روحیں اس کے دونوں جانب موجود تھیں، (واللہ اعلم) اس امام انسان کا مشاہدہ تھا۔

صورت شخصیہ (جو مطلق صورت انسانیہ کا فرد ہے) کا مناط ''رحمٰن'' کے اسم پاک سے نازل شدہ کلمہ ہے جو تمام ارتقائی منازل میں محفوظ رہتا ہے۔ یہ کلمہ ایک امر فرد ہے۔ جس میں رحمانیت کی صفت عالیہ کی تجلی نمایاں ہوتی ہے۔ جب کوئی سالک طریقت مقامات سلوک کو طے کرتے ہوئے صورت شخصیہ کے اطلاق میں پہنچ جاتا ہے تو اس کلمۂ نازلہ محفوظ کی بدولت اس پر خاص علوم نازل ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ ان علوم کا نزول کہاں سے ہو رہا ہے لیکن وہ فردِ کامل جو تمام منازل ارتقا سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ اور ان ارتقائی منازل کی ہر منزل کو طے کر کے بالآخر مسیر طریقت میں ''الرحمٰن'' تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

فلاسفہ کا یہ زعم غلط ہے، کہ انسان اور گھوڑا جنسِ حیوان کی دو شاخیں ہیں، بعینہٖ اسی طرح جس طرح حیوان اور درخت جنس نامی کی دو شاخیں ہیں، حاشا وکلّا ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ خدائے رحمٰن جلّ وعلا نے اسمائے حسنیٰ کے تنزلات اور صورِ موجودات کے تصاعد کے لیے حرکت دوریہ کا نظام قائم فرمایا ہے۔ جس کا ظہور مختلف مناطات کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر عالم نامی میں فاسد مادّہ موجود نہ ہوتا، جس کا ضروری نتیجہ نباتات کی ایسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو اوپر جانے کی استعداد سے محروم اور سفلی استعداد سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، تو سب نباتات حیوانات کی شکل وصورت میں تبدیل ہو جاتے، اسی طرح (اگر استعداد مکمل ہوتی) تو تمام حیوانات انسان بن جاتے۔

کوئی شخص منازل ارتقا سے بری ہو کر عارف الٰہی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے اندر کسی درخت مثلاً کھجور یا بیری کو نہ دیکھے گا۔ اور یا اس کو اپنے نفس کے اندر کسی حیوان مثلاً گھوڑے یا گائے کی صورت نظر نہ آئے گی۔ پھر اس کے باوجود وہ اس بات سے واماندہ[1] نہ ہو کر مقامات سلوک طے کر کے ''حقیقت قصوی'' یعنی باری تعالیٰ تک پہنچ جائے جو ہر موجود کے لیے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

---

[1] واماندہ بقا، قیام

فصل۔۳

انسان کی صورت نوعیہ اور اس کے طبعی تقاضوں کا بیان

جاننا چاہیے کہ نوع انسانی کی طبیعت کے لیے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام افراد انسان نطق، ضحک وغیرہ سب خصوصیات کے حامل ہوں یہ ضروری ہے۔ کہ اس کی ایک مستقل ہستی اور وحدت دوسرے اشخاص وافراد کی وحدتوں اور ہستیوں سے الگ جداگانہ ہو اور اس ہستی اور وحدت کی بنا پر اسے جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ طبیعت نوع انسانی اس وقت تک باقی رہے گی جب تک نوع انسانی کا کوئی ایک فرد بھی باقی ہو بلکہ اگر کسی فرد کی بقا کا امکان بھی ہو اگر تم یہ باور کر سکو کہ فانیات زمانیہ اپنی فنا کے بعد بھی دہر (غیر متناہی) میں باقی رہتی ہیں۔ اسی طرح طبیعت نوع انسانی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خاص مقدار سیدھی قامت (حیوان کے گھنے بالوں کے مقابلہ میں) صاف جلد اور اس قسم کی دوسری خصوصیات (جو اس کے سب افراد میں بلا تخلف فرد پائی جاتی ہیں) کے بارے میں اس کی معین حد ہو۔ اگرچہ سرسری نظر میں یہ صورت (نوعیہ) دوسری (افرادی) صورتوں سے علیحدہ کر کے مجرد نہیں دیکھی جا سکتی۔ لیکن نظر غائر تو اس کو اپنے (نوعی) خواص سے اور آثار کے ذریعہ دوسری (افرادی) صورتوں سے جدا کر سکتی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جس وجود کی بنا پر زید زید ہے، اس میں انسان کی صورت نوعیہ زید کی صورت شخصیہ سے متمیز نہیں لیکن جس وجود کے ذریعہ انسان انسان ہے۔ اس کے لحاظ سے اس کی صورت نوعیہ کسی دوسری چیز سے خلط ملط نہیں ہو سکتی۔

یہی حال زمان کے ظرف ولبادہ کا ہے۔ جس میں اگرچہ ایک وحدت میں مختلف صورتیں پوری طرح بغل گیر ہو کر جمع ہو گئیں۔ یہ وحدت دنیوی زندگی کے تقاضوں کے مطابق وجود میں آتی ہے۔ جس میں گردش اور ہیر پھیر (اور ارتقائی تغیرات) کی استعداد موجود ہے۔ لیکن

(لامتناہی) دہر کے ظرف میں ہر ایک صورت دوسری صورت سے متمیز ہو کر محفوظ ہے، جو اس کی نشاۃ قصوی کا تقاضا ہے اور جو اپنے مبدأ ہی سے فیض قبول کرتی ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ ہر ایک موجود کا مبدأ دوسرے موجود کے مبدأ سے مختلف ہوتا ہے، ورنہ سب موجودات ایک ہی موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دوئی اور مغائرت کبھی نہ ہوتی۔ دہر کو ملحوظ نظر رکھ کر یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت کی حقیقت دوسری صورت کی حقیقت اور اصل سے متمیز نظر آتی ہے۔[1]

جب تحقیق اس درجہ تک پہنچ گئی، تو کیا وجہ ہے کہ طبیعت انسانیہ (انسان کی صورت نوعیہ) کو ایک مستقل ہستی کے طور پر آپ اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں لا سکتے جس میں جنس اور فرد کے احکام کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔[2]

انسانی طبیعت اور رحمٰن جل وعلا سے فیضیابی کی کیفیت

میں تم سے اس وقت خوش ہوں گا جب ہر چیز کی اصل خلقت کو ان اصول کی روشنی میں ملاحظہ کرو جو ہم نے ذرا پہلے بیان کیے ہیں ہم نے تجھے یہ سمجھا دیا تھا کہ "الرحمٰن" اسم پاک کی ہر حقیقت پر مشتمل ہے اور حقائق (اشیائے کائنات) اپنی فطری استعدادات کے مطابق فیضانِ رحمٰن سے بہرور ہوتے ہیں۔ اور انسان کی صورتِ نوع کا فیضان بھی صورت حیوانیہ کی استعداد کے مطابق "الرحمٰن" سے ہوتا ہے۔ یہ افاضہ ایک معلوم درجہ، مخصوص اندازہ، مقررہ اصول اور محدود حد کے ساتھ ان فطری استعدادات کے مطابق ہوتا ہے، جو باران جود الٰہی سے استدعائے فیض کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس پر صورت انسانی فائض ہو جاتی ہے۔[3]

---

[1] اس عبارت میں پروفیسر آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہ انسانی صورت نوعیہ کی مستقل ہستی کے نظریہ کے قائل ہیں، اور یہاں فلاسفۂ یونان کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ انسانی نوع کی ہستی صرف افراد کے ضمن میں متصور ہو سکتی ہے اور "مطلق انسان" کا مفہوم انتزاعی ہے۔ جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔

[3] یہ درحقیقت قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی فلسفیانہ تشریح ہے۔ وان من شیئی الا عندنا خزائنه وماننزله الا بقدر معلوم حضرت شیخ سعدیؒ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم وخس

اور معلوم وزن وحد سے متصف یہ افاضہ شئون رحمٰن میں سے ایک شان اور اس کے مختلف جہات مندرجہ میں سے ایک جہت ہے، جو طبیعت انسانی کی صورت میں جلوہ گری سے پہلے لم یکن شیئاً مذکوراً کا مصداق تھا اور جلوہ گری کے بعد "اسم جزی" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کیونکہ اس کا درجہ بلحاظ نزول اسمائے مطلقہ (تجلیات) اسمائے پاک کے درجہ سے کم تر ہے۔ اسم جزی یا تجلی یہ ہمارے (صوفیا) کی اصطلاح میں ہے ورنہ فلاسفہ کی اصطلاح میں اسے "عقل طباعی" کہتے ہیں۔[1]

ہر طبیعت نوعی اپنے امام سے پیوستگی و وابستگی رکھتی ہے

اور اس بات کی توقع اور طمع مت کرو کہ شریعت اسلام کے بانی جو مخلوق کے لیے معلم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت بھیجے گئے ہیں۔ اس اسم خاص کے جاری و ساری ہونے سے متعلق علوم کے سوا کسی اور بات کا ذکر کرے، وہ بھی اس طرح کہ اجمالی سریان کے بجائے جو عام لوگوں کے فہم واستعداد سے بعید ہوتا ہے، صرف تفصیلی سریان کا ذکر کیا گیا ہے جو عام فہم ہے۔

اس شخص سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو یہ بات تو تسلیم کرے کہ افلاک میں سے ہر فلک اپنی حرکت دوریہ کے سلسلہ میں اور اُن اثرات کے سلسلہ میں جو اس سے زمین

---

[1] تنزل کے سلسلہ میں اس حدیث شریف پر غور کرنا چاہیے "ینزل ربنا کل لیلة الی السماء الدنیا" الخ

غالب شاہ صاحب عقل طباعی سے مراد وہی عقل لیتے ہیں جو ابن رشد نے تلخیص مابعد الطبیعیہ ص ۲۹ میں ذکر کر چکے ہیں۔ اما العقل فان شانہ ان ینتزع الصور من الھیولیٰ ویتصورھا مفردة علی کنھھا وذالك امرہ بین۔

یا پھر ارسطو کی "عقل فعال" مراد لیتے ہیں جس کو معجم فلسفی ص ۱۱۱ پر یوں کیا گیا ہے:

"یحب ان یکون فی النفس تمیز یقابل التمیز التام بین العادة وبین العلة الفاعلیة التی تحدث الصور فی العادة، اسی قوت عقل اور تمیز نفس کو اس جزی یا تجلی کہنا شاہ صاحب کی مخصوص اصطلاح ہے۔ ہاں تجلیات کے تنزل کے سلسلے میں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے استشہاد کیا جا سکتا ہے۔

پر نازل ہوتے ہیں۔ اپنے امام (عقل) کے تابع ہوتا ہے اور پھر اس حقیقت سے انکار پر اصرار کرتا ہے کہ ہر نوعی صورت وزن و مقدار معلوم کے لحاظ سے اپنے امام کی تابع ہوتی ہے۔ یہ قصورِ نظر، سوفہم اور عدم تحقیق کا نتیجہ ہے (کہ وہ اس حقیقت سے انکار کرتا ہے) ورنہ اہل معرفت جن کے سامنے طبیعت نوعیہ کے آثار و خواص متمثل ہو کر نظر آتے ہیں اس کی صداقت میں ذرہ بھر شک نہیں کرتے۔ اس لیے تم کبھی آنکھوں کے سامنے اس (صورت نوعیہ) کی مستقل ہستی کے جلوہ گر ہونے میں شک نہ کرو۔ اور کیوں نہ ہو جس کو ہم اسمائے حسنیٰ میں سے اسم پاک کہتے ہیں، اور فلاسفہ کے نزدیک وہ عقل طباعی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ شئون رحمانیہ میں سے ایک شان ہوتی ہے جو بالاترین مقام میں ان (شئون) کے اجمالی ادغام کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے گویا کہ وہ عنوان ہے جسے عنوانیت کے درجہ میں پیدا کیا گیا ہے اور نوع کے افراد میں جو کچھ بعد میں آتا ہے وہ معنون اور تفصیل ہوتی ہے)۔

تمثیل اسم کے بارے میں یہ توقع نہ رکھیے کہ وہ امام (یعنی شان خاص) اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ متمثل ہو سکے گی۔

عالم مجرد اور اجسام کے درمیان قوت متوسطہ

اب میں تم کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس اسم پاک کا سریان طبیعت انسانیہ (صورت نوعیہ انسانیہ) میں کس طرح ہوتا ہے اور ہر طبیعت نوعیہ اشخاص و افراد میں کس طرح سرایت و نفوذ کرتی ہے قریب ترین تشبیہ یہ ہے کہ اسم پاک گویا ایک روح کلی[1] ہے۔ طبیعت نوعیہ روح حیوانی یا نسمہ[2] اور مجموعۂ افراد سب بمنزلہ شخصِ واحد کے ہے اور اس سرایت کے بعض اثرات تو (ظاہری آنکھ اور) سرسری نظر سے محسوس ہوتے ہیں مثلاً کسی فرد کی تخلیق کے اسباب فراہم ہو جائیں تو اسم پاک یک بارگی اس فرد کی شکل میں اتر کر رونما ہوتا ہے۔ پھر دوسرے شخص کی تخلیق کے اسباب و علل فراہم ہو جاتے ہیں۔ تو اس رنگ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظہور اس طرح ہوتا ہے جس طرح کلی اپنی جزئیات

۱۔ (Uninersal Soul)

۲۔ (Nesmie Body)

میں ظہور کرتی ہے۔ (اس طرح نہیں جیسے کل اپنے اجزا میں ظہور کرتا ہے) یعنی کلی کی جزئیات اسی طرح ظہور میں آتے ہیں۔ اور جب یہ افراد واشخاص عالم خلق میں قدم رکھتے ہیں تو اس اسم پاک کے آثار ان افراد میں کلی طور پر سرایت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دوسری خاصیتیں ہیں جن کا احساس وادراک دقیق وعمیق نظر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً

نمبر ۱: وہ تدبیر کلی ہے جسے کوئی اسم پاک ایک ہی مرتبہ سب اشخاص میں جاری کرتا ہے اور جس کے نتیجہ میں سب افراد (ایک وحدانی نظام وتدبیر کے ذریعہ) شخص واحد کی طرح ہوجاتے ہیں۔ اور اس کی صحت وبیماری حرارت وبخار اور دیگر عوارض کا ظہور اسی تدبیر کلی یا وحدانی نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔

یا نمبر ۲ جیسے کہ اشخاص انسانیہ کی استعداد کے مطابق کسی شخص کا کسی صورتِ ظاہری، صورتِ نوری، صورت ذاتی یا مکاشفہ کے طور پر کسی صورت (ذوقی) میں متمثل ہونا (بھی گہری نظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا)۔

ان صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرنے کے بعد اُس پر ان کی استعداد کے مطابق اسم پاک کی تجلیات مرکوز ہوجاتی ہیں۔ عوام کا علم (اور احاطۂ نظر) اس اسم پاک کی تجلی سے بالاتر (حقائق کی طرف) نہیں جاتا لیکن کامل افراد کو وحدت کبریٰ اور اس کے بعد کی تجلیات تمام کے تمام اسی اسم پاک کی راہ سے مشاہدہ ہوتے ہیں جس کی راہ سے وہ خود ظہور میں آئے ہیں کوئی بات اُن سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔

یا (۳) اُن جزی اسما کی حقیقت کا فہم وادراک بھی نظر غائر سے ہوسکتا ہے جو اُس تصادم وکشمکش کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جو اس تدبیر الٰہی (جس کا دوسرا نام حق ہے) اور عالم کون وفساد کے اندر جزی حوادثات اور سلسلۂ مرض وصحت کے درمیان ہوتی ہے۔ جیسے وہ جزوی اسم جس کی تفصیل ملت حنیفیہ ابراہیمیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی، بعد ازاں وہ اسم جزوی جس کی تفصیل دین موسوی اور شریعت محمدی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ان تین علوم کی حقیقت کا ادراک صرف علما حق اور اہل معرفت ہی کرسکتے ہیں۔

اہل معرفت اس سریانی کیفیت کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں جب اس کا تعلق نوع سے ہو تو اس کو "عنایت رحمانی" کا نام دیتے ہیں اور جب اس کا تعلق اُن عوارض سے ہو جو نوع پر عالم خلق میں طاری ہوتے ہیں، تو اسے "تدبیر رحمانی" سے موسوم کرتے ہیں اور جب کشمکش و تصادم سے اس کا تعلق ہو تو اسے باطل کو توڑنے کے لیے "حق دامغ" کہتے ہیں۔ اور پھر عنایت الٰہی اور حق کو جن کا نزول اسم الرحمٰن سے ہوتا ہے آثار ظاہرہ کے لحاظ سے مناسب حال اسما مثلاً رزاق، مصور، قابض اور باسط وغیرہ ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اسما (اپنے اجمالی مفہوم میں) مفردات ہیں اور عالم امر و خلق میں جو قوائے عاملہ اُن کے مظاہر ہیں وہ ان کے مرکبات ہیں۔

امام الانسان اور اس کی تفصیل

اور اس تحقیق جلیل میں تمہاری مزید امداد ہماری اس دلیل و بیان سے ہوسکتی ہے کہ "امام الانسان" کے لیے ضروری ہے کہ نوع انسانی کے جملہ افراد کے اس کی وحدت میں مندرج ہوں اور ہر فرد انسانی بحیثیت مطلق انسان اس کے دائرہ شمولیت سے باہر نہ ہو۔ زید، عمرو اور بکر کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں، کیونکہ زیدیت اور عمرویت عارضی خصوصیت و احوال ہیں جو حسب استعداد افراد پر طاری ہوتی ہیں۔ یہ بات امکان و تجویز کے دائرہ کے اندر رہتی ہے کہ اگر وہ اسباب و علل یا استعدادات جمع ہوں جو زیدیت کی متقاضی ہیں تو وہ شخص زید بن جاتا ہے۔ اور اگر عمرویت کے متقاضی ہیں تو وہ شخص عمرو بن جاتا ہے۔ پس امام الانسان کے پاس زید کو زیدیت اور عمرو کو عمرویت کی صورت بخشنے کی قوت حد امکان تک تو ہے لیکن ان کو بالفعل ان صورتوں سے نوازنے کے لیے احوال و ظروف اور معدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی پر ان خاص احوال و ظروف کو قیاس کیجئے جو بعد میں (دنیوی زندگی میں) ان افراد و اشخاص پر طاری ہوتے ہیں۔ جب زید اور عمرو عالم وجود میں قدم رکھتے ہیں تو وہ باتیں جو پہلے دائرہ امکان کے اندر تھیں اب ایک ہی دفعہ فعل (و عملی صورت) کا لبادہ پہن لیتی ہیں۔

اسی طرح وہ حالات وکوائف ہیں جو تمام کائنات عالم بالا و اسفل پر ابتدائے آفرینش سے انتہائے عالم کون وفساد تک طاری ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں، یا ہوں گے اور جن کا ظہور ان لوگوں کے نزدیک جو زمان کے قید میں محبوس ہیں، مختلف اوقات میں یوماً بعد یوم ہوتا ہے اور اس خدائے قدوس کے نزدیک جو مکان وزمان کے قیود سے منزہ اور برتر ہے، ایک دم ظہور میں آتے ہیں۔ بہر حال یہ سب حالات اور واقعات دائرۂ امکان میں رہتے ہیں۔ اور اسباب وعلل موجبہ کے جمع ہونے پر قوۃ سے فعل میں آتے ہیں۔ اور یہ تمام حوادث جو ایک ایک فرد کو پیش آتے ہیں دونوں حالتوں میں یعنی جبکہ وہ دائرہ امکان کے اندر ہوں اور پھر جب وہ بالفعل کا لبادہ پہن لیں، خدائے بزرگ وبرتر کے مقرر نظام میں شامل ہیں۔

تقدیر کا مسئلہ

کیا اہل معرفت الٰہی نے تجھے اس حقیقت سے روشناس کیا ہے کہ موجودات عالم میں ہر روز جو انقلابات وتغیرات رونما ہوتے ہیں وہ دو مرتبہ وجوب (یعنی لازماً وجود میں آنے کے تقاضے) سے متصف ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ قبل از وجود (جبکہ ابھی درجۂ اجمال میں ہوتے ہیں) اور دوسری مرتبہ بعد از وجود (جب عالم کون وفساد میں) اس کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی حال ان کے علل موجبہ کا بھی ہے۔ چاہے وہ حادث ہوں یا قدیم[1] دونوں پر یہ نظریہ حاوی ہے۔ اور یہ سلسلہ کائنات میں ابتدا کی طرف اسی طرح ممتد ہے یہاں تک کہ یہ تمام حوادث وموجودات اس سر میں مندرج ہیں جو الرحمٰن سے نازل ہوتا ہے۔ اس لیے کائنات کا معاملہ وقتاً فوقتاً پیدائش کا نہیں بلکہ ہر چیز کے وجود کا حتمی فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے جو کچھ وجود میں نہیں آئے گا۔ اس کے موجود ہونے کا امکان ہی نہیں۔ اور جس شے کے وجود کا امکان ہے وہ لامحالہ وجود میں آئے گی۔ یہ اور بات ہے کہ امکان کا یہ مفہوم لیا جائے کہ حق کے ظہور سے پہلے جب آدمی دائیں بائیں عقلی گھوڑے دوڑاتا ہے تو وہ ذہنی احاطہ

---

[1] حادث کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز ایک وقت نہیں تھی، پھر ہو گئی، ظاہر ہے کہ ایسی چیز اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی اسے وجود میں لائے۔ قدیم وہ چیز جس کے وجود کے لیے زمانی ابتدا نہ ہو۔

کے اعتبار سے صفتِ شیء ا ۔ رکر لیتا ہے اور وہ اس صورت ذہنی پر ممکن کا اطلاق کرتا ہے مگر اہل حق سے حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور وہ یہ ہے کہ اس نظام واجب الوجود (غیر وجوب ذاتی) کا ظہور خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی صفت عالیہ سے ہے، جو اس کے ظہور سے قبل بھی اس میں موجود تھا۔

انسان کے افراد پر جو کچھ بھی فیض نازل ہوتا ہے وہ یا تو امام الانسان سے ہوتا ہے یا دیگر ائمہ انواع میں سے کسی نوع کے امام سے ہوتا ہے۔ پھر جب کوئی حادث ظہور پذیر ہوتا ہے تو ان دونوں کے احکام آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

عالم امر وعقل کی حقیقت

پھر خدائے رحمٰن کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ممکنات ''امور مجردہ'' کی متعینہ بالفعل کا درجہ حاصل کر کے ''موجود کلی'' کی قوت عقل وادراک میں نازل ہوں پھر جب بھی (اسباب اور علل موجبہ کے جمع ہونے پر) اس کے عالم وجود میں آنے کا وقت آتا ہے تو خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی طرف سے اس کے ایجاد وایجاب یعنی معرض وجود میں لانے میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی گویا ایجاد وایجاب عالم مجرد تک محدود ہو جس کو اکثر صوفیا کرام عالم امر بھی کہتے ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک اس کا دوسرا نام عالم عقلی ہے اور ہمارے اس قول ''درّاکۃ الموجود الکل'' (یعنی ممکنات جن کا بالفعل تعین موجود کلی کی قوت عقل وادراک میں ہو) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ان اشیا کو خارج کرنا چاہتے ہیں، جن کا وجود ذہنی ہو بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ موجود کلی کے درّاکہ میں وجود کے وقت وہ مجردات میں سے ہوتے ہیں اور عالم مادی سے اس کے تجرد اور تنزہ کی توصیف وتصریح مقصود ہے۔

عالم مجرد وعالم اجسام میں قوت متوسطہ کے مظاہر

پھر یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ موجود کلی کی قوتوں میں ایک ایسی قوت بھی ہے جو عالم مجرد اور عالم اجسام کے درمیان قوت متوسطہ کا کام دیتی ہے جس کی شان یہ ہے کہ اس کی بدولت مجردات عالم بالا مادہ کے احکام سے متصف ہوتے ہیں اور مادیات پر مجردات کے

احکام کا اجرا ہوتا ہے۔ اگر یہ درمیانی قوت نہ ہوتی تو اشیا کے آثار و خاصیتیں ان کی صورتوں سے جبلی طور پر وابستہ نہ ہوسکتیں۔ اور کسی کے ذہن میں زید کی جو صورت ہوتی وہ زید کی متعین صورت نہ بن سکتی۔ اور نہ خدائے رحمٰن جل و علا سے جو تجرد محض سے متصف ہے کوئی مادی صورت صادر ہوسکتی۔

اور انہی وجوہ کی بنا پر فلاسفہ مشائین نے بھی افلاک کے لیے بھی متوسط قوت کا اثبات کیا۔ جو خدائے رحمان کی طرف سے مختلف صورتوں کے فیضان کے لیے برزخ کا کام دیتی ہے۔ اور افلاک کی علل کلیّہ کے احکام کو جزوی حرکات میں تبدیل کرنے کے لیے واسطہ اور ذریعہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوت متوسطہ (صرف افلاک تک محدود نہیں بلکہ وہ) تمام کائنات (الموجود الکل) پر ایک محمول کی طرح احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کے اپنے مظاہر ہیں جن میں اس کی تجلی ہوتی ہے چنانچہ اس کا کامل ترین مظہر عرش بریں کی قوت متخیلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا مظہر افلاک کی قوت متخیلہ ہے اور تیسرا مظہر انسان کی قوت متخیلہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک مظہر میں جداگانہ آثار و احکام اس سے اوپر کی قوتوں کی مناسبت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ احکام کے مجردات (ارواح) اس قوت پر نازل ہوتے ہیں اور اس قوت میں اس کے اشکال والوان ظاہر ہوتے ہیں پھر یہ اشکال والوان، عالم امر سے عالم اجسام پر نازل ہوتے ہیں۔

انسانی وجود چار عالموں میں ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان کا ایک وجود وہ ہے جس کا فیصلہ علم جبروت میں ہوا اور دوسرا وجود وہ جس کا فیصلہ عالم ارواح میں ہوا پھر تیسرا وجود وہ جس کا فیصلہ عالم مثال میں ہوا۔ اور سب سے آخری وجود وہ ہے جو اس عالم اجسام میں ظاہر ہوا۔

(عوالم اربعہ میں مختلف صورتوں میں انسانی وجود کے اس نظریہ کو) اچھی طرح جان لو۔

پہلا مقالہ

(۱)

امام الانسان کے ان احکام کا بیان جن کا ظہور بنی نوع انسانی کی طبائع میں ہوتا ہے اور ان سے وہ اپنے اخلاق، ارتفاقات، اور رسومات میں ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

پہلی فصل

ہر صورت نوعیہ حیوانیہ کی دو قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں

حیوانی انواع کی نوعی صورتوں میں سے ہر یک صورت نوعیہ کی خصوصیتیں دو قسم کی ہیں:

۱۔پہلی قسم اس کی ظاہری خصوصیات ہیں جیسی خلقت اور بناوٹ یعنی شکل وصورت، رنگ اور مقدار اور آواز میں دیگر انواع مخلوقات سے جداگانہ اور ممتاز ہے مثلاً انسان کی قد و قامت سیدھی ہوتی ہے وہ نطق و گفتگو کرتا ہے، سمجھتا ہے۔وہ بالوں سے صاف ستھری جلد رکھتا ہے، اس کے برعکس گھوڑے کو دیکھیے وہ کج قامت (اور زمین پر چار پاؤں سے چلتا ہے) ہنہناتا ہے، گھنے بالوں والا (گچھ وار دُم) کا مالک ہے اور اس پر دوسرے حیوانات اور انواع کے خواص کے باہمی تمایز کو قیاس کر لو۔تھوڑے سے غور وامعان کے بعد تمہاری نظروں کے سامنے وہ سب امتیازی صفات وخصوصیات آجائیں گی جن سے ہر نوع کے افراد دوسرے انواع کے افراد کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت سے متصف ہیں۔

۲۔دوسری قسم کی خصوصیات باطنی خصوصیات ہیں۔جن کی وجہ سے انسان دیگر حیوانات سے ممیز ہو جاتا ہے مثلاً: اس کو اللہ تعالیٰ نے قوت ادراک اور معلومات ومحسوسات کے ذریعہ مجہولات کا علم حاصل کرنے کی استعداد سے نوازا ہے۔اور وہ اپنی زندگی کو مخصوص طریقے پر بسر کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کو جداگانہ ادراک اور طریقہ معاش سے نوازا ہے اور ان کے مدارج بھی مقرر ہیں مثلاً شہد مکھیوں کو اس کی فطرت کے مطابق یہ الہام کیا گیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ مناسب درختوں کی

تلاش بھی کریں، اور ایک گھر بنائیں جس میں اس کی نوع کے افراد جمع ہوں اور مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس چوس چوس کر وہاں شہد تیار کریں۔

اس طرح چڑیا چڑے کو دیکھیے کہ شہوت کے وقت ''نر'' اپنی ''مادہ'' سے کس طرح مباشرت اور اس کا پیچھا کرتا ہے پھر کس طرح وہ دونوں رہنے سہنے کے لیے پہاڑوں میں آشیانہ بناتے ہیں۔ اور انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں اور مدت ختم ہونے پر انڈوں کو چونچوں سے مارتے ہیں۔ اور بچے نکالتے ہیں۔ جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو کس طرح وہ ان کو دانے اور غذا بہم پہنچاتے ہیں؟ پھر کس طرح آہستہ آہستہ ان کو پرواز کے لیے چھوڑتے ہیں۔ بعد ازاں بچوں کو بلّی، شکاری اور جال سے بچنے کی تربیت دیتے ہیں۔ اور انھیں سکھاتے ہیں کہ غلہ، پانی اور غذا وہ کہاں کہاں سے حاصل کریں۔ اور ان مقامات میں دشمنوں سے کس طرح حفاظت کریں۔ نیز یہ کہ وہ اپنی نوع کے دوسرے پرندوں کے ساتھ رہیں اور حصول نفع وضرر کے لیے کس طرح لڑیں۔

وعلی ہذا القیاس دوسری باتیں ملاحظہ کیجیے تا کہ تمہارے سامنے وہ تمام الہامات وجبلّی تقاضے متمثل ہو جائیں جو کسی ایک نوع کے افراد کے لیے مخصوص ہیں اور وہ دوسرے انواع کے افراد میں نہیں پائے جاتے۔ پھر اس سے زیادہ کم عقلی اور بے وقوفی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ احکام، آثار وخواص جو سب افراد نوع سے مختص ہیں ان کے بارے میں یہ خیال قائم کیا جائے کہ وہ صورت نوعیہ اور امام النوع کا تقاضا نہیں ہیں۔

انسان کی امتیازی خصوصیات: جہاں تک انسان کا تعلق ہے تو اس کو دوسری انواع سے اس بات میں تفوق وامتیاز حاصل ہے کہ اس کی خصوصیات اکمل، اتم اور افضل ہیں، مثلاً یہ کہ انسان رائے کلی اور انجام کار کو ملحوظ رکھ کر کوئی عمل کرتا ہے اور مافی الضمیر اور قلبی جذبات اور باطنی احساسات کو کلام سے ادا کرتا ہے اور (اپنے اور دوسروں کے کلام کو (سمجھ، بول اور) لکھ سکتا ہے۔ اس میں سلیقہ اور جذبۂ لطافت وزیبائش بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور اگرچہ یہ خاصیتیں بے شمار ولا محدود ہیں مگر ان سب کا مرجع تین بنیادی باتیں، بنیادی خصوصیات ہیں۔

انسان رائے کلی کے ماتحت قصد وعمل کرتا ہے مثلاً جلب نفع ورفع ضرر کے لیے

غضبناک ہو کر کامیابی کے موانع کو راستہ سے ہٹانا اگرچہ انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے لیکن چوپایہ کو اس کی تحریک کسی امرِ محسوس یا موہوم سے ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کا غیظ و غضب (ان محسوس و موہوم موانع کو ہٹانے کے علاوہ) بعض اوقات شہریت اور تمدن و تہذیب انسانی کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کامل قانون اور ضابطہ و نظام کی تشکیل کی خاطر بھی ظہور میں آتا ہے۔ اسی طرح چوپایہ اپنی اغراض و خواہشات کی تسکین و تحصیل کے لیے اپنے آپ کو تھکاتا ہے۔ لیکن اس کی جدوجہد کا نصب العین بھوک اور پیاس کو رفع کرنے اور صنفی خواہش یا اس قسم کی سفلی اور حیوانی خواہش کے پورا کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ مگر انسان بعض اوقات ایسے مقاصد کے حصول کے لیے مصائب و تکالیف برداشت کرتا ہے۔ جن کے لیے کوئی جسمانی خواہش اور جسدی محرک نہیں ہوتا بلکہ کسی عمل میں اس کی سعی اور جدوجہد اس لیے ہوتی ہے کہ یا آخرت (کی نجات و سعادت) کا مقصد یا دنیا میں ارتفاقات و اداروں کی تشکیل کا مقصد حاصل کرے جن کے اثرات دیر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

۲- انسان کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی ظرافت (سلیقہ) ہے، یعنی حس لطافت و زیبائش ہے، چوپایہ شدت بھوک اور پیاس، اور گرمی و سردی کی شدت سے بچنے کے لیے بقدر ضرورت و کفایت کھانے پینے اور سر چھپانے کے لیے جگہ بنا لیتا ہے اور شکم سیری کے لیے غلیظ گھاس پھوس اور گدلا پانی کھا پی لیتا ہے اور کسی درخت کی پناہ لینے یا کسی غار میں گھس جانے پر اکتفا کرتا ہے لیکن انسان اپنے ماکولات و مشروبات اور رہائش و مسکن میں صرف کفایت اور دفع ضرورت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس میں اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور لطف اندوز ہونے کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے لطافت و زیبائش کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اور سکون قلب و نظر حاصل کرتا ہے۔

۳- تیسری امتیازی خصوصیت انسان کی حیوانات کے مقابلہ پر یہ کہ چوپایہ کو جو الہامی جبلتیں دی گئی ہیں وہ اس کی معاشی زندگی کے لیے امدادی آلات اور ذریعوں کا کام دیتی ہیں۔ اور ان کی ضرورت صرف اس وقت محسوس و ظاہر ہوتی ہے جب اسے کوئی حاجت

پیش آتی ہے۔اس لیے چوپایوں کو علم کی تحصیل کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر انسان تحصیل علم کو تکمیل ذات کے لیے لازمی اور ضروری سمجھتا ہے اور صفت ایجاد وتقلید کی وجہ سے الہامی علوم کے مؤید اکتسابی علوم وفنون سے اپنی دنیوی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کو ترقی کے عروج پر پہنچانے میں کوشاں رہتا ہے۔یہی تین اصول ہیں جن پر نوع انسانی کی ان تمام خصوصیات کا مدار ہے جن کی بدولت انسان دوسرے انواع مخلوقات سے ممتاز نظر آتا ہے۔

انسانوں کے باہمی تفوق کے اسباب

یہ بھی جاننا چاہیے کہ جس طرح حیوانات میں ایک دوسرے سے امتیاز وتفاوت کا مدار ان کے اجزائے ترکیبی میں باہمی ربط واتصال، صلابت وبستگی اور صفائی ونظافت کے اختلاف پر ہے جس کے نتیجہ میں بعض کامل الخلقت ہوتے ہیں۔اور بعض متوسط اور بعض ناقص الخلقت ہوتے ہیں۔بعینہٖ اسی طرح نوع انسانی کے افراد بھی ان اوصاف کے تفاوتِ مراتب کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں چنانچہ بعض انسان صلابت، صفائی اور اتصال اجزائے ترکیبی میں ایک دوسرے سے زیادہ کامل الخلقت ہوتے ہیں اور ان مذکورہ اوصاف ثلاثہ میں کمال کے مطابق ان میں تفاوت مراتب ہوتا ہے۔مگر کامل ترین انسان وہ ہے جس میں صلابت صفائی اور اتصال اجزا کے اوصاف بہ درجۂ اتم موجود ہوں اور پھر ان اوصاف سہ گانہ کے کمال کے اثرات ان کی قلبی، طبیعی اور نفسانی، روحانی تین قوتوں میں نمایاں ہوں اور نتیجہ ان قوائے ثلاثہ میں اشتباک اور کامل وابستگی وتلازم ظہور پذیر ہو اس لیے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حقیقی شرف وفضیلت کا مدار ان صفات ثلاثہ میں زیادتی واضافہ ہی پر ہوتا ہے۔اس قسم کا کامل ترین انسان ایک قانون ومثال[1] کا حکم رکھتا ہے اور حکمت خلقیہ (فلسفہ اخلاق) میں اس کو معیار[2] مانا جاتا ہے، وہ اخلاق قابل تقلید اور پسندیدہ خیال کیے جاتے ہیں جو اس کے نمونہ اخلاق کے مطابق ہوں اور جو اخلاق اس کے کردار کے مخالف ہوں ان کو اخلاق ذمیمہ اور قابل نفریں سمجھا جاتا ہے پھر یہ بھی یاد رکھو کہ حکمت خلقیہ

---

[1] (Ideal) [2] (Slandasd)

(فلسفہ اخلاق) دوسرے سب اقسام حکمت وفلسفہ مثلاً حکمت معاشیہ (اقتصادیات) تدبیر منزل[1] اور سیاست مدنیہ[2] وغیرہ کے لیے بمنزلہ قانون ومعیار کے ہے۔

نیز اس قسم کے کامل ترین انسان کو معرفت باری تعالیٰ اور مجازات اعمال کے مسائل میں بھی سند ومعیار مانا جاتا ہے اور اس معرفت باری کے ساتھ جو عبادات وابستہ ہیں ان کے لیے اعضا کے (مخصوص طریقہ سے) استعمال کا جو قاعدہ مناسب ہے اس کی پہچان کے لیے بھی اس کامل ترین انسان کا طرز عمل معیار کا کام دیتا ہے۔

شجاعت وغضب اور دیگر خصال کی حقیقت

کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ چوپایوں میں جو سانڈ ہر طرح کی آسودگی اور خوشحالی میں پل کر حد کمال تک پہنچ جائے اور اسے مزاج جسم کے مطابق غذا (طعام وشراب) میسر ہو اور اس کو نشست وبرخاست اور چلنے پھرنے میں پوری آزادی وغیرہ حاصل ہو تو وہ اپنی نوع کے دوسرے چوپایوں سے دو باتوں میں نمایاں امتیاز حاصل کر لیتا ہے۔

۱- پہلی امتیازی صورت اس کی ظاہری اور جسدی خصوصیتوں کی حامل ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اس کا سینہ فراخ اس کا رنگ شوخ، اس کا بدن قوی اس کے اعضا جسمانی مضبوط اس کے بال گھنے اس کے بدن کی بو، تیز، اس کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط اس کے جوڑ نمایاں اس کی رگوں میں خون تیز۔ اس کی آواز بلند وشدید، اس کی گرفت سخت اور اس کی قوت شہوانیہ زبردست ہوتی ہے۔ وہ مادہ کے ساتھ عظیم محبت کرتا ہے۔ (اگر چہ یہ محبت کسی خاص مادہ کے ساتھ نہیں بلکہ مطلق مادہ کے ساتھ ہوتی ہے) اس کی گردن موٹی اور اس کے بدن پر گوشت زیادہ ہوتا ہے۔

۲- دوسری امتیازی خصوصیت (شان) اس کی روح حیوانی کے آثار وخواص میں نمایاں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتا ہے۔ بڑا دلیر اور بہادر ہوتا ہے اور حملہ کرنے میں پیش رفت کرتا ہے۔ کینہ ور اور غیرت مند ہوتا ہے۔ اور وہ یہ برداشت نہیں

---

[1] (Economics) [2] (Political Science)

کر سکتا کہ اس کی نوع کا کوئی دوسرا فرد گرفت و سرکشی میں اس پر فائق رہے وہ ارادہ کا پختہ ہوتا ہے اور اپنے ارادے کی تنفیذ چاہتا ہے اور کوئی چیز اسے اپنے عزم و ارادے کی تنفیذ سے پھیر نہیں سکتی۔ جب وہ کسی چیز کی طرف دیکھتا ہے تو بنظر ہیبت دیکھتا ہے اور جب چلتا ہے تو نہایت وقار کے ساتھ چلتا ہے جب اسے کوئی خوفناک چیز درپیش ہو تو وہ یا تو حملہ آورانہ انداز میں اس سے نمٹتا ہے اور یا بے خوفی کے ساتھ اسے نظر انداز کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت تفوق اور ریاست کا خواہاں رہتا ہے اگرچہ یہ ریاست و حکمرانی اس کے طبقہ اناث (مادوں) تک محدود کیوں نہ ہو اور اسے یہ قطعاً ناگوارِ خاطر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا نر اس کا ہم پلّہ اور مقابل ہو۔ تام الخلقت سانڈ میں یہ سب ظاہری اور باطنی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ ہاں بعض ناقص الخلقت سانڈوں میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے (اور اس اندازے سے اس کے تفوق و برتری کا معیار بھی کم ہو جاتا ہے) اور ان اوصاف میں کمی یا فقدان کے بنیادی اسباب یہ ہوتے ہیں کہ یا

۱۔ شکم مادر میں ان جمع شدہ مواد میں نقص و کمی ہوتی ہے۔ جن سے اس کی تخلیق ہوتی ہے اور نتیجہ اس کی ناقص الخلقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ یا اس تدبیر و تربیت کا قصور ہے جو اس کی نشو و نما اور اس کو اپنی صورت نوعیہ کے تقاضوں کے مطابق مرتبہ کمال و بلوغ تک پہنچانے کی باعث ہوتی ہے۔

جس طرح حیوانات میں ان صفات کی مثال دے دی گئی ہے بعینہ اسی طرح ان صفات کو نوعِ انسانی میں قیاس کیجیے اور وہ مذکورہ اصول ثلاثہ جو خصوصیات انسان میں سے ہیں یعنی رائے کلی عواقب امور پر نظر رکھنا، ظرافت (جمالیاتی ذوق یا جذبہ لطافت وزیبائش) اور تکمل بالاخلاق والعلوم (یعنی علوم و اخلاق کو ضرورت سے قطع نظر کر کے صرف تحصیل کمال کی خاطر حاصل کرنا) کو بھی مدنظر رکھیے۔

جاننا چاہیے کہ جب قوت غضبیہ کا محرک ''رائے کلی'' ہو تو اس کا جو نتیجہ ظہور میں آئے گا اس کا نام شجاعت ہوگا، اور یہ ایک وصفِ محمود ہے کیونکہ ایسے شخص کا اقدام اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اسے یقین یا گمان غالب رہتا ہے کہ اگر وہ انتقام لے لے تو مستقبل

میں اسے کوئی نفع حاصل ہوگا یا کسی ضرر سے وہ بچ جائے گا۔ پھر اپنے ایک خلق پر (یعنی شجاعت پر) اعتماد کرتے ہوئے اور اس کے ذریعہ اپنی شخصیت کی تکمیل کرتے ہوئے وہ جنگجوئی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور محرک اس کی طبیعت میں کام نہیں کرتی۔

رائے کلی اور ظرافت کے آثار

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب علوم کی تدوین ''رائے کلی'' اور تکمیل بالاخلاق (اخلاق کے ذریعہ کمال حاصل کرنا) پر مبنی ہوتو وہ حکمت (فلسفہ) بن جاتے ہیں، اور جب ان کی تحصیل میں سلیقہ اور جذبۂ لطافت وتحسین کا دخل ہوتو علوم میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور ان کے مسائل میں باریکیاں اور نکتہ سنجیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح بلند آواز میں جب ظرافت اور جمالیاتی ذوق داخل ہوجائے تو وہ حروف سے مرکب کلام اور سمجھانے والے بول بن جاتے ہیں۔ اور جب اس میں ''رائے کلی'' اور ''تکمل بالاخلاق'' کا عمل دخل شروع ہوجائے تو وہ فصاحت کی شکل اختیار کرلیتی ہے، جو مخفی اسرار وافکار اور جذبات وعواطف کے اظہار کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس طرح خود بینی وخود پسندی (جو بہ ظاہر مذموم اوصاف ہیں) کو جب ''رائے کلی'' مہذب وشائستہ بنادے تو وہ سماحت (فیاضی اور عالی منش) جیسے قابل تعریف اخلاق کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور جب اس میں ذوق جمال کی کارفرمائی شروع ہوجائے تو اس سے عفو ودرگزر اور سخاوت وغیرہ مختلف اوصاف ظہور میں آجاتے ہیں۔ اسی طرح محبتِ نسواں جس میں غلبہ وتفوق ملحوظ ہو اور اس کی بنا انقیاد واطاعت پر نہ ہو یعنی زن مریدی کی حد تک نہ پہنچی ہو، اگر اس میں ''رائے کلی'' سے اصلاح کی جائے تو اس کیفیت کو عفت وپاک دامنی کہیں گے۔

کیا میں تمھیں اس قانون سے روشناس نہ کروں کہ کس طرح ایک ہی صفت مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے محمود بھی ہوسکتی ہے اور مذموم بھی بادشاہ اور فقیر دونوں مانگتے ہیں۔ بادشاہ اپنی رعیت سے مانگتا ہے اور بھکاری اپنی قوم کے اغنیا اور مالداروں سے مانگتا ہے۔ ان دونوں میں خطِ فاصل قوت وغلبہ اور عجز ونیاز کی صفتیں ہیں۔ بادشاہ کا مطالبہ چونکہ قہر و

غلبہ پر مبنی ہوتا ہے وہ قوم کا سردار کہلاتا ہے اور بھکاری چونکہ مغلوب اور عاجز ہوتا ہے اس لیے فقیر سمجھا جاتا ہے۔ الحاصل حسن وقبح میں اس خط تمیز کو اصول قانون کے طور پر یاد رکھو اور ان شکوک وشبہات سے بچو جو اخلاقِ محمودہ اور اخلاقِ ذمیمہ میں بظاہر التباس سے عوام الناس کے ذہنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ تم نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ جو شخص انتقام لیتا ہے لوگ اسے ظالم کہتے ہیں اور جو شخص ظلم کا بدلہ نہیں لیتا ان کے نزدیک وہ بزدل ہے۔ اور جو شخص بے دریغی سے اپنا مال اُڑاتا ہے، لوگوں کے نزدیک مسرف اور فضول خرچ ہے اور جو مال خرچ نہیں کرتا، ان کے نزدیک وہ کنجوس ہے، کاش کہ ان لوگوں کی طعنہ زنی سے بچنے کی کوئی صورت معلوم ہوتی؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اخلاق (محمودہ اور مذمومہ) میں اگرچہ بہ ظاہر تشابہ اور یکسانی معلوم ہوتی ہے پھر بھی ان کے حقائق ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اخلاق محمودہ کی شناخت کا یہ گر یاد رکھیے کہ ہر وہ وصف جس کا منبع علو نفس وحوصلہ اعتدال مزاج اور قلب کا کمال ہو وہ ستودہ صفات۔ کے زمرہ میں شامل ہوگا اور ان صفات حمیدہ میں بھی افضل اور مفضول کے لحاظ سے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی بہتر اور زیادہ پسندیدہ اور کوئی کچھ کم۔ اس کے برخلاف ہر وہ وصف جو خسّت نفس، تنگ دلی اور ضعفِ قلب سے صادر ہو، اس کو اخلاق مذمومہ میں سے گردانیے۔ اور ان مذموم اخلاق میں بھی مدارج ذم مختلف ہوتے ہیں بعض بہت زیادہ برے اور بعض نسبتاً کم برے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ مسلّمہ بات ہے کہ مدح وتعریف کا دارومدار صفت حمیدہ کے مذکورہ حقائق اربعہ (کبری نفس، سفِ صدر، تمام مزاج اور سبوغ قلب) پر ہے۔ اور میں نے کسی کو کسی کی تعریف ومدح کرتے ہوئے نہیں سنا، مگر وہ یقیناً انہی حقائق اربعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے خواہ وہ اپنے اندازہ میں درست ہو یا غلطی پر۔ اس طرح میں نے کسی کو کسی (کے اخلاق) کی مذمت کرتے ہوئے نہیں سنا الاّ یہ کہ وہ حقائق ذم (ضیق نفس، انخداج قلب) کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ان اندرونی اوصاف کی تطبیق میں اس کا اندازہ صحیح ہو یا غلط (اور قطع نظر اس کے کہ وہ اس اصول کو واضح طور پر جانتا ہو یا کہ علم اجمالی کی طرح اس کے ذہن میں محفوظ ہو)۔

انسانی عقل کی دو قسمیں

انسان میں عقل دو طرح کی ہوتی ہے ایک عقل معاش: جو ہر انسان میں جبلّی طور پر ودیعت رکھی گئی ہے، اور اس کی بدولت وہ دوسرے حیوانات کی طرح معیشت سے متعلقہ امور کی رہنمائی حاصل کر کے زندگی بسر کرتا ہے اگرچہ اس عقل معاشی میں بھی وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں (رائے کلی، ظرافت اور اکتساب) زائد اوصاف پائے جاتے ہیں۔

دوسری عقل اس کو رب رحمٰن کی طرف سے اس وقت عنایت ہوتی ہے جبکہ وہ اس حیاتِ فانیہ کی ظلمت اور تعلقات کو پس پشت ڈال کر اپنے مثالی وجود کے ذریعہ جو اس کی مثالی حیات کے ساتھ ایک خاص وقت تک وابستہ و پیوستہ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان میں علیٰحدگی واقع ہوتی ہے بارگاہ اقدس کا قصد کرتا ہے، اس کے بعد اس کا ذریعہ قرب اس کا وجود روحانی ہوتا ہے جو اس کی حیات مثالی کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد ان میں علیٰحدگی واقع ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کے قرب وارتقا کا ذریعہ ''وجود عینی'' ہوتا ہے جو اس کی حیات روحانی کے ساتھ مخروج ہوتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ان کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔

یہ تینوں مراتب اس کی حیات حیوانیہ کے مراتب یا احکام میں شامل نہیں بلکہ ان مراتب کا حصول مشار الیہ غیر حیوانی نشا کے آثار میں سے ہے جو بارگاہ خداوندی میں انسان کے لیے مخصوص ہوتی ہے اور نوع انسان کے سب افراد میں لازماً پائے جاتے ہیں، اس نکتہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لو اور اپنی نظر کو صرف عقلی حیوانی تک محدود (نہ) رکھو تا کہ جو کچھ ہم تمہاری خدمت میں عرض کرنے والے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ سکو۔

یہ مذکورہ علوم والہامات جو سب انواع کائنات میں بالعموم اور نوع انسانی میں (بالخصوص) ودیعت رکھے گئے ہیں، خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی عنایت کا نتیجہ ہیں۔ اگر تم اس تحقیق میں زیادہ گہری نظر وفکر سے کام لو تو تجھے یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ انبیا علیہم السلام اور اولیا کرام کو جو علوم عطا کیے گئے ہیں وہ سب عنایت ازلی کا نتیجہ ہیں جن کا تعلق

بالا جمال نوع انسانی (کے جملہ افراد) سے ہے اور مختلف افراد میں یہ کمالات فلکی عنصری، فضائی اور مثالی (عوالم میں رونما ہونے والے) اسباب و علل کے مطابق تفصیل کے ساتھ تقسیم ہوتے ہیں۔ ان کمالات شخصیہ کا ظہور مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ہوتا ہے جسے تجدد زمانی کہا جاتا ہے صرف ظاہری نظر کا نتیجہ ہے (حقیقتاً عنایت ازلی کا تعلق اجمالاً تمام نوع و افراد نوع سے ہے)۔

اگر دوررس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یقیناً معلوم ہوگا کہ (موہوبی علوم کو تو چھوڑیے) اکتسابی علوم بھی عنایت ازلی کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں، اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ عنایات الٰہی کے تاثر سے انسانی قوتوں ادراک کے ذریعوں اور کسی خاص مقصد و مطلب پر ابھارنے والے محرکات میں صلاحیت ابھرتی ہے جو بعد میں کسب اور جدو جہد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ کسی اور شکل میں نمودار ہوتی ہے اس لیے ان مختلف مراتب ظہور کو عنایت ازلی کے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھیے۔ حقیقت میں استیناف امر یعنی کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے بغیر کسی حادثے کے ظہور کا اصول کائنات میں کارفرما ہی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عنایت ازلی اس تدبیر اجمالی کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں انواع کائنات سے متعلق فرمایا ہے اور ہر ایک تفصیلی تدبیر کو جو بعد میں کارفرما ہو، اسے اسی تدبیر اجمالی کی شرح سمجھیے اور یہ اجمالی تدبیر (ازل و ابد میں) ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ اور اس کا وجود بعینہٖ انواع کائنات کا وجود ہے اور ان انواع کی صورتیں درحقیقت اس تدبیر کی مختلف صورتیں ہیں جو وقت اور ضرورت کے مطابق ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

دوسری فصل

نفس ناطقہ نسمہ پر اعتماد رکھتی ہے

یہ بھی جاننا چاہیے کہ نفس ناطقہ یعنی صورتِ شخصیہ جس کی وجہ سے انسان کا کوئی فرد وہی فرد کہلاتا ہے، سب سے پہلے اس کا سہارا اخلاط کے بخار سے بنا ہوا لطیف جسم ہوتا ہے کیونکہ صورتوں کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ ان کا سہارا وہ ''ہیولیٰ'' ہو جس کو اس سے جبلّی مناسبت ہے اور اس ''ہیولیٰ'' میں ایسی استعداد ہو جس کے باعث وہ صورت خاص اس پر طاری ہو سکے اور چونکہ نفس ناطقہ (روح انسانی) جملہ صورتوں میں لطیف ترین، صاف ترین اور مضبوط ترین صورت ہے، اس لیے اس کے وجود کا سہارا بھی ایسے لطیف ترین جسم پر ہوتا ہے جو لطافت واعتدال (یعنی مبدأ کے ساتھ تجرد کی طرف میلان میں مشابہت کے لحاظ سے) اپنی مثال آپ ہو۔ نفس ناطقہ کے حامل ہونے کے لیے ایسا ہی جسم ہیولیٰ کا کام دے سکتا ہے۔ یہ جسم لطیف جو کثیف کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور کمالات نفس ناطقہ کے اظہار کا ذریعہ ہے، ہمارے نزدیک ''نسمہ'' کہلاتا ہے۔ ہماری اس اصطلاح کو اچھی طرح یاد رکھیے۔

نسمہ کی حقیقت

''نسمہ'' ایک لطیف ترین جسم ہے جو انسان کے نفس ناطقہ (روح) سے (اسی طرح) متصل اور جسد عنصری میں جاری وساری ہے (جس طرح پھول میں اس کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے) تمام افعال اور قوتوں کا حامل بھی نسمہ ہے اس کی تکوین و پیدائش اس طرح ہوتی ہے کہ جب غذا معدہ میں پہنچ جاتی ہے تو وہاں پکنے لگتی ہے اور اس کا لطیف حصہ جگر میں

پہنچ جاتا ہے اور وہاں دوبارہ اس کا انطباخ (پکنا) ہوتا ہے۔ پھر یہ پکا ہوا جز اور چار اخلاط میں تقسیم ہو جاتا ہے، چنانچہ ان اخلاط میں سے لطیف خون دل کی طرف چلا جاتا ہے اور اس کے ایک جوف میں جمع ہو جاتا ہے اور لطیف ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ ہوا پھر دوسرے جوف قلب میں جمع ہو جاتی ہے اور ان کا ایک حصہ (جو لطیف ترین ہوتا ہے) دماغ کی طرف صعود کرنے لگتا ہے اور یہاں دس قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔

پانچ ظاہری حواس اور پانچ باطنی حواس

پانچ ظاہری حواس یہ ہیں: دیکھنے، سننے، سونگھنے، اور چکھنے کے، چار حواس جو مخصوص جگہوں (یعنی آنکھ، کان، ناک اور زبان) سے متعلق ہیں جن میں ''نسمہ'' کا ایک حصہ سرایت کیے ہوئے ہے اور وہی ان حواس اور قوتوں کا حامل ہوتا ہے اور پانچواں حس چھونے کا حس ہے جو نسمہ کے ایک حصہ میں شامل ہو کر تمام بدن یا بدن کے اکثر حصے میں سرایت کرتا ہے۔

پانچ باطنی حواس یہ ہیں: (۱) حس مشترک (جو ظاہری حواس خمسہ کے محسوسات کے نتائج کو ایک دوسرے سے ملا کر احساس کرتا ہے۔ (۲) قوت خیال جو صورت محسوسات کا تصور ذہن میں بند رکھتی ہے۔

(۳) قوت واہمہ: جو جزئیات کا احساس کرتی ہے۔ (۴): قوت حافظہ (تمام محسوسات، متخیلات، موہومات اور معانی کو اپنے خانہ میں ضرورت کے وقت کے لیے جمع رکھتی ہے اور قوت مدرکہ جو ان سب قوائے باطنہ کو جمع کرتی ہے اور ان میں تصرف کرتی ہے اور یہ پانچ باطنی حواس جو اگرچہ دماغ میں مخصوص جگہوں سے اختصاص رکھتے ہیں ہمارے نزدیک ان کی حکومت (صرف ان مراکز پر نہیں بلکہ) تمام جسم پر ہے۔

اسی طرح لطیف خون کا کچھ حصہ جگر کی طرف اُترتا ہے اور اعضا جسمانی اور بدن میں جاری قوتوں مثلاً قوت تولید و تناسل، قوت افزائش و نمو، قوت تغذیہ و پرورش اور قوت مصورہ کی بقا و تقویت کے لیے تقسیم ہوتا ہے۔ قوائے مذکورہ کے لحاظ سے دماغ اور قلب دونوں جگر کے

محکوم ہوتے ہیں۔ اگر چہ بعض دوسری قوتوں کے اعتبار سے جگر، قلب و دماغ کے تابع ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جگر اور دل کی قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتی ہیں۔

اور نسمہ کا ایک حصہ دل میں باقی رہتا ہے اور دماغ اور جگر کی قوتوں میں تصرف کرتا ہے، جب انسان کی قوت غضبیہ میں انگیخت پیدا ہوتی ہے تو وہ عقل جو اس کی اس حالت غضبیہ کے بارے میں سوچتی ہے معلوم کر لیتی ہے کہ اس کے قوت غضبیہ میں شدت پیدا ہونے کا سبب دراصل وہ ضرر ہے جو وہ "مغضوب علیہ" میں محسوس کرتا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ انتقام لینے سے اسے لذت حاصل ہوگی۔ اس کے بدن میں خون جو اترا ہے اور چہرہ سرخ ہوا ہے اور رگیں پھول گئی ہیں، جسم کی حرارت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ اس کا سبب طبیعت کے متعدد افعال اور حرکات ہیں، عقل یہ بھی معلوم کر لیتی ہے کہ غضب کی ابتدا تو ایک مصدر سے ایک کلمہ کے صدور کے ساتھ ہوئی ہے اور پھر ایک ہی ہیجان کے بعد یہ تمام اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔ اور کتنے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دل وجگر کی قوتیں وافر درست ہوتی ہیں لیکن ان کے قوائے قلبیہ میں ضعف و کمزوری ہوتی ہے اور ان کا غصہ برانگیختہ نہیں ہوتا۔ ان ملاحظات سے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حقیقی معنوں میں جسم پر حکومت صرف قلب اور قلبی جذبات کی ہے اور ان جذبات کی تکمیل جگر و دماغ دونوں کی اعانت سے ہوتی ہے اس لیے قلب اور قلبی تصرفات کی اچھائی کا انحصار اس پر ہے کہ جگر و دماغ اور قلب تینوں کے قوی مضبوط ہوں۔

نسمہ (جسم انسان کی روح ہوائی جس کی کچھ تفصیل گزر چکی) ایک چھوٹی سی منظم سلطنت کے مشابہ ہے۔ جس میں جگر گویا وزیر مال ہے جو قلمرو کی آمد و خرچ کا نگراں رہتا ہے اور اعضا اور ان کے افعال اور تمام قوائے طبعیہ کی جو بمنزلہ افراد سلطنت کے ہوتے ہیں خبر گیری کرتا ہے۔ دماغ کی مثال ایک مدبر حکیم کی ہے جو بادشاہ کا مشیر ہو اس کے ماتحت حواس (خارجہ) بمنزلہ اس فوج کے ہیں جو باہر کے اخبار واطلاعات اس کو پہنچاتے رہتے ہیں (اور حواس باطنہ) بمنزلہ داخلی مشیران کار کے ہیں، جو طبیعت کے افواج کے خیر خواہ اور ہوا خواہ رہتے ہیں۔ قلب کی مثال ایک خود مختار، مطلق العنان حکمراں کی ہے جس کا فیصلہ قطعی

اور نافذ العمل (ہوتا ہے) وہ جب کوئی فیصلہ کرتا ہے اور کسی کام کو قطعی قرار دیتا ہے تو اپنے احکام کی تنفیذ شاہی سطوت وشان سے کرتا ہے اور تمام اعضائے جسمانی اور قوائے طبیعیہ کو اس کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ نظام بدن میں فساد پیدا ہو اور وہ حد اعتدال سے دور پڑ جائے۔

بات یہ ہے کہ قلب اگر چہ بادشاہ ہے لیکن احکام کی تنفیذ میں دیگر معاونوں کا محتاج ہے (بعینہٖ جس طرح بادشاہ اپنے وزرا اور اعیانِ مملکت اور لشکروں کا محتاج ہوتا ہے) چنانچہ مشورہ دماغ سے لیتا ہے اور غذا جگر سے حاصل کرتا ہے اور اختلاف علوم (اور مشوروں کے اختلاف) سے احکام واوامر میں اختلاف رونما ہوتا ہے اور غذا کی فراوانی سے سطوت شاہی میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ (قلب) اندر ہی اندر ان کے زیر نفوذ ہونے کا احساس کرتا ہے۔ اگر چہ بہ ظاہر سب پر اس کا حکم چلتا ہے جیسے کہ کسی ملک کا بادشاہ نافذ الکلمہ ہونے کے باوجود اپنے وزرا اور اعوان کا محتاج ہوتا ہے اور ان کے لیے اپنے باطن میں انقیاد وتسلیم کے آثار محسوس کرتا ہے۔ اگر چہ ظاہر میں وہی حاکم نظر آتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر نفسانی خواہش اور حیوانی مقتضیات کی فوج مضبوط ہوگی تو قلب کے تمام فیصلوں پر اس کا اثر نمایاں ہوگا۔ اور وہ (قلب) ان کے مقتضیات کی تعمیل کی طرف مائل رہے گا۔ لیکن اگر دماغی قوتیں مضبوط تر ہوں تو قلب ہمیشہ جواسیس اور دُخَلا (حواس خمسہ ظاہرہ وباطنہ) کی نیرنگیوں کی طرف مائل ہوگا۔

اور جب کبھی ان لشکروں میں سے کوئی فوج مغلوب وکمزور ہو جائے تو ''قلب'' اس کے ضعف سے پریشان ہوتا ہے جیسے (عموماً) بھوک اور پیاس کی حالت میں یا پُر خوری اور نیند کی حالت میں یا حواس کی سستی اور اضطراب کی حالت میں اس کے اعمال میں اختلال آجاتا ہے اور اگر اس کا کوئی لشکر اس سے بغاوت پر آمادہ ہو، مثلاً حواس اور جذبات وعواطف سرکشی اختیار کرلیں یا حیوانی طبیعت شاہراہ معصیت پر گامزن ہو کر تولید میں اسراف اور شہوت میں غلبہ حاصل کرے تو ان صورتوں میں اگر دل کا استعداد قوی ہے تو خوب زجر وتوبیخ کر کے راہ راست پر لے آتا ہے لیکن اگر دل ضعیف الارادہ ہے تو وہ بھی اس اشارہ (بغاوت وسرکشی کے غلط رویوں) کی طرف مائل ہو کر اسے مستحسن قرار دیتا ہے۔

ا۔ احکام قلب

ا۔ ارادہ: قلب کے جملہ احکام میں سے ایک اس کا ارادہ ہے۔ چنانچہ جب دماغ کو جو قلب کا مشیر ہے کسی چیز کی بابت یہ یقین ہوتا ہے کہ اس میں اس کے لیے نفع اور فائدہ ہے اس لیے اس کا حاصل کرنا لازمی یا کم از کم مستحسن ہے۔ یا یہ کہ اس میں ضرر اور نقصان ہے اور اس سے احتراز کرنا ضروری ہے تو وہ قلب کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو تحصیل مراد کے لیے متوجہ کرے چنانچہ قلب اس کے حسب مشورہ ایسا ہی کرتا ہے اور اس کے تمام اعضا اور قوائے طبعیہ مصروف تعمیل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ عقل: منجملہ ان احکام کے ایک اس کی عقل ہے چنانچہ جب قلب سریر آرائے مملکت ہوتا ہے اور اس کے جنود (اعضائے جسمانی اور قوائے طبعیہ) سب اس کے حضور دست بستہ حاضر ہوتے ہیں (اور کسی درپیش مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں) تو قلب اپنے مشیر دانا کی طرف رجوع کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ فلاں فلاں مسئلے کے باب میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مشیر حکیم کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ جواباً پیش خدمت بادشاہ کر دیتا ہے۔ قلب اس کے لمیت وانیت (علل ونتائج) کے بارے میں یکے بعد دیگرے سوال اور بحث وتمحیص کرتا ہے، حتی کہ کثرت مراجعت یا دلیل کی قوت سے مشیر کی بات پر اس کا ذہن مطمئن ہو کر یہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ مشیر دانشمند تم نے ٹھیک کہا، یہ میرا مقصد ومذہب ہے (اور پھر حکم صادر فرما دیتا ہے جسے) سب لشکر سن کر دل کی روش کا اتباع کرتے ہیں، کیونکہ لوگ اپنے بادشاہ کے دین وطریقے پر چلتے ہیں۔ اس وقت یہ علم عقل وحکمت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل بھی ''احوال'' میں سے ایک حال ہے۔ اور فہم واردات میں سے ایک وارد ہے جو انسان کے لوح قلب پر وارد ہوتے ہیں۔

عشق: قلب کے احکام میں سے ایک حکم اس کا عشق ہے۔ جب طبیعت کا لشکر (نفسانی شہوات اور حیوانی خواہشات) بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے اور جذبات وعواطف پر اثر انداز ہوتا ہے تو دماغ بھی ان کے تقاضے سے سرتابی نہیں کرتا اور وہ اپنے جواسیس (حواس

عشرہ) کو حکم دیتا ہے کہ اس جوش آتش شہوت کو بجھانے کے لیے مناسب جگہ تلاش کریں۔اور جب بعد از تلاش ایسی جگہ مل جاتی ہے تو دماغ اسے درست قرار دیتا ہے اور قلب کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ بھی اسے پسندیدہ قرار دے کر اسے حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب جائے اب اگر دل مضبوط اور قوی الارادہ ہے تو امور کے نتائج وعواقب پر غور کرتا ہے اور غالب قاہر بن کر دماغ کا مشورہ مسترد کر دیتا ہے اور کسی مناسب جگہ کی تلاش کے لیے صرف حکم کلی صادر فرماتا ہے لیکن اگر وہ ضعیف اور کمزور ہوتا ہے تو وہ دماغ کے مشورہ کو قبول کر کے اس کی پیروی کرتا ہے اور اعضائے جسمانی اور قوائے طبعیہ کو حکم دیتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس کی محبت میں مگن ہو جاؤ۔ پھر تمام قوی بھی اس کی محبت میں مبتلا ہو کر قلب ودماغ کے تابع ہو جاتے ہیں۔(اس طرح اس انسان پر قلب کی کمزوری کی وجہ سے ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

فخر اور بلند پروازی

جب جگر دل کو نہایت قوی اور طاقتور غذا مہیا کر دیتا ہے، اور دماغ کے جواسیس (حواس ظاہرہ وباطنہ) میں ایک قوت اور استقرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دماغ کا ادراک نہایت قوی اور وسیع ہو تو دماغ ایسے علوم کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو قوت اور وسعت کے تقاضا کرتے ہیں۔ایسے علوم کی تحصیل کر کے وہ انھیں دل تک پہنچا دیتا ہے۔ دل کے اندر بھی ان علوم کی طرف میلان کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبھی مناسب موقع آتا ہے، دل اپنے لشکروں کو جمع کرتا ہے اور اپنے دانائے راز مشیر (حکیم) دماغ سے مشورہ لیتا ہے تو وہ ایسے فیصلے کا مشورہ دیتا ہے جو اظہار قوت فخر اور بلند پروازی اور پھیلاؤ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔یہ مشورہ دل اور اس کے عساکر کی منشا کے مطابق ہوتا ہے اور دل اپنے پختہ عزم کو اس مشورہ کے مطابق خوب پختگی سے نافذ کرتا ہے۔ایسے حالات میں اگر حکیم دماغ، صاحب تقویٰ ہو یا اس کی قوت معنوی اور حقیقی ہو تو اس کا میلان ایسے امر خیر کی طرف ہوتا ہے جو کلی اور نفع عام سے تعلق رکھتا ہو۔اور حقیقی خیر ہو اور اگر یہ مشیر (دماغ) غبی

اور اپنی فطرت میں حیوانی ہو تو صرف ایسے امر خیر کی طرف مائل ہوتا ہے جس کا خیر ہونا جزئی اور وقتی ہو اور اس کی خوبی سرسری ہو۔

اگر دل کو جگر کی طرف سے غذا کمزور اور کم ملے اور دماغ کے جواسیس کا اندرونی احساس کمزوری کا ہو تو دماغ کا مشورہ دل کو اور دل کا فیصلہ اس مشورہ کے مطابق فخر اور بلند پروازی کی بجائے کمزوری خود سپردگی اور تسلیم کا ہوتا ہے۔

رضا اور ناراضگی

حکیم دماغ کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی اور ہمارے ساتھ نفع کے حصول یا ضرر سے بچاؤ کے سلسلے میں مزاحمت کر رہا ہے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کی یہ مزاحمت ہمارے مطلوب خیر کے لیے مناسب نہیں، تو دل کو اپنا مشورہ پیش کرتا ہے۔ دل اپنے تخت شاہی پر بیٹھا رہتا ہے اور اس کے لشکر اس کے زیرِ فرمان حاضر ہوتے ہیں جب حکیم دماغ اپنا مشورہ بار بار پیش کر کے دل کو مطمئن کر لیتا ہے اور دماغ کے مشورہ کے بارے میں اس کا یقین پختہ ہو جاتا ہے تو اپنے لشکر کو بانگ دہل آواز دیتا ہے کہ میں فلاں سے ناراض ہوں تم بھی اس سے ناراض ہو جاؤ۔

اس کے برعکس اگر اسے یقین ہو جائے کہ یہ شخص میرا خیر خواہ اور صاحب نعمت ہے اور اس میں ایسے اوصاف محسوس کرے جنھیں وہ اچھا سمجھتا ہے تو اپنے لشکر کو آواز دیتا ہے کہ میں فلاں سے راضی ہوں تم بھی اس سے راضی ہو جاؤ۔

خوشی اور غم

کبھی دل تختِ شاہی پر بیٹھ کر اپنے قوی کے لشکر کو حاضر کرتا ہے، اگر دل اپنے حکیم (مشیر دماغ) کے ساتھ بار بار مشورہ کیا کرتا ہو اور اس کی بات مانتا ہو تو وہ اس کی طرف بہت مائل ہوتا ہے ایسے اوقات میں اگر دماغ کو باہر سے کچھ اشیا کا ایسا علم حاصل ہو جائے، جو اس کے لیے خوش آئند ہو تو دل کو دماغ میں مسرت اور انبساط کی لہر نظر آتی ہے۔ اس کی مسرت سے دل بھی مسرت وانبساط اور وارفتگی کا اظہار کرتا ہے اور حکیم کے لشکر (حواس

ظاہرہ وباطنہ) کو اشارہ کرتا ہے کہ آلات طرب لے کر آجاؤ۔ چنانچہ وہ تعمیل کر کے رباب لے کر آتے ہیں اور حسب حال اور مناسب موقع غزل یا نظم گا لیتے ہیں قلب کیف ومستی کا جام نوش کر لیتا ہے اور یہ دن اس کے لیے جشن کا دن ہوتا ہے اس کے برخلاف اگر مشیر کو کوئی چیز ناپسندیدہ وناگوارِ خاطر گزرتی ہے تو قلب (کو بھی مشیر یعنی دماغ کے اس مشورہ کو قبول کرنے میں پس وپیش نہیں ہوتی بلکہ اس) میں بھی غم والم کی کیفیت پیدا ہوگی اعضا اور قوی کو غمگین وملول ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ سب روتے چیختے چلاّتے اور نوحہ گری کرتے ہیں کیونکہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را) اس صورت حال سے متاثر ہو کر دل پر رقّت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سیاہ لباس غم میں ملبوس ہوتا ہے یہ قلب کے لیے ماتم دغم کا دن ہوتا ہے۔

اگر ''دل'' اپنے معاملات میں عموماً اپنے وزیر مال قوائے جگر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے مشورہ کی طرف کان لگا کر میلان طبع کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس حالت میں وزیر مال کے سرور ونشاط اور حزن وملال سے پوری طرح متاثر ہوتا ہے بہر حال وزیر مال (جگر) کے کارندے ہوتے ہیں جو ''حکیم (دماغ) کے لیے انس ومحبت رکھتے ہیں۔ اور اسی ''حکیم'' (دماغ) کے کارندے ہوتے ہیں جو ''وزیر مال'' جگر سے الفت رکھتے ہیں ان دونوں کے آپس میں دوستانہ تعلقات ہیں اس لیے کہ دونوں معاونت میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ (اس لیے دل پر دماغ وجگر کے انبساط یا ملال کا اثر تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

فصاحات ودیانات

من جملہ دل کے احکام کے فصاحات ودیانات (یعنی اقوال واعمال) ہیں اس کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ قلب اپنے عرش سلطنت پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے تمام اعوان وانصار اور لشکر اس کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ حکیم (دماغ) پہلے سے قلب کو ضروری معلومات فراہم کر چکا ہوتا ہے اس دل کے باطن (لاشعور) میں اس کی طرف میلان پہلے سے موجود رہتا ہے اس حالت میں حکیم اٹھ کر اپنے لشکر کے ساتھ صف بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور وزیر مال (جگر اپنے قوی کے لشکر کو اپنے پیچھے صف بستہ لگا کر دست بستہ کھڑا

ہو جاتا ہے۔ اور سریر سلطنت ان دونوں کے رہتا ہے۔ چنانچہ حکم وزیر مال (جگر) کو حکم دیتا ہے کہ اپنے لشکروں کو زبان یا دیگر جوارح کی طرف حرکت دو اور فلاں حکم کی تعمیل کرادو۔ قلب اس حکم پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اور جگر بامر مجبور (بسر وچشم) اس کی اطاعت کرتا ہے۔ اور زبان یا دیگر جوارح سے وہی کچھ صادر ہوتا ہے جس کا صدور قلب کو اپنے وزیر کے مشورہ سے منظور ہوتا ہے۔

یہ یادرکھو کہ انسان میں سید وحکمراں صرف قلب ہے۔ اور وہی اپنی رعیت (دیگر اعضائے جسمانی) کی نگرانی کا ذمہ وار ہے۔ اور وہی جسم انسانی کے عالم کا کرتا دھرتا ہے۔ علمانفس اس کے احوال وکوائف سے بحث اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہی انسانی علوم اور انسانی انانیت کا مرکزی موضوع اور محور گفتگو رہتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جو شخص ریاضت کے ذریعے اپنے قلب کی تہذیب واصلاح کرنا چاہتا ہے، وہ بالتبع اس کے عساکر کو بھی بعض اوقات موضوع بحث بنا دیتا ہے۔ مثلاً سالک پر جب عشق نفسانی یا حرص مال وجاہ غلبہ کرلیتا ہے اور اس کو ریاضت کی مشق دینے والا اس مرض کا علاج کرنا چاہتا ہے اور دوران علاج اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ چونکہ طبیعت (نفس شہوانی) اس قدر طاقتور ہوچکی ہے کہ قلب اس کے تقاضا کو رد نہیں کرسکتا۔ اور اس پر طبیعت کے لشکروں کا یہ میلان راسخ ہوچکا ہے تو وہ کم خوری اور شب بیداری کے ذریعے اس کی طاقت کو کمزور کرتا ہے۔ اور اسی طرح اس کا غلبہ کمزور پڑجاتا ہے۔ اور قلب کو پھر از سرنو اقتدار اور نفاذ حکم نصب ہوتا ہے۔ اور اس طرح سالک کا معاملہ درست ہوکر اعتدال پر آجاتا ہے۔

اسی طرح جب دماغ کے جواسیس یعنی حواس خمسہ سالک کے دل میں خطرات اور وساوس پیدا کرتے ہیں اور اس کو رب الٰہی کی پاکیزہ محبت میں منہمک ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ تو ریاضت کرانے والا مرشد حواس خمسہ کو قید کرلینے کا حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کو دلکش مناظر سے لطف اندوز نہ کرے۔ کانوں کو فضول اور گندی باتیں سننے نہ دے اور اپنی قوتِ متخیّلہ اور قوت واہمہ کو کھلے بندوں نہ چھوڑے بلکہ جہاں تک ہوسکے انھیں امور مطلوبہ میں مصروف رکھے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے قوائے متخیلہ اور واہمہ کو امر مطلوب میں مشغول رکھنے پر قادر

نہیں تو ان کو کسی ایک کام پر کوئی سا بھی ہوا ایسا مرکوز کرتا ہے کہ اس سے انھیں فراغت نہ ہو۔ تا کہ ان کی جولانیاں موقوف ہو جائیں اور اس طرح جواسیس کے کمزور پڑنے سے قلب کو (فارغ ہو کر) اپنے مقصد کی طرف ملتفت ہونے کا موقع میسر آ جاتا ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نیابی سرّ حق بر من بخند

یہ بھی یاد رکھیے کہ قلب کے اعمال اور قضایا لاتعداد اور بے شمار ہیں اور ہر جنس عمل کا محرک و متمم اس میں ایک خاص ملکہ ہوتا ہے، جو اس میں مستحکم ہوتا ہے اور اس کے تقاضے کے مطابق اس کے اعمال و قضایا میں موزونیت پیدا ہوتی ہے جس طرح رنگوں کے وزن اور مقدار ہوتے ہیں اور خاص تناسب کے ساتھ رنگوں کو ملانے سے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب زرد رنگ، سیاہ رنگ پر غالب آ جائے تو اس سے پیازی رنگ ظہور میں آئے گا اور اگر دونوں برابر مقدار و وزن میں ملا دیئے جائیں تو زنگاری رنگ کا ظہور ہو گا۔ لیکن اگر بالعکس سیاہی زردی پر غالب آ جائے تو گاڑھے سبز (جس میں سیاہ بھی ہو گا) رنگ کا ظہور ہو گا۔ دوسرے تمام رنگوں کی ترکیب (یا دیگر مرکبات) کو انہی پر قیاس کر لو۔ اسی طرح دماغ اور جگر کے رنگ ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر مستقل حیثیت رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہیں اور ان کی ترکیبی صورتوں کی حد متعیّن اور حالت مقرر ہے۔ قضایائے قلب کی نوعیت میں قلب کی طاقت اور کمزوری کو بڑا دخل ہے، نیز دماغ اور جگر کی حالت سے بھی وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ تو ضروری ہے کہ قلب کے جملہ افعال میں سے ہر عمل کی ایک خاص حد مقرر ہو، جس سے اس کے سب افراد (جزئیات عمل) باہر نہیں جاتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کلّی طور پر تمام اعمال میں ایک دوسرے کے ساتھ گونہ مماثلت پائی جاتی ہے ملکات راسخہ کے بارے میں تحقیق یہی ہے۔

ہر ملکہ راسخہ کو ''خلق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سب اخلاق اُس وقت پسندیدہ اور ستودہ ہوتے ہیں جب نفس ناطقہ (روح انسانی) میں صلابت، صفائی اور باطنی اتصال کے اوصاف پائے جائیں۔ کیونکہ ان کی موجودگی سے جسم انسانی میں ان کے مماثل مزاج پیدا

ہوتا ہے اوران کے مشابہ روح ہوائی (نسمہ) قلب وجگراور دماغ پیدا ہوتے ہیں۔اوران کے ہم رنگ صاف ستھرے اور پختہ و پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔پس ان کا معاملہ ایک دوسرے سے مشابہ اور مماثل نظر آتا ہے۔

اور جب تم اخلاق فاضلہ کے حقائق کی تحیص غور وفکر سے کرنا چاہو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اخلاق فاضلہ سات ہیں:

۱۔ حکمت، ۲۔عفت، ۳۔سماحت، ۴۔شجاعت، ۵۔فصاحت، ۶۔دیانت، ۷۔سمت صالح، آگے تفصیل کا انتظار کریں۔

تیسری فصل

حکمت کی تعریف

حکمت قلب کی ایسی ذکاوت ہے جس کی بدولت آدمی ان علوم صحیحہ پر یقین کرتا ہے جو بدیہیات میں سے ہوں۔ یا استدلال اور فکر و نظر سے حاصل ہوں یا اس نورِ الٰہی سے ماخوذ ہوں جو خدائے رحمٰن کی طرف سے عالم ناسوت میں نازل فرمایا گیا ہے اور جسے عالم ظہور میں شریعت الٰہیہ کہا جاتا ہے اور پھر ان علوم کو جمع کرتا اور خزانہ دماغ میں محفوظ کر لیتا اور ان سے کام لیتا ہے۔

اگر تم نوع انسانی کے جملہ افراد کا بہ غور و فکر، دقیق مطالعہ کر کے استقرا کے ذریعے نتائج حاصل کرنا چاہو تو یقیناً تم کو انسانی معاشرہ میں (مندرجہ ذیل) مختلف قسم کے اشخاص نظر آئیں گے۔

الف- وہ کند ذہن اور ثقیل الروح شخص جو خفیہ اشاروں کو قطعاً نہیں سمجھ سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا کلام اس کے سامنے پیش کیا جائے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ متکلم کو کوئی خاص کیفیت یا حالت درپیش ہے تو وہ اس کلام کی باریکیوں اور مخفی تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتا مثلاً اگر اس کے سامنے شکایت آمیز کلام پیش کیا جائے جس سے متکلم کے انقباض روحانی کا پتہ چلتا ہے یا ہجو اور طعن و تشنیع جو اس کے قائل کا غصہ ظاہر کرتے ہیں یا مدحیہ کلام جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بولنے والے کے دل میں ممدوح کی محبت راسخ ہے، تو وہ اس کلام (کی تلمیحات وتشبیہات اور معانی و مطالب) کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے (اور نافہمی کی وجہ سے اس کلام کی طرف توجہ دینے سے غافل رہتا ہے) اس کے مقابلہ میں ذکی اور ''زیرک'' شخص ہوتا ہے (جو ہر نوع کے کلام کے اسرار و معانی اور فصاحت و بلاغت کو سمجھتا ہے اور اس کے

اشاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے)۔

ب۔ (معاشرے میں تم کو اس کے علاوہ) ایسا بے وقوف (بھی ملے گا) جو فائدہ اور ضرر میں تمیز نہیں کر سکتا اور اگر اس کو زجر و توبیخ، پند و نصیحت یا تخویف و انذار کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کی جائے اور اسے سمجھایا جائے کہ اگر وہ اپنے کردار کو درست نہیں کرے گا تو اسے مستقبل میں اس کے برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ تو اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ سنی اَن سنی کر کے چلا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذہن میں مفید اور مضر کا ایسا صحیح مفہوم نہیں بیٹھتا کہ مفید اور مضر ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر اس کے سامنے آئیں۔ اور قلب ان دونوں میں امتیاز کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے۔

اس ''سفیہ'' کے مقابلہ پر جو شخص سمجھ دار ہوتا ہے وہ ''متفہم'' اور ''متبصر'' کہلاتا ہے۔

چوتھی فصل

ارتفاقات (۱) چارگنہ کے حقائق پر مجمل بحث اور ان کی اقسام کی کیفیتِ استنباط

نوع انسانی پر خدائے عز وجل کی یہ عنایت ہے کہ اس نے انسان کے اندر کھانے پینے کی فطری خواہش و جبلتیں پیدا کی ہیں۔ جن پر اس کی حیاتِ جسمانی اور قوتِ بدنی کی بقا کا انحصار ہے۔ اسی طرح افراد انسانی کے اندر جماع اور جنس تعلق کا فطری داعیہ ودیعت کر رکھا ہے تاکہ وہ پیدائش و افزائشِ نسل کا انتظام کر سکیں جس کے نتیجہ میں نسل انسانی اپنی مقررہ مدت تک صفحہ ہستی پر موجود و باقی رہے، نیز یہ بھی لطف الٰہی میں سے ہے کہ انسانوں کو اس فطری تقاضے سے نوازا کہ وہ (گرمی، سردی اور چوروں، ڈاکوؤں اور دشمنوں کی دست بُرد سے محفوظ رہنے کے لیے) گھر اور لباس بنائیں، یہ انسان کی وہ ضروریات ہیں جن کی ہر فرد انسان محتاج ہے اس کے ساتھ ساتھ ہر شخص جبلّی طور پر دوسرے کے مقابلہ میں ان ضروریات کے حصول میں برتری بھی چاہتا ہے اور زیادہ کا خواہاں رہتا ہے (جس کے نتیجہ میں کشمکش اور تصادم کا بھی خطرہ رہتا ہے) تو ان ضروریات کا اس طرح پورا ہو جانا کہ ہر شخص نوعی تقاضوں کے مناسب اپنی جبلی اور فطری خواہشات کو پورا کرے (اور ایک دوسرے کے ساتھ مزاحمت کرنے سے پرہیز کرے)۔ یہی درجہ (اجتماعی اداروں کی تشکیل اور تمدنی وتہذیبی زندگی کا پہلا درجہ ہے جسے شاہ صاحب کی اصطلاح میں) ارتفاق اول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (ارتفاق اول جس میں انسان اپنی ضروریات اور فطری وجبلی خواہشات کو نوعی تقاضوں کے مطابق حیوان کا مقابلہ پر بہتر تدبیروں اور طریقوں سے مہیا کرتا ہے ان میں سے مثال کے طور پر زراعت اور امداد باہمی (نافع تدبیریں ہیں اسی طرح مافی الضمیر

اور اندرونی خیالات وافکار کے لیے) قابل فہم کلام بھی ہے اور اسی زمرہ میں کھانا پکانا بھی آتا ہے۔ اور اسی میں زن (منکوحہ) کی تعین بھی ہے۔ تا کہ کوئی دوسرا اس بارے میں اس کی مزاحمت نہ کر سکے۔

(چونکہ نوع انسانی دیگر تمام انواع سے رائے کلی[1]، ظرافت اور ذوق جمال و لطافت[2] اور ایجاد وتقلید یا اکتساب الاخلاق بالعلوم کی خصوصیات کی وجہ سے بلند مرتبہ ہے۔ اور اس کے افراد شاہراہ زندگی میں عقلی، اخلاقی، جمالیاتی اور جسمانی میدانوں میں خوب سے خوب تر کے متلاشی رہتے ہیں اس لیے قدرتی امر ہے کہ وہ منازل حیات میں کسی منزل پر ٹھہر نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں ان امتیازی خصوصیات ثلاثہ نے دوسری بلند تر منزل حیات کی طرف پیش رفت کی ہے) پھر جب انسان کے اخلاق، اُس کے فطری علوم اور وہ اکتسابی علوم جو اُس نے تجربہ، ذوقِ جمال تأنق وترفہ، اور رائے کلی کے ذریعہ حاصل کیے، سب کے سب ارتفاق اول کے ساتھ پوری طرح پیوست ہو جاتے ہیں تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ارتفاق اول کے شعبوں کو ان امور اور خصوصیاتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر نفس انسانی میں دردوالم اور کرب وبے قراری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کو وہ راحت اور آرام نہیں ملتا جو ان علوم واخلاق اور ان خصوصیات کے لحاظ سے اس کے مناسبِ حال ہے۔ اگر ان ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام معاشرہ میں اس طرح ہو جائے جو نوع انسانی کی مذکورہ بالا کیفیات کے مناسب حال ہوں، تو معاشرہ کی حالت ارتفاق ثانی (دوسری ترقی یافتہ منزل زندگی) کہلاتا ہے ارتفاق ثانی کی منزل تک نفس انسانی کا پہنچنا تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب وہ بھوک پیاس، صنفی خواہش اور اُن تمام (حیوانی) خواہشات کے غلبہ سے نجات حاصل کرے جو اسے ارتفاق اول میں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔

۱؎ (Public will)

۲؎ (Aesthetic Sense)

ارتفاق ثانی کے حِکَمِ خمسہ

استقرا سے معلوم ہوا ہے کہ ارتفاق ثانی کے علوم پانچ فنون میں منحصر ہیں:

(۱) حکمت معاشیہ (یا فن معاش): یہ حکمت اُس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب انسان اپنے کھانے پینے، لباس و پوشاک، رہنے، سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت، سفرو حضر وغیرہ میں اچھی وضع کا پابند ہو جائے اور صحیح تجربوں (اور فضائلِ اخلاق) کی کسوٹی پر انھیں پرکھ لے۔

(۲) حکمتِ اکتسابیہ (صنعت وحرفت): یہ حکمت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب صنعت و حرفت کی مختلف اقسام مثلاً کھیتی باڑی، زراعت، نجاری آہنگری وغیرہ میں سے ہر ایک شخص وہ پیشہ اختیار کرے جس کی اس میں صلاحیت و قابلیت ہے اور عام طور پر اس کے حصول کے ذرائع و اسباب بھی اس کو میسر ہوں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی جسمانی نقص کی بنا پر یا سہل پسندی اور راحت طلبی کی وجہ سے صنعت وحرفت کی پُر مشقت قسموں سے منحرف ہو کر اپنی جسمانی ساخت کی بنا پر یا اسباب کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے گداگری، چوری اور فریب دہی جیسے رذیل پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔

(یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ) جہاں جہاں اور جیسے جیسے طبیعتوں میں شائستگی، تمدن اور راحت و آسائش کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ معاش کے (گوناگوں) گوشوں کی احتیاج محسوس کرتی ہیں ویسے ہی مختلف قسم کے پیشے، صنعتیں اور ہنر نکلتے چلے جاتے ہیں جن کا شمار میں لانا مشکل ہے۔ ہاں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ بعض جگہوں اور بعض زمانوں میں وہ بہت زیادہ ترقی پر ہوتے ہیں اور بعض جگہوں اور بعض زمانوں میں ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔ مگر ہر حالت میں خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ ایک ہی درجۂ تدبیر اور منزلِ حیات (ارتفاق ثانی) کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۳) حکمت منزلیہ: اس حکمت وفن میں ازدواج، ولادت، تدبیر منزل، ملکیت، قرابت داروں کے باہمی حقوق اور آداب صحبت کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

(۴) حکمت تعاملیہ: جس میں لین دین کے قواعد، مسائل اور آداب شامل ہوتے ہیں مثلاً خرید و فروخت، ہبہ اور اجارہ، رہن اور قرض کے معاملات۔

(۵) حکمتِ تعاونیہ: اس میں کفالت، مضاربت، شرکت، وکالت، اور اجرت یا اجارہ طلبی کے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔

ارتفاق ثالث

جب ارتفاق ثانی کے ان اصول کے ساتھ انسان کے اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ شامل ہو جاتے ہیں تو (تمدن کو شائستہ بنانے کے لیے) ایک اور ضرورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کو صرف ارتفاق ثالث (یعنی تیسری اعلیٰ منزل حیات اور اس کے علوم اور حکمتوں) کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔

ارتفاق ثالث کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ ارتفاق ثانی کے اصول کی بنا پر انسان کے لیے شہریت واجب و لازمی ہے، اور شہریت صرف فصیل، بازار اور سر بفلک عمارتوں کا نام نہیں۔ بلکہ تمدن و شہریت اس باہمی ربط و تعلق کا نام ہے جو انسانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان زندگی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ربط و تعلق فطری ہے۔ جو انسانوں کی مذکورہ خصوصیات، امتیازی صفات، اور مدنی الطبع ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور ان مذکورہ اصولِ تعارف اور حکم تعامل کے مطابق جماعتیں شخص واحد کی مانند ہوتی ہیں کہ (اختلاف رنگ و بو اور کثرت عدد و جسم کے وجود) اُن میں ایک معنوی وحدت پائی جاتی ہے اور یہ وحدت (جسم انسان کی طرح) صحت اور مرض کے اسباب سے متاثر ہوتی ہے اور کبھی داخلی اسباب کی وجہ سے اور کبھی خارجی اسباب کی وجہ سے اس میں خلل پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس تمدن کی صحت کو برقرار رکھنے اور اسے اندرونی اور بیرونی اسباب خلل اور بیماریوں سے بچانے کے لیے کوئی طبیب حاذق ہو، تمدن کا یہ "طبیب" امام بہ شمولیت اعوان ہوتا ہے جو زندگی کی اس منزل میں نوع میں نوع انسانی کی تہذیبی حیات اور متمدن زندگی کو درست رکھتا ہے اور تمدن کے اس درجہ کا نام ارتفاق ثالث ہے۔

ارتفاقِ رابع

جب ارتفاق ثالث کے یہ اصول انسانی طبیعتوں سے وابستگی اختیار کر لیتے ہیں تو ایک اور ضرورت اُبھر آتی ہے جس کو ارتفاقِ رابع میں پورا کیا جاتا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مختلف علاقوں اور گروہوں میں چھوٹے چھوٹے پیانہ پر تمدن ظہور میں آتے ہیں تو تصادم اغراض کے باعث ان میں فساد جھگڑے اور مناقشات پیدا ہوتے ہیں۔اور قتل ومقاتلہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور نفرت وعداوت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور ایسی بے شمار (معاشرتی اور اخلاقی) بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا علاج وہ خود نہیں کر سکتے اس لیے وہ ایک ''طبیب اعظم'' (طبیب الاطبا) اور کنفیڈریٹر اعلی[1] کے محتاج ہوتے ہیں جو ان بیماریوں کا استیصال کرے اور سب وحدتوں کو ایک تمدنی کنفیڈریشن میں منسلک رکھے۔اسی کا نام ارتفاق رابع ہے۔اور اسی کی تشریح وتفسیر سے نظام عالم کی تکمیل ہوتی ہے۔

انسانی معاشرے کے ارتفاق اوّل کی عمارت کی بنیاد چوپاؤں کی حیوانی زندگی پر قائم ہے ہاں انسانوں نے ،اس (حیوانی زندگی) کو اپنی نفاست پسندی، تسلسل اور ذوق نظافت وپاکیزگی کی وجہ سے بہتر بنا دیا، بعینہٖ اسی طرح جس طرح معدنیات کے وجود کا سنگ اوّل عناصر وموالید کو قرار دیا جا سکتا ہے انسانی معاشرے میں ارتفاق ثانی، ارتفاق اول پر مبنی ہوتا ہے اتنی بات ہے کہ اول الذکر میں صفائی، صلابت، لطافت اور ذوق جمال کے اضافے شامل ہو جاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ نباتات کی بنیاد معدنیات کے وجود پر رکھی گئی ہے۔

ارتفاق ثالث: ارتفاق ثانی پر مبنی ہوتا ہے جیسے کہ حیوانی زندگی کا وجود نباتی زندگی پر مبنی ہے۔

ارتفاق رابع: ارتفاق ثالث پر مبنی ہے جیسے کہ انسانی زندگی کا وجود حیوانی زندگی پر مبنی ہے۔

---

[1] (Confederater)

یہ بھی یاد رکھیے کہ ہر ایک ارتفاق دوسرے ارتفاق کے ضمن میں داخل اور اس کا گویا اجمال ہوتا ہے۔ ارتفاق اول بہائم کے ارتفاق کے تحت آتا ہے فرق اجمال و تفصیل کا ہے، بہائم میں اجمال ہے تو ارتفاق اول میں تفصیل، علیٰ ہذا القیاس ارتفاق اول میں اجمال ہے اور ارتفاق ثانی میں اس کی تفصیل، پھر ارتفاق ثانی میں اجمال ہے، ارتفاق ثالث میں اس کی تفصیل، پھر ارتفاق ثالث میں اجمال ہے اور ارتفاق رابع میں اس کی تفصیل ہے۔

ارتفاقات کے بارے میں دو ناقابل فراموش نکتے

جب ہم مذکورہ ارتفاقات چہارگانہ کے احکام وعلوم کی گہرائیوں میں جائیں گے تو تم کو دو نکتوں کا اچھی طرح ملحوظ خاطر اور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(الف) جب کبھی ہم کسی مسئلہ کی صورت باندھ کر اسے پیش کرتے ہیں تو صرف وہی صورت ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ ہمارا مقصد ایسی ایسی وہ صورت بھی ہوتی اور اس کے ہم مثل اور اس کے قریب دوسری صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کی صحت پر وہ قواعد کلیہ دلالت کرتے ہیں جن کا ہمیں علم ہوا ہے یہ صورتیں ان قواعد کلیہ میں دخول کے باوجود ہر ایک قوم کے علوم و عادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

(ب) ارتفاق اول کا معیار و میزان بنی نوع انسان کے ہر ضرورت مند انسان کی طبعی ضرورت و حاجت ہوتا ہے۔ ارتفاق ثانی کا معیار یہ ہے کہ ارتفاق اول کے احکام وعلوم کے ساتھ علوم تجربیہ اور اخلاق صالحہ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح باقی ارتفاقات یعنی ارتفاق ثالث و رابع کو قیاس کیجیے (ارتفاق ثالث کا معیار یہ ہوگا کہ ارتفاق ثانی کے احکام وعلوم کے ساتھ علوم تجربیہ، اخلاق صالحہ اور ظرافت و لطافت شامل ہو جائیں اور ارتفاق رابع کا میزان و معیار یہ ہوگا کہ ارتفاق ثالث کے احکام وعلوم اور قواعد کے ساتھ علوم تجربیہ، اخلاق صالحہ اور ذوق لطافت شامل ہو جائیں)۔

ارکان و مکملات ارتفاقات کی تعریف و تشریح

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان ارتفاقات (چہارگانہ) میں سے ہر ارتفاق کے ارکان و

ستون ہوتے ہیں (جو طاس کے وجود و بقا کے لیے عناصر لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں حتی کہ) اگر وہ ارکان نہ رہیں تو سرے سے ارتفاق کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح ہر ارتفاق (کی تعمیر وتحسین وجود) کے لیے بعض باتیں متمم ومکمل ہوتی ہیں (جن کے نہ ہونے سے وجود ارتفاق میں کوئی خاص ضرر ونقصان تو پیدا نہیں ہوتا لیکن) اگر وہ موجود ہوں تو یہ ارتفاق ممکن حد تک مکمل ترین اور خوبصورت ترین مثالی صورت وہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اگر ان مکملات وتحسینات کا فقدان ہے، تو اسی اندازے کے مطابق (اس ارتفاق کے ظاہری حسن و جمال میں) نقصان رونما ہوگا۔

ارکان سے مراد وہ امور ہیں جن کا ظہور وحدوث اس وقت ہوتا ہے جب نوع بشری کے اندر سرتا سر پھیلے ہوئے فطری اخلاق اور معیشت انسانی کے وقوع پذیر لوازمِ حیات اور اقوام عالم کے ہاں مسلمہ علوم آپس میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان پر راسخ وجمع ہونا طبعی تقاضوں کا فطری نتیجہ معلوم ہوتا ہے جب یہ ارکان ارتفاق اُن کے دلوں میں راسخ ومضبوط ہو جاتے ہیں تو دین حق (فطرت) کے احکام بھی اُن کے مطابق نازل ہوتے ہیں۔

مکملات ومتممات سے مراد وہ باتیں ہیں جو کسی نافع تدبیر اجتماعی ادارہ یا درجہ معاشرت سے منسلک کسی معتدل مزاج، سلیم الطبع اور اوصاف حمیدہ واخلاق فاضلہ سے متصف شخص سے صادر ہوں۔ اور اس نظام کی صحت سے پیدا ہوں جو ایسے با کمال شخص کا پیدا کردہ ہو۔ یا جزئیات کو پیش نظر رکھنے سے حاصل ہوں۔ یا وہ حقائق جو خشوع وخضوع اور انابت وانکساری کے ساتھ بارگاہِ غیب کی طرف توجہ کے دوران منکشف ہوتی ہیں۔ اور وہ اُمور جو ضروریات زندگی کو مکمل طور پر پورا کرنے کے لیے عمیق ودقیق فکر ونظر کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں، یہ سب کے سب متممات (تکمیل وتحسین کنندہ امورِ حیات) کے زمرہ میں شامل ہیں۔ بہر کیف ان امور تحسینیہ وتکمیلیہ کے بھی مخصوص ضابطے ہیں جن کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری ہے تا کہ ارتفاقات سے متعلقہ مسائل میں غور وخوض کے وقت تمہاری بصیرت افزائی ہو۔

ہدیٰ صالح

(۱) سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان اشیا کے اسباب و دواعی پر غور وفکر کرے۔ اگر کوئی شے بذات خود غیر مشروع وحرام ہے تو اس کے اسباب ودواعی بھی مکروہ ورناپسندیدہ ہوں گے۔ برخلاف اس کے اگر شرع نے کسی امر کو فرض یا واجب قرار دیا ہے تو ایسے لازم امور کے دواعی اور اسباب بھی مستحب اور پسندیدہ ہوں گے۔

(۲) اصل یہ ہے کہ جس چیز میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا عمل میں لانا یا اس کی تکمیل ہو یا اس کی نعمت واحسان کا اعتراف واعتداد ہو تو یقیناً وہ "ہدیٰ صالح" (نیک طریقہ) ہے۔

(۳) اسی طرح جس بات میں وقار وسنجیدگی، اعتماد نفس وعالی منشی اور بلند ہمتی پائی جائے وہ بھی "نیک طریقہ" یا "ہدیٰ صالح" ہے۔

(۴) ہر وہ بات جو باہمی عداوت اور بغض ودشمنی سے اس طرح نجات دے کہ جس سے گھریلو، شہری اور ملکی مصالح وفوائد کو نقصان بھی نہ پہنچے اور اس کی بنا، اعتدال، میانہ روی اور نیک نیتی پر ہو "ہدیٰ صالح" میں شامل ہوتی ہے۔

(۵) نیز وہ ہر چیز جو تمہیں موہوم آفات اور احتمال تباہیوں سے مامون ومحفوظ رکھے "ہدیٰ صالح" میں سے ہے۔

ہدیٰ صالح اور صالح معاشرہ کی روح باہمی محبت اور فلاح عام ہے

ان سب ارتفاقات اور مفید تدبیروں کے سلسلہ میں منعقدہ اجتماعات اور مجالس کا سنگ بنیاد یا مدار انعقاد باہمی محبت اور ایک دوسرے سے الفت پر ہونا چاہیے۔ ایسی الفت ومحبت جس میں ان محافل ومجالس سے پیوست مناسب آداب ولوازم کا بھی خیال رکھا گیا ہو، مثلاً امام اور خلیفہ کا شکوہ اور عظمت، شریک (تجارت، بیع وغیرہ) اور اجیر ومزدور کی ضروریات کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش۔

ہر وقت اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کون سے امور ہیں جو الفت ومحبت کو برقرار رکھتے ہیں اور کون سے امور ہیں جو اس رشتہ الفت ومحبت کو برقرار رکھتے ہیں اور کون

سے امور ہیں جو اس رشتہ الفت ومحبت کو نقصان پہنچاتے ہیں اور پھر اول الذکر امور (موجبات ازدیاد محبت کو اختیار کرنا چاہیے اور موخر الذکر امور (موجبات نقصان محبت) سے اجتناب و پرہیز کرنا چاہیے۔(ہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ) ہر شخص کا ارتفاق اس کی طبیعت کے مناسب حال ہوتا ہے اور شاید اس مقالہ کے آخر میں ہم بشری طبائع کے موضوع پر مفصل تحریر پیش کرسکیں۔

نظام ارتفاقات میں خلل واقع ہونے کے اسباب ووجوہ

روئے زمین میں جتنے معاشرتی فسادات اور نقصان دہ واقعات رونما ہوتے ہیں ان کی بنیادی دو وجہیں ہیں۔

(الف) یہ کہ لوگ ارتفاق کی ایسی نوعیت اختیار کرتے ہیں جو ان کی طبیعتوں کے مناسب اور مزاجوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ یا تو اس لیے کہ وہ طریقہ خود انھیں پسند ہوتا ہے (جیسے مستغربین ومتنورین زمانہ کرتے ہیں) یا وہ اپنے آبا و اجداد اور اقران وامائل کے اختیار کردہ ارتفاق کو چھوڑنے سے گریز کرتے ہیں۔(اور مناسب حال ارتفاق کے مقابلہ میں قدیم غیر مفید ارتفاق کی اندھی تقلید و پیروی کرتے ہیں۔ جیسے عصر حاضر میں رواج پرستوں کا شیوہ ہے۔ حالانکہ راہِ صواب اعتدال ومیانہ روی کی راہ) ایک مرتبہ مجھ پر ارتفاق ثانی کے سلسلہ میں عنایت ازلی سے روشنی الہام کی جھلک ہوئی اور وہ فارسی زبان اس جملہ کے ذریعہ تھی کہ

''اہل خاندان قدیم زیان کار انند در آنہا شومی ہست''

(قدیم اہل خاندان نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں ان میں بدبختی مضمر و پوشیدہ) ہے۔ مجھے اس الہام کی تاویل اس وقت سمجھ میں آئی جب ہم پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ہر وہ شخص جسے اپنی طبیعت کے مطابق ومناسب ارتفاق نہیں ملا (اور وہ اپنے آبا و اجداد کے قدیم مگر غیر مفید (ارتفاقات سے چمٹا رہا) وہ قلبی سکون وقرار اور ذہنی سعادت سے کبھی ہمکنار نہیں ہوا۔

(ب) معاشرتی زندگی کی پہلی منزل یا ارتفاق اول کی تکمیل سے پہلے لوگوں کا دوسری منزل یا ارتفاق ثانی کی طرف مشترک پیش رفت کرنا تہذیب وتمدن انسانی کے لیے ضرر رساں ہے مثلاً یہ کہ تدبیر وارتفاق منزلی (کے ارکان، مکملات اور تحسینی امور) کی تکمیل سے وہ جاہ ومنصب کے درپے ہو جاتے ہیں یا یہ کہ ارتفاق اکتسابی صنعت وحرفت کو چھوڑ کر شاہی خزانے اور بیت المال پر بوجھ ڈالنے کی کوشش کریں۔ (مدارج زندگی یا ارتفاقات چہارگانہ کی قدرتی ترتیب کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور بلاضرورت نچلے درجہ کی معاشرت نامکمل چھوڑ کر اونچے درجہ کی معاشرت اختیار کرنا سوسائٹی اور تہذیب انسان کے لیے سخت مضر ہے۔ (۱)

حدیث:

(۱) حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ "ایسے لوگ جو پیروں ننگے، بدن کے لباس میں ادھورے اور تمدن میں بھیڑوں کے چرواہے ہوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عمارات بنانے کا اہتمام کریں یہ اس تمدنی ناہمواری کی طرف اشارہ ہے کہ ایک معاشرہ کو ابھی ابتدا کی ضروریات مہیا نہ ہوں اور وہ تمدن کے اونچے مدارج اختیار کرنے میں ترقی یافتہ معاشروں کی نقل اتارنے لگے۔

پانچویں فصل

ارتفاقِ اوّل کے لوازم

۱۔زبان (کلام):ارتفاق اول یعنی معاشرتی زندگی کے پہلے درجہ کے لوازمات حیات میں سے ایک لازمہ یہ ہے کہ انسان کو(اللہ تعالیٰ نے) تقطیع اصوات (اور تشکیل حروف وکلمات) کی فطری استعداد سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ ذہنی افکار وصورتوں (اندرونی احساسات، باطنی کیفیات اور مافی الضمیر) کی تعبیر وترجمانی بلاتکلف طبعی انداز میں کرتا ہے۔ (ابتدا میں مفہوم کلام کا دائرہ محدود تھا) پھر (جوں جوں نوع انسانی توسع اور تکثر سے متصف ہونے لگی اور باہمی تعلقات وضروریات زندگی میں اضافہ ہونے لگا توں توں)الفاظ میں مجاز کی وجہ سے دائرہ کلام وسیع تر ہوتا گیا۔زبان کی وسعت میں اشیا کے درمیان مجازی علاقوں کے ساتھ ساتھ آلات صوت (زبان، حلق وغیرہ)اور طبائع کے اختلاف نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔حتی کہ ان اسباب کی وجہ سے مختلف زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں ظہور میں آئیں اور یہ کہا جانے لگا کہ فلاں لفظ فلاں زبان میں فلاں مفہوم کے لیے وضع کیا گیا ہے۔(حالانکہ یہ استعمال ان زبانوں میں وضعی نہیں بلکہ طبعی ہے)۔

زبان کی اصل یہ ہے کہ بہائم بھی اپنے قلبی احوال اور شعوری کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے خاص قسم کی طبعی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ان کے غیظ وغضب اور خوف وہراس کے اظہار کے لیے مخصوص قسم کی آوازیں ہوتی ہیں۔اسی پر دوسری کیفیات، احساسات اور احوال کو قیاس کیجئے۔انسان کو بہائم پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنے ذہنی افکار وخیالات اور قلبی کیفیتوں کا اظہار واضح عبارت میں حکایت کی صورت میں کرسکتا ہے۔انسان کے تختۂ

ذہن پر جو تصورات منقوش ہوتے ہیں وہ یا تو باہر سے حاسئہ سامعہ کے ذریعہ دماغ میں داخل ہوتے ہیں ان ذہنی تصورات کی نقل و حکایت اور دوسروں تک پہنچانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان محفوظ اصوات کو بعینہٖ یا اس کے قریب قریب الفاظ کا لباس پہنا کر مخاطب تک پہنچایا جائے۔ اور یا وہ تصورات حاسئہ باصرہ کے ذریعہ اس کے دل و دماغ کے تختوں پر منقوش ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا جائے کہ ان الفاظ کا مخاطب کے سامعہ پر وہی اثر ہو جو متکلم کے حاسئہ باصرہ پر کسی چیز کو یا کسی واقعہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ اور جس کا اثر بالواسطہ اس کے دل و دماغ نے قبول کیا تھا اور اگر انسان کو کسی اپنی قلبی کیفیت کے اظہار کی ضرورت درپیش ہوئی تو اس کا اظہار اسی طرح کیا جس طرح بہائم اپنے قلبی احوال کو مخصوص آوازوں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ پھر انسان کی طبیعت میں ان آوازوں میں اجزا بنانے (تقطیع) کی قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اور اس طرح ہر منقطع آواز ایک حروف کی شکل و صورت اختیار کر لیتی ہے جو معانی میں سے کسی ایک معنیٰ کا حامل ہوتا ہے۔ پھر معانی اور حروف کی باہمی ترکیب ہوتی ہے جس سے جملہ یا کلام حاصل ہوتا ہے اور کلام کے موضوع پر ہم نے اپنی بعض تصنیفات میں شرح و بسط کے ساتھ کلام کیا ہے۔ (مثلاً حجة اللہ البالغہ باب الارتفاقات، ارتفاق اول)۔

غذائی اجناس کی پہچان اور اکل و شرب کے مناسب طریقوں کا علم

یہ بھی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ہے کہ آدمی ان غذائی دانوں (اور اناجوں) کا علم رکھتا ہو جو اس کی طبیعت کے موافق اس کی غذائی ضروریات پوری کریں۔ وہ اس اناج کے استعمال کا وہ طریقہ بھی جانے جس کے ذریعہ وہ اس کے معدہ تک پہنچایا جائے اور یہ کہ کس طرح انھیں پکایا جائے وہ ان کی کاشت کاری، آب پاشی اور کٹائی اور دانوں کو بھوسہ سے الگ کرنے کے طریقوں سے بھی واقف ہو۔ وقت ضرورت کے لیے ان کو محفوظ رکھنا اور ذخیرہ کرنا بھی جانتا ہو۔ ان کو بھوننے یا پکا کر روٹی بنانے اور روٹی کے معاون کے طور پر حیوانات اور نباتات سے تیار کردہ سالن مثلاً گوشت، دودھ، دہی، مکھن

اور گھی، دالیں اور ہر قسم کی ترکاریوں کے مناسب حال و مزاج استعمال کرنے کے طریقے بھی جانتا ہو۔

دریاؤں، نہروں اور چشموں سے پینے کے قابل پانی کی پہچان بھی ضروری ہے۔ نیز یہ کہ جب پانی تک رسائی نہ ہو تو کس طرح (کنوئیں کھودنے یا نہروں کے ذریعہ) پانی حاصل کیا جائے گا۔ اسی طرح ماکولات اور مشروبات کے استعمال اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے مناسب برتنوں، ڈولوں اور مشکیزوں کا مہیا کرنا بھی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ہے۔

چوپانی و گلہ بانی

اسی ارتفاق اول کے لوازمات میں سے ایک لازمہ وہ الہام ہے جو انسان کو تسخیر بہائم اور ان کے پالنے اور سدھانے پر اُبھارتا ہے اور اس (گلہ بانی) کے ذریعے اس کی بڑی بڑی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں انہی چوپایوں کے ذریعے وہ زمین کو زراعت اور کھیتی باڑی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اور دور و دراز کے کٹھن سفر اُن پر سوار ہو کر طے کرتا ہے اور تجارتی مال اُن پر لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتا ہے اور ان کے دودھ، گوشت، اون اور بالوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

مکان و لباس

اسی ارتفاق کے لوازمات میں سے ایک مسکن اور لباس بھی ہیں۔ گرمی سردی (اور دشمن) سے محفوظ رہنے کے لیے (مناسب) مسکن بنانا اور جانوروں کی کھالوں، درختوں کے پتوں یا دیگر مصنوعات سے ایسا لباس بنانا جو انسان کو ایسا کام دے جیسے حیوانات کو بال کام دیتے ہیں اور اسے عریانی بدن اور شدائد موسم سے محفوظ رکھے۔

زن منکوحہ کی تعیین

اسی ارتفاق میں سے ایک لازمہ زن منکوحہ کی تعیین بھی ہے۔ تاکہ کوئی دوسرا اس بارے میں اس کی مزاحمت نہ کر سکے۔ اور پھر اس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے اور اس کے ذریعہ اپنی نسل بڑھائے۔ انسان کے سوا دیگر حیوانات (ان مقاصد کو مدنظر رکھ کر دوامی

طور پر) اپنے جوڑے کو متعین نہیں کر سکے محض اتفاقیہ طور پر بعض اسباب کی وجہ سے ان کا جوڑا قائم ہو جاتا ہے۔ یہ اسباب یا تو خارجی ہوتے ہیں اور یا وہ دونوں توامین (جڑواں) ہوتے ہیں اور بلوغ تک ان میں پرانی باہمی رفاقت رہی ہوتی ہے اور اتفاقاً ان کا جوڑ قائم ہو جاتا ہے۔

اور جب انسان کی اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی طبیعت میں اولاد کی محبت، شفقت اور ان کی مناسب پرورش و تربیت کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے حتی کہ وہ اولاد بلوغ تک پہنچ کر زندگی کے فرائض کے قابل ہو جائے۔

چھٹی فصل

ارتفاق ثانی سے متعلق حکمتوں کی تفصیل، حکمت معاشی کی تعریف

حکمت معاشی (فن معاشیات) یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو اخلاق فاضلہ مثلاً دیانت، اچھی وضعداری (سمت صالح) وغیرہ کے تقاضوں، اور علوم تجربیہ اور رائے کلی کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں پورا کیا جائے (یعنی ارتفاق اول کی تدبیروں کو صحیح تجربہ اور رائے کلی پبلک ول[1] کی کسوٹی پر کسا جائے جو نقصان سے بعید اور نفع سے قریب تر ہوں اور جو فلاح نوعی اور اصلاح عمومی سے وابستہ ہوں جنھیں ارباب علم و دانش اور اصحاب اعتدال پسندیدہ قرار دے چکے ہوں، ان امور و تدبیر کو اختیار کیا جائے اور باقی ہیئتوں کو چھوڑ دیا جائے تو اس صورت کو ارتفاق ثانی کی حکمت معاشی کہیں گے۔

اصولی ابواب

اس معاشی حکمت کے اصولی ابواب اور بنیادی اہم ترین مسائل یہ ہیں: کھانا، پینا، نظافت وصفائی، زینت وآرائش، لباس وپوشاک، مسکن ومکان، چلنا پھرنا، نشست وبرخاست، سفر و سیاحت، باہمی گفتگو، خواب واستراحت، جنسی خواہشات ومباشرت، امراض وآفات (اور شادی بیاہ، موت و وفات، خوشیوں کے ایام و وقائع اور حوادث اجتماعیہ) یہ اس کے ستون اور اصول ہیں۔

اقسام الناس بلحاظ حکمت معاشیہ

حکمت معاشیہ کے لحاظ سے لوگوں کے حالات تین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم

---

[1] Public will

ان لوگوں کی ہے جو بے انتہا آسائش پسند اور ہر قسم کی عیش وعشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔
دوسری قسم متوسط طبقہ ہے جو نہ زیادہ آسائش پسند ہوتے ہیں اور نہ مفلوک الحال زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر قسم کی عیش وعشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔
تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلی قسم کے بالکل برعکس ضروریات زندگی کو چوپایوں کے قریب قریب نہایت سادگی کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔
اور ہم عنقریب بیان کریں گے کہ حکمت معاشیہ کا معیار لازماً درمیانی قسم یعنی متوسط طبقہ کو بنانا چاہیے جو افراد وتفریط سے پاک ہے (یہی صراط مستقیم، خیر الامور اور قوام اصلی ہے)۔

حکمت معاشیہ کے اصولی ابواب کی مختصر تشریح، طیب اشیا کھانا پینا

مذکورہ اصولی ابواب ومسائل میں ہر ایک کے آداب مختصراً درج ذیل ہیں:
ضروری ہے کہ کھانے کی چیزیں طیب اور پاکیزہ ہوں خبیث اور گندی نہ ہوں۔
خبیث سے میری مراد وہ اشیا خورد ونوش ہیں جن سے آسائش اور تجربہ کے لحاظ سے متوسط طبقہ کے میانہ رو اشخاص کی سلیم طبیعتیں نفرت کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بدبودار طعام، مردار جانور کا گوشت، حشرات الارض خنزیر (سوّر) اور وہ درندہ جانور جو پھاڑنے چیرنے میں بے ڈھنگے ہیں اور ان سے بدبو آتی ہے) جیسے کتا شیر وغیرہ یہ سب خبیث اور غیر طیب ہیں۔ نیز آدمی کو چاہیے کہ اس تنعم اور عیش پرستی سے احتراز کرے جو اس کے درجۂ معیشت سے بالاتر ہو۔ کیونکہ اس میں کئی ایک خرابیاں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ عیاش اور عشرت پرستانہ زندگی تکلیف اور مشقت شاقہ سے خالی نہیں ہوتی۔
(۲) دوسرے یہ کہ مال (جو قوام زندگی ہے) ضائع ہوتا ہے۔
(۳) تیسرے یہ کہ ضروریات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔
(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ فقر وافلاس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ ہاں عیش پسندی کے لحاظ سے معاشرہ میں انسانوں کے طبقے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہر ایک کا علیحدہ معیار تنعم ہوتا ہے۔ مثلاً امرا اور سلاطین کے ہاں عموماً مال ودولت کی فراوانی

اور خادموں کا لشکر ہوتا ہے اس لیے ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ ان کے درباروں میں دستر خوانوں پر متعدد لذیذ کھانے ہوں اور دل پسند سامان عیش و عشرت ہو لیکن فقرا اور غریب اگر ایسی معیشت کا قصد کریں تو یہ (نہ صرف اسراف ہوگا بلکہ) ان کے معاشرتی و معاشی حالات کی تباہی اور ان کی فکری اور قلبی دنیا کی بے قراری کا باعث ہوگا۔

تنعم پسندی کے بارے میں دو متضاد نظریئے

یہاں پر دو مختلف اور متعارض دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک یہ تنعم پسندی اچھی صفت ہے کیونکہ فطرت سلیم اس کا تقاضا کرتی ہے اور اس سے مزاج اور دل و دماغ میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اس سے سیرت و کردار کی تعمیر اور اخلاق و علوم کی تحسین و درستگی ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کند ذہنی اور بد خلقی جیسی صفات رذیلہ بری غذا اور مضر طریقوں سے کھانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور کھانے پینے کے بارے میں اچھی تدبیر اختیار کرنے سے ذہن میں تیزی، اخلاق میں شائستگی اور مزاج میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ترفہ اور تنعم پسندی بری اور قبیح چیز ہے کیونکہ عیش و عشرت اور تنعم کی زندگی کے لیے سخت کدوکاوش کرنی پڑتی ہے۔ اور دوسروں کے ساتھ تنازعات اور خصومتیں شروع ہوتی ہیں۔ مادیت پرستانہ اور جنگ و جھگڑوں سے بھرپور زندگی میں مستغرق انسان (اللہ تعالیٰ اور) عالم غیب کی جانب سے غافل اور آخرت کی زندگی و تدبیر کو بھول جاتا ہے۔ (اس لیے ترفہ اور تنعم پسندی کو مستحسن سمجھنا غلط ہے)۔

وجہ تطبیق

ان دو متضاد دلیلوں یا نظریوں میں جمع و تطبیق کا طریقہ ہونا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ طریق جمع و تطبیق یہ ہے کہ اگر تنعم سے یہ قباحتیں پیدا ہوں جو مؤخر الذکر فریق نے بیان کی ہیں تو یقیناً وہ تنعم اچھا نہیں لیکن اگر ان قبائح سے دور رہ کر کوئی شخص تنعم کی بدولت وہ محاسن

حاصل کر سکتا ہے جن کا ذکر فریق اول نے کیا ہے تو اس سے بہتر کون سی چیز ہو سکتی ہے۔
عموماً جو وقوع پذیر ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ متوسط آسائش و تنعم اختیار کیا جائے اس صورت میں تجھے کچھ نقصانات پہنچیں گے مگر زیادہ نہیں پہنچیں گے۔ اور کچھ فوائد بھی حاصل ہوں گے اگرچہ پورے حاصل نہ ہو سکیں گے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بغیر کسی محنت، مشقت اور تکلیف کے انسان کو فراخ روزی ملتی ہے اور یہ قسمت کی یاوری کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے اصل اسباب کی تہ تک صرف وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو معرفت الٰہی اور معرفت تجلیات الٰہی کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

اکل (کھانے) کے آداب

انسان کو چاہیے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھو کر، ناک صاف کر کے اور کلی کر کے اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے اور طعام کو نہ زمین پر اور نہ کسی میز پر بلکہ دستر خوان پر رکھ دے اور کھانا اپنے سامنے سے کھائے۔ بدحواسی کے عالم میں جلدی جلدی کھانے سے احتراز کرے۔ بڑے بڑے لقمے نہ اٹھائے کیونکہ اس میں حرص اور بے ادبی پائی جاتی ہے۔ جب تک کھانے پینے کی اشتہا صادق نہ ہو اور خوب بھوک یا پیاس نہ لگی ہو، اس وقت تک کھانے پینے سے گریز کریں۔ بہترین کھانا پینا وہ ہے جو آسانی کے ساتھ میسر ہو سریع الہضم اور معدہ سے ہم آہنگ ہو۔ کھانے پینے کے لیے مٹی کے پکے ہوئے یا لکڑی کے بنے ہوئے برتن استعمال کیے جائیں۔ خالص سونے چاندی اور کچی مٹی کے برتنوں سے احتراز کیا جائے۔
مشروبات میں سب سے بری چیز نشہ آور مشروب ہے کیونکہ اس میں عقل انسانی زائل ہوتی ہے۔ سمت صالح اور متانت میں فساد پیدا ہوتا ہے بچے اور جاہل، تمسخر و استہزا کرتے ہیں۔ مال ضائع و برباد ہوتا ہے اور گھریلو اور شہری زندگی کے مصالح و فوائد کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ پیتے وقت برتن میں (منہ ڈال کر) سانس نہ لے بلکہ برتن کو منہ سے الگ کر کے سانس لے۔ نہ بدحواسی کے ساتھ سانس لیے بغیر غٹ غٹ کر کے ایک ہی

گھونٹ میں پیئے۔ اور نہ حوض یا بڑے برتن وغیرہ میں منہ ڈال کر پیئے۔ کیونکہ یہ انسانی وقار ومتانت کے خلاف ہیں۔ علاوہ ازیں ان سے جگر میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پانی کو آہستگی کے ساتھ تین دفعہ سانس لے کر پینا چاہیے کیونکہ اس کا معدہ پر بھی خوشگوار اثر ہوتا ہے اور وقار ومتانت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

آداب نظافت

انسان کے لیے اپنے بدن اور کپڑوں کو نجاستوں سے پاک وصاف رکھنا لازم ہے۔ یہ صفائی مٹی یا پانی سے کی جا سکتی ہے اس لیے جب کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے (بیت الخلا) آتا ہے تو چاہیے کہ کم از کم تین ڈھیلوں سے نظافت حاصل کرے۔ اور اگر وہ پانی سے مزید طہارت حاصل کرے تو اطہر وابلغ یعنی اچھی طہارت ہے اور جسم کو میل کچیل سے پاک رکھے اور کم از کم ہفتہ میں ایک بار (مثلاً جمعہ کے دن غسل کر کے) بدن کو مل لیا کرے تو یہ افضل ہے۔ (گندہ دہنی دور کرنے کے لیے مسواک اور (ناک کی صفائی استنشار (جھاڑے) کرے)، زیر ناف اور بغل کے بالوں کو بھی دور کرے، اسی طرح ان غیر حسی نجاستوں سے پاک وصاف رہے جس کی نجاست کا حکم ذہنی ہوتا ہے جیسے جنابت (جس کے بعد نہانا لازم ہے) اور رفع حاجت (جس کے بعد وضو کرنا لازم ہے)۔

زینت وآرائش

(زینت سے مراد زنانہ طرز پر کنگھی پٹی کرنا نہیں) زینت کے معنی یہ ہیں کہ انسان لوگوں کے درمیان صاف اور پسندیدہ حالت میں رہے۔ وہ پگڑی طرحدار اور لباس خوشنما پہنے اس نے سر اور داڑھی کے بال کنگھی سے درست کیے ہوئے ہوں۔ داڑھی کے گھنے بالوں میں شانہ کرے اور ہاتھ میں شریفانہ انداز کی چھڑی رکھے، کیوں کہ ایسی شکل وصورت وقار وسنجیدگی اور شہامت وبزرگی کی علامت ومظہر سمجھی جاتی ہے۔

اور شادی شدہ عورت کے لیے چاہیے کہ اس کے ہاتھ مہندی سے رنگین رہیں وہ سر کے بالوں میں (خوشبودار کریم اور) تیل لگا کر شانہ کرے۔ اس کے کپڑے رنگین ومنقش

ہوں اور ہمیشہ وہ رنگ استعمال کرے جو اس کے خاوند کے لیے جاذب نظر اور پسندیدہ ہوں وہ اپنے آپ کو سونے کے زیورات اور دوسری مناسب اشیا زینت سے آراستہ رکھے۔

لباس

عقلائے روزگار کا اس پر اتفاق ہے کہ برہنگی عیب ہے۔ اور لباس زینت ہے۔ اس لیے شرم گاہوں اور رانوں کو کھلا رکھنا بے شرمی ہے۔ سب سے افضل لباس وہ ہے جو سب اعضائے بدن اور تمام جسم کو چھپائے اور اس میں شرم گاہوں کو چھپانے والا (کپڑا) اس کپڑے سے جدا ہو جو باقی اعضائے بدن کو چھپانے کے لیے استعمال ہو اور لباس ایسا ہو کہ انسان اپنے ہاتھوں کو آزادانہ حرکت دے سکے۔ اور اپنی ضروریات کو پورا کرتے وقت انھیں یہ محسوس نہ ہو کہ وہ گردن سے معلق اور بندھے ہوئے ہیں۔ مردوں کو ایسے کپڑوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عشرت پرستی، بدمستی، بے راہ روی اور مسخرہ پن کا مظہر ہوں۔ جیسے ریشمی ارغوانی اور زعفرانی کپڑے اور نہ اتنا چست کپڑا پہنیں جس سے جسم کا حجم نظر آ رہا ہو البتہ عورت اگر اس قسم کے کپڑے پہن لیا کرے تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ تنعم پسندی، نزاکت بنی اور زینت خواہی اس کی جبلّت میں رکھی گئی ہے۔ اور خاوند بیوی کی نزاکت پسندی کی طرف راغب ہوتا ہے۔

مرد مونث (یعنی جو مرد لباس وغیرہ میں عورتوں سے مشابہت پیدا کرنا چاہتا ہے) اور مرأۃ مترجلہ (جو عورت لباس وغیرہ میں مردوں کی مشابہت پیدا کرنا چاہتی ہے) دونوں راندۂ بارگاہِ الٰہی ہیں اور کوئی (ذی عقل سلیم شخص) انہیں محبوب و پسند نہیں کرتا (کیونکہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو مخصوص جسمانی اور نفسیاتی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اور جس طرح ان دونوں کی جسمانی ساخت میں اختلاف ہے اسی طرح ان دونوں کے جداگانہ فرائض و واجبات میں فرق ہے۔ مرد، عورت بننے کی خواہش کرے اور عورت مرد، تو ایک طرف تو یہ فطرت کے خلاف جنگ ہوگی اور دوسری طرف انسان کی نوعی تمدنی اور تہذیبی زندگی میں کوئی پیش رفت نہیں ہوگی۔ کمال ذاتی اور کمال نوعی کے لیے مرد اور عورت کو اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر تعاون و تناصر کے جذبہ کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوگی۔

مکان و مسکن

مسکن کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ وہ آدمی کو گرمی، سردی کی شدت اور چوروں کے حملوں سے بچا سکے۔ اور گھر والوں اور ان کے سامان کی حفاظت کر سکے۔ ارتفاق منزل کا صحیح مقصود یہی ہے۔ چاہیے یہ کہ مسکن کی تعمیر میں استحکام کے توغل و تکلف اور اس کے نقش و نگار میں اسراف بے جا سے احتراز کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکان حد درجہ تنگ بھی نہ ہو (جس سے رہنے والوں کی بنیادی ضروریات سادہ طریق سے بھی پوری نہ ہو رہی ہوں) بہترین مکان وہ ہے جس کی تعمیر بلاتکلف ہوئی ہو۔ جس میں رہنے والے مناسب طور پر آرام و راحت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ فضا وسیع و عریض ہو، ہوادار ہو اور اس کی بلندی بھی متوسط درجہ کی ہو۔

مکان ہو یا دیگر ضرورتیں، ان سب کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ پیش آمدہ ضرورتوں کو اس طور سے پورا کیا جائے جو طبع سلیم اور رسم صالح کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ لیکن بدقسمتی سے بعض لوگ شاندار عمارتیں بنوانے میں ہوائے نفس کے تابع ہوتے ہیں۔ اور ان کی تعمیر میں نفسانی خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کو مقصود بالذات چیز سمجھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اس قسم کے لوگ نہ تو دنیا کی کدّ و کاوش سے نجات پا سکتے ہیں اور نہ انہیں فتنۂ قبر اور فتنۂ محشر سے نجات مل سکے گی۔

سفر

اگرچہ سفر میں انسان کو خوف و وحشت اور وطن سے اور بھائیوں سے دوری اور کتنی اور قسم کی تکلیفیں پیش آتی ہیں، پھر بھی اہم مقاصد اور اعلیٰ اغراض کے حصول کے لیے سفر کرنا ہی پڑتا ہے، چاہیے یہی کہ بلاضرورت حتی الامکان سفر سے احتراز کیا جائے لیکن جب ضرورت پڑے تو سفر پر جانے سے پہلے ''اچھے ساتھی'' کی تلاش ضروری ہے کیونکہ ''اکیلا مسافر ایک بھٹکا ہوا شیطان ہے جو شاید اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو''۔ یہ بات کامیاب تجربات سے ثابت ہوئی ہے۔

سفر کے دوران پڑاؤ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جاری اور کھلے راستے میں یا ندی، نالے کے پیٹ میں نہ اُتریں، خشک اور بے آب و گیاہ علاقے سے جلد نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر سرسبز و شادات وادی ہے تو اطمینان کے ساتھ منزل طے کرنا چاہیے اور درمیان میں آرام کر کے اپنی سواری کو آزاد چھوڑنا مناسب ہے تا کہ وہ گھاس پھوس کھائے، چوپایوں پر رحم اور ان کی صحت کے لیے یہ طریقہ کار زیادہ درست ہے۔ جہاں بھی قیام کرے ہمیشہ چوروں سے چوکنا ہو کر رہے۔ خیموں کو بلند جگہوں اور ٹیلوں پر نصب کرنا چاہیے تا کہ سیلاب اور طوفان سے حفاظت بھی ہو سکے اور کسی آفت یا دشمن کے خطرہ کے وقت اجتماعی مدافعت کا سامان بھی فراہم ہو سکے۔

نشست و برخاست اور چلنے پھرنے کے آداب

چلتے وقت اعضائے جسمانی کو زائد از ضرورت حرکت و جنبش نہیں دینا چاہیے اور زیادہ تیز چلنا اور بہت آہستہ چلنا آداب مشی کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان ہر دو افراطی و تفریطی صورتوں سے حماقت خفیف الحرکتی اور کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ حلقہ یاراں میں عین درمیان میں بیٹھنا زیادہ اچھا نہیں بہترین محفل و مجلس جس میں بیٹھنا افضل واحسن ہے وہ ہے جس میں ان امور کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے جن سے آدمی دین و دنیا کا کوئی معتد بہ فائدہ حاصل کرے۔ سب سے بدترین نشست گاہ وہ ہے جو راستہ میں ہو جہاں سے عورتوں کے پُرکشش حصوں پر نظر پڑتی ہے اور نتیجہ پردۂ ذہن پر تشویش انگیز تصویریں بن جاتی ہیں۔

صنفی تعلقات کے آداب

میاں بیوی کے درمیان صنفی تعلقات میں تستر اور حیا کو ہر حالت میں ملحوظ رکھنا ہے ہم بستری سے پہلے میاں بیوی کے درمیان ہنسی خوشی اور کھیل وملاعبت کی سازگار فضا قائم ہونی چاہیے کیونکہ اس طرح استفراغ منی میں سہولت و آرام رہتا ہے۔ ہم بستری کے وقت غیر ضروری باتیں نہیں کرنی چاہیے کیونکہ شریفانہ اخلاق کے منافی امر ہے۔ ہم بستری کے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ استفراغ منی کے بعد بھی میاں اپنی زوجہ پیٹ پر رہے تا کہ اس کی زوجہ

بھی اسی طرح لطف اندوز ہو جس طرح وہ اپنی صنفی خواہش پوری کر کے لطف اندوز ہوا ہو۔

آدابِ نوم

سوتے وقت دائیں جانب پر لیٹنا اور اپنے دائیں ہاتھ سے سر کو سہارا دینا چاہیے کیونکہ اس طرح سونے سے قلب بیدار رہتا ہے۔ آرام وراحت زیادہ ملتی ہے اور جگر کی کارکردگی زیادہ بہتر ہوتی ہے (سونے کے اوقات کے سلسلہ میں) چاہیے کہ آدمی یا دوپہر کو قیلولہ کرے، یا عشا کے بعد آرام، ہاں ضرورت کی بات اور ہے۔

سوتے وقت مناسب ہے کہ طہارت (غسل یا وضو یا تیمّم) کر کے سوئے اور اپنے دماغ کو پریشان کن ذہنی خیالات اور تصوروں سے صاف رکھے اور اس کا وسیلہ یہ ہے کہ سونے سے پہلے قصہ کہانی اور گپ شپ نہ سنے۔ سوتے وقت چند آیات قرآن پاک پڑھ لینا انسان کو پراگندہ خوابوں اور ہیبت ناک بے ترتیب خیالات سے محفوظ رکھتا ہے۔

پھر جب انسان کوئی خواب دیکھے تو اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ عالم بیداری میں خیالات وتصورات لوحِ ذہن پر منقوش ہوتے ہیں، اور جن کا اثر حس مشترک میں باقی رہ جاتا ہے وہ عالم خواب میں منتقل ہو کر سامنے آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ طبیعت کے حیوانی اثرات کا غلبہ اپنا عمل کر جاتا ہے جو کبھی شہوات کی بنا پر احتلام کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی امور طبعیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے مثلاً غلبۂ صفرا کی حالت میں انسان دیکھتا ہے کہ آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اور اس سے شعلے اٹھ رہے ہیں اس قسم کے خوابوں کو "انزار الشیطان" (بھوت پریت کے ڈراوٴنے) اور "اضغاث الاحلام" کہتے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ عالم مجردات اور عالم محسوسات کے درمیان قوت متوسط یعنی عالم مثال کے فیضان کے نتیجہ میں نفس ناطقہ انسان میں خواب متمثل ہوتے ہیں تو اس صورت میں خواب کی کوئی نہ کوئی تعبیر ہوگی۔

مرض کے آداب

جو شخص کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو ایک طرف وہ (جاہلی اور جاہلانہ جھاڑ پھونک کی

بجائے مکمل اور پورے جھاڑ پھونک یعنی قرآن پاک کی آیت اور اسمائے حسنیٰ سے توسل کرے۔
کیونکہ یہ اسمائے پاک ان قوی پر دلالت کرتے ہیں جو قوائے سماویہ اور قوائے ارضیہ کے باہمی ارتباط کے بعد معنوی طور پر اس عالم کون وفساد میں ایسے کارفرما ہوتے ہیں کہ یہ دونوں (اسمائے حسنیٰ میں مضمر قوی اور عالم کون وفساد) باہم دیگر مل کر ایک کل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان اسباب طبیعیہ اور قوائے مخفیہ کی تسخیر میں آیات اللہ اور اسمائے حسنیٰ کا اثر ونفوذ معنوی طور پر ہوتا ہے اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ (عنقریب) بیان کریں گے۔ اور دوسری طرف اس کے ساتھ ہی ساتھ طبی اصول کے مطابق مجرب مفید دواؤں سے علاج معالجہ بھی کرتا رہے۔

ہر مصیبت زدہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔

یا تو (۱) وہ مخلوقات وموجودات عالم میں خدائے رحمٰن جل وعلا کے فیصلوں پر اپنے نفس کو راضی ومطمئن کرے گا اور علم یقین سے جانتا ہوگا کہ کارخانہ ہستی اور کائنات کا نظام جس حکمت بالغہ پر مبنی ہے اس کا تقاضا یہی تھا۔ رضا بقضائے الٰہی اور کون ومکان میں حکمت بالغہ کی کارفرمائی پر یقین کامل سے اس کے قلب میں ایسی الٰہیاتی وجدانی کیفیت پیدا ہوگی جو اسے دنیاوی پریشانیوں سے نجات دے گا اور اسے مادّی آلائشوں سے پاک کر کے اپنے پروردگار کے قریب کر دے گی۔ دنیا میں وہ سمت جمیل سے موصوف ہوگا اور آخرت میں اس کو اجر جزیل اور ثواب کامل ملے گا۔

اور یا (۲) وہ مصیبت سے گھبرا کر پریشان ومتردد ہوگا۔ اور (عالم ملکوں وجبروت کے بجائے عالم دنیا کے پست ترین حصہ) زمین سے پیوست رہے گا۔ اور ہر آن کھوئی ہوئی چیز (صحت مال، اولاد وغیرہ) اور اس کے حسن وجمال کو یاد کر کے دست تأسف ملتا رہے گا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو اس دنیا اور دنیا کے مزخرفات سے دل بستگی ہے اور اپنے پروردگار (کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے عملی انکار ہے۔ اور اسے یوم آخرت میں اُمید نجات سے محرومی اور دوسروں کے احسان ومہربانی سے ناامیدی کا احساس پریشان کر رہا ہے حتیٰ کہ اس دنیا میں اس کے فزع وجزع اور اضطراب کا یہ عالم ہوتا ہے گویا اس پر جنون کا دورہ پڑ گیا ہے یا اسے جنات نے حواس باختہ کر دیا ہے۔ ہمارے اس بیان سے تمہیں وہ راز معلوم

ہو گیا ہو گا کہ شریعت محمدیہ نے میت پر نوحہ وزاری اور مرثیہ خوانی کو کیوں منع فرمایا ہے۔

آداب کلام

ضروری ہے کہ کلام فصیح وبلیغ ہو اور اجمال وابہام ولکنت یعنی بندش ورکاوٹوں سے خالی ہو۔ اور ان کے لب ولہجہ میں رکاکت وکرختگی نہ ہو۔ اس میں آب رواں کی طرح تسلسل وروانی ہو اور وہ ان معانی پر مشتمل نہ ہو جن سے سننے والے کو ذہنی کوفت اور قلبی رنجش ہو مثلاً کج بحثی، نکتہ چینی، عیب جوئی اور چغل خوری وغیرہ۔ کلام مخاطب کی ذہنی حالت واستعداد اور اس کے درجۂ ذکاوت وغباوت کے مطابق ہونا چاہیے۔

حکمت معاشیہ کے متعلق مشتے نمونہ خروارے یہاں اتنا کافی ہے۔

ساتویں فصل

الحکمة المنزلیة (تدبیر منزل)

حکمت منزلیہ کی تعریف

حکمت منزلیہ (یا فنِ تدبیر منزل) کا مفہوم ہے اہل منزل یعنی ایک گھر کے رہنے والوں اور احباب اور ساتھیوں کے ساتھ معاملات میں اس قسم کا ربط و تعلق قائم کرنا اور سلوک روا رکھنا جو "اخلاق فاضلہ" "علوم تجربیہ" اور "رائے کلی" کے تقاضے کے مطابق ہو اور جس نتیجہ میں تیرا رہنا سہنا اچھے طریقے اور باعزت میل جول کے ساتھ ہو (بالفاظ دیگر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بہترین اور معزز ترین برتاؤ اور اس برتاؤ کی حفاظت کی تدبیروں کا نام حکمت منزلیہ ہے)۔

تدبیر منزل کے حصے

اس حکمت کے تین حصے یا نظام ہیں:

(۱) ازدواج و نکاح (۲) ولادت و اولاد (۳) مالک و مملوک یا آقا و ماتحت۔

نکاح: انسان کے حق میں ایک عنایت الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مروجہ طریقہ پر نکاح کرنے کا الہام فرمایا یعنی یہ کہ نکاح غیر محرموں کے ساتھ ہو اس میں ایجاب وقبول ہو (یعنی فریقین کی رضامندی ہو) اور عورت کے سرپرستوں سے درخواست اور ان کی نگرانی اور گواہوں کی موجودگی میں عقد نکاح پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ خطبہ (منگنی اور خطبہ (بوقت نکاح) کے ذریعہ اس کا اعلان کیا جائے اور مہر کی مقدار مقرر کی جائے۔ (نکاح کے بعد) عورتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ شوہروں کی فرماں برداری کریں اور ان کی خدمت میں کوئی

وقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اور امور خانہ داری اور شوہروں کی گھریلو ضروریات پورا کرنے کی فکر کریں۔ شوہروں کا فرض یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر اکتساب معاش میں مشغول رہ کر عیال داری کی ضروریات پورا کرنے کی فکر کریں۔

اسرار و اسباب تعیین زن منکوحہ

اس (تعیین زن منکوحہ) کا ایک (۱) راز یہ ہے کہ انسان فطرتاً امر نکاح میں غیرت مند واقع ہوا ہے اور دوسرے چوپایوں کے غیور (سانڈوں اور) نروں کی طرح یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا امرد اس کی منکوحہ بیوی سے صنفی تعلقات اور ازدواجی روابط قائم کرے۔ اور منافستِ باہمی کی صورت میں زور آزمائی، قتل وخوں ریزی اور فساد و بدامنی تک نوبت پہنچ جائے۔ علاوہ بریں انسان کی حمیت وغیرت یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کی بیٹیوں بہنوں اور جگر گوشوں کو اس کی موجودگی میں عریاں و برہنہ کرے اور (جس طرح جی چاہے) سانڈوں کی طرح ان سے صنفی تعلقات قائم کرے۔

(۲) اس (حمیت اور غیرت) کی (دوسری وجہ) ایک طبعی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مرد بالطبع پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کے ساتھ غیر فطری معاملہ کرے۔

اس فطرت کے ساتھ جب وہ خود اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے اور حصول منفعت اور دفع ضرر کے اصولوں کے لحاظ سے ان کو اپنی جیسی حیثیت دیدیتا ہے تو اپنی جبلت اور ذات کے احکام کے ساتھ اس غیرت کا جذبہ اولاد کے حق میں بھی محسوس کرتا ہے۔

(۳) نکاح کے بارے میں اس اہتمام کا ایک سبب صفت حیا بھی ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ نیز عقل سلیم بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تعیین ہو جانے کے بغیر کسی سے اس کے صنفی تعلقات نہ ہوں ان اسباب کی بنا پر انسان کو غیب سے الہام ہوا کہ (صنفی تعلق) کو راز داری کے ساتھ انجام دے۔ اور حکم دیا گیا ہے کہ صنفی مباشرت کو (صراحت کے ساتھ ذکر نہ کیا جائے بلکہ اس کو) شادی کے لوازم و رسومات اور عروج (عورت کو اپنی جانب مائل کرنے) کے ایسے طریقوں میں مخفی رکھا جائے جن کی ان

دونوں (مرداورعورت) سے توقع کی جاتی ہے۔گویا کہ دونوں کے وجود سے بظاہر یہی (یعنی رسم شادی) مقصود ہے۔لوگ اس رسموں اور رواجوں کو موجب اطمینان پا لیتے ہیں اور جماع ومباشرت کو کان لم یکن سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔امر نکاح و جماع میں یہی طریقہ شروع سے جاری ہے(اور لوگ شادی کو خاص رسوم کے ساتھ بجالا کر بیٹیوں اور بہنوں کا نکاح کراتے ہیں)۔

(۴) زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے مقابلہ کرنا اور ان پر سبقت حاصل کرنا انسان کی جبلت ہے۔یہ جبلت اپنے جگر گوشوں کے سلسلہ میں بھی کارفرما رہتی ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جس چیز سے جگر گوشوں کو اذیت پہنچتی ہے وہ ماں باپ کے لیے بھی باعث اذیت ہوتی ہے اور جو چیز ان کو سرور وخوشی بخشتی ہے اس سے والدین کے دلوں کو بھی مسرت حاصل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے مہر، خطبہ اور اعزاز پیش کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ شوہر اس رشتہ کا سچے دل سے طالب ہے۔

مرداورعورت کی جسمانی اور ذہنی قوتوں میں فطری اختلاف اوراس کے فائدے

یہ بھی فطری امر ہے کہ مرد خوددار، خود پسند اور اقتدار پسند واقع ہوا ہے، اس کی جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیت دونوں (صنف نازک کے مقابلہ میں) بہتر ہیں۔اور وہ روزی کمانے کے طریقوں پر زیادہ قادر ہے۔اور اس قابل ہے کہ اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کے خوب کمائے، خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے۔(اس کے برعکس) عورت فطرتاً حقیر اور ادنیٰ چھوٹے چھوٹے امور کو خود سمجھتی اور انجام دیتی ہے۔وہ بمقابلہ مرد کے زیادہ اطاعت کیش اور جسمانی و ذہنی قوتوں کے لحاظ سے اس سے ضعیف تر ہوتی ہے۔معیشت بترا (کم درجہ کے وسائل معاش) اور تنگدستی وزبوں حالی میں بھی بہتر معیشتی تدبیریں اختیار کرنے پر قادر ہوتی ہے (مگر بعض خلقی کمزوریوں کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ مردانہ افعال واعمال بجالا سکے) اس لیے (تمام سلیم الطبع اقوام کا) اس بات پر اتفاق ہے کہ مرد گھر کے اندر کے کاموں مثلاً جھاڑو دینے، کھانے سالن پکانے، آٹا پیسنے اور

بچے پالنے کے کاموں کے لیے کم فارغ ہوتا ہے اور عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر خانہ داری کے فرائض انجام دینے چاہیں کیونکہ وہ نرم مزاج اور کمزور دل ہوتی ہیں۔

عورت کی فطرت میں یہ بات بھی ہے کہ عفیف عوتیں جماع و مباشرت کی خواہش کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس کو بوجہ حیا کے دوسروں سے پوشیدہ رکھتی ہیں۔ مردوں کو عورتوں کی یہ بات اچھی لگی ہے۔ اور ہمیشہ اس صفت کو نظر استحسان سے دیکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کے نکاح کا معاملہ ان کے سرپرستوں کے سپرد کیا گیا اگر وہ سرپرستوں کی وساطت چھوڑ کر براہ راست اس قسم کی کارروائی کریں تو یہ سخت معیوب اور بے حیائی کا کام سمجھا جاتا ہے۔

نکاح محارم کی حرمت میں یہ حکمت ہے کہ انسان ماں بہن کی گود میں پرورش پاتا ہے اور بیٹیاں اس کی گود میں تربیت و پرورش پاتی ہیں۔ اور (اس طرح قریبی رشتہ داروں یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان ایسا گہرا تعلق رہتا ہے جو) راہ نکاح اور ترغیب ازدواج میں مانع ہوتا ہے جب تک خَلق وخُلقِ انسان سلامت اور درست ہیں اس وقت تک قریبی رشتہ دار عوروں سے نکاح میں رغبت کا اظہار بالکل نہ ہوگا۔ ایسی سخت مجبوری اور ضرورت پیش آجائے (جو مصلحت عامہ اور ارتفاق انسانی پر مبنی ہو) تو اور بات ہے۔ (یہاں شاہ صاحب اس واقعہ کے لیے عذر تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں جب حضرت آدم وحوا سے نسل چلی تھی، تو ابتدائی توام جوڑوں کو دوسرے توام جوڑوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی تھی)۔

نکاح محارم کی حرمت میں ایک مصلحت بھی ہے وہ یہ کہ محارم کے ساتھ ہر وقت اور ہر حال میں انسان کا نہایت گہرا تعلق رہتا ہے اور اختلاط اور بے تکلفانہ صحبتوں میں فساد (بے راہ روی اور کج روی) کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ابتدا سے نکاح محارم کی حرمت وتقدس لوگوں کے ذہن نشین نہ کیے جائیں تو صنفی بے راہ روی کے عام ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم وبیش ہر معتدل المزاج قوم نظریہ تحریم نکاح محارم کی قائل اور اس پر عامل ہے۔ یہ محرم عورتیں کون کون سی ہیں؟ اس بارے میں بہر حال مختلف اقوام میں اپنی عادات کے لحاظ سے اختلاف موجود ہے (جیسے ہندو سوسائٹی چچازاد کو بھی بہن سمجھتی ہے)۔

مدارج معیشت میں اختلاف فطری ہے

یہ بھی خدائے بخشندہ کی بخشش وعنایت ہے کہ سب انسانوں کو یکساں طبیعت سے نہیں نوازا بلکہ انھیں مختلف مراتب ومدارج کے ساتھ پیدا کیا۔(اس لیے مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ) بعض اشخاص بالطبع غلامی اور ماتحتی کے خوگر ہوتے ہیں اور کم ہمتی اور ضعف قوی کی وجہ سے آزادانہ طور پر اکتساب معاش نہیں کر سکتے۔ وہ سرداروں کے تابع فرمان اور ان کے عیال میں شامل ہو کر اوامر کی تعمیل میں تسلیم وانقیاد کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔اس قسم کے بالطبع غلاموں کو اس وقت تک آرام محسوس نہیں ہوتا جب تک وہ کسی آقا کے) ماتحت نہ ہوں۔ خواہ وہ آقا ان کا مالک ہو یا مالک جیسا طرز عمل اختیار کرنے والا (حاکم وغیرہ) ہو۔

اس کے برعکس بعض لوگ بالطبع سردار اور آقا ہوتے ہیں، وہ عالی ہمت اور سیادت وقیادت کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنے معاش ومکاسب میں نہ صرف مستقل وخود کفیل ہوتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کی ضروریات کا بوجھ برداشت کر سکتے ہیں۔اور چاہتے ہیں کہ زمام سیاست وقیادت ان کے ہاتھوں میں رہے۔ پھر انسانی معاشرہ کے ان کے افراد نے ایسے واقعات اور ارتفاقات (جنگ وجدل یا حملہ وغارت کے) برپا کیے کہ ان میں لوگوں نے ایک دوسرے کو غلام بنانا شروع کیا اور ان غلاموں کی گردنوں کے مالک بنے اور ان کی گردنوں کو طوقِ تملیک میں جکڑا اور ان سے اس طرح کام لینے لگے، جس طرح جانوروں سے کام لیا جاتا ہے۔(یعنی آقا وغلام کا ایک رشتہ اور ادارہ معاشرہ میں پیدا ہوا اور ضرورت پیدا ہوئی کہ ان کا باہمی تعلق کے لیے بھی کوئی اصول وضع کیا جائے) مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ آقاؤں اور غلاموں کی معاشرتی اور معاشی زندگی میں بعض ایسی ضرورتیں پیدا ہوئیں جو ایک دوسرے کے تعاون اور ہاتھ بٹانے کے بغیر پوری ہی نہیں ہوسکتی تھیں اس لیے ضروری ہوا کہ زندگی کو پُرسکون وخوشگوار رکھنے کے لیے ان دونوں کے باہمی تعلقات کو آپس میں اُستوار ہوں۔اس قدرتی تدبیر کی بنا پر انسانوں کی معیشت کا

کاروبار اچھی طرح چلنے لگا۔[1]

والدین اور اولاد کا تعلق

انسان پر اللہ کا یہ ایک عظیم احسان ہے کہ اس نے اولاد کو والدین اور آباو اجداد کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا ہے اس کا بنیادی سبب والدین کا وہ طرزِ عمل اور طریقۂ پرورش ہے جو وہ اپنی اولاد کی تربیت و خبر گیری کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے اپنے بچوں بچیوں کی تربیت ایک طرف قوت اور بالادستی کے ساتھ اور دوسری طرف شفقت و مہربانی اور طبعی محبت و احتیاط کے ساتھ کر کے ان پر ان کے بچپن میں ہی اپنی قیادت کا سکہ بٹھا لیتے ہیں۔ اور جب اولاد سنِ بلوغ کو پہنچتی ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ان کے بزرگ (باپ) کی عقل و فہم اور اس کا تجربہ زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد جب بڑی ہو جاتی ہے تو وہ طبعاً والدین کی فرماں برداری اور خدمت گزار رہنا پسند کرتی ہے۔ احسان شناسی کے تحت اور جذبہ ان کے احسانات کو یاد کرتی ہے اور اپنی عقل و فہم اور تجربہ کے مقابلہ میں ان کی پختہ رائے کا سہارا لے کر مسائلِ زندگی حل کرتی ہے۔ چوپائے بھی فطری طور پر وفادار ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں جو محبت آہستہ آہستہ گھر کر جاتی ہے۔ وہ اس پر قائم رہتے ہیں۔ ان میں بھی احسان شناسی کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ اور اپنے منعم و مربی کے حسنِ سلوک اور احسان و انعام کا خیال کر کے اس سے محبت کرتے ہیں۔ (گویا انسان کی حیوانی جبلّت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ محبت اور ان کی اطاعت کریں)۔

بہر حال خارجی اسباب کے علاوہ بھی آبا کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اولاد سے محبت اور ان پر شفقت ڈالی ہے۔ اور ابنا کی طبیعت میں یہ ڈالا ہے کہ اپنے آبا کے تابع اور مطیع فرمان رہیں۔ اور ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آئیں۔ (یہ بھی ایک عام جبلّت ہے) چوپایوں میں بھی یہ اوصاف نمایاں نظر آتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

---

[1] شاہ صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ارتفاق ثانی کی منزل پر غلامی انسانی معاشرہ کی ضرورت تھی اور اس ادارہ کی بدولت انسانوں کو دو طرفہ ضروریات کے پورے ہونے کی سبیل نکل آتی تھی۔

ازدواجی تعلقات پدرانہ و فرزندانہ روابط اور آقا و غلام کے تعلقات کو معقول اور شرعی حدود کے اندر رکھنے کے لیے جو نظام قائم ہے اس کو ہم تدبیر منزل کہتے ہیں کیونکہ منزل صرف چار دیواری، دروازوں، کمروں اور چونے پتھر کی بنی ہوئی عمارت کا نام نہیں۔ (بلکہ اس ادارہ کا نام ہے جس کے تحت یہ تعلقات پیدا ہوتے ہیں)۔

ازدواج کی ضروریات اور آداب

اس ارتفاق کا کمال اس میں ہے کہ جن اغراض و مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ازدواج و نکاح کی مشروعیت کی گئی ہے، وہ بہ طریق احسن پوری ہو جائیں۔ چنانچہ پسندیدہ امر یہ ہے کہ جس عورت کو رفیقۂ حیات کی حیثیت سے منتخب کیا جائے وہ خوبصورت ہو، کنواری ہو، اولاد پیدا کرنے کی پوری استعداد و صلاحیت رکھتی ہو، عفیف و پاکدامن ہو، اپنی اولاد سے قلبی لگاؤ رکھتی ہو۔ اس کے دل میں شوہر کی محبت ہو، اور اس کے مال و دولت کی حفاظت کنندہ اور امانت دار ہو، امور خانہ داری سے پوری طرح واقف و ماہر ہو۔ غصیلی اور کمزور طبیعت کی نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

شوہر کے انتخاب میں مندرجہ ذیل اوصاف کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ فقیر و قلاش نہ ہو اور نہ بے جا غصہ کرنے والا، اور نہ مار پیٹ کا عادی ہو، اس کے مزاج میں طیش (چھچھورا پن) نہ ہو نہ وہ قوت مردی سے محروم ہو اور نہ کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو۔ مثلاً وہ کوڑھی نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی بیماری (مثلاً برص وغیرہ) اسے لاحق ہوگئی ہو۔ جو نا قابل علاج یا قابل نفرت ہو۔ نہ وہ مجنوں و دیوانہ ہو۔ اور نہ وہ اکتساب معاش اور طلب رزق سے جی چرا کر دوسروں پر بوجھ بن کر رہتا ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام ممکن ذرائع سے متعاقدین (زوجین) میں الفت پیدا کی جائے اور اس الفت کو باقی اور پائدار رکھنے کی سعی کی جائے۔ (ان ذرائع میں سے ایک اتنا مہر دینا ہے جو مرد کے صدق رغبت پر دلالت کرے اور دوسری چیز ولیمہ (شادی کی تقریب پر ضیافت دینا ہے) ہاں اگر ان ذرائع سے زوجین کے درمیان الفت پیدا نہ ہو سکے

یا اس پر کوئی آفت ناگہانی پڑ کر اس کو باقی نہ رکھے تو ان ذرائع مذکورہ کے علاوہ دوسرے مناسب ذرائع اور تدبیریں اختیار کی جائیں۔

ولیمہ کے اندر کئی اہم نکتے پوشیدہ ہیں مثلاً

(۱) اس سے نکاح کا اعلان ہو جاتا ہے اور نہایت لطیف انداز سے عقد نکاح کی توثیق ہو جاتی ہے۔

(۲) ولیمہ دراصل عہد طفولیت کے اختتام اور رشد و کمال تک پہنچنے اور نظام منزل میں قدم رکھنے کی توفیق عطا کرنے پر (جو گویا مقصود زمانہ بلوغ ہے) منعم حقیقی کا شکر نعمت اور اعتراف احسان ہے۔

(۳) زنِ منکوحہ کی طرف خاوند کی رغبت کا اظہار بھی اسی ضیافت سے ہوتا ہے (اور دلہن کی عزت افزائی بھی اس سے ہوتی ہے)۔

(۴) نیز انسان قلبی مسرت کا اظہار بھی کرتا ہے اور خوشی کے موقع پر مال خرچ کرنے کی فطری خواہش بھی اس سے پوری ہوتی ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان جو الفت پیدا ہوتی ہے اس کو باقی رکھنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ عورت کی بدمزاجی کو حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا جائے اور اشیائے خورد و نوش کے بارے میں عورت کے لیے فراخی کا سامان مہیا کیا جائے۔

دوسری طرف عورت کا یہ فرض ہے کہ حتی المقدور زیورات اور جواہرات سے آراستہ ہو کر رہے۔ اور ہمیشہ ظاہری نظافت و پاکیزگی اور جسمانی صفائی کا پورا پورا خیال رکھے اور اپنی نشست و برخاست اور آداب زندگی کے وہ طریقے معلوم کر کے انہیں اختیار کرتی رہے جو شوہر کو پسند ہوں۔ اور اس کی محبت قلبی میں روز افزوں اضافہ کی تاثیر رکھتے ہوں۔

تدبیر منزل کی خرابیوں کو دور کرنے کے طریقے

جب میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات اور گھریلو زندگی میں خرابی اور ناچاقی پیدا ہو تو باہمی صلح صفائی کے لیے ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے گھر والوں

سے مقرر کریں مگر ضروری ہے کہ ثالث ایسے ہوں کہ وہ ان دونوں کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں اور ان کے درمیان موجود اختلاف کے اسباب و وجوہ بھی انہیں معلوم ہوں۔ نیز یہ کہ وہ میاں بیوی سے مخلصانہ ہمدردی رکھتے ہوں اور عادل و منصف مزاج ہوں۔ ان صفات سے متصف ثالثوں کو سیاہ وسفید کا اختیار دیدیں، کیونکہ جب دلوں میں بخل اور کنجوسی گھر کر جائے تو حق بات یہ ہے کہ جانبین کو نہ بہتر تدبیر نظر آتی ہے اور نہ وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔ ان ثالثوں کو سب سے پہلے ناچاقی کے بنیادی سبب یا اسباب معلوم کونے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان ناچاقی کی اصل وجہ ان کی تنگدستی ہوتی ہے۔ بعض اوقات بیوی کی قلت شہوت اور بے رغبتی ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی دوسرے انسان کے حسن پر فریفتگی ہوتی ہے۔ (یا اس قسم کے اور اسباب جن میں دینی، سیاسی اور فکری ناہمواریاں بھی ہو سکتی ہیں) اسباب معلوم ہونے کے بعد ثالثوں کو آسان ترین تدبیر اختیار کرنی چاہیے جس کے ذریعہ وہ میاں بیوی کے درمیان رشتہ اُلفت کو بحال کر سکیں۔ لیکن مصالحت کی تدبیر نہ ہو سکے اور وہ دونو ں مصالحتی کوشش کے کامیاب ہونے سے انکار کریں۔ اور سوائے تفریق وجدائی کے کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آئے تو (بحکم الضرورات تبیح المحظورات) ان دونوں کو جھگڑوں کے دباؤ اور لاحق پریشانیوں سے نجات دیدی جائے اور (شرعی طریقہ کے مطابق) معاوضہ یا بغیر معاوضہ طلاق دلوادی جائے۔ ثالثوں کو چاہیے کہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں اور کسی پر ظلم وجور نہ کریں۔

حکمت عدت

طلاق کے بعد عدت لازمی قرار دی گئی ہے۔ جس میں (ایک) یہ حکمت ہے کہ عقد نکاح کی شان کو برقرار رکھا جائے اور نکاح کو بچوں کا کھیل نہ سمجھا جائے کہ جب چاہا عقد کر لیا اور جب چاہا توڑ دیا، بلکہ اس کو ایک قابل احترام رشتہ تصور کیا جائے کہ جب عقد نکاح منظور ہو تو بذل مال اور جمع رجال کے بعد قائم کیا جائے اور جب یہ مستحکم ومقدس رشتہ ٹوٹے تو فوراً نہیں بلکہ کافی مدت کے بعد اور قیود وشروط کی رعایت کے ساتھ ٹوٹے (اس لیے

تو بیوی کو طلاق کے بعد کافی مدت تک دوسرے شوہر کرنے کی اجازت نہیں اور اس پر گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ملتی)۔

عدت میں دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حمل موجود ہو تو وضع حمل تک انتظار کیا جائے تا کہ نسب میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔

ضرورت قضائے قاضی

(اگر مصالحت کی سب کوششیں نا کام ہو جائیں اور میاں بیوی کے درمیان) جدائی کے سوا کوئی دوسری صورت کارگر نہیں ہو سکتی مگر شوہر لالچ اور طمع کی وجہ سے آسانی کے ساتھ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ اس کو تنگ کرنے کے لیے اپنے عقد نکاح میں رکھنا چاہتا ہے تو اس صورت میں قاضی یا حاکم وقت شوہر کا مقام لے کر ان دونوں کے درمیان جدائی کے احکام صادر کرے۔

حقوق وواجبات وہدایات وآداب برائے آقا وغلام

آقا اور غلام کے تعلقات کے لیے بہترین نظام عمل یہ ہے کہ غلام ایسا چن لیا جائے جو بالطبع عبد اور خدمت گزار ہو۔ نہ یہ کہ صرف ایک جبر کی بنا پر اسے غلام بنایا گیا ہو کیونکہ آزاد منش اور حریت پسند انسان کو پابند ضوابط وسیاست رکھنا عام طور پر دشوار رہتا ہے۔ صرف امیر الامرا یا شہنشاہ (جس کے پاس ہر قسم کی عسکری قوت اور وسائل ضبط موجود ہوں) ہی آزاد لوگوں سے معاونین کی حیثیت سے مناسب حال اور موافق طبیعت خدمت لے سکتا ہے۔ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کو حساب کتاب کے لیے منشی اور محاسب کی حیثیت سے اور جسمانی طور پر تندرست اور مضبوط لوگوں کو بوجھ اٹھانے پر مامور کیا جا سکتا ہے اور اسی پر دوسرے کاموں اور صلاحیتوں کو قیاس کیجئے۔

جو لوگ بالطبع خدمت گزاری کے پیشہ سے رغبت رکھتے ہیں اگر انھیں اپنے لیے آقاؤں میں سے کسی ایک آقا کا انتخاب کرنا پڑے تو چاہیے کہ وہ ایسے شخص کی خدمت اختیار کرے جو سخی اور فیاض ہو۔ بخیلی اور کنجوسی اس کی طبیعت میں نہ ہو۔ اور کھانے پینے کے سلسلے

میں دریا دل واقع ہوا ہو، صاحب عقل و دانش، بامروّت اور عالی ہمت ہو کیونکہ خسیس آدمی کا نوکر بھی خسیس وحقیر رہتا ہے۔

ان دونوں کے درمیان تعلقات کی اساس احسان، ہمدردی اور شراکت پر ہونا چاہیے اس لیے آقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خادموں کو اپنے ساتھ (دسترخوان پر لگے ہوئے) لذیذ کھانوں میں اور (شادی بیاہ اور عید وغیرہ کے موقعوں پر) خوبصورت وقیمتی کپڑوں میں شریک کرلیا کرے گو یہ شرکت ہر وقت اور ہمیشہ نہ ہو مگر خاص اوقات، ایام ومواقع پر تو ضرور ہو۔ اور ان سے گفتگو خندہ پیشانی سے کرے اور اسی طرح زندگی کے باقی معاملات میں اسے بھائی سمجھ کر سلوک کرے۔

اس کے مقابلہ میں غلام اور نوکر کو چاہیے کہ وہ ظاہر و باطن میں اپنے آقا کا مطیع فرمان رہے۔ اور اس کی موجودگی ہو یا غیر حاضری ہر حالت میں وفادار وخیر خواہ رہے۔ اس کے مال میں خیانت نہ کرے، اور ہر حالت میں اپنے آقا کو خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ آقا کے خیر خواہ اور دوست ہیں ان کو دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو دشمن سمجھ کر زندگی بسر کرے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے معاملات میں بھی آقا کی خیر خواہی کا خیال رکھا کرے پھر اگر آقا اپنے غلام میں رشد و ذکاوت کی حس ترقی پذیر یا برسرِ عمل دیکھے تو سمجھ لے کہ یہ شخص بالطبع آزاد منش ہو گیا ہے تو اس کو مال کے بدلے یا بغیر مال کے جس طریقے میں اس کا اور غلام کا فائدہ ہو، آزاد کردے۔ کیونکہ انسانی شرافت کا یہی تقاضا ہے، نیز اس باب (عتق) کو بند رکھنے سے مصالح منزل میں خلل پڑنے اور فساد و بگاڑ عام ہونے کا ڈر ہے۔

اولاد کے حقوق وواجبات

نظام منزلی کے لیے یہ بھی لائق ہے کہ (والدین) اپنے بچوں کے لیے اچھے نام انتخاب کریں اور جانور ذبح کر کے عقیقہ کی سنت بجالائیں جس میں یہ نکتے ہیں:

۱۔ (نومولود) بچے کی صحیح نسبی کا اعلان اور خوشگوار طریقہ سے اس کا اقرار ہے۔

۲۔ زچہ بچہ کی خیریت پر خوشی ومسرت کے اظہار اور شکر نعمت کے اعتراف کا ذریعہ ہے۔

۳۔ (نومولود) بچے اور اس کی ماں سے پیار کا ظاہری ثبوت ہے۔

۴۔ بچے کا فدیہ ہے۔

بچوں کی مناسب نشو و نما کے لیے تربیت اور پرورش کی مناسب تدبیر والدین کا فرض ہے۔ان کی جسمانی صحت کو درست رکھنے کے لیے مناسب کھیل اور تفریح کا انتظام ہونا چاہیے اور ان کو ایسے مواقع سے بچانا ضروری ہے جہاں مار پیٹ یا اعضا کے ٹوٹنے اور ان کے ضائع ہونے کا غالب گمان یا وہمی احتمال بھی موجود ہو۔

پھر جب وہ سنِ تمیز کو پہنچ جائیں اور تعبیر پر قادر ہو جائیں تو سب سے پہلے ان کو فصیح و بلیغ زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ ان کی زبان لکنت اور رکاوٹوں سے صاف ہو جائے۔ انھیں پاکیزہ اخلاق کا خوگر بنایا جائے۔ اور ایسے آداب کی تعلیم دی جائے جو شرفا اور سرداروں کے لیے مناسب ہیں۔ ذلت و مہانت اور تکبر و تعلّی دونوں کی افراطی و تفریطی طرفوں سے بچائے رکھیں۔ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بزرگوں کے سامنے گفتگو کے آداب و اخلاق سے ان کو آگاہ کریں۔

نصاب تعلیم میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بچوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی جائے جو ان کے لیے معاش و معاد اور دین و دنیا دونوں میں فائدہ پہنچائیں (صرف ذہنی عیاشی یا علم برائے علم کے نظریہ کے تحت نہیں کیونکہ علوم و فنون زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ذرائع ہیں ان کے ذریعہ زندگی کی گراں قدر دولت کو فضول باتوں میں صرف کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے)۔

جب بچے حدّ بلوغ تک پہنچ جائیں تو ان کے دو حق والدین کے ذمہ واجب ہو جاتے ہیں ایک یہ کہ انھیں حلال طریقے سے روزی کمانے کے مناسب پیشے یا ہنر سکھائیں (جو انھیں دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے یا بھوک و افلاس سے دوچار ہونے سے بچائیں)۔ اور دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی شادی کرائیں۔

اولاد پر فرض ہے کہ وہ والدین کی خدمت کریں اور ان کی تعظیم بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ انھیں کی صوابدید پر عمل کریں اور کبھی ان کے سامنے اُف تک نہ

کریں۔حتی المقدور والدین کی نافرمانی سے بچنا چاہیے (کیونکہ ان کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے)۔

سربراہ خاندان کے فرائض وحقوق

ہر نظام میں ایک ایسے سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو چلانے اور نافذ کرنے والا ہو نظام منزل کو (خوش اسلوبی سے) چلانے والا رب المنزل یعنی گھر کا مالک اور سربراہ ہی ہوتا ہے۔ سیاست منزلی میں سربراہ خاندان کو وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جو ماہر وہوشیار چابک سوار، اپنے گھوڑے کو سدھانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔سب سے پہلا فرض سائیس کا یہ ہوتا ہے کہ اسے رفتار کی مختلف اقسام اور دوڑ کی مختلف انواع مثلاً سست رفتاری، تیز رفتاری، دلکی اور پویہ اور سرپٹ دوڑ وغیرہ سے اچھی طرح واقفیت ہو اور اسے گھوڑے کی ناپسند اوصاف وعادات کا اچھی طرح علم ہو مثلاً چلتے چلتے اٹک جانا، پانی اور کیچڑ میں گھسنے کی بے ہمتی اور ہاتھی یا اس کے مشابہ دیگر حیوانات سے گھبرانا یا اس قسم کی دوسرے عیوب (اور وہ ان عیوب کو علاج کرنے کا ماہر ہو)۔

گھر کے سربراہ کو زجر وتوبیخ یا کوڑے اور چھڑی کے مفید اور شائستہ استعمال سے پوری واقفیت حاصل ہونی چاہیے۔اور جب کبھی اس کے سامنے ایسی (ناشائستہ حرکات اور افعال کیے جائیں جو اس کی نظر میں پسندیدہ نہ ہوں یا وہ دیکھے کہ مقاصد منزلیہ اور نظام منزل کے مطلوبہ کاموں میں، جس کو وہ پورا دیکھنا چاہتا ہے کمی کی گئی ہے تو وہ ان طرق تادیب وسزا کے استعمال پر آمادہ ہو جائے اور سزا ایسے طریقے پر دے کہ سزا پانے والے کو اس کا احساس ہو کہ یہ اس کی ناشائستہ حرکت کی پاداش ہے، سزا دینے میں اس طرح کا ابہام نہ ہو کہ بچے کا ذہن مشوش ہو اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس پر یہ غصہ کیوں نکالا جا رہا ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ خاندان کا سربراہ بچے سے جو کام کرانا چاہتا ہے اس کے بارے میں بچے کے ذہن میں واضح لائحہ عمل موجود ہو۔

بچوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم ہو کہ اگر والد (یا سربراہ) کے حسب مرضی کام نہ کیا گیا تو نتیجہ کے طور پر ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی صورت میں سزا ضرور ملے گی۔ جب ناپسندیدہ عمل سے احتراز اور مطلوب وپسندیدہ عمل کو کرنے کی اصلاحی صورت حاصل ہو

جائے (اور اس کا طرز عمل درست ہو جائے) تب بھی اس کی نگرانی سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلسل اس کو ایسے اعمال کی مشق کرائی جاتی رہے تا آں کہ خُلق مطلوب اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے اور یہ کیفیت ہو کہ اگر اس کے دل میں سزا کا خوف نہ بھی ہو، تو بھی وہ اس خُلق مذموم یا عادت قبیحہ کا ارتکاب نہ کرے جس سے اس کو منع کیا گیا ہے اور کسی مامور بہ امر کے ترک کرنے کی جرأت نہ کرے۔ الغرض صاحبِ خانہ کو اپنی بیوی اور اپنی اولاد اور نوکروں کے ساتھ اسی قسم کا حکیمانہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے کہ گھر کا انتظام صحیح اور درست طریقے پر چلے۔ (مردوں کی طرح) عورتوں میں بھی بعض عورتیں اطاعت پسند اور کنیز طبع ہوتی ہیں اور بعض کنیزائیں بالطبع حریت پسند اور آزاد منش ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کے ساتھ اس کی مخصوص طبیعت کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ اور خلاف طبیعت جبر و اکراہ سے احتراز کرنا چاہیے۔ (ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی ایک ایسی عورت کو بھی جو بالطبع کنیز ہو اس لیے کنیز یا نوکر نہ رکھا جائے کہ اس کا اس طرح رکھنا باعث عار ہو)۔

انسان مدنی الطبع اور فطرتاً اجتماع پسند ہے

انسان کا مدنی الطبع ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایتِ ازلیہ کا کرشمہ ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اور ابنائے نوع کے تعاون سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی زندگی کی تدبیر، تعمیر اور تحسین نہیں کر سکتا۔ (وہ تا دم مرگ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ اور جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی ضروریات کا انحصار بھی دوسروں پر یعنی اساتذہ اور بزرگوں پر ہوتا ہے) معاشرتی زندگی ایسے آداب کے بغیر بسر ہو نہیں سکتی۔ جو افراد کے آپس میں باہمی محبت، تعاون و تناصر کا رشتہ پیدا بھی کریں اور پھر اس رشتہ کو برقرار اور اُستوار بھی رکھیں۔

اگر ان پر برے عوامل اثر انداز ہو کر ان میں فساد پیدا کریں تو ان عوامل کا استیصال کرنا چاہیے۔ اور ایک بار پھر نفرت و دشمنی کے بجائے باہمی الفت و محبت کی طرف لوٹنے کی تدبیر کرنا چاہیے اس لیے کہ باہم میل جول کے مفید نتائج تب ہی ہاتھ آتے ہیں جب آپس

میں محبت اور الفت کا رشتہ قائم ہو۔

معاشرتی زندگی میں انسان کا جن لوگوں سے زیادہ قریبی تعلق رہتا ہے وہ اس کے ذوی الارحام (قریبی رشتہ دار) پڑوسی اور دیگر دوست آشنا اور متعلقین ہوتے ہیں مثلاً ہم درس، ہم پیشہ اور ایک ہی حلقہ خدمت وارادت کے ہم نشین وغیرہ وغیرہ۔ان کو چاہیے کہ آپس میں ملاقات کا سلسلہ جاری رکھیں، مناسب موقعوں پر ایک دوسروں کو ہدیہ اور پیشکش دیا کریں۔اور ایک دوسرے سے دوری کے وقت خط وکتابت کے ذریعہ حال واحوال معلوم کیا کریں۔اور امور معاش میں ایک دوسرے کی حتی المقدور اعانت وامداد کریں۔مصیبت کے وقت ہمدردی سے دریغ نہ کریں۔گفتگو میں خوش طبعی اور شیریں زبانی کو ملحوظ رکھیں اور تکالیف وشدائد میں ایک دوسری کی غمگساری کریں۔انہی باتوں سے الفت باہمی بڑھتی اور محبت زیادہ ہوتی ہے اور انہی پر عمران وتمدن کی بقا کا دارومدار ہے۔

آداب صحبت میں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو عندالملاقات سلام کیا جائے۔اسی طرح ایک دوسرے کے کمروں یا گھروں میں داخل ہوتے وقت اجازت حاصل کرنا چاہیے۔غیر محرم اور اجنبی عورتوں سے اپنی نظروں کو نیچا رکھنا چاہیے اور ان مخفی اور باریک نکتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو (غیر مرئی طور پر) چیونٹی کی چال چل کر آہستہ آہستہ دلوں میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔مثلاً گفتگو میں پیش دستی کرنے، آگے چلنے کی کوشش کرنے اور بات بات پر تنقید ونکتہ چینی کرنے اور خودنمائی کے لیے دوسروں کی تحقیر کرنے سے ساتھیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔

معاشرتی زندگی میں انسانوں کے حقوق کے مختلف درجے ہیں۔سب سے مقدم والدین کا حق ہے۔اس کے بعد بھائیوں اور قرابت داروں اور زوجین اور پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔اس کے بعد نوکروں چاکروں کے حقوق ہیں اور پھر عام مسلمانوں (اور انسانوں) کے حقوق ہیں۔

آٹھویں فصل

الحکمۃ الاکتسابیۃ (فن معاملات)

حکمت اکتسابیہ کا مفہوم

حکمت اکتسابیہ (فن معاملات) کا مفہوم یہ ہے کہ تحصیل معاش میں رفاہیت اور خوشحالی سے زندگی بسر کرنے کے ساتھ لطافت وزیبائش اور خوش اسلوبی کو ملحوظ رکھا جائے چنانچہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ معاش کی جملہ ضروریات بوجہ احسن پوری ہوسکیں اور آدمی خوش وخرم اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرسکے۔ اگر حکمتِ اکتسابیہ کے اصول مہیا نہ ہوں تو محنت اور تکلیف سے دن رات کاٹتے ہوں گے اور اتنی زیادہ ضرورتیں پیش آئیں گی کہ ان میں سے کوئی بھی خوش اسلوبی کے ساتھ پوری نہیں ہوگی۔

پیشوں کے اختلاف کے اسباب اور تمدن کی بنیاد

یہ حقیقت معلوم ہونی چاہیے کہ لوگوں کا مختلف پیشوں میں تقسیم ہونے کا سبب وحید ان پر ضروریات زندگی کا ہجوم ہے کیوں کہ ارتفاق ثانی یا تہذیب وتمدن کے درجہ ثانیہ میں رہنے والے کسی گھر کے افراد اپنے دوسرے ابنائے نوع کی اعانت وامداد کے بغیر زندگی کی سب ضروریات پوری نہیں کرسکتے مثلاً جب انھیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے زراعت اور کھیتی باڑی کے مختلف طریقے ایجاد کیے اور اچھی اور بہتر زراعت اور کھیتی باڑی کے لیے چوپائے مہیا کرنے اور ان سے کام لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں جو ابتدا ان کو میسر ہی نہ تھا۔ اسی طرح اگر زراعت اور مویشیوں سے کام لینے میں بہترین طریقہ استعمال کرنا ہوتو اس ضمن میں آلات کشاورزی کی ضرورت پڑتی ہے جو نجاری (بڑھئی

کے پیشہ) اور آہنگری کے بغیر مہیا نہیں ہوتے۔

ان سب پیشوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے عمل پیہم اور ضروری علوم وفنون کے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانی دماغ ان سب کو ایک ہی وقت میں جمع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کھانا روٹی اور سالن کا محتاج ہے اگر کسی گھر کا ایک فرد یا افراد تنہا روٹی اور سالن دونوں وافر اور اچھی مقدار میں حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو یہ دشوار ہے جب تک وہ اپنی عمر کو اسی غرض کے لیے وقف کریں۔

علاوہ ازیں لباس بھی انسان کی ایک ضرورت ہے جس کے حصول کے لیے روئی وغیرہ کی کاشت پھر روئی کو صاف کر کے کاتنا اور بننا مقدم شرطیں ہیں۔ اور یہ کام کوئی ایک فرد خوش اسلوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔

اسی طرح انھیں پانی پینے کی اشد ضرورت ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے کنویں اور نہریں کھودنا پڑتی ہیں، بعض اوقات اس کو مشک یا کسی اور برتن میں بھر کر دور سے لانا ہوتا ہے (لیکن تم جانتے ہو کہ مشک تیار کرنے اور برتن بنانے کے لیے موچی اور کمہار کی حاجت پڑتی ہے جو ہر ایک آدمی کا کام نہیں) اسی طرح انھیں مکان کی ضرورت ہوتی ہے ،(لیکن وہ مکان کی عمارت اور تعمیر کے لیے معمار کارکنوں اور مزدوروں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں) مختصراً یہ کہ ایک فرد یا ایک گھر کے افراد کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ تو ممکن ہوسکتا ہے کہ ارتفاق اول (غیر متمدن زندگی) کی ضروریات نہایت سادہ صورت میں پوری کر سکیں مگر ارتفاق ثانی (متمدن زندگی) کے قابل حسین وخوبصورت انداز ہ سے ان ضروریات کو پورا کرنا یقیناً ایک گھر کے افراد کے بس کی بات نہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے حسب ضرورت ان کاموں کو مختلف پیشوں میں تقسیم کر لیا اور ہر شخص نے مستقل طور پر جداگانہ پیشہ اختیار کر لیا اور اس میں ذاتی لگن اور تکرار عمل کے ذریعہ کافی مہارت پیدا کر لی اور بحیثیت ماہر کے اس سب نکتوں اور باریکیوں سے واقفیت حاصل کر لی۔ اور اسی ایک پیشہ کو اپنی جملہ ضروریات حیات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اسی طرح ہر شخص نے تمدن کے دوسرے درجہ کے مطابق خوشحال زندگی بسر کرنا شروع کیا، اور اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم ہونے لگی۔

مختلف پیشوں کا ظہور میں آنا

اور جب انسانی ضروریات کی کثرت ہوئی اور اکثر و بیشتر موقعوں پر لین دین کرنے والے دو شخص ایک دوسرے کی ضرورت پوری نہ کر سکے (مثلاً ایک کو ایک چیز مرغوب اور دوسری غیر مرغوب ہو مگر اسے اس وقت کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس سے لین دین کر سکے) چنانچہ اپنی اپنی ضروریات مہیا کرنے اور اپنی اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے کسی جوہرِ معدنی کو ذریعہ تعامل ٹھہرانے پر مجبور ہو گئے۔ ضروری تھا کہ وہ جوہر معدنی ایسی چیز ہو جو بذاتِ خود انسان کے کام نہ آئے صرف معاوضہ کے طور پر مستعمل ہو۔ اس میں عرصۂ دراز تک باقی رہنے کی صلاحیت ہو (اس کا حجم چھوٹا اور ان کے اقسام میں باہمی یکسانیت و مماثلت بھی پائی جاتی ہو۔ جسم انسانی کے لیے بھی زیادہ نفع بخش ہو اور سبب آرائش و زینت ہو) ان صفات کو ملحوظ رکھ کر لوگوں نے حجرین (دو پتھروں یعنی سونے اور چاندی) کو نقدین قرار دے کر ان کو تعامل اور معاملات باہمی کا ذریعہ قرار دیا۔

چونکہ ارتفاق ثالث میں امامت (وخلافت) اور حکومت قائم ہوتی ہے اس لیے اہل صنعت و حرفت کے علاوہ ایسے مختلف اشخاص کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، جو حکومت کو درست طریقہ پر چلانے میں مدد دیں اس سے کئی ایک نئے پیشے نکل آئے مثلاً سپہ گری، کلرکی، چوکیداری وغیرہ وغیرہ۔

اصول کسب اور اہم ذرائع معاش

انسان کے اصول کسب اور اہم ذرائع معاش یہ ہیں:

وہ مکاسب جن کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے مثلاً جہاد اور فتویٰ وغیرہ اور وہ جن کا تعلق اکل و شرب، لباس و پوشاک، مکان و مسکن وغیرہ سے ہوتا ہے اور وہ جن کی مناسبت پیشہ تجارت سے ہے چنانچہ تاجر لوگ مختلف قسم کی اشیائے خورد و نوش، مصنوعات اور ضروریات زندگی ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتے اور لے آتے ہیں اور اس پر نفع کماتے ہیں۔ اور بعض وہ پیشے ہیں جن کا مقصد زیادہ تر قدرتی وسائل سے براہ راست

اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

برّ و بحر اور جبل و سہل سے ضروریات کی فراہمی کے مکاسب (مثلاً شکار کھیلنا، لکڑی جمع کرنا، شہد اکٹھا کرنا، چوپایوں کی جوپانی، دریا و سمندر میں ماہی گیری اور کشتی رانی وغیرہ پہاڑوں میں کان کنی اور جواہر سازی، زراعت اور باغبانی یا معماری، نجاری، پارچہ بافی وغیرہ) شامل ہیں۔

اختلاف مکاسب کے وجوہ و عوامل

مختلف لوگوں کا مختلف پیشوں کو اختیار کرنا دو عوامل کی بنیاد پر ہے:

(ا) طبعی قوی اور فطری استعداد کی مناسبت: چنانچہ شجاع و بہادر اور مجاہد و جنگجو آدمی، امام و حاکم کا (بہترین فوجی) معاون (اور غزوہ و جہاد کے لیے موزوں) ہوا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ طاقتور ہے لیکن جوہر شجاعت اور جذبہ جہاد سے محروم ہے، تو اس کے لیے بار برداری اور جسمانی محنت و مشقت کے کام زیادہ موزوں ہیں۔ اسی طرح جو شخص تجارت و بیوپاری کے باریک نکتوں سے واقف ہے وہ اچھا تاجر بن سکتا ہے وہ شخص جو شکار کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور شکار کے ذریعے اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے اس کے لیے ماہی گیری وغیرہ جیسے پیشے کرنا سہل و مفید ہوتا۔

(ب) اتفاقات ماحول کی مناسبت: یعنی ماحول کچھ اس قسم کا مہیا ہوتا ہے کہ اس کو کوئی خاص پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور آلات و اوزار یا استاد و سرپرست اس قسم کے ملے ہیں جو اس کو کسی خاص پیشہ کے اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں، (مثلاً جو لوگ ساحل سمندر پر رہتے ہیں ان کے لیے ماہی گیری اور دریائی شکار کرنا دوسرے کاموں کی نسبت زیادہ سہل ہوتا ہے)۔ اور یا وہ لوگ جن کے باپ دادا کا پیشہ مثلاً آہنگری ہے ان کے لیے اس پیشہ سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، علی ہذا القیاس ماحول کے زیر اثر پیدا شدہ دوسرے پیشے۔

پیشہ اختیار کرنے کے متعلق ہدایات

زندگی بسر کرنے کے لیے پیشے خواہ اچھے ہوں یا برے مجبوراً اختیار کرنے پڑتے ہیں

اور بقول عرب لکل ساقطۃ لا قطۃ (ہر ذلیل و پست کو اٹھانے والی بھی ہوتی ہے) مگر ایک شریف و بامروت آدمی کے لیے مناسب نہیں کہ تحصیل معاش کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کرے جس میں اس کی تذلیل وتحقیر ہو۔

انسان کی دانش مندی یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو دیکھے اور پھر ایسا پیشہ اختیار کرے جو اس کی سب ضروریات کو پورا کر سکے۔ (اور کچھ مستقبل کے لیے پس انداز بھی کر سکے) ہم نے بعض بھوکے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ حصول معاش کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کرتے ہیں جن سے ان کی ضروریاتِ جوع پوری نہیں ہوسکتیں اور گداگری پر اتر آکر (دوسروں کے سامنے دست نگر ہوکر) ذلت ومشقت سے دوچار ہوتے ہیں۔

بعض مغلوب الغضب لوگ ایسے پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں بعض ناگوار باتیں سننی سہنی پڑتی ہیں لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہوکر لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

بعض شہوت پسند اور قوت باہ سے معمور لوگ صرف اتنا کمانے پر اکتفا کرتے ہیں جو ان کی ذات کے لیے کافی ہو سکے۔ وہ (صنفی خواہش کی تسکین کے لیے صحیح طریقے سے نکاح کرنے سے گریز کرکے (حرام کاری کا ارتکاب کرتے اور بے شرمی پر اتر آتے ہیں۔ اگر وہ اپنی ضرورت کے مطابق کمانے کی کوشش کرتے اور اس میں کامیاب ہوتے تو انھیں ذلت اٹھانی نہ پڑتی۔

لوگوں کی حالت بگڑنے کی بڑی وجہ سوچے سمجھے بغیر باپ دادا کی تقلید کرنا اور لکیر کے فقیر بنا رہنا ہے جن کی وجہ سے وہ (اپنے لیے سوچ سمجھ کر کوئی موزوں پیشہ اختیار نہیں کرتے بلکہ) اپنے رشتہ داروں کے اختیار کردہ پیشوں میں گتھم گتھا رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ پیشے ان کے لیے کبھی موزوں نہیں ہوتے (یہ اور بات ہے کہ کبھی انسان کے لیے بعض پیشے حقارت آمیز ہوتے ہیں تو وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کر لیتا ہے جس کے ذریعہ عار سے چھٹکارا حاصل ہو) عقلمند آدمی سے یہ اصول مخفی نہیں کہ کمائی کے محدود ہونے سے رزق کی تنگی پیدا ہوتی ہے اور فراخیٔ رزق سے کمائی میں وسعت آسکتی ہے۔ اگر خاص کسب میں آدمی کو کامیابی حاصل نہ ہو تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے پیشے پر ہاتھ ڈالنا چاہیے اور ہر مردے

و ہر کارے کے اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔

کمانے والے کے لیے دو مقامات ایسے ہیں جن میں ذوق لطافت اور رائے عمیق سے کام لینا چاہیے:

(۱) اس کو چاہیے کہ ایسے صنعت و حرفت یا پیشہ و ہنر کو اختیار کرے جو (اس کی طبعی قوی اور ارتفاقات ماحول سے ہم آہنگ ہو کر) اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ضامن و کفیل ہو۔

(۲) اپنی کمائی اچھی طرح سوچ سمجھ کر میانہ روی کے ساتھ خرچ کرے (تاکہ ضروریات سے زائد و فاضل کمائی تحسینات اور تعمیر زندگی میں خرچ کی جا سکے)۔

جب کوئی شخص کسی میدانِ معاش میں داخل ہو جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس کے اصول و ارکان اور آلات میں خوب غور و فکر سے کام لے۔ جب وہ ان سے پوری طرح واقف ہو کر ان میں مہارت حاصل کرے، تب اس کی باریکیوں اور مزید متعلقہ حاشیوں کی طرف متوجہ ہو، اسی طریقِ کار میں کامیابی و کامرانی کا راز مضمر ہے۔

نویں فصل

مبادلات وتبرعات

جب ہر شخص نے جداگانہ پیشہ اختیار کرلیا اور سب پیشے یکے بعد دیگرے انفرادی طور پر اختیار کر لیے گئے اور ظاہر ہے کہ کوئی پیشہ بذاتِ خود تمام ضروریات کا کفیل نہیں ہوتا تھا (کیونکہ ایک کے پاس ایک چیز اپنی ضروریات سے فاضل رہتی ہے اور دوسرا اس کا محتاج ہوتا ہے۔ دوسرے کے پاس کی زائد از ضرورت چیز کی، تیسرے کو ضرورت ہوتی ہے) لامحالہ ارتفاق کی تکمیل کے لیے اشیا باہمی کے تبادلے کی ضرورت پیش آئی۔ اور (زائد از ضرورت اشیا میں) تبرعات کا سلسلہ بھی جاری ہوتا کہ (خالق کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ) بندوں (قرابت داروں اور دوستوں کے حقوق ادا کر کے ان) کو خوش کیا جا سکے (اور رشتہ محبت کو استوار کیا جا سکے) کیونکہ (سعادت دارین اور ترقی تہذیب وتمدن کے لیے) باہمی محبت ایک معاشرتی ضرورت اور ارتفاق کا ذریعہ ہے۔ یہی وہ حال ہے جس کے ذریعہ بنیادی ضروریات اور تحسینات زندگی کا حصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات فیاضی، وفا شعاری یا شفقت کے طبعی تقاضے انسان کو اموال ومنافع کی بخشش وعطا پر ابھارتے ہیں۔

تبادلہ اشیا کے اہم جائز ذریعے

ان سب امور ضروریہ کے پیش نظر لوگوں کو مختلف معاملات اور لین دین کے طریقے الہامی طور پر سکھائے گئے۔ ان میں (تبادلۂ اشیا کا اہم ترین ذریعہ):

بیع: اور خرید وفروخت ہے جس میں مال کے بدلے مال لیا دیا جاتا ہے۔

اجارہ: ہے جس میں کسی چیز کا نفع مال کے بدلے دیا جاتا ہے۔

ہبہ: یعنی بخشش ہے۔ اس میں بغیر عوض کے کوئی چیز دی جاتی ہے (بیع کا مدّ مقابل ہے) اس معاملہ کو دنیوی یا اُخروی ضروریات خفیفہ کی خاطر عمل میں لایا جاتا ہے۔

اعارہ: یعنی کوئی چیز عاریت دینا ہے اس میں بغیر عوض کے کسی چیز سے نفع اٹھانے کی اجازت دی جاتی ہے (اجارہ کا مدّ مقابل ہے) یہ بھی مذکورہ خفیف ضروریات دنیویہ واُخرویہ کے لیے کیا جاتا ہے۔

دَین: یعنی قرض دینا، اس مبادلہ میں بیع و اعارہ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جب اس کے بدلے میں کوئی جنس لینا مقصود ہو جیسے سَلَم تو اس میں بیع کی کیفیت زیادہ مرجح ہوتی ہے اس کے برعکس نقدین (دراہم ودینار) کے قرض حسنہ میں اعارہ اور رعایت کا پہلو راجح ہوتا ہے۔ (اور اس صورت میں آدمی کے پیش نظر کوئی نہ کوئی ثواب عاجل وآجل ہوتا ہے۔

تبادلہ اشیا کے لیے ضروری امور

چونکہ ہر ایک مبادلہ کی بنا کسی حاجت معین کے پورا کرنے یا نقدین (دنانیر ودراہم) کے حاصل کرنے پر ہے جن کے ضمن میں سب ضروریاتِ زندگی مجملاً آجاتے ہیں اور چونکہ یہ حاجات تب پوری ہوں گی کہ شے کی تعیین بھی ہو اور معاملہ کے درست ہونے میں فریقین کا غور وفکر بھی شامل ہو اور اس شے سے ضرورت بھی پوری ہوسکتی ہو۔ اس لیے شریعت (یا باہمی اصطلاح) نے یہ بات لازم قرار دی ہے کہ بیع، (شیَ برائے فروخت) قیمت، اُجرت، عمل اور نفع شیَ کسی صورت میں غیر معین اور نامعلوم نہ ہو۔ اسی طرح عقود میں دھوکے (اور غرر یا اٹکل اور قسمت) سے بھی احتراز کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا غالب گمان رہتا ہے کہ (کسی فریق کی) ضرورت پوری نہ ہو (اور یا کسی کو گھاٹے اور نقصان کا خطرہ ہو۔ اور (شریعت محمدی کی رو سے) یہ واجب ہے کہ عقود میں ایجاب وقبول یا لین دین (برضا ورغبت) ہو۔ تاکہ دونوں جانب سے مبادلے پر رضا مندی کا اظہار ہوسکے اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جب تک مجلس قائم ہے عقد بیع (وغیرہ) میں غور وفکر کی اجازت ہے اور عیب کی صورت میں عقد کو فسخ کرکے چیز واپس کی جاسکتی ہے

اور کبھی شرط خیار اور شرط تعیین کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ اجارہ میں مدت کی تعیین اور سَلَم میں جنس اور معیار وغیرہ کی پوری توصیف اور علم ضروری ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ عقد بیع کرنے والے دونوں عقل مند ہوں اور اچھے برے میں تمیز کر سکتے ہوں[1]

لالچ اور حرص بھی انسان کی سرشت میں داخل ہے اس لیے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ٹال مٹول اور لیت ولعل سے کام لیا جاتا ہے اور ادائیگی حق سے انکار ہوتا ہے اس لیے الہامی طور پر یہ لازمی قرار دیا گیا کہ لین دَین کے عقود میں دستاویز لکھ دینا اور گواہوں کے سامنے عقد طے ہونا چاہیے یا رہن کے ذریعہ قرض کی واپسی کا اعتماد حاصل کیا جائے۔

حرام ذرائع ومبادلات

قمار: اور جُوا ایک حرام اور باطل معاملہ ہے کیونکہ جوا وہ مال ہے جو صرف عقد کے ذریعہ کسی عوض کے بغیر حاصل کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں ہمدردی کے جذبے کے تحت دل کی مرضی

---

[1] نوٹ: شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی ضروری تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''معلوم ہونا چاہیے کہ تبادلۂ اشیا کے لیے چند امور واجب وضروری ہیں (۱) عاقدین یعنی لین دین کرنے والوں کا ہونا ضروری ہے (۲) عوضین یعنی آمنے سامنے دو معاوضوں کا موجود ہونا ضروری ہے (۳) نیز عاقدین کے باہمی تبادلہ کی رضامندی کی ظاہری دلیل اور واضح علامت بھی ضروری ہے (۴) عقد لین دین کو عاقدین پر لازم کرنے والی چیز بھی جو منازعت ومخاصمت کا دروازہ بند کردے۔

عاقدین کے لیے ذیل کی چیزیں بھی شرط ہیں:

(الف) ہر دو عاقدین آزاد ہوں، عاقل وبالغ ہوں، نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں۔

(ب) عقد مبادلہ پورے فہم وبصیرت اور ثبات واستقامت کے ساتھ کر سکتے ہوں۔

تبادلہ عوضین کے لیے ذیل کی باتیں شرط ہیں:

(۱) ہر دو عوض مال کی قسم سے ہوں جس سے انتفاع حاصل کیا جا سکتا ہو (۲) تبادلہ کے لیے ہر دو عوض قابل رغبت ہوں اور لوگ اس قسم کے مال کی خواہش وآرزو رکھتے ہوں (۳) وہ اس قسم کا مال نہ ہو جو عام لوگوں کے لیے مباح ہوا کرتا ہے۔ (۴) وہ اس قسم کا مال نہ ہو کہ جس کے اندر قابل اعتماد نفع اور فائدہ نہ پایا جائے۔ مذکورہ بالا باتیں جس عقد میں نہ پائی جائیں گی وہ غیر مشروع اور عبث نہ ہوگا۔

شامل نہیں ہوتی ۔صرف حرص اور غلط آرزو کے اندھے جذبے کے تحت دوسرے کو دھوکہ وفریب دے کر مال چھین لیا جاتا ہے۔

ربوا: اور سود بھی حرام ہے کیونکہ قرض دینے والا قرض مانگنے والے بھائی کے احتیاج و مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی محنت و تکلیف کے مال بٹورتا ہے اور مقروض ناچاری کی بنا پر فاحش اور ناقابل برداشت شرح سود کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جس کی ادائیگی اس پر بارِ گراں کی طرح ناقابلِ برداشت اور دشوار ہو جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لیکن دین کے عقود میں مباح اور جائز صورتیں صرف وہ ہیں جن میں مال کے بدلہ مال (بیع) یا نفع کے بدلہ میں مال یا باہمی رضامندی اور طیب خاطر سے خرچ وصرف (ہبہ، اعارہ) ہو، ان صورتوں کے علاوہ کسب مال کے سب طریقے ناجائز اور باطل ہیں۔

ان ناجائز صورتوں میں سے ایک رشوت کی لین دین ہے۔ رشوت دراصل اس مال کا نام ہے جو دوسرے کے اموال پر قبضہ جمانے کے لیے خرچ کیا جائے۔

ہر عقد صحیح کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رہے کہ معاملہ کی پوری وضاحت کی جائے تاکہ ٹال مٹول جھگڑے اور فساد تک نوبت نہ پہنچے اور معاً جس عقد میں عادتاً اس قسم کے جھگڑے پیدا ہوتے ہوں (وہ شرعاً ممنوع ہے اور) چاہیے کہ ارتقاق ثالث کی تمدنی زندگی میں (قانوناً) اس کے انعقاد کی ممانعت کی جائے۔

دسویں فصل

عقد مزارعت اور عقد مضاربت

چونکہ سب لوگ (جسمانی، عقلی اور روحانی استعدادوں میں) یکساں اور برابر نہیں ہوتے، کوئی غبی وکند ذہن ہے تو کوئی ذکی وتیز ذہن والا۔ کسی کے پاس مال ودولت ہے (مگر کام نہیں جانتا یا نہیں کرنا چاہتا) اور دوسرا تہی دست اور مفلس ہے۔ مگر کام کی قدرت وطاقت رکھتا ہے۔ کوئی معمولی اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتا اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جو کسی بھی خسیس کام سے منہ نہیں موڑتے۔ بعض لوگوں کی ضروریات زندگی بہت زیادہ ہوتی ہیں (اور کام سے فراغت نصیب نہیں ہوتی) اور بعض بالکل فارغ اور بیکار و بے روزگار رہتے ہیں۔ اس لیے معاشی زندگی میں ناہمواری پیدا ہوتی اور اکتساب معاش میں بھی باہمی تعاون اور امداد کی ضرورت پیش آتی ہے اور مخصوص عقود وجود میں آتے ہیں مثلاً مزارعت مضاربت، شراکت اور وکالت کی بنیاد اسی پر پڑی ہے۔

مزارعت یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس زمین ہوتی ہے لیکن یا تو اس کو زراعت کے لیے فرصت نہیں ہوتی یا وہ کھیتی باڑی کے اعمال شاقہ کے انجام دینے کے قابل ہی نہیں ہوتا اور ضروری سامان زراعت مثلاً بیل، ہل وغیرہ یا تخم پاشی وغیرہ تمام وسائل یا بعض وسائل کا مالک نہیں ہوتا، اس لیے وہ دوسرے کو پیداوار میں شریک کر کے زمین اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کو مزارعت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مال ودولت یا نقد سرمایہ کو مضاربت سے وہی نسبت ہے جو زمین کو مزارعت سے ہے، یعنی ایک شخص کے پاس مال ہے مگر وہ تجارت کے لیے فارغ نہیں ہے اور نہ اس میں دُور دراز کی مسافتیں طے کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ مال لے جانے، لے آنے کی طاقت ہے۔ اور اس قسم کے اعمال تجاریہ سے اسے کوئی

قلبی شغف نہیں ہے تو وہ اپنا مال دوسرے کو دے کر اسے نفع میں شریک کر لیتا ہے۔ بعض اوقات کسی کو مذکورہ دونوں صورتیں میسر نہیں ہوتیں۔ تو اسے وکالت (کسی کو اپنا کردار بنانے) اور کفالت (کسی کو کسی کی طرف سے ذمہ داری لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی دو آدمی کسی معاملہ میں اشتراک کرتے ہیں، یا اس لیے کہ وراثتاً ان کو یہ ملکیت حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ اور بلا ارادہ شراکت کی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور کبھی اشتراک عاقدین کے قصد وارادہ کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے۔

گیارہویں فصل

ارتفاق ثالث کی تحقیق اور اس کی اقسام کی تفصیل

تمدن کی ضرورت:

ظاہر ہے کہ جب لوگ آپس میں یہ معاملے برتیں گے اور ہر شخص کسب معاش کے لیے کسی پیشہ اور ہنر کو جداگانہ طور پر اختیار کرے گا، اور وہ ضروریات زندگی کی فراہمی (اور خوشحال اجتماعی زندگی بسر کرنے) کے لیے باہمی امداد و تعاون کریں گے اور اس کے نتیجہ میں مبادلات اور امداد باہمی کے مختلف طریقے ایجاد ہوں گے، تو ضرور مختلف طبقات مثلاً کاشت کاروں، تاجروں، بافندوں اور دیگر اہل صنعت وحرفت کے درمیان تعلقات پیدا ہوں گے۔

ان جماعتوں کے درمیان باہمی ربط اور تعلق کا نام ہی مدنیہ (شہر) ہے۔ مدنیہ یا شہر، فصیل، بازار اور قلعے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ تو تعامل و تعاون پر مبنی روابط کا نام ہے۔ اس لیے اگر قریب قریب آباد ہونے والی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوں اور ان میں کچھ اجتماعی گروہ ایسے ہوں جن کے آپس میں معاملات جاری ہوں تو ہم اس کا نام بھی شہر (مدنیہ) رکھیں گے۔ اس باہمی ربط کی وجہ سے شہر شخص واحد کے مشابہ ہوتا ہے، اور اس کے اندر کا ایک گھرانہ جسم کے ایک عضو کے مانند ہوتا ہے۔

تمدنی وحدت کو درست رکھنے کے لیے امام المسلمین کی ضرورت ہے

(اس اصطلاحی) شہر میں لازمی طور پر ایک وحدت پائی جاتی ہے جس کو مطلوبہ
(درست) حالت میں قائم رکھنا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ اب جس

تدبیر سے یہ مقصد حاصل ہو (خواہ منتخب افراد کی جماعت اس کا اہتمام کرے یا ایک ہی قابل ہستی کو یہ مہم تفویض کی جائے۔ بہرحال اس قوت قاہرہ کو جس کے تصرف میں مدنیت کا نظم ونسق ہے) اوراس کے ذریعہ اس کے قیام وبقا کا انتظام ہو سکے حقیقت میں وہی امام کہلائے گا۔ ہمارے نزدیک امام سے مراد صرف فرد واحد نہیں، ہاں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر کوئی شخص واحد اس امر کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور پوری استعداد و قوت اور حسن تدبیر اور غیر معمولی قابلیت کی بدولت تمدنی زندگی کو احسن طریقہ پر چلائے تو بلاشبہ انتظام میں پوری صلاحیت پیدا ہوگی اور ایسا شخص واضح طور پر امام کہلانے کا مستحق ہوگا۔

امام المسلمین کے فرائض

امام حق کو چاہیے کہ نظام تمدن پر غائر نظر ڈال کر دیکھے کہ اس وحدت کو بقائے حیات اور استحکام ذات کے لیے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور کون کون سے امور ہیں جو اس کے اندر عدم استحکام اور فساد پیدا کرتے ہیں اور وہ نافع تدبیریں کونسی ہیں جو ہر ضرورت کو پورا اور ہر مفسدہ کا مناسب حال انسداد کر سکتی ہیں۔ تمدنِ صالح کے ان لوازم اور تدابیر نافعہ کو ہم ذیل میں کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(پہلی ضرورت) محکمۂ قضا وعدلیہ

تمدنی زندگی میں لوگوں کے درمیان مختلف قسم کے معاملات اور لین دین کے عقود ہوتے رہتے ہیں اور اکثر طبائع میں حرص ولالچ، حسد وتغلب اور ٹال مٹول یا انکار کی طبعی صفات ہوتی ہیں جو عقود و معاملات پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اجتماعی زندگی میں اختلافات اور تنازعات کا ظہور ناگزیر ہو جاتا ہے اور اگر بروقت ان کا تدارک نہ کیا جائے، تو باہمی جنگ وجدال اور قتل وقتال کا سلسلہ گرم ہو جائے گا۔ اور تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جو قوم یا جماعت جس قدر بخل وحسد سے مغلوب ہو اسی قدر اور اسی انداز سے اسے

امام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال ایک ایسا ضابطہ یا قانون (شفوی یا تحریری) ہونا چاہیے جو جمہور اور اکثریت کے لیے قابل قبول ہوتا کہ باہمی جھگڑوں اور مقدمات کو اسی کے مطابق فیصلہ کرا سکیں۔

جب غضب، بخل اور حسد کا ہیجان اور غلبہ ہوتا ہے تو بخیل اور تند و تیز آدمی عدل و انصاف کے قانون پر نہیں چلتا یا اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجتمع ہو کر اس تند و تیز شخص پر قابو پالیں اور اسے ان کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔ یا کسی ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بات مانی جاتی ہو اور اس کے حکم سے کوئی روگردانی نہ کر سکے۔ اس نافع تدبیر کو محکمہ قضا یا عدلیہ کہا جاتا ہے۔

دوسری حاجت، شہر یاریہ (شہری انتظامیہ یا پولیس)

نوعِ انسانی کے عام افراد اخلاقِ فاضلہ اور اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتے، اور حیوانی خواہشات، ردّی اخلاق اور تخریبی اعمال کی شکل اختیار کر کے ان پر غالب ہوتی ہیں۔ اس لیے عموماً ان سے ناشائستہ حرکات سرزد ہوتے ہیں جن کا شہریت و مدنیت کے نظام صالح پر بُرا اثر پڑتا ہے اور اس میں مختلف قسم کی معاشرتی اور اخلاقی فساد اور بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی اصلاح ضروری ہوتی ہے اور وہ زجر و توبیخ کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے عدل و انصاف پر مبنی قانونِ سزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ ہر شخص ہر آدمی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا، اور نہ ہر شخص کے حق میں معمولی زجر و توبیخ مفید و کارگر ثابت ہوتی ہے اس لیے بعض اوقات قوت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے، خواہ اس کی تنفیذ کوئی جماعت کرے جو مفسد کو قابو کرے۔ یا شخصِ واحد جس کا لوگوں پر اس قدر تسلّط اور دبدبہ ہو کہ اس کے حکم سے انحراف کرنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہو اس کا نام ہمارے نزدیک شہر یاریت (یا پولیس اور شہری انتظامیہ) ہے۔

تیسری حاجت، جہاد (قوتِ مسلّحہ)

انسانی معاشرہ میں جہاں بھی لوگوں کی اجتماعی زندگی بسر ہو رہی ہو وہاں لوگ عموماً

کینہ پروری، حسد اور حرص ولالچ جیسے غیر پسندیدہ اخلاق وصفات سے خالی نہیں ہوں گے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات اور غیر انسانی منصوبوں کو دھڑلے سے پورا کرنے کے لیے جمگھٹا بنانے اور قتل وغارت برپا کرنے کی جرأت بھی کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اموال زبردستی چھینے جاتے ہیں اور کشت وخون کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔اور مدنی نظام صالح میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اکثر اوقات ان مفسدوں کے پیش نظر حصولِ مال وجاہ اور اراضی وجائداد یا بعض دیگر دنیوی اغراض ہوتی ہیں۔لیکن بعض اوقات دین ومذہب کی آڑ میں اور ظلم وجور کے انسداد کے نام پر فساد انگیز باتوں کا ارتکاب کرتے ہیں ان لوگوں کی مفسدانہ قوت کو توڑنے ان کی سرکشی کو ختم کرنے اور شہری زندگی کو ان کے شر وفساد سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ امام کے پاس بہادروں کی ایک طاقتور فوج ہو جو اُن کا مقابلہ کر سکے۔فوج یا تو کسی ایسے قانون اور قاعدے کے مطابق تیار کی جائے جس پر انسانی معاشرہ اطمینان کا اظہار کر چکا ہو (اور اس کی قیادت کسی ایسی جماعت کے ہاتھوں میں ہو جس کو جمہور نے ان کی استعداد قابلیت سے مطمئن ہو کر نظام مدنیت کو قائم رکھنے کا اہتمام سپرد کیا ہو) اور یا اُن میں سے کوئی شخص ایسا ہو جس کے سامنے ہر شخص سر تسلیم خم کرے۔اور وہ حکمت ودانائی اور صولت وجواں مردی کے ساتھ جنگ کی قیادت کرتا رہے۔اس تدبیر نافع کو شریعت کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔

چوتھی حاجت، تولیت ونقابت شہر (کوتوالی)

شہر کا اصطلاحی مفہوم تو وہ ہے جس کا ذکر ہم کر چکے یعنی معاشرہ کا ایک خاص نظام زندگی، تاہم عملاً اس نظام کے لیے چند (مخصوص) شکلیں اور صورتیں ایسی ہوا کرتی ہیں کہ اگر وہ نظام اُن صورتوں میں قائم رہے تو یقیناً بہترین اور اکمل ترین ہوتا ہے اور اگر اس نظام کی وہ شکلیں مفقود ہوں تو نظام شہریت میں نقصان وکمی رونما ہوگی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سب لوگ حقیقت میں یہی چاہتے ہیں کہ اُن صورتوں کو قائم رکھا جائے اور درحقیقت ان صورتوں کا قیام معاشرہ کے افراد ہی کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔تاہم ان میں سے کوئی

ایک فرد ایسا ضرور ہونا چاہیے جس کو وہ ان صورتوں کے قیام کا معاملہ سپرد کر دیں۔ اور وہ اپنی صحیح حکمت عملی اور دور رس عقل ورائے کے ساتھ ان امور کو سرانجام دے۔ کیونکہ ہر فردِ معاشرہ کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان صورتوں کو قائم رکھ سکے یا کم از کم ہر ایک کے لیے یہ آسان نہیں کہ نظام کے مشترک منافع کی خاطر جو شکل اختیار کرنا ہو اس کی تمام اخراجات اپنی طرف سے ادا کر سکے (یہ اس فرد واحد کا کام ہوگا جس کو معاشرے نے یہ کام سپرد کیا ہوگا کہ) ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جمعیت بہم پہنچانے کی ضرورت ہو) تو جمعیت بہم پہنچانے، عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے معاشرہ اسے اختیارات سپرد کرے اور اس سلسلہ میں اس کے مطیع فرمان رہے۔

شہری نظام کے ان صور واشکال میں سے کچھ یہ ہیں: (۱) سرحدات پر چوکیاں قائم کرنا اور سرحدات کو محفوظ رکھنا۔ (۲) فوج کے لیے مضبوط قلعوں کی تعمیر۔ (۳) شہروں کے اردگرد فصیلوں کا کھڑا کرنا۔ (۴) تجارت کو فروغ دینے اور ضروریات زندگی کو مہیا کرنے کے لیے بازاروں اور تجارتی منڈیوں کا قیام۔ (۵) (زراعت اور کھیتی باڑی اور آمد ورفت کے لیے) نہریں کھودنے اور دریاؤں پر بند اور پُل باندھنے کا انتظام۔ (۶) (بیواؤں کے حقوق اور) یتیموں کی خانہ آبادی اور اُن کے اموال اور جائدادوں کی دوسروں کے دست تعدی سے حفاظت۔ (۷) (بیت المال میں جمع شدہ مال و) صدقات کی مدّ سے حاجت مندوں کی اعانت، وارثوں کے درمیان (شرعی قانونِ وراثت کے مطابق) مال متروکہ تقسیم کرنا۔ (۸) پوری قوم کی پسندیدہ اسباب ترقی، اور دیگر اجتماعی امور خیر سے خبردار رہنا۔ (۹) مالیہ (اور دیگر ٹیکس) وصول کرنے اور ان کو ٹھیک طور سے خرچ کرنے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ضرورت اصطلاحاً تولی اور نقابت کہلاتی ہے اور جس صاحب اختیار حاکم کو اس کا انتظام سپرد ہوتا ہے وہ متولی اور نقیب کہلاتا ہے۔ (ہماری موجودہ اصطلاح میں وزیر داخلہ بہ شمول وزیر عدلیہ و وزیر رفاہ عامہ ان امور کا نگراں ہوتا ہے)۔

پانچویں حاجت۔ وعظ وارشاد (اُمورِ مذہبیہ کی نگرانی)

اگرچہ دینِ حق یعنی اسلام کی حقانیت کے دلائل وشواہد اس قدر واضح ہیں کہ عقلِ سلیم رکھنے والے اس کی حقانیت اور خوبیوں کے معترف ہیں۔ پھر بھی مبلّغوں کی ضرورت ہے جو عام لوگوں تک خدائے برتر واعلیٰ کے احکامات اور پیغامات پہنچائیں، کیونکہ اکثر فاسد مزاج لوگ حبِّ دنیا اور اتباعِ شہواتِ نفسانیہ کے باعث دینِ حق کی پاکیزہ تعلیمات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں حکمت ودانائی کے خدائی قوانین اور دین اسلام کے احکام وفرامین، (اور ان کے اندر مخفی اسرار ورموز اور باریک معانی ومطالب) کو سمجھنے کے لیے (امین ودیانتدار) مبلّغ ومعلّم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے واعظ ومرشد کے محتاج ہوتے ہیں جو ان کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دے۔ اعمالِ صالحہ کی خوبیاں ان کے ذہن نشین کردے اور حیاتِ منزلی کے حقوق وواجبات اور باہمی لین دین اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان آدابِ مطلوبہ سے انہیں آگاہ کرے جن کا ذکر ہم کر چکے۔ مرشد کا پیرایۂ بیان نہایت مؤثر اور طریقۂ خطابت نہایت دل نشین ہو۔ اور ترغیب وترہیب کی دونوں صورتوں میں بہترین تذکیر اور اُصولِ تذکیر پیشِ نظر رکھے۔ اس محکمہ کو وعظ وارشاد (یا مذہبی امور کا شعبہ) کہا جاتا ہے۔

امام کی ضرورت، شرائط اور امتیازی صفات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مدنیت کا کامل نظام بہت سے افراد یا مجموعہ ہائے افراد سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن جب اجتماع کی کثرت ہو تو اختلافِ طبائع، تباینِ اغراض اور تشتتِ آرا کی وجہ سے اس نظام کا صالح طور پر قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے مرد کو منتخب کریں جو اپنی قابلیت اور حسنِ تدبر وتدبیر سے ان سب امور کو بہ یک وقت انجام دیا کرے۔ ایسا ہی شخص حقیقت میں امام (المسلمین) کہلاتا ہے۔ مگر یہ ہوتا کم ہے کہ ایک ہی آدمی سب اُمورِ مملکت کو بخوبی سرانجام دے۔ وسیع پیمانہ پر مہذب ومتمدن لوگوں میں عموماً نظامِ حکومت مختلف شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اور ہر شعبہ کا علیحدہ

علیٰحدہ سربراہ ہوتا ہے یا کسی کے پاس دو یا تین کام ہوتے ہیں اور باقی اُمور دوسروں کے پاس ہوتے ہیں (اور سب شعبے ایک ہی منتظم یا ناظم اعلیٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں) بلکہ ناقص تمدن میں بھی ہر ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی اپنا قاعدہ وقانون ہوتا ہے یا ہر ایک پیشہ والوں کی جماعت کا ایک سردار ہوتا ہے جس کے حکم اور رائے کے سب افرادِ صنعت پابند ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قوم کے سربرآوردہ اور عقل مند لوگوں کی جماعت (پنچوں کی جماعت) ان کے نظام زندگی کو پُر امن طور پر چلاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی ایسی جلیل القدر ہستی ان کے اجتماعی نظام کو قائم رکھتی ہے۔ جس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے اور جس کی حقانیت وصداقت کو تسلیم کر کے اس کی مخالفت اور اس کے مشورہ سے غفلت کے نقصانات کو وہ آزما چکے ہوں اور یہ دیکھ چکے ہوں کہ اس سے اعراض وانحراف میں قتل وفساد یا غیبی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جب کسی کو امام منتخب کرنا ہو تو چند خاص شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک وہ شرطیں اس میں پوری نہ ہوں اس کے انتخاب وتقرر سے مطلوبہ تدابیرِ نافعہ اور نظام مدنیت قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ (مثلاً وہ ہر لحاظ سے جسمانی اور ذہنی استعدادات کا مالک ہو، اس کی علمی، عملی، سیاسی اور اخلاقی حالت دوسروں کے لیے قابل تقلید ہو۔ وہ فنونِ حرب وضرب اور اُصول جنگ وصلح سے پوری طرح واقف ہو وہ عدل وانصاف قائم رکھنے اور مختلف شعبوں کے لوگوں کو کنٹرول میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو) فرائض منصبی کو کما حقہ پورا کرنے کے لیے اسے معاونوں اور مددگاروں کی بھی ضرورت ہوگی، ان اعوان وانصار اور لشکر ورعایا کو خوشگوار ربط میں رکھنے کے لیے انصاف پر مبنی قوانین ہونے چاہئیں اور جملہ مددگاروں اور فوجیوں کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لیے اس کے پاس مالیہ اور ٹیکس وصول کرنے کے ساتھ شاہی خزانے یا بیت المال کا انتظام ہو۔ اور چونکہ مسلح افواج اور سرکاری ملازمین ہر وقت سربکف ہو کر قوم وملک کی خدمت کرتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ اُن کی ضروریاتِ زندگی کا بوجھ عوام پر پڑے (اور بالخصوص ان لوگوں پر پڑے جن کے پاس دولت اور ذرائع

دولت ہیں۔ اور ضروریات زندگی سے فاضل وزائد سرمایہ ان کے پاس بیکار پڑا ہے)۔

تمدن کے اقسام ومراتب

جب کوئی تمدنی وحدت اس قدر انسانی افراد پر مشتمل ہو کہ قوم پر مصائب ونوائب کے ہجوم کے وقت کم از کم چار ہزار جنگجو اور لڑائی کے قابل) افراد کی جمعیت فراہم کر سکے اور اس کے علاوہ معاشرہ میں کسان، بننے والے دوسرے پیشہ ور لوگ بھی ہوں تو اُس کامل تمدن اور اس معاشرے کے سربراہ متصرف اور منتظم اعلیٰ کو امام حقیقی سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اس تعداد نفوس اور استعداد مدافعت سے کم تمدنی یونٹ ہے، تو اسے ناقص تمدن سمجھا جائے گا۔

تمدن تام کے مختلف مراتب ہیں جو قد وقامت اور جسامت وصلاحیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جس امام کے پاس بارہ ہزار باقاعدہ فوج ہو جو ہر وقت جہاد کے لیے تیار ہو، اور ملک کی اس قدر آمدنی ہو کہ اس کے مالیہ سے ان کے اخراجات مکمل پورے ہوسکیں (اور دوسری حکومتوں کے ساتھ ان کے تعلقات مساویانہ ہو) تو حکمت ودانائی کا تقاضا ہے کہ اس کو خلفا میں سے شمار کیا جائے۔

اسی طرح خلفا بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اگر کسی خلیفہ کے پاس ایک لاکھ کی پوری طرح مستعد و مسلح فوج ہے اور وہ ایک وسیع وعریض خطہ زمین کا مالک ہے جس سے وافر مقدار میں مال ودولت اور پیداوار وغیرہ حاصل ہوتی ہے، جو ملک وقوم اعوان وانصار اور فوج وسپاہ کے اخراجات مکمل برداشت کرسکتی ہے۔ تو ایسے خلیفہ کو خلیفہ اعظم کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے، اس کے اوپر کوئی دوسرا خلیفہ یا حکمراں نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر خلافت کو ان معنوں میں لیا جائے کہ اصطلاحی طور پر کسی بڑے خلیفہ کو برائے نام سب کا مطاع سمجھا جائے لیکن حقیقی معنی میں وہ خلیفہ نہ ہو یعنی تمام خلافتوں میں جن کو اس سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اس کے احکام کی کماحقہ، تنفیذ نہ ہوتی ہو ایسی حالت میں اس بڑے خلیفہ کو خلیفۂ اعظم کہنا ہماری اصطلاح کے مطابق درست نہ ہوگا۔ ہاں اسے خلیفۃ الخلفا کہا جائے گا۔

بارھویں فصل

امام کے اخلاق سبعہ

امام یا خلیفہ کو اخلاق[1] سبعہ جس کا ذکر ہم (اس مقالے کی دوسری فصل کے آخر میں) کر چکے ہیں، کا جامع ہونا چاہیے بصورت دیگر اس کا وجود نظام مدنیت پر بوجھ ہوگا۔ اور تمدنی نظام کا سنبھالنا اس کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوگا اور اس طرح دونوں کی حالت خراب و دگرگوں رہے گی۔

مثلاً اگر اس میں خلق شجاعت نہیں ہے تو وہ ہمیشہ دشمنوں اور مزاحمت کرنے والوں سے دبتا رہے گا، اور اپنی رعیت کی نظروں میں بھی ذلیل ہوگا اور (ہر کس و ناکس حتی کہ بزدل (سے بزدل) بھی اس پر پھبتیاں کسے گا۔ اور اگر اس میں جوہر سماحت و فیاضی نہیں تو اس کی تنگدلی اور بخل کی وجہ سے وہ ان کو ایسی مصیبت میں ڈال دے گا جس کی تلافی اور علاج مشکل ہوگا۔ اگر وہ صفت حکمت و تدبر سے متصف نہیں تو تمدن کے صلاح و ترقی کی مفید تدبیریں اور اچھے اجتماعی اداروں کی تشکیل نہیں کر سکے گا۔

اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جاہ و حشمت کا مالک اور شان و شوکت والا ہو۔ اور یہ کہ لوگ اس کے اور اس کے آباؤ اجداد کے فضائل و مآثر دیکھ چکے ہوں ورنہ لوگوں کے دلوں پر اس کی عظمت و رعب کا سکہ نہیں بیٹھے گا، یہی درحقیقت سیادت و قیادت کا اصل ہے کہ لوگ یا تو اس شخص کے اندر اخلاق فاضلہ: خیر خواہی اور کفایت کلی (ہر کام کر سکنے کی صلاحیت) دیکھ کر اس کی امامت پر یقین کامل اور ایمان جازم رکھتے ہیں۔ اور یا ان صفات محمودہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اس شخص کو تائید غیبی حاصل ہے جس کا اقتضا یہی

---

[1] حکمت، عفت، سماحت، شجاعت، فصاحت، دیانت سمت صالح

ہے کہ اس کی شخصیت (اور اس کی امامت) کو تسلیم کر لیا جائے۔

امامت کے آداب

ہر امامت خواہ وہ ناقص ہو یا کامل، ہر صورت میں نفوذ اور جاہ وحشمت کی صفت سے ضرور متصف ہونی چاہیے جو شخص نفوذ اور جاہ وحشمت کا خواہاں ہو اس کے لیے دو طریقے اختیار کرنے ہوں گے: (۱) جو آدمی ان مذکورہ پانچ اقسام امامت (تمدن ناقص تمدن تام خلیفہ، خلیفۃ الخلفا اور خلیفہ اعظم) میں سے جس کسی منصب کا ارادہ رکھے اسے چاہیے کہ وہ اسی امامت کے مناسب حال جاہ وحشمت کے وسائل اختیار کرے اور بتدریج تھوڑا تھوڑا اضافہ کر کے نصاب مطلوب اور مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

(۲): جاہ وحشمت کا جو درجہ حاصل ہو جائے اس کی حفاظت کرے اور مناسب تدبیروں کے ذریعہ اُن خدشات اور خطروں کا انسداد کرے جو اس کی راہ میں پیش آ سکتے ہوں۔

بنا بریں لوگوں میں سے جو شخص صاحب جاہ وحشمت نہیں ہے اور وہ سربراہ یا امام بننا چاہتا ہے اسے سب سے پہلے اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہونا چاہیے اگر اس کو ان اوصاف کا حصول میسر نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ (اس امامت مطلوبہ کے مناسب حال) مطلوبہ جاہ سے متعلق اچھی خصلتوں کا اظہار شروع کر دے مثلاً داد و دہش اور سخاوت و فیاضی کا مظاہرہ کرے۔ ظالموں کو معاف کرے تواضع و انکساری کا شیوہ اختیار کرے، بہادری اور شجاعت سے کام لے اور حکمت و دانائی کے ساتھ اُمور کا فیصلہ کرے۔

لوگوں کے ساتھ اس کو وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو صیاد (شکاری) وحشی جانوروں کے ساتھ کرتا ہے اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ جنگل میں جا کر شکار کی جگہ تلاش کرتا ہے۔ وہ (مثلاً) ہرنوں کو دیکھتا ہے اور اُن کی جگہ متعین کر لیتا ہے۔ بعد ازاں ہرنوں کی طبائع و عادات کے مناسب ہیئت اور شکل اختیار کرنے پر غور کرتا ہے۔ چنانچہ وہ سبز لباس پہنتا ہے اور اپنے آپ کو کسی درخت کے سبز پتوں سے ڈھانپ لیتا ہے (تا کہ ان ہرنوں کو یہ شک نہ ہو کہ وہ ان کو شکار کرنا چاہتا ہے)۔ اس ہیئت و شکل کے ساتھ وہ دور سے ان کے سامنے آتا ہے ان کے کام اور نگاہوں کی طرف اپنی نگاہ جمائے رکھتا ہے۔ جب ہرن کو چوکنا

،خبردار اور بدکتا ہوا دیکھتا ہے تو فوراً دبک جاتا ہے۔ اور اس طرح دبک جاتا ہے گویا پتھر (یا مٹی کا تودہ) ہے۔ گویا اس کے اندر نقل وحرکت کا مادّہ ہی نہیں ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ ہرن غافل ہے تو دبے پاؤں آگے بڑھتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب اس میں کوئی خوف ونفرت نہیں ہے، تو اس کو خوش کن آوازوں سے خوش کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے اس کی پسندیدہ گھاس یا چارہ اس طرح ڈالتا ہے گویا وہ طبعاً صاحب جود وکرم واقع ہوا ہے۔ اور شکار کا ارادہ ہی نہیں رکھتا۔ اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ احسان دلوں میں محسن کی محبت پیدا کر ہی دیتا ہے اور جب اس طرح اس کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر جائے تو پھر انھیں جس طرح قید و بند رکھنا چاہے گا وہ دل وجان سے تسلیم کا شیوہ اختیار کریں گے کیونکہ محبت کی زنجیریں لوہے کی بیڑیوں سے زیادہ مضبوط ہوا کرتی ہیں۔

بعینہٖ اسی شکاری کی طرح اُس شخص کا طرز عمل بھی ہونا چاہیے جو لوگوں میں ممتاز درجہ (اور زمام حکومت وقیادت ہاتھ میں لینا) چاہتا ہے۔

اس کے لیے لازم ہے کہ وہ وہی ہیئت اختیار کرے جس سے لوگوں کے قلوب اس کی طرف مائل ہوں۔ لباس بھی ایسا ہو جو لوگوں کو مرغوب ہو، گفتگو بھی ایسی ہو جو پسندیدہ ہو، آداب واخلاق اور وضع وقطع بھی ایسے ہوں جن سے لوگ اس سے مانوس ہوں پھر آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ ان کے قریب ہوتا جائے اور نصائح ومحبت سے ان کو اپنا گرویدہ بنالے اور نصیحت ومحبت کا اندازہ ایسا ہو کہ اس میں مزاح اور شیخی کی بو نہ آتی ہو۔ کوئی قرینہ ایسا ان کے سامنے ظاہر نہ ہونے پائے جس سے وہ خیال کرنے لگیں کہ ہمیں شکار بنانے کے لیے ایسا کیا جارہا ہے۔ پھر اس کا یہ فرض ہے کہ ان پر اپنی فضیلت وبرتری کا اظہار اس طریقہ سے ظاہر کرے جس طرح اس کا مقصود ہے اور اس طرح یہ امور انجام دے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی افضلیت وبرتری مسلّم اور باعث اطمینان ہو جائے اور وہ خود بخود اس کے احکام کے سامنے سر اطاعت خم کریں۔ اور پھر جب اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو پھر ان امور کی پوری طرح حفاظت کرے۔ کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہونے پائے جس کی آڑ لے کر کوئی اس کی مخالفت پر اُتر آئے اور اگر کہیں کسی امر کے متعلق کسی قسم کی

کچھ کوتاہی ہو جائے تو فوراً لطف واحسان سے تدارک کرے اور واضح کر دے کہ جو کچھ کیا گیا ہے ان کی ضروریات کی تکمیل اور مصلحت عمومی کے لیے کیا گیا ہے۔ اسے یہ یقین بھی دلانا چاہیے کہ اس جیسا قائد وامام انھیں میسر ہی نہیں آسکتا۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے تو لوگوں کے دل اس کے اطاعت اور وفاداری کے جذبات سے معمور اور ان کے اعضائے جسمانی اور جوارح بدن خشوع وخضوع اور انکساری کے ساتھ جھکنے پر مجبور ہوں گے۔

امام تام (یعنی مستقل مملکت کے سربراہ اور بادشاہ) کو اس کی بھی ضرورت ہے کہ رعایا پر اپنی اطاعت لازم اور برقرار رکھنے کے لیے اپنے دشمنوں باغیوں اور ایسے سرکشوں کو (جن کے دلوں میں اس کے ساتھ عداوت مضمر ہے) خوب تادیبی سزا دے لیکن اجرائے عقوبت کے بعد ان سے مہر ومحبت سے پیش آکر ان کی دلجوئی اور اشک شوئی کر لیا کرے۔ اور لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ مجرموں کے ساتھ اس کا سلوک منتقمانہ نہیں بلکہ مصلحانہ ہے۔

امام یا بادشاہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ دولت مند اور مالدار ہو (اور اس کا خزانہ بھرا پڑا ہو) کیونکہ لوگ دولت کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ان کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ بھرے خزانوں اور فراخ آمدنی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور وفاداری پر آمادہ ہوتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ امام یا بادشاہ منع وعطا پر پوری طرح قادر ہو۔ اور کوئی اسے روک نہ سکے، ہاں بخشش وعطا میں مصلحت وقت کا خیال رکھے، اگر وہ کسی کی میدان جنگ میں یا تحصیل خراج میں (یا تدبیر سلطنت میں) حسن خدمات اور بہتر کارکردگی دیکھ لے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی تنخواہ بڑھا دے اور اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرے۔ لیکن اگر کسی سے اطاعت گزاری میں کوتاہی، فرض منصبی کی ادائیگی میں غفلت اور کام میں کسی طرح کی نالائقی دیکھے تو اس پر انعام وبخشش کی مقدار اور اس کی قدر ومنزلت کم کر دے۔

امام یا بادشاہ کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے پاس پوری طرح باخبر اور بیدار جاسوس ہوں جو اس کو اپنی رعیت اور فوج کے احوال وظروف سے ٹھیک طور پر آگاہ کرتے رہیں۔

تیرھویں فصل

ارتفاق ثالث کے اقسام پنجگانہ کے احکام کی تفصیل

آداب قضاو قاضی

جب قاضی لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے کچہری لگاتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ نہایت بارعب اور پُر وقار لباس میں ملبوس ہو۔ اور اس کا دل دماغ مقدمات کے فیصلہ کے وقت دوسری پریشانیوں سے فارغ ہوں۔ وہ مجلس میں کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے فریقین میں سے کسی فریق کو دوسرے پر دست درازی یا کسی قسم کی بالادستی حاصل کرنے کی جرأت ہو سکے۔ وہ اولاً مدعی سے دعویٰ سنے جو وہ مدعی علیہ پر کرتا ہے اور یہ کہ اس سے اس کا پہلا واسطہ کیا پڑا تھا۔ کوئی معاملہ (عقد) آپس میں طے ہوا تھا یا کوئی اور رابطہ تھا، مدعی اپنے دعویٰ کے حق میں جو دلیل پیش کرتا ہے وہ بھی معلوم کرے، پھر وہ مدعی علیہ سے اس کا جواب سنے اور یہ کہ اس کا اس کے ساتھ کیا سابقہ رہا تھا۔ اور یہ کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے بارے میں اس کی دلیل کیا ہے۔ (غرض یہ کہ قاضی مدعی اور مدعیٰ علیہ سے مفصل بیان لے جس سے مقدمہ کی حقیقت اور فریقین کا عندیہ واضح ہو جائے اور قاضی ہر ایک کی مالہ و ماعلیہ سن کر صورت حالات سے اچھی طرح واقف ہو جائے) یہاں تین باتوں میں غور و خوض اور امعان نظر کی ضرورت ہے۔

اوّل: ہر فریق کا ارادہ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا اشد ضروری اس لیے ہے کہ دعویٰ اور جواب دعویٰ دونوں کی حقیقت متعیّن کرنے کا مدار اسی پر ہے۔ ہاں بعض اوقات ان کا نزاع لفظی قسم کا ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اپنی بات پر قائم رہ کر کسی مزید شے کی طلب سے کنارہ

کش ہو جائیں تو ہر ایک کو (نزاع لفظی کی صورت میں) اپنی مطلوبہ چیز خود بخود مل جائے گی۔ اور جھگڑا طے ہو جائے گا۔

دوم: جس معاملہ پر دعویٰ کی بنیاد ہے اگر اس کی کیفیت بیان میں دونوں فریق متفق ہوں تو سمجھ لو کہ اس مقدمہ کا تعلق قاضی سے نہیں مفتی سے ہے (اس لیے مناسب یہ ہے کہ وہ مقدمہ مفتی دیار کے پاس بھیج دیا جائے) لیکن اگر فریقین کا اس میں اختلاف ہے تو نصیحت کے طور پر ان سے کہا جائے کہ تم دونوں نے بیان عقد میں اختلاف کیا ہے اور تم جانتے ہو کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے اور جھوٹے کا مآل وانجام دنیا اور آخرت میں یوں یوں ہے (یعنی ہلاکت وتباہی، آتش جہنم اور خدا کی نظر کرم سے محرومی وغیرہ وغیرہ) اس لیے تمہاری دنیاوی سعادت اور اخروی نجات کے پیش نظر حقیقت حال صریح الفاظ میں بیان کر دو۔ کیونکہ بعض اوقات لوگ آپس میں اختلاف کسی وہم اور شبہہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب اپنا مطلب صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو حقیقت ان پر خود ہی واضح ہو جاتی ہے اور بعض اوقات لوگ ویسے جھوٹ بولنے کی چنداں پرواہ نہیں کرتے، لالچ نے ان کو اندھا کر دیا ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ سمجھانے اور وعظ ونصیحت سے متأثر ہو کر وہ اصل حقیقت کا اقرار کر دیں اگر اس طرح ان میں باہم مصالحت ہو جائے تو بہتر ورنہ تیسری صورت یہ ہو گی۔

سوم: جس فریق کا بیان ظاہری قرائن اور حالات گرد وپیش کے خلاف ہو قاضی اس سے دو یا دو سے زیادہ معتبر گواہ طلب کرے۔ اگر وہ کم از کم دو گواہ بھی پیش نہ کر سکے تو اس کے صرف ایک گواہ پر اکتفا کرے لیکن ساتھ ہی اس کو قسم بھی دلائے[1] یہ بھی میسر نہ ہو تو مدعی علیہ کے حلف سے انکار کرنا اور مدعی کا قسم کھا لینا بھی کافی ہو گا۔

قاضی کو چاہیے کہ حقیقت حال سے باخبر ہونے کے لیے قرائن کا تتبع کرے اور دوسروں سے استفسار واستکشاف کرے لیکن شرط یہ ہے کہ فریقین کو اس کی (خفیہ تفتیش کی)

---

[1] ایک حدیث کا بظاہر مفہوم یہی ہے کہ ایک گواہ اور مدعی کی قسم سے بھی مدعی کے حق میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔ تاہم حنفیہ مشہور اصول (البينة على المدعى واليمين على من انكر) پر عمل کرتے ہوئے ایک گواہ کو نا کافی سمجھتے اور مدعی علیہ کی قسم پر مقدمہ کا فیصلہ مدعی علیہ کے حق میں خود بخود فیصلہ ہو جاتا ہے۔

اطلاع نہ پہنچے۔ اب اگر وہ آزادانہ تحقیقات ذاتی طور پر حاصل کردہ نتیجہ اور گواہوں کے بیانات میں تناقض واختلاف پائے تو گواہوں کی بابت خوب چھان بین کرے۔ بصورت دیگر جب بظاہر کوئی تضاد وتضاد نہ ہو گواہوں کی عدالت کے بارے میں خفیہ رپورٹ طلب کرنے اور مزید تحقیق وکاوش کی ضرورت بھی نہیں بلکہ گواہوں کی ظاہری عدالت واعتبار کو کافی سمجھا جائے۔

جب مقدمہ کی حقیقت واضح ہو جائے تو قاضی کو فریقین کے دلائل سننے چاہئیں۔ اب اگر کسی ایک کے پاس قوی دلیل موجود ہے اور کتاب (وسنت) سے اس کو تقویت ملتی ہے اور وہ عرف عام کے منشا کے مطابق ہے تو اس کا حکم واضح ہے (اور فیصلہ دیدینا چاہیے)۔ اگر صورت حال یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے دلائل قوت واستدلال میں برابر ومساوی ہوں یا دونوں ضعیف اور کمزور ہوں تو پھر اُن اُصول کا اتباع کرے جو معاملات اور مبادلات کے باب میں ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں۔ یعنی فریقین کو سمجھایا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو، صلح وصفائی اچھی چیز ہے۔ ان کو باہمی رضامندی پر آمادہ کیا جائے اور یہ کہ دونوں فریقین اپنی مرضی سے تشدد سے باز آجائیں۔ کچھ لو کچھ دو کے اُصول سے یا کسی ایک فریق کی پوری فراخدلی سے باہم مصالحت کرلیں۔ کیونکہ یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ باہمی صلح میں ہر قسم کی خیر وبرکت ہے۔ ہاں اگر صلح بالکل نہیں ہوسکتی اور ان کی باہمی رضامندی حاصل نہیں ہوسکتی اور مقدمہ کی نوعیت وصورت بالکل واضح ہو تو قاضی کو چاہیے کہ وہ بلا تاخیر فیصلہ سنا دے۔ اور اگر صورت بالکل واضح نہ ہو بلکہ غالب گمان کے درجہ میں ہو تو فیصلہ بھی غالب گمان کے مطابق صادر کرنا چاہیے۔ جیسے چوری کے معاملہ میں ہاتھ کاٹنے کی بجائے صرف مال کی واپسی کا فیصلہ اور قتل میں قصاص کی بجائے دیت کا فیصلہ ظنی نوعیت کے فیصلے ہیں۔

چند اہم کلیاتِ قضا

قضا کے لیے چند کلیات اور اُصولی باتیں ہیں، جنھیں احاطۂ علم میں لانے والے جج کو فیصلوں میں شک وتردد سے دوچار ہونا نہیں پڑتا ان میں چند درج ذیل ہیں۔

۱-**الغُنْم بالغرُم:** یعنی فائدہ کے ساتھ تاوان بھی قبول کرنا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر آدمی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے گا تو نقصان کی صورت میں تاوان بھی برداشت کرے گا۔

۲-**تحکیم کل شرطٍ وبیان وقع بینھم الخ:** یعنی جس شرط یا بیان پر فریقین نے اتفاق کیا ہے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مطابق فیصلہ سنانا ضروری ہے۔ اور اگر کسی چیز یا بات کے بارے میں انھوں نے سکوت وخاموشی اختیار کر لی ہے تو عرف وعادت یا مسلمہ رواج کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

۳-**الاستیفا لکل رجل ماقصد بعقدہ من نفع وربح الخ:** یعنی جو عقد کسی شخص نے اپنے فائدے کے لیے منعقد کر لیا ہے۔ اس شخص کو اس فائدہ سے محروم نہ رکھا جائے اور جو چیز وہ دوسرے کے لیے بطور حق تسلیم کر چکا ہے وہ اس سے پورا پورا وصول کیا جائے۔

۴-**فک الربط وبقا کل رجل علی ما کان علیہ عندفساد باب التفتیش:**

یعنی ظاہر ہے کہ بنائے مخاصمت یا تو روابط منزلی ہوں گے یا مبادلہ اور لین دین کا قضیہ ہوگا۔ یا آپس میں تعاون (اجارہ، کرایہ، اور ہبہ وتبرعات میں سے کسی ایک قسم) کا قضیہ ہوگا۔ اب اگر تفتیش وتحقیق سے صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی تو بہتر یہ ہے کہ اس ربط یا عقد کو فسخ کر دیا جائے جس سے وہ جھگڑا پیدا ہوا اور ہر شخص کو اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس اثنا میں اگر کسی ایک نے دوسرے کے حق میں زیادتی کی ہو تو عدوان وزیادتی کا اندازہ لگایا جائے گا اور عدل وانصاف کے ساتھ تلافی مافات کی جائے گی نہ کم اور نہ زیادہ لیا یا دیا جائے گا۔

۵-**اتباع العرف الغالب:**

اقرار، شہادتوں، دعووں اور دیگر مبہم باتوں کی تشریح وتوضیح میں عرف غالب اور مسلمہ رسم ورواج سے کام لیا جائے اور اگر قرائن سے معلوم ہو کہ کسی فریق کے حق سے انکار کیا جا رہا ہے تو قاعدہ اور عرف کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔

چودھویں فصل

شہری انتظام کے فساد اور خرابیوں کے اسباب و وجوہ

شہری انتظام میں کئی وجوہ سے خرابی پیدا ہو سکتی ہے:

ایک وجہ یہ ہو گئی ہے کہ ان کے آپس میں کوئی ظاہری مذہبی اختلاف ہو۔ اکثر اوقات تفریق و اختلاف میں باطل کی آمیزش ہوتی ہے۔ اگر ان کا اختلاف عبادات میں ہے تو یہ اختلاف ان کی آخرت کے لیے خراب و مضرت رساں ہوتا ہے۔ اور اگر اختلاف معاملات میں ہے تو دنیوی زندگی میں انتشار و نقصان ہوگا۔ ان اختلافات سے عموماً جھگڑے فساد بلکہ کشت و خون تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حاکم وقت مرتدین اور زنادقہ کو توبہ و انابت پر مجبور کرے اگر وہ تنبیہ اور تادیبی سزاؤں کے بعد بھی باز نہیں آتے اور ان کی سرکشی و تمرد برابر بڑھتی جاتی ہے تو ان مفسدوں کو قتل کر دیا جائے (تاکہ خس کم جہاں پاک، پر عمل ہو جائے)۔

دوسری وجہ فساد یہ ہے کہ شہریوں کے اندر خفیہ تخریبی کارروائیاں اور پوشیدہ اسباب فساد مصروف عمل ہوں مثلاً ساحروں کی جادوگری کی فتنہ پردازیاں (شباب پر) ہوں، دوسروں کو زہر کھلانے والوں کی مذموم کوششیں جاری ہوں، عیاری اور فریب جیسے غیر اخلاقی طریقوں سے (مثلاً اپنے پاس کچھ بھی نہ ہو اور عیاری سے خرید و فروخت کا سلسلہ جاری ہو) لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی فریب کاریاں جاری ہوں، ان کے اندر ایسے غیر ذمہ دار اور شریعت کو مذاق بنانے والے جج قاضی اور مفتی موجود ہوں جو شرعی احکام سے بچنے کے حیلے بہانے اور آپس میں لڑنے کے طریقے بتاتے ہوں۔ مملکت کے اندر دشمنان ملک کے جاسوس اپنی مذموم حرکتوں میں مصروف ہوں تو اس قسم کے تخریبی عناصر کو تعزیراتی قوانین کے تحت قید بند یا قتل اور پھانسی کی سزا دی جائے تاکہ شہر ان کے فساد سے محفوظ رہے۔

تیسری وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کے اموال و جائداد پر غصب، چوری اور رہزنی کے ذریعے دست درازی اور زیادتی کی جائے۔ ان سب قسموں کی تعدّی اور ظلم کو روکنے کے لیے حسب حال اور مناسب وقت سزائیں دی جائیں۔ (جس میں جرمانہ، قید و بند اور دوسری قسم کی تادیبی و تعزیری سزائیں شامل ہیں)۔

چوتھی وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کے (محترم و حرام) خون کو ناحق بہایا جائے خواہ اس کی شکل قتل عمد، قتل خطا، یا شبہہ خطا میں سے کوئی بھی ہو۔ یا اعضائے جسمانی کو زخمی و مجروح کر کے فساد و بے چینی پیدا کی جائے۔ (بہر حال جو لوگ قتل و خوں ریزی اور مار پیٹ یا جرح وضرب کے ذریعہ لوگوں کو ناحق جسمانی تکلیف یا بدنی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں ان کو مناسب تعزیرات اور حدود کے مطابق سزائیں دی جائیں تا کہ معاشرہ میں امن قائم ہو)۔

پانچویں وجہ فساد یہ ہے کہ لوگوں کی آبروؤں اور نسبوں کو تخریب کا نشانہ بنا دیا جائے اور ان کو بہتان، گالی گلوچ، بدزبانی اور غلط بیانی کے ذریعے ذلیل و خوار کیا جائے (اس کے استیصال کے لیے بھی مقررہ سزاؤں اور تعزیراتی سزاؤں میں سے جو مناسب حال ہوں وہ سزائیں دی جائیں)۔

چھٹی وجہ فساد یہ ہے کہ فطرت کے خلاف حیوانی خواہشات کی تسکین کی جائے اور زنا کے ذریعہ فطری حمیت اور تعیین منکوحہ کے جبلّتوں کو بری طرح مجروح کیا جائے۔ کیونکہ ایک ہی عورت سے مباشرت پر ہجوم ایک ناپسندیدہ غیر فطری امر ہے۔ نیز اس سے ایک دوسرے سے جنگ اور لڑائی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور نسل انسانی میں نسب کی خرابی رونما ہوتی ہے۔ حالاں کہ نسب کی حفاظت بہت ضروری بات ہے جس کا قصد ہر ابن آدم کو کرتا ہے۔ اور بدکاری میں نکاح سے بے نیازی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ معاشرتی زندگی کے دوسرے درجہ بلکہ پہلے درجہ میں نکاح نہایت اہم ارتفاق اور ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

زنا کے مشابہہ، لواطت و اغلام بھی ہے۔ کیونکہ یہ بھی فطرت کی تبدیلی کی ایک مذموم کوشش ہے۔ نفسیات رجال سے واقف لوگوں سے مخفی نہیں ہے کہ یہ مرد کی فطرت نہیں کہ اس سے غلمان بازی کی جائے۔ اسی زمرہ میں جوئے اور سودی لین دین بھی آتے ہیں کیونکہ ان دونوں سے اموال میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ اور لاتعداد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بعینہٖ شراب نوشی بھی اسی کیفیت کی حامل ہے۔ اس سے دینی اعمال میں بھی خرابی رونما ہوتی ہے

اور یہ (عقل انسانی کو بری طرح متاثر کر کے) جھگڑوں اور لڑائیوں کو جنم دیتی ہے۔

ساتویں وجہ فساد یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے مخصوص فطری تقاضوں کے خلاف ایک دوسرے کے عادات واطوار اور لباس وطریقے اختیار کر لیتے ہیں مثلاً مرد اپنے مردانگی کے اوصاف کو چھوڑ کر زنانہ پن اختیار کرے اور عورت شرم وحیا اور تستر کے فطری جذبوں کو ترک کر کے مردوں کے اطوار اختیار کرے۔ یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ مردوں کے شایان شان جو لباس اور طور طریقے ہیں وہ ان کو بالکل نہ چھوڑیں اور عورتیں اپنے لباس شرم اور طریقوں کو نہ چھوڑیں نظام تمدن میں فساد کے ممکنہ وجوہ مذکورہ بالا ہی ہو سکتے ہیں۔ ارباب حل وعقد کا یہ فرض ہے کہ وہ مدنیتِ صالحہ کے حدود میں اس قسم کے اسباب فساد کو ظہور میں نہ آنے دیں۔ ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے مفسدوں کی طرف توجہ دینے والے معالج د مصلح کو چاہیے کہ وہ سزا دیتے وقت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے کہ جب یقینی طور پر کسی شخص کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو مقررہ شرعی سزا پوری کی پوری دے۔ لیکن صرف تہمت کی صورت میں، جبکہ جرم کے ارتکاب کا صرف شائبہ ہو، صرف ایسی تنبیہ اور زجر وتوبیخ پر اکتفا کرے جو کارگر ثابت ہو۔

ان جرائم میں سے ہر ایک جرم (کبیرہ ہو یا صغیرہ) اپنا خاص اثر فساد دکھاتا ہے اور اس کی تاثیر کے مدارج وکیفیات میں اختلاف ہوتا ہے اور قوم میں اس جرم کے کثرت سے صادر ہونے یا کبھی کبھار سرزد ہونے میں فساد کا پیمانہ بھی علیحدہ علیحدہ رہتا ہے (اور اس کی کثرت وقلت سے قوم کے مزاج میں اسی اندازے سے بگاڑ ہوتا ہے)۔ اس لیے شہریار (یعنی کوتوال یا انتظامیہ) کو چاہیے کہ ان سب باتوں کا خیال رکھے اور کسی کو سزا دیتے وقت جرم کی نوعیت کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرے۔

منتظم شہر کو چاہیے کہ وہ اپنی رعیت کے سب افراد سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرے اور ان کے حق میں وہی بات پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ بہر حال وہ پورے معاشرے کی مصلحت اور ان کے حق میں محبت وشفقت کو مقدم رکھے۔ اگر اس کا نقطۂ نظر معاشرہ کی بہتری ہو تو بہترین علاج کی طرف اس کی رہ نمائی غیب سے خود بخود ہوتی جائے گی اور اگر امیر وقت کسی معاملے میں شک وشبہہ میں پڑ جائے تو اس پہلو کو اختیار کرے جس میں رعیت کو (بہ حیثیت مجموعی) سہولت وآرام میسر ہو۔

پندرھویں فصل

امیر کی سیرت و کردار، اعدا سے اس کا برتاؤ
تعین لشکر اور دیگر امور لائقہ سے متعلق بحوث

جنگ سے پہلے

جنگ کے موقع پر مجاہدین اسلام کے سربراہ کو مندرجہ ذیل اصول ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں:

۱۔اس کو دفاع کا وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو قوم و ملک اور فوج و سپاہ کے لیے سہل ترین اور حصول مقصد کے لیے بہترین اور مناسب حال ہو۔ اور جب تک صلح کا امکان ہو وہ صلح سے منہ نہ موڑے اور جنگ کی طرف سبقت نہ کرے، الا یہ کہ اگر جنگ کے بغیر فتنہ وفساد کا استیصال ناممکن ہو۔ یا ملک وقوم اور امام کے دامن غیرت وشجاعت پر بزدلی اور عار کے سیاہ داغ کے طول عہد تک باقی رہنے کا خدشہ ہو (تو اس صورت میں اپنے پروردگار عزّ وجل پر بھروسہ کرکے بہادری اور پامردی کے ساتھ جہاد کا فرض انجام دے۔

۲۔وہ مقاصد جنگ سے پوری طرح باخبر ہو، اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ اس جنگ سے ظلم و جور کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں یا توسیع سلطنت، ملک گیری اور مال غنیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا رعایا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ یا باغیوں اور سرکشوں کو خوفزدہ یا نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔ یا بدخواہوں کو ذلیل وخوار کرنا اور انہیں قتل وسلب اور قید وبند کے ذریعے اپنی زندگیوں، مالوں اور حریتوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں یا ان کے سرغنوں کو قتل

کرنا چاہتے ہیں۔ان مقاصد میں سے جس جس مقصد کے لیے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کے جدا جدا آداب ہیں۔ چنانچہ اگر جنگ کا مقصد فقط حصول مال غنیمت ہے تو اس میں حتی المقدور وحتی الامکان اتلاف جان سے احتراز کرنا چاہیے۔

۳-اسے ہر قسم کے ضروری آلات حرب وضرب اور ساز وسامان جنگ ورسد مہیا رکھنے چاہئیں اور اس کے پاس بہادر جوانمرد سپاہیوں پر مشتمل مسلّح وتربیت یافتہ فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے۔اسے مردم شناسی اور فراست ایمانی سے متصف ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص کی اس کی ذہنی وجسمانی استعداد اور کارکردگی کے مطابق قدر دانی کرے۔اور کسی کو ایسا کام سپرد نہ کرے جس کے انجام دینے کی اس میں صلاحیت وقابلیت ہی نہیں۔

۴-جہاں تک ممکن ہو جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران دشمن کی جنگی چالوں اور حربی منصوبوں سے باخبر ہوکر انسدادی تدابیر اختیار کرے،اس غرض کے لیے محکمہ جاسوسی کو خوب منظم کرکے دشمن کے کیمپوں سے معلومات حاصل کرے اور حریف کے جاسوس سے محتاط رہے۔

۵-امام المجاہدین سپہ سالار اعظم جب جہاد کے لیے میدان جنگ میں اتر جائے تو اسے اپنی فوجوں کی مناسب صف بندی کرنی چاہیے اور میمنہ(دائیں جانب متعین دستہ) میسرہ(بائیں جانب متعین دستہ) کو اپنی اپنی جگہ لائق سپہ سالاروں کی قیادت میں کھڑا کردے۔

دورانِ جنگ

(الف) جب وہ معرکہ آرا ہوکر میدان کارزار میں جنگ کی کمان کرے تو وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھے اور خوب چوکنا رہے۔گویا کہ اس کی چار آنکھیں ہیں،جو ہر طرف ان دشمنوں پر لگی رہتی ہیں۔جو اس کی ذات پر حملہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد بکثرت،اور وافر ہوتی ہے جو خود امیر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں امام یا سپہ سالار اعظم کو حتی الامکان خود عملی طور پر لڑائی میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کسی ایسے محفوظ مقام پر بیٹھ کر

جنگ کی تنظیم اور فوجی کارروائی کرے جہاں سے وہ اپنی فوج کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکتا ہو۔ یا ان کو اپنی نظر کے سامنے رکھ کر قیادت کرسکتا ہو۔ اور پانچوں کے پانچوں فوجی دستے اس کی ہدایات واحکام حاصل کرسکتے ہوں۔ ایک طرف سے لوگوں کے سامنے آشکارا بھی ہونا چاہیے اور دوسری طرف خوب بچاؤ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی میں حکمت ودانائی ہے کہ دونوں باتوں کا اہتمام ہو۔

(ب) اگر لڑائی طریق قدیم کے مطابق مبارزت کے طریقے پر ہورہی ہو۔ تو اس کو چاہیے کہ ہر مبارز پر اس کی نظر رہے۔ جب دشمن کی فوج سے کوئی آگے بڑھ کر للکارے تو امام اس شخص اور اس کے خاندان کی حیثیت کو دیکھ کر اس کے مقابلہ پر ایسے جانباز کو میدان جنگ میں آنے کا حکم دے، جو حریف سے قوی تر اور فنون جنگ سے زیادہ واقف ہو۔ بشرطیکہ وہ ایسا نہ ہو کہ اپنی فوج کا اسی پر دارومدار ہو۔

امیر کو چاہیے کہ دوران جنگ مناسب موقعوں پر لسان حال وقال سے فوجیوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور انھیں استقلال وپامردی کی ترغیب دے اور بہادرانہ کارناموں پر خوشنودی کا اظہار کرے۔ اور مستحق لوگوں کو انعام واکرام سے نواز کر دوسروں کا حوصلہ بڑھائے۔ نیز انھیں خوش آئند ترغیبات اور ترقی واحسان کے اچھے وعدوں کے ذریعے جنگ پر آمادہ رکھنے کی کوشش کرے۔

(ج) جب دشمن کا کوئی دستہ مجاہدین (کے پانچ دستوں میں سے کسی دستہ) پر حملہ کا ارادہ کرنے لگے، تو بہتر یہ ہے کہ بلاتاخیر اس کے مقابلہ کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ اس طاقت کا روانہ کردے اور دشمن کو حتی الامکان یہ موقع نہ دے کہ اچانک حملہ سے پورے اسلامی لشکر میں کسی قسم کی بے ترتیبی رونما کردے۔ کیونکہ چھوٹی ٹکری کی بے ترتیبی کا علاج ہوسکتا ہے اور پوری فوج میں بے ترتیبی پیدا ہو تو اس کا سنبھالنا مشکل ہے۔ نفسیاتی رعب ڈالنے کے لیے ہر مجاہد کا زور زور سے چیخنا چلاّنا (اور اللہ اکبر کے نعرے بلند کرنا) اور لمبے چوڑے بہادرانہ دعوے کرنا پچاس بہادروں کی خاموش لڑائی سے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

(د) امام کو ایسی ثابت قدمی اور استقلال دکھانا چاہیے کہ دوسرے اس کو موجب اطمینان اور قابل تقلید سمجھ کر پیروی کریں۔ نیز اس کی عقل وتدبر کی یہ کیفیت ہو کہ ہر ایک مشکل کا علاج شافی اس کے پاس ہو۔ اور اس کے وقوع سے بہت پہلے اس نے انسدادی یا دفاعی تدبیر سوچی ہو۔ اپنے لشکر اور دشمن کی برسرِ پیکار فوج دونوں پر اس کی کڑی نظر ہو۔ کیونکہ دونوں اپنے مدمقابل کو شکست دینے کے لیے حریف کے حرکات وسکنات، غفلت وبیداری اور قوت وضعف کا اندازہ لگانے کے لیے تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس لیے امام جب بھی دشمن کی صفوں میں کوئی کمزوری دیکھے، ان میں غفلت پائے تو فوراً وہاں دھاوا بول دینے کا حکم دے وہ ایک لمحہ بھی حریف کی چالبازیوں سے غافل نہ ہو۔ اس کو بھیڑیئے کی چال چلنا ہوگا چنانچہ جب ایک تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تو اس کی بجائے دوسری تدبیر عمل میں لائے۔ اس کے پیش نظر سب سے مقدم یہ بات ہو کہ دشمن کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا کر کے ان کے دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اب ان کی نجات ناممکن ہے جب اس میں کامیاب ہو تو یکدم ان پر بھرپور حملہ کر کے معرکہ کا حتمی فیصلہ کر دے۔

فتح وکامرانی کے بعد

(ناکامی کی صورت میں مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلمانوں کو از سرِ نو تنظیم عساکر، فراہمی اسبابِ جنگ اور تربیت فنون عسکری کی طرف توجہ دینی چاہیے، ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کریں اور مستقبل میں ظاہری اور معنوی قوتوں کو یکجا کر کے نبرد آزمائی کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں) ہاں جب امیر المومنین دشمن کو شکست فاش دیدے، اور ان کی قوت وشوکت کو پوری طرح توڑ دے اور دشمن کے سربرآوردہ لوگوں کو تہ تیغ کر کے باقی ماندہ کو خوف وہراس میں رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اپنے ان منصوبوں کو جو جنگ سے پہلے وہ تیار کر چکا تھا، عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ امام کو چاہیے کہ اس وقت تک قتل لوٹ مار، قید وبند اور تذلیل وتسخیر اعدا کا سلسلہ جاری رکھے جب تک وہ سب اس کے سامنے دست بستہ

غلاموں کی طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ اور امام کو ان کے حق میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے اور کوئی اس کو روکنے والا باقی نہ رہے۔ اس کلی انقیاد و تسلیم کی حالت میں امام اگر چاہے تو احسان کر کے ان کے قیدیوں کو آزاد کر دے، لیکن ضروری یہ ہے کہ ان پر ایک ہزیمت کی کیفیت اور اپنے اقتدار کا دبدبہ کافی عرصہ تک جاری رکھے۔ اس کی ایک شکل یہ ہوگی کہ ان پر جزیہ یا ٹیکس (یا تاوانِ جنگ) مقرر کر دے یا یہ کہ ان کو غلامی کے طوق میں جکڑے رکھے اور ان کے قلعوں اور جنگی تنصیبات کو مسمار کر دے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو ایسی حالت پر رکھا جائے کہ دوبارہ امام کے خلاف قوت جمع کرنے اور جنگ کرنے کے مواقع کا امکان کم باقی رہے اور وہ بار بار نبرد آزمائی کے قابل نہ ہوں۔

بہر حال دشمن پر فتح حاصل کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں فتح و ظفر کے بعد مسلسل قابو میں رکھنا اور فرماں بردار بنائے رکھنے کی تدابیر ان سے بھی مشکل تر اور دقت طلب ہوتی ہیں۔

سولھویں فصل

تعلیم وتربیت کی دوقسمیں

لوگوں کی خیر وبھلائی کی تعلیم دینے والے کو دومختلف طریقوں سے تعلیم دینی پڑتی ہے

ایک یہ کہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دے جو ان کے اخلاق کو درست کریں اور اقامتِ خیر اور رائے سلیم پر مبنی معاشرتی زندگی بالخصوص ارتفاق ثانی وثالث کے نظام کو اس طریقہ سے قائم کرنے میں مدد دیں جو رائے صواب کے مطابق ہو۔

دوسرے یہ کہ ان کو ان باتوں کی تعلیم دے جن کے ذریعہ وہ خدائے بزرگ وبرتر کا قرب حاصل کریں اور دار آخرت میں ان کی نجات وسعادت کے باعث ہوں، مؤخرالذکر کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ایک دوسری تقسیم کے مطابق خیر کی تعلیم دوطریقوں سے دی جاسکتی ہے:

(الف) جن باتوں کے ذریعہ ان کی دنیا سنورتی ہے اور جن باتوں سے ان کو بارگاہ الٰہی میں تقرب حاصل ہوتا ہے ان تمام باتوں کی تعلیم دینا، جو زبانی وعظ وتذکیر کے ذریعہ بھی دی جاسکتی ہے اور قلم وتحریر کے ذریعہ بھی ان مسائل کی اشاعت کی جاسکتی ہے۔

(ب) (صوفیائے کرام کے طرز پر لوگوں کا تزکیہ نفس کرکے) ان کے باطن میں پاکیزہ حالت پیدا کردینا جس کو سکینہ یا اطمانیت قلب کہا جاتا ہے اور جس کی تشریح ہے کہ آدمی کا دل ہر وقت آخرت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور دارالغرور یعنی دنیا سے اعراض اور بے تعلقی پیدا ہوتی ہے نیز ان امور سے بھی لاتعلقی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دنیاوی زندگی سے

نفس کی کلّی وابستگی کے ذرائع ہیں۔ یہ پاکیزہ حالت معلم کبھی تو مؤثر پند ونصیحت کے ذریعہ پیدا کرتا ہے اور کبھی اپنی پاکیزہ مجلس وصحبت اور روحانی توجہ کے ذریعہ پیدا کرتا ہے۔

معلم کے اوصاف حمیدہ

معلم ان دونوں میں سے جو بھی قسم یا طریقہ تعلیم اختیار کرے اس کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ خود عادل ومنصف مزاج اور کامل ترین نمونۂ اخلاق ہو۔ اور آخرت کی نجات وسعادت کو دنیا اور دنیا کی عیش وعشرت پر ترجیح دینے والا ہو۔ لوگوں کے بہی خواہ ہونے کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا ہو۔ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول کا حافظ ہو، اور قرآن وحدیث کے احکام ومعانی سے پوری طرح واقف ہو۔ عالی ہمت اور بلند ظرف کا مالک ہو، سیدھی راہ چلنے والا اور چلانے والا ہو، میانہ رو اور زندگی میں افراط وتفریط سے گریز پا ہو۔ خوش مزاج وخوش اخلاق ہو، پکا دیندار ہو، اور عمیق حکمت ودانائی سے سرفراز ہو چکا ہو۔ ان اسباب میں غور وفکر کرتا ہو جن کی بدولت لوگ اس کی اطاعت کے لیے آمادہ ہوں۔ بہر حال یہ بہت ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے افضل وبرتر ہو یا دینداری کی کیفیت میں یا علم میں یا ایسے غیر معمولی خارق عادت امور کے سرزد ہونے کے لحاظ سے جو دوسروں میں یا تو یکسر مفقود ہیں یا بہت کم پائے جاتے ہیں۔

وعظ وتذکیر کی بنا خطابیات پر ہے

لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے کو چاہیے کہ وہ وعظ وتذکیر میں (منطقی دلائل کی بجائے خطابیات سے کام لے کر) لوگوں کی سطح فہم کے مطابق بات کرے اور کلام (وبیان اور علم کلام) کے دقیق وباریک مسائل میں الجھنے سے گریز کرے کیوں کہ اس صورت میں یا تو وہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے غلط بیانی سے کام لے گا اور اس سے لوگوں کے اذہان وقلوب منتشر ہوں گے یا اگر اپنے علم کے مطابق ٹھیک ٹھیک بات کہے گا تو اس کے علم کا فائدہ مخاطبین کو حاصل نہ ہوگا بہر حال یہ مسلّمہ امر ہے کہ وعظ وتذکیر کے سلسلہ میں مؤثر ترین طریقہ اور عوام پر پوری طرح اثر انداز ہونے والا طرز بیان منطقی استدلال نہیں بلکہ خطابیات ہے۔

ارکان وعظ

وعظ وتذکیر کا پہلا رکن یہ ہے کہ واعظ سامعین کو ایسے عبرت انگیز واقعات سنائے جن کو سن کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ دنیا کی ہوس رانیوں سے دل بیزار ہو جائے اور توشۂ آخرت جمع کرنے کا خیال دل میں جم جائے اور نفسانی خواہشات کے درپے رہنے سے دل ہٹ جائے۔ لیکن قصص بیان کرتے وقت یا ترغیب و ترہیب کی روایت سناتے وقت یہ احتیاط رہے کہ کوئی جعلی قصہ یا موضوع روایت ذکر نہ کیا جائے جیسے کہ اس عصر کے واعظین کرتے ہیں کیونکہ یہ تو ہدایت وروشنی کے بجائے گمراہی وتاریکی سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ترغیب وترہیب اس انداز سے ہو کہ زمانہ کی گردش کی سرعت اور اس کے ایک نہج پر عدم ثبات کو اچھی طرح واضح کرے اس طرح (صحیح قصص انبیاء، ایام اللہ اور آلاء اللہ کے ذریعہ) تذکیر ووعظ سے لوگوں کی جبروتی ذہنیت اور سرکشی پاش پاش ہو جاتی ہے۔

وعظ کا دوسرا رکن یہ ہے کہ واعظ لوگوں کو نظام شرعی کی پابندی کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے مفاسد ونقصانات سمجھائے۔ معاشرتی زندگی میں نظام کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے مفاسد بیان کرتے وقت ماوراء العقل کلیات بیان کرنے سے گریز کر کے زیادہ تر جزئیات اور فروعی باتوں کا ذکر کرے اس طرز خطابت کا فائدہ زیادہ حاصل ہوگا۔

وعظ کا تیسرا رکن یہ ہے کہ اپنی تقریر وبیان میں دل نشین تشبیہات اور اثر آفریں استعارات اور اصناف سخن میں سے مجازات استعمال کرے اور اپنے بیان میں اسے بلند و عالی افکار وخیالات کو پیش کرے جو لوگوں کے دلوں کو تسلیم ورضا پر مجبور کریں اسے چاہیے کہ وہ مسلمات اور مشہور روایات سے تمسک کرتا رہے۔

معلم الخیر کے اقسام

معلم یا تو براہ راست (الہام کے ذریعہ) عالم غیب سے علم حاصل کرتا ہوگا، اور غیب سے منصب تبلیغ وتعلیم پر مامور ہوگا، یا کسی ایسے ہی دوسرے معلم الخیر کے فیض صحبت کا

تربیت یافتہ ہوا اور اس سے سب الہامی علوم وفنون غور وفکر اور بحث ونظر کی کامل ترین شکل میں حاصل کر چکا ہوگا، اور ان وجوہ سے پوری طرح باخبر ہوگا جس کا قصد معلم اول کر چکا تھا، اور جن پر اس کی تعلیم کی بنیاد قائم ہے اس کو اسے معلم اول سے وہی نسبت ہوگی جو مجتہد فی المذہب کو مجتہد مطلق سے ہوتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ معلم خیر اس معلم اول سے راوی کے درجہ میں ہو، جو اپنے شیخ کے اسباق ودروس کے پوشیدہ اسرار کا علم رکھے بغیر اس کی باتوں کو بلاکم وکاست روایت کرتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر چہ شریعت حقہ انبیا سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہے لیکن اس کی شرح (احکام) اسے قانونی شکل دینے اور اس کی اقامت واجرا کی صورت ہمیشہ مختلف رہی ہیں۔ اب جس کو (شریعت حقہ کی بنیادی اور اصلی صورت یعنی) اسلام وسنت ثابتہ کا تفصیلی علم حاصل ہوا اور ان میں ہر بات کی اصل وماخذ معلوم کر سکا تو اسے علم نبوت کے بعد دوسرے اعلیٰ ترین قسم کے علم پر فائز ہونے کا شرف حاصل ہوا اور جس نے سنت محمدیہ کو شریعت حقہ کے استناد کے بغیر پالیا (یعنی وہ نہیں جانتا کہ مسائل کے ماخذ کیا ہیں تو وہ اگر چہ اس رتبہ عالیہ سے محروم رہا پھر بھی اس کا وجود غنیمت ہے۔ ہمارے نزدیک ان دو درجوں کے بعد علما کا تیسرا درجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد متعلمین کے مراتب شروع ہوتے ہیں۔ علما اور طلاب علم دونوں کے متعلق بہت سے اصولی اور فروعی آداب ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو اختصار کے اس دائرہ سے ہم آگے نکل جائیں گے۔ جس کی شرط ہم نے اس کتاب میں لگادی ہے۔ (اس لیے اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

سترھویں فصل

متولی ونقیب کے آداب وفرائض

ضروری ہے کہ متولی یا نقیب اپنی قوم کا عادل ومعتبر آدمی ہو جو اپنی قوم کے مصالح و مفادات اور مفاسد ومضرت رساں امور کو اچھی طرح جانتا ہو، اسے اپنی قوم کی حالت کا علم ہو اور جن حالات سے اس کی قوم دوچار ہے ان حالات (کے اسباب ووجوہ) میں دوررس نگاہوں سے کام لینے والا ہو۔

اموال متروکہ کی مناسب تقسیم

نقیب شہر کے فرائض میں سے ایک فرض یہ ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے اور مال چھوڑ جائے وہ اسے مناسب مصرف میں لگادے کیونکہ عدم تقسیم یا عدم صرف کی صورت میں مال کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو جس وقت متولی مال متروکہ تقسیم کرے تو دو باتوں کا خیال رکھے۔

پہلے یہ کہ اس مال سے وہ لوگ مستفید ہوں جو مرنے والے کی زندگی میں اس کے شریک رنج وراحت رہے ہوں۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مددگار اور نفع رساں ثابت ہوئے ہوں نیز میت ان کے ساتھ سچی ہمدردی اور محبت حقیقی کے روابط میں منسلک تھا اور وہ مالی لین دین اور مبادلات کے ذریعے ایک دوسرے کی اعانت کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ ان لوگوں کا حق ہے جن کے متعلق یہ گمان غالب ہو کہ اگر میت زندہ ہوتا اور اسے مال کی خود ضرورت نہ ہوتی اور اس سے پوچھا جاتا کہ اس کا مال کن لوگوں کو دینا مناسب ہے تو وہ انہیں کی طرف اشارہ کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال کا اصل مالک تو میت ہی ہے۔ اور تقسیم کا اختیار اسی کو حاصل ہونا چاہیے۔ (لیکن یہ اور بات ہے کہ وہ اس مال میں اس وقت تصرف کرنے پر قادر نہیں ہے) علاوہ ازیں جب اقربا اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسروں کو مال متروکہ دیا جائے گا تو ان کے دلوں میں (میت کی زندگی میں اس سے اور میت کے بعد

دوسرے وصول کنندگان سے) عداوت اور دشمنی پیدا ہوگی۔بعبارت دیگر زندگی میں مواساۃ و غمگساری اور تعاون وتناصر کی حقیقت میت کے مال سے دولت مند ہونے کی امید سے وابستہ ہے مگر جب یہ گمان پیدا ہو جائے کہ مرنے والے کا مال دوسروں کو دیا جائے گا تو رشتہ داروں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوگا کہ ان سے اپنا ہی مال زبردستی چھین لیا گیا ہے۔

یہ جو قاعدہ ہم نے اوپر بتایا اس کے مطابق اجمالاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرابت کی ترتیب میں سب سے مقدم اولاد ہے۔اس کے بعد ابوت کا رشتہ ہے۔ پھر زوجیت کا تعلق ہے۔ بعد میں بھائی اور چچے کا رشتہ ہے، پھر اس اجمال کی تفصیل اشخاص کے اختلاف حال کے ساتھ مختلف رہتی ہے جس کو ضبط تحریر میں لانا دشوار ہے۔

فقرا و مساکین کی اعانت

نقیب کا یہ بھی فرض ہے کہ جب اس کی عملداری میں کوئی مہمان یا فقیر و مسکین داخل ہو جائے اور وہ روزی کے اکتساب سے عاجز ہو تو اس صورت میں لوگ (خود اپنی مرضی سے یا بذریعہ ٹیکس) چندہ کر کے معقول رقم جمع کریں اور اسے (فقرا، مساکین اور مہمانوں پر خرچ کرنے کے لیے) اس کے حوالہ کریں۔

نیز اس میں معاشرہ اور آبادی کی پُر امن زندگی کے لیے بے شمار فائدے مضمر ہیں کیونکہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تمدن کی یہ حالت ہو اور وہاں اس قسم کے حاجت مندوں کا ورود و وجود نہ ہو اور جب ان کے فقر و افلاس اور خورد و نوش یا سر چھپانے کی ضروریات کا انتظام نہ ہو تو وہ شدت احتیاج سے تنگ آئیں گے اور تخریبی کاموں میں پڑنے اور غیر اخلاقی باتوں کے ارتکاب سے کبھی گریز نہیں کریں گے۔ اور اس طرح چوری، ڈاکہ زنی، قتل و زنا وغیرہ جرائم ہوں گے) اسی ہمدردی اور ایثار پر آمادہ کرنے والی دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں ابنائے نوع انسانی سے سخاوت و مہربانی کا جذبہ رکھا گیا ہے اور وہ سخاوت اور ہمدردی کو مستحسن بھی سمجھتا ہے۔

چونکہ ہر وقت اس قسم کا سرمایہ جمع کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے ارتفاق ثالث (یعنی حکومتوں کے ارباب حل وعقد) کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کا مناسب اور بہترین وقت غلّہ اور

فصل کے اٹھانے کے دن ہیں۔

ناتواں مسافروں کی دست گیری

نقیب کا یہ بھی فرض ہے کہ جب وہ کسی سفر پر قوم کے ساتھ ہو تو سب سے کمزور مسافر کی حالت کو ملحوظ رکھ کر چلے اور عام طور پر کمزوروں اور پیدل چلنے والوں کا خاصا خیال رکھے اور ان کا بوجھ ہلکا کر کے ان کی دست گیری کرے (وہ سردار قوم کی حیثیت سے خادم قوم ہوتا ہے)۔

ضروری اجتماعی اداروں کی تشکیل و تعمیر

نقیب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب اس کی قوم تمدن کی اس اونچی منزل (ارتفاق ثالث) پر پہنچ کر زندگی بسر کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ شہر کے اردگرد فصیل تعمیر کرائے اور شہر کے عین وسط میں بازار بنوائے جس کا فاصلہ اور فائدہ شہر کے سب گوشوں کے لیے یکساں ہو۔ جو لوگ قریبی رشتہ دار یا ایک قبیلہ کے ہوں یا ایک ہی پیشہ سے منسلک ہوں ان کی آبادی علیحدہ ہو، چوپال یا مرکز کی طرح ان کے لیے ایک جائے اجتماع بھی ہو جس میں بوقت ضرورت وہ اکٹھے بیٹھ سکیں۔ شہر کے قریب کوئی ایسا میدان ہونا چاہیے جس میں وہ خود بھی اجتماعی رنگ میں جمع ہو سکیں) مثلاً عید کی نماز پڑھ سکیں، یا کوئی اجتماعی تقریب منعقد کر سکیں اور جہاں ان کے چوپائے بھی پناہ لے سکیں۔ ہر محلّہ میں ایک مسجد ہو جس کے ساتھ (وضو اور غسل کے لیے) پانی وغیرہ کا انتظام ہو، ہر محلّہ کی مسجد میں امام، مؤذن وغیرہ کا انتظام بھی لازم ہے۔ نیز ہر ایک محلّہ میں ایک درس گاہ ہو جس میں اس محلّہ کے بچوں کو تعلیم دی جائے اور پڑھانے کے لیے قابل اساتذہ بھی میسر ہوں۔

بعض علما نے امور مذکورہ (مسجد، درس گاہ، اساتذہ وغیرہ کے انتظام) کو معلم الخیر کے فرائض میں سے شمار کیا ہے۔

مرجع العوام عند النوائب

بہرحال قوم کو جو بھی مشکل پیش آئے وہ اپنے سربراہ یا متولی کی طرف رجوع کریں اور اس کی اعانت حاصل کریں۔

اٹھارھویں فصل

امام کے معاون

معاونوں کی ضرورت اور بنیادی شرائط

چونکہ امام ان سب مصالح اور امور خلافت کو تنہا انجام نہیں دے سکتا اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام تمدن کے ان شعبہ ہائے پنجگانہ میں سے ہر ایک شعبہ کے لیے معاونین مقرر کرلے، معاونوں کے لیے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ وہ عادل ہوں ان میں مفوضہ شعبہ کے چلانے کی پوری قابلیت ہو اور ظاہر و باطن میں امام کی ہدایات کے پابند اور احکام کے فرماں بردار ہوں اور کسی قسم کی روگردانی اور اعراض نہ کرتے ہوں۔ (جو معاون ان مذکورہ اوصاف سے متصف نہ ہو وہ اس لائق نہیں کہ اس کا تقرر کیا جائے) اور جو معاون تقرر کے بعد ان شرائط میں سے کوئی شرط کھو بیٹھے تو وہ منصب سے ہٹائے جانے کا مستحق ہے (اسے ہٹانا چاہیے) کیونکہ اگر امام یا بادشاہ اس کو منصب سے نہ ہٹائے تو نظام میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو معاونین کی حیثیت سے تقرر نہ دیا جائے۔ (جو نہایت ہی بارسوخ واثر والے ہوں اور) جن کو معزول کرنا مشکل و دشوار ہو یا امام پر بوجہ قرابت داری یا احسان ان کے کچھ حقوق عائد ہو چکے ہوں جن کے پیش نظر بعد میں انھیں منصب سے معزول کرنا اخلاقاً مناسب نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ امام، صاحب استطاعت ہے تو اس قسم کے لوگوں کے ساتھ اپنی ذاتی جائیداد سے یا کسی اور مناسب طریقے پر احسان کرے۔

امام یا بادشاہ کے سات معاون

امام کو نظام حکومت چلانے کے لیے سات معاونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ساتوں معاونوں کے اوصاف لازمہ یہ ہیں کہ وہ وفادار و فرماں بردار ہوں، خیر خواہ اور

خیر اندیش ہوں، (استعداد و صلاحیت کے ساتھ ساتھ) امام سے بے پناہ دلی محبت رکھتے ہوں۔ یہ سات معاون درج ذیل ہیں:

(۱) وزیر (وزیر اعظم) جو تمام ماتحت حاکموں کے لیے ذمہ دار ہوگا، اسے لوگوں سے اموال جمع کرنے اور ان کو مناسب طور پر شعبوں میں تقسیم و خرچ کرنے میں ماہر ہونا چاہیے۔ اور نظام ملک میں اقتصادیات آمد و خرچ وغیرہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔

(۲) امیر الغزاۃ سپہ سالار اعظم (یا کمانڈر ان چیف) جو غازیوں اور مجاہدوں کو جمع و منظم رکھنے کا ذمہ دار ہوگا۔ کمانڈر ان چیف کو فوجوں کے حالات و کوائف زندگی کے بارے میں پوری معلومات ہونے چاہئیں۔ اور ان کو باہمی الفت و مودت کے رشتہ میں پرونے میں پُر وقار ہونا چاہیے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پاس کتنی مسلح فوج ہے اور ہر ایک فوجی (یا فوجی یونٹ) کی حربی صلاحیت کیا ہے۔ اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے ان کی استعداد کتنی ہے۔

(۳) امیر الحرس (پولیس جرنیل) جس کا فرض منصبی یہ ہوگا کہ وہ (لوگوں کی جانوں، مالوں اور آبروؤں کی حفاظت کرنے کے لیے) شہر و ملک کے ظالموں اور تعدی کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھے اور ان کے ظلم و جور اور طغیان و سرکشی کے خلاف (قانونی چارہ جوئی اور) تادیبی کارروائی سے گریز نہ کرے۔

(۴) قاضی (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) جو لوگوں کے مقدمات اور خصومات کے فیصلہ کرنے کا ذمہ دار ہوگا بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس بات کا پابند بنائے کہ وہ اپنے معاملات اور عقود اور معاہدہ بھری مجلسوں میں منعقد کیا کریں۔ جن میں عقد کے لیے گواہ، گواہوں کے تصدیق کرنے والے معتمد لوگ اور عقود کی جملہ شرائط کو دستاویز کی شکل میں ترتیب دینے والے کاتب (یا عرضی نویس) موجود ہوں۔

(۵) شیخ الاسلام: جس کا فرض منصبی یہ ہوگا کہ وہ اقامت دین اور اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کے اہم شعبوں کا انتظام کرے۔ اس کے ساتھ رفقائے کار اور معاونین بھی ہونے چاہئیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقدس فرض کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔

(۶) حکیم (ناظم علوم ادبیہ وطبیہ) امام کے دربار میں ایک ناظم علوم افادیہ ادبیہ

وطبیہ بھی ہونا چاہیے جو (علوم وفنون متداولہ مثلاً) علم طب، فن شعر وشاعری، علم النجوم، تاریخ، حساب اور انشا وادب سے واقف ہو۔ مشاہدہ سے یہ امر واضح اور ثابت ہے کہ امام کو اپنے دربار میں ان علوم کی (اور اس قسم کی شخصیت کی) ضرورت محسوس ہوتی ہے (جو ان علوم وفنون سے باخبر اور ان کی صحت واصلاح، تعلیم وتعلم اور درس وتدریس پر قادر ہو)۔

(۷) وکیل (خان ساماں وناظر خانہ) اس کا اپنا ذاتی وکیل اور خان ساماں ہونا چاہیے۔ جو اس کے آمد وخرچ کے حسابات کی نگرانی کرے یہ اس لیے ضروری ہے کہ امام رعیت کے امور اور نظام حکومت میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ وہ اپنے معاشی مسائل کی طرف ذاتی توجہ مبذول نہیں رکھ سکتا اور اس طرح بے انتظامی کی وجہ سے اس کے معاشی وسائل کے استحکام میں خلل پڑتا ہے۔

معاونین پر کڑی نگرانی رکھنا، امام کا فرض ہے

امام کو اپنے نائبین اور معاونین سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ ہر روز، دو روز (یا مناسب وقفوں) کے بعد ان عہدہ داروں کے حالات اور کارکردگی کے بارے میں پوچھا کرے اور اپنی ذاتی رائے اور عقل وفراست کے ساتھ ان کی مناسب رہنمائی کرے۔ ان کو بے لگام آزادی نہیں دینی چاہیے اگر ان کی کارکردگی اور فرض منصبی کی ادائیگی واضح طور پر اچھی ہے تو ان سے خوشنودی کا اظہار کر کے ان کی قدر افزائی کرے تا کہ وہ مزید بہتر کارکردگی دکھانے کی سعی کریں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو ان کی اصلاح کے لیے مؤثر زجر وتوبیخ سے کام لیا جائے۔

اگر کسی شخص کے متعلق امام کو یہ خوف ہو کہ عالی منصب ملنے پر اس کا مزاج بگڑ جائے گا اور طوق اطاعت پھینک دیگا تو ایک بہتر تدبیر یہ ہے کہ اس کے سپرد محکمہ اور منصب کو مصلحت کے مطابق دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے سپرد کرے۔ اس طرح کی باغیانہ کیفیت مزاج کی شدت ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

امام اور معاونین امام کی تنخواہ قوم کے ذمہ واجب

چونکہ امام اور اس کے ساتھ کام کرنے والے عہدہ داروں نے اپنی زندگیاں قوم کی

خدمت اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف کر رکھی ہوتی ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ان کے لوازم حیات اور معاشی حاجتوں کا بوجھ قوم پر ڈالا جائے ان کی مثال اجیروں (اُجرت پر مزدوری کرنے والوں) کی ہے جو قوم وملت کے لیے مفید خدمات انجام دے کر اس کا معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عام لوگوں سے مالیہ (اور ٹیکس) وصول کرنے کی ضرور پڑ جاتی ہے تاہم ٹیکس کی شرح ومقدار معین کرنے میں امام ظلم و جور سے اجتناب کرے اور عدل وانصاف (اور احسان وشفقت) سے کام لے تاکہ کسی کے لیے اس کا ادا کرنا بارگراں اور ناقابل برداشت نہ ہو۔بہتر تو یہ ہوگا کہ مالیہ کی وصولی کا ایک مقرر ضابطہ ہو (جسے ہر خاص وعام جانتا ہو اور) جو ایک طرف معاونین کے اخراجات کے لیے کافی ہو،اور دوسری طرف عوام کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔

ایسا قاعدہ یا قانون ہر جگہ اور ہر قوم کے لیے یکساں نہیں ہوسکتا۔کسی جگہ طریقہ وصولی ایک قسم کا ہوگا اور شرح ومقدار بھی مخصوص ہوگی اور دوسری جگہ طریقہ اور شرح ومقدار مالیہ کی دوسری صورت ہوگی (بارانی اور نہری زمین کی پیداوار میں فرق قدرتی امر ہے۔اسی طرح شہری اور بدوی زندگی میں فرق بھی واضح ہے)۔

امام کو چاہیے کہ ایک بیت المال بنائے جس میں مالیہ وغیرہ وصول کردہ اموال کو بحفاظت جمع کرسکے اور ان میں سے بوقت ضرورت مناسب طریقہ پر خرچ کرسکے۔

امام کے لیے بہترین ذریعۂ معاش

بہتر یہ ہے کہ امام بیت المال یا سرکاری خزانہ سے لینے کے بجائے ایک غیر آباد زمین منتخب کرے جس کو آباد کرا کے اس کی آمدنی ذاتی ضروریات میں صرف کرے اسی طرح اس کے پاس چوپاؤں کے ریوڑ ہوں اور ان سے فائدے حاصل کرے کیونکہ یہ اس کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش اور سودمند ذریعہ ہے۔اور قوم کے لیے بھی آسان اور قابل برداشت ہے۔

جب امام کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے عزیز واقارب اس کی حمایت اور آمدنی کے لیے دل وجان سے حاضر ہیں تو ان کی قدردانی میں کوئی کسر باقی نہ رکھے کیونکہ دوسروں کی نسبت قرابت داروں کی اعانت دوچند اعتماد کی موجب بنتی ہے۔

انیسویں فصل

(ارتفاق رابع)

خلیفۂ اعظم کی ضرورت

جب ہر ایک سربراہ کو کسی ایک شہر یا متعدد شہروں میں انفرادی حیثیت واقتدار حاصل ہوجاتا ہے اور لوگوں کے اموال وذرائع دولت اس کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اور جنگجو اور شجاع افراد اس سے محبت وحمیت کے جذبے سے سرشار ہوکر اس پر جان نثار کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ تو ہوس ملک گیری اور باہمی بغض وعداوت ان کے اندر بھڑک اٹھتی ہے۔ اور سربراہوں کے درمیان کشمکش اور لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں اس طرح (بیش قیمت) انسانی جانیں فنا اور اطمینان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ اور تہذیبی اور تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں زبردست خلل وفساد پیدا ہوتا ہے اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ان سربراہوں میں ایک خلیفۃ الخلفا ہو جس کے پاس اتنا ساز وسامان ہو، اس کی حمایت کے لیے اتنی صاحب حمیت رعیت ہو، اس کے لشکر میں اتنے بہادر جمع ہوں کہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ ناممکن ہو کہ اس سے حکومت وامامت بزور شمشیر چھین سکے۔ اور اگر کسی طرح یہ فرض بھی کیا جائے کہ اس کا اقتدار چھین سکتا ہے۔ تو یہ صرف اس صورت میں ممکن ہوگا۔ جب کوئی بڑا فتنہ بپا ہوجائے اور اس کے خلاف مختلف علاقوں میں بار بار بڑے ہنگامے برپا ہوں۔ اور مخالف بے دریغ مال ودولت خرچ کرے اور بہت سخت مشقت اور بڑی جدوجہد سے کام لے تب ہوسکتا ہے کہ اس قسم کا کوئی مخالف امام سربراہ کو منصب سے ہٹا کر تختِ حکومت پر بیٹھ جائے۔ اور یہ طرز حکومت (یعنی خلیفۃ الخلفا) یا اس کے خلاف اسی طرح کے واقعات ہر جگہ یکساں نہیں

ہوتے بلکہ اشخاص اور عادات کے اختلاف کی بنا پر اس کی صورتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔

جب یہ چھوٹے چھوٹے امیر اور حاکم خلیفہ نصب کرنے کے معاملہ میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں اور کسی ایک کو خلیفۃ الخلفا مقرر کرنے پر طوعاً و کرہاً کسی صورت میں متفق نہ ہو سکتے ہوں تو یہ (طوائف الملوکی یا فوضویت) لاعلاج مرض ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کوئی ایسا قاہر و جابر شخص پیدا کرے جس کو تائید غیبی حاصل ہو اور طالع سعید اس کا معاون ہو۔ اور اس کے دل میں اس طوائف الملوکی کے خلاف غیظ و غضب کی زبردست آگ بھڑک اٹھتی ہو۔ اور وہ اپنی جاذب شخصیت و شجاعت کی بدولت زبردست جنگجو اور فرماں بردار فوج تیار کر کے ان سربراہوں کے خلاف برابر جہاد کرے۔ اور زمین کی انتہائی سرحدوں اور دور دراز گوشوں میں بھی ان کی سرکشی کو پاش پاش کرے، مگر یہ صورت ہر آن پیش نہیں آتی، اس لیے ضروری ہے کہ سربراہان ممالک اسلامیہ ارتفاق رابع یعنی بین البراعظمی اور بین المملکی سطح پر حکومت کے طریقے اور خلیفۂ اعظم کے انتخاب و تقرر کے اصول و آداب کی پابندی کریں۔ تاکہ نوع انسانی کے تمدن زندگی میں فساد پیدا نہ ہو۔

خلیفۂ اعظم کے آداب و اخلاق

خلافت عظمیٰ نہایت ہی سخت کٹھن اور مشکل کام ہے اس لیے اس پر جو شخص فائز ہوگا اسے اخلاق فاضلہ کے زیور سے بدرجۂ کمال و تمام آراستہ ہونا چاہیے۔

اسے چاہیے کہ ہر صوبہ یا ہر حصۂ خلافت کی طرف کسی کو امیر اور حاکم بنا کر بھیجے اور دیکھے کہ اس کا حاکم غیب و شہود ہر حالت میں اس کا بہی خواہ ہو اور اس کا قلب و دماغ اپنے خلیفۂ محسن کی محبت سے لبریز ہو۔ جب وہ اپنے کسی حاکم کو اعراض و بے رخی پر آمادہ دیکھے تو فوراً اس کو راہ راست پر لانے کے لیے مناسب تادیبی سزا دے اور زجر و توبیخ سے کام لے۔

خلیفہ اعظم کو چاہیے کہ وہ اپنی فوجوں کے فرائض و لوازم کو معین اور منضبط رکھے۔ استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے بڑے بڑے دو فرض ہیں:

(الف) بنیادی فوجی اور عسکری خدمات و فرائض یعنی بادشاہ یا امام یا حکومت کے

لیے (دشمنوں سے جزیہ یا مال غنیمت اور رعایا سے مالیہ وغیرہ) تحصیل اموال۔ اور

(ب) مملکت کو (اندرون وبیرونی ایسے باغیوں سے جو گروہ بندیوں کے عادی ہوتے ہیں، محفوظ رکھنے کے لیے جہاد و جنگ کرنے کا فرض۔

خلیفہ ان فرائض کو بھی متعین اور منضبط رکھے جو فوج سے متعلق نہیں یعنی پولیس، تعلیم وتربیت، قضا وانصاف اور احتساب اور نگرانی کے محکمے، ہر ایک محکمہ جو فوج سے متعلق نہیں اس کے انتظام کے لیے ایک قابل واقف کار شخص ایسا مقرر کرے جو عادل بھی ہو اور لوگ بھی اس کے تقرر پر راضی ہوں اور وہ قوم میں سیادت اور عزوجاہ کے مالک ہوں۔

(یعنی مناسب یہ ہے کہ امام نظم حکومت کے غیر فوجی شعبوں کے انتظام کے لیے بھی ایسے قابل آدمی مقرر کرے جو اپنے فرائض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس صورت میں تعلیم وارشاد، افتا وقضا، اور نقابت وحسب وغیرہ ہر ایک شعبہ کے لیے جداگانہ قابلیتوں اور استعدادوں والے اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ یہ ایسے اشخاص ہوں جو لوگوں کی نظر میں پسندیدہ ہوں کسی معزز و بااثر خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور قابل افراد ہوں)

ان سب شعبوں کے عہدہ داروں سے حلفیہ بیان اور سخت غلیظ قسم لیا جائے کہ وہ کبھی سیف وتفنگ کا استعمال نہ کریں گے اور اگر صاحب الحسبۃ اور پولیس کو بھی کسی سے قصاص لینے اور راہزنوں کو پھانسی پر چڑھانے کی ضرورت پڑے تو یہاں بھی وہ ہتھیار کا استعمال فوج کے سربراہ کی مدد اور اس کی اجازت کے بغیر نہ کرے گا۔ (یعنی ہتھیار کا استعمال اصولاً فوج تک محدود ہو)

خلاصہ یہ کہ فوج کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے یہ گنجائش نہ چھوڑے کہ وہ ہتھیار اور اسلحہ سے کام لیں۔ (تاکہ فوجی ٹریننگ تنظیم اور ضبط وغیرہ میں کوئی فرق نہ آئے)۔

اور اگر کہیں یہ نظر آئے کہ کسی شخص کے اردگرد لوگ بکثرت جمع ہونے لگے ہیں۔ تو امام کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ بغیر کسی تاخیر یا تضیع وقت کے اس کے حلقہ کو توڑ ڈالے اور اس کی موہوم بغاوت کے اسباب ووسائل کو ختم کر کے سانس لے۔

جب وہ مطلوبہ بنیادی خدمات کے لیے فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دے تو اس کو یہ بھی چاہیے کہ ان سب پر کڑی نگرانی رکھے اور جاسوسوں کا جال پھیلا کر صورت حال

سے مطلع رہے اور اس معاملے میں پوری فراست اور تدبر سے کام لے۔ پھر جب کبھی کسی کی طرف سے خلافت کے منصب پر خود فائز ہونے کی طلب یا خلیفہ کی مخالفت کے آثار دیکھے تو امام کو چاہیے کہ وہ (اس کی اس مذموم کوشش کو ناکام بنادے اور) اسے کیفر کردار تک پہنچاوے۔ جب کسی فرد یا افرادِ لشکر کے پاس (معاندانہ) محفلوں کا انعقاد ہو (جس سے اندیشہ ہو کہ امام کے خلاف سازش یا بغاوت پر آمادہ ہوں گے) تو ان کی ہمت شکنی اور استیصال قوت کے لیے مدمقابل اور مخالف کی حیثیت سے کوئی دوسرا گروہ ایسا کھڑا کرنا چاہیے کہ ان کے آپس میں اختلافات اور لاینحل مناقشات ایسے ہوں کہ وہ انہی میں الجھ کر رہ جائیں اور عادتاً یہ ناممکن ہو کہ یہ دونوں گروہ امام کے خلاف ریشہ دوانیوں اور منصوبہ بندیوں کے لیے آپس میں متفق ہوسکیں۔

یہ وہ آداب ہیں جن کو انعقادِ خلافت کے بعد ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ رہا تحصیل منصب خلافت کا مسئلہ، تو اس میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہوسکتی جب تک بڑے بڑے سر برآوردہ لوگ مدبرین سیاست اور سپہ گری اور امور حرب کے ارباب بصیرت اس کے ساتھ مل کر پُرخلوص اعانت نہ کریں۔ اور وہ سب اس کی فضیلت و برتری کے قائل ہو کر اطاعت نہ کریں۔ اور جب تک اس کی حمایت کے لیے دو تلواریں نہ ہوں۔ یعنی ایک سیف القہر (غلبہ اور جنگ کی تلوار) جو دشمن کو نیست و نابود کرتی ہے اور دوسری سیف المحبت (محبت کی تلوار) جو دشمنوں کو احسان اور حسن سلوک کی بیڑیوں میں جکڑ کر زیر کرتی ہے۔

امام کو ان دونوں سے بوقت ضرورت کام لینا اور ان دونوں کو واضح طور پر سامنے لانا چاہیے (کہ اس میں قہاریت اور غفاریت دونوں اوصاف کی جھلک موجود ہے)۔

بیسویں فصل

تحقیق حقیقت رسم اور بہتر رسوم کا بیان

(اس موضوع کا تعلق ارتفاق ثانی وثالث کے قواعد کلیہ کے بعد کے مباحث سے ہے)

تقلید فطری خاصہ ہے

نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کی یہ بھی ایک بڑی عنایت ہے کہ ان کی سرشت میں تقلیداً اخلاق اور ارتفاقات قبول کرنے کا مادّہ رکھا ہے (کہ وہ دوسروں کے طریقوں اور عملی تدبیروں، اور اچھے نمونوں کی پیروی پر قادر ہیں۔ اور ان کی نقل اتار سکتے ہیں ورنہ) اگر انسانوں کو اپنی حیوانی طبیعت پر آزاد چھوڑ دیا جاتا اور ان میں سے کوئی بھی کوئی عمل اس وقت تک انجام نہ دے سکتا جب تک اس کی طرف اس کی فطرتِ انسانیہ، علوم الہامیہ واکتسابیہ، تجارت ذاتیہ ونوعیہ اور اس کے ملکات واخلاق اس کی رہنمائی نہ کرتے اور وہ کسی کی تقلید نہ کرتا، تو ان پاکیزہ اخلاق اور بہترین وجوہ معاش وارتفاقات کا سراغ انسان کو یکے بعد دیگرے (گاہ گاہ) ملتا (صرف اِکے دُکے افراد ان سے مستفید ہوتے) اور دنیا کے عام لوگ ارتفاقات کو عام کرنے سے محروم رہتے۔ بلکہ انسانوں کی اکثریت بہیمی سطح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صرف بہیمی طبیعت پر آزاد ومہمل نہیں چھوڑا بلکہ اس نے ان کی عقلوں کو آئینوں کی طرح اس قابل بنایا کہ دوسروں کا علم، تجربہ اور مختلف علمی وعملی تدبیروں کی صورتیں ان میں منعکس ہوتی ہیں اور وہ ان کے مطابق تقلیداً اسی قسم کے اعمال صادر کرتے رہیں۔ اگرچہ ان کو اخلاق وارتفاقات کا راز اپنے اکتسابی علوم کے ذریعہ معلوم نہ بھی ہوا ہو۔

ائمہ ومقلدین

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو (اُن) ہفت گانہ اخلاق فاضلہ سے کامل طور پر متصف ہیں (جن کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے) فطری طور پر ائمہ اور سیادت وقیادت کا حقدار بنایا ہے اور باقی سب لوگوں کو بالطبع اُن کا مقلّد اور مطیع وفرماں بردار بنا دیا ہے۔اور جب تک کوئی رسم فاسد ان کی طبیعتوں میں کوئی تغیر فاسد پیدا نہ کرے، ائمہ ومقلّدین کی یہ تقسیم برابر جاری رہے گی (اصحاب اخلاق سبعہ ہمیشہ امام رہیں گے اور باقی لوگ پیروکار مقلّدین)۔

تقلید ورسم کی پابندی خاصۂ حیوانی ہے

دوسروں کی یہ پیروی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف انسان کے لیے خاص ہے۔اگر بنظر امعان وتحقیق دیکھا جائے تو رسم وتقلید سے چوپائے بھی خالی نہیں ہیں۔مثلاً ایک کبوتر کو دیکھ کر دوسرا کبوتر بھی وہی کرتا ہے۔اور اس کی مثال کی تقلید کرتا ہے۔یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے کہ جس حالت پر کبوتر نے اپنے دوست کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس کی تصویر اس کے تختۂ ذہن پر منقوش ہوتی ہے، اسی نقشہ نے اس میں اس کام کا شوق پیدا کیا ہے۔

پابندی رسم ورواج تہذیب انسانی کے لیے ضروری ہے

رسم ورواج کی فطری پابندی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ تم بہت سے آدمیوں کو ان مروجہ طریقوں کے مطابق نکاح کرتے ہوئے پاؤ گے جن کا ذکر ہم تدبیر منزل کے مباحث میں کر چکے ہیں۔لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ نکاح کے ان مخصوص شرائط وحدود کی رعایت برتنے پر کس چیز نے تم کو آمادہ کیا؟ ہزار میں سے ایک بھی اس کا جواب سوائے اس کے نہ دے سکے گا کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔اگر نکاح کے شرائط وحدود میں سے کوئی ایک بھی نظر انداز ہو جائے تو لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں۔اس قسم کا شخص اگر آبائی رسم ورواج کا پابند نہ رہے تو وہ چوپاؤں کی سطح پر زندگی گزارنے پر اتر آئے گا۔

تقلید رسم کے لیے خارجی مؤید کا ہونا ضروری ہے

انسانی طبیعت میں رسم کا پابندی کے اس فطری داعیہ کے علاوہ رسم کے ساتھ پوری

وابستگی اوراس کی مکمل پابندی کے لیے خارجی مؤید کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ یا اس کی ابتدا کسی جلیل القدر سیاسی ہستی اور مقتدر بادشاہ سے ہوئی ہو جس کے اثر ونفوذ سے سب مرعوب اوراس کے سامنے سب سرنگوں ہوتے ہیں۔یا اس کی اجرا کسی ماہر حکیم اور روشن دماغ فیلسوف نے کی ہو۔(اور لوگوں کو یقین ہو کہ اس حکیم کا کوئی کام خالی از حکمت نہیں ہوتا)یا اس رسم کے اندر ایسی حکمتیں اور فائدے مضمر ہوں کہ اس کے چھوڑنے سے بیکراں نقصانات کا اندیشہ ہوتا ہے۔اور لوگوں نے بارہا اس کا تجربہ بھی کیا ہو کہ اس رسم کے چھوڑنے سے آپس کے تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔اور یا ان کا عقیدہ ہو کہ اس رسم کی پابندی نہ کرنے سے غیب سے عقوبت وعذاب نازل ہوگا۔

(یہی وجہ ہے کہ) ہر ملک وقوم میں گفتگو،لباس اور شادی بیاہ اور غم والم کے موقعوں پر مخصوص رسمیں ہوتی ہیں جنھیں لوگ ترک کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتے۔اور پھر ان رسموں اور رواجوں کا باہمی اختلاف اور تنوع ایک ایک شہر ایک ایک قبیلہ اور ایک ایک شاخ تک ممتد ہوتا ہے۔

الناس علی دین ملوکھم

تمدن کی نوعیت اور رسوم ورواج کے طریقے ہر معاشرہ کے مقتدا کی اُفتادِ طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً اگر کسی شہر میں ایسا سردار ہو جس کی بات مانی جاتی ہو (اور وہ علم وامن دوست ہو) اور لوگوں کو علم واخلاق اور رشد وہدایت کی تعلیم دے(اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اُن کو نیکی پر مائل رکھے) تو یہ معاشرہ (اور مدنیہ) مدنیہ راشدہ باصلاح معاشرہ) بن جائے گا۔لیکن اگر اس سید مطاع (مسلّم سردار) کی طبیعت میں جنگ وجدل کی طرف رجحان پایا جائے تو اس کی رعیت میں بھی جنگ جوئی اور لڑائی مار کٹائی کے رجحانات اُبھرتے ہیں۔اور اگر اس سردار کا شیوہ دوسروں کے سامنے جھکنے اور ذلت قبول کرنے کا ہو،تو یہ پورا معاشرہ اور مدنیہ ذلت وخواری میں مبتلا ہوتا ہے۔

افساد رسوم کے وجوہ واسباب

اگرچہ رسم ورواج کی ابتدا جب پڑتی ہے تو وہ اصل میں سرتاپا خیر ہوتا ہے۔کیونکہ ہر

اسم اخلاق فاضلہ اور ارتفاقات صالحہ کی حفاظت کے لیے رائج ہوتی ہے۔لیکن بعض اوقات بعض عوارض کے پیش آنے سے رسوم برائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔اس انقلاب وتبدیلی کے کئی وجوہ واسباب ہیں۔ان میں اسے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

۱- جب رسم کی پابندی سے مطلوبہ فضائل اخلاق کا ظہور ہی نہیں ہوتا۔مثلاً جب رسم کی بنیاد مناقشہ اور قومی تنازعہ یا قوم کے دلیروں اور قائدوں کی تقلید پر رکھی گئی ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے اور معتدل انسان کے اندر سماحت اور فیاضی اور سیادت وقیادت کی تخلیقی صلاحیتیں پیدا ہی نہیں ہوتیں، اس کے برعکس اگر اس رسم کی بنیاد سماحت وفیاضی اور سیادت وقیادت صالحہ پر اُستوار کی گئی ہو تو کج رو وکج خو آدمی کی فطرت پابندی رسم سے اس رسم کی پابندی رک جاتی ہے۔اور یہی حالت اس شخص کی بھی ہوتی ہے جو آفات سماویہ اور مصائب افلاکیہ کی زد میں آ کر نا قابلِ اصلاح معاشی زبوں حالی کا شکار ہو چکا ہو۔اس کی حالتِ زار کی اصلاح صرف اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ یا تو کسی کا تابع ہو کر اپنا گزارہ چلاتا رہے اور خرچ میں جزرسی اور دوسروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر مناقشہ کیا کرے۔ اسی طرح جب رسم کا انعقاد حد سے زیادہ داد ودہش اور بخشش واکرام پر مبنی ہو اور سخت طویل تکلیف ومشقت کے بعد بھی اس رسم کے تقاضے پورے نہ ہو سکیں، اسی طرح جب رسم کی بنا مسرفانہ لباس وپوشاک اور عیاشانہ شان وشوکت پر رکھی گئی ہو اور یہ رسمی ہوس پرست آدمی اپنی ظاہری پوزیشن کو قائم رکھنے کے لیے محافل ادب وشاعری اور مجالس طعام وقیام کا انتظام کرکے کثیر تعداد میں نوکروں، چاکروں کو رکھے۔(تو یہ رسوم بجائے خیر کے شر کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔اور ان کی اصلاح لازم ہو جاتی ہے)۔

۲- جب رسم بذاتِ خود اخلاق فاضلہ اور معقول ارتفاقات کے خلاف ہو مثلاً زنا اور ناجائز صنفی تعلقات کو رسماً قبیح وناشائستہ نہ سمجھا جائے یا (رسم وقانون کی رُو سے) لواطت وغلمان بازی کو روا رکھا جائے (جیسے یورپ کے اکثر ممالک میں زمانۂ حاضر میں عام ہے) یا مثلاً عورتوں کے لیے مردانہ پن اور مردوں کے لیے زنانہ پن قطعاً معیوب نہ سمجھا جائے۔ (جیسے عصر حاضر کی مغربی قوموں اور ان کے نقالوں کی تمدنی حالت ہے) اور یا وہ سب رسوم

جو غیر ضروری تکلیف و مشقت کی طرف لے جاتی ہیں اور زندگی کو غیر فطری اور تکلیف دہ بنا دیتی ہیں۔

۳- جب رسم قرب الٰہی کے ذرائع اور عبادات کے لیے باعث فساد ہو۔ اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب رسم کی بنیاد دنیاوی امور اور معاشی شعبوں میں انہماک واستغراق اور اللہ تعالیٰ (اور ملاء اعلیٰ کی روحانیات) سے اعراض پر رکھی گئی ہو۔

بہترین رسوم

(اس لیے) بہترین رسمیں وہ ہیں جن سے اخلاق درست ہوں اور تمدنی زندگی کی تدابیر نافعہ کی اصلاح میں مدومعاون ہوں۔ ان کا دائرہ اخلاق وسیع وکشادہ ہو جس کی پابندی کرنے سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اور نہ ان پر ایسا تمسک ہو کہ ان کو چھوڑنے پر معاشرے کے لوگ ناقابلِ برداشت حد تک سزا دینے اور ملامت کرنے سے دریغ نہ کرتے ہوں۔ ان کی بنا اعتدال ومیانہ روی پر ہو نہ وہ اسراف وفضول خرچی پر منتج ہو اور نہ ان سے انتہائی تنگی وعسرت کی حالت پیدا ہو، اہل حجاز کے ہاں زمانہ جاہلیت میں جو رسوم مروّج تھیں وہ افراط وتفریط پر مبنی تھیں، ہمارے ہاں اپنے ملک میں انیسویں صدی کے غیر منقسم ہندوستان کے) آباد شہروں میں رسمیں رفاہیت بالغہ اور تقشف بالغ میں کسی ایک پر مبنی ہوتی ہیں۔

معاشی رسوم کے مخالفین

جن رسموں کا تعلق معاش ومعیشت سے ہے اس کی مخالفت دو قسم کے اشخاص کر سکتے ہیں:

ایک تو وہ شخص جو صاحب عقل ودانش اور مالک عزت وقیادت ہو۔ اور وہ اپنی عقل خداداد اور عطا شدہ قابلیت سیادت کی بدولت ایک ایسی رسم ایجاد کر لیتا ہے جو رسم قدیم سے زیادہ اچھی، بہتر اور مفید تر ہوتی ہے (اور قدیم رسم کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے اس کو دیکھ کر اس کی ایجاد کردہ نئی رسم کو قبول کر لیتے ہیں)۔

دوسرا وہ شخص رسوم کی مخالفت کر سکتا ہے جو بدمعاش و بدقماش ہو، اور اس کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو۔ اور وہ اپنی بےشرمی و بیباکی کی وجہ سے دوسروں کے معیار مدح وذم سے آزاد ہو اور اپنے اخلاق میں کسی اصول، ضابطے یا معیار کا پابند نہ ہو۔ اس دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اذالم تستحیی فاصنع ماشئت یعنی جب کسی کا شرم وحیا تمہارے دامن گیر نہ ہو تو جو کچھ جی میں آئے کر گزرو۔

مگر ان دونوں مخالفت کے نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ اول الذکر یعنی صاحب علم و دانش کی ایجاد کردہ رسم نو کے محاسن لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اور لوگ اس کی اختیار کردہ رسم کی خوبیوں کو دیکھ کر قدیم رسم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر چہ کچھ عرصہ کے بعد کیوں نہ ہو مگر مؤخر الذکر تو اس کا مستحق ہے کہ اس کی خوب تذلیل کی جائے اور اس کو راہ راست پر لانے کے لیے وعظ وارشاد اور پند و نصیحت کی جائے اور اس کے اختیار کردہ غلط نمونہ رسم کو چھوڑ کر قدیم اچھی رسم سے وابستگی ظاہر کی جائے اور اس طرح لوگوں کے دلوں سے نئی قبیح رسم کی تصویر ہی مٹا دی جائے۔

جو شخص بادشاہ مطاع یا حکیم و دانا و مرشد یا اپنی قوم کا سردار ہو، اس پر فرض ہے کہ وہ اچھی اور بری رسموں میں فرق و تمیز کرے اور ہر رسم کے فوائد اور عیوب اسے معلوم ہوں اور لوگوں کو اس کا پابند کرے کہ وہ نیک رسم پر عمل کریں۔ اور بری رسم کو چھوڑ دیں اور جو لوگ اچھی رسموں کو بلاوجہ چھوڑنے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کریں، ان کو تنبیہ اور ملامت کرے۔ اگر وہ اس فرض منصبی میں سستی یا غفلت کرے گا تو وہ عظیم خیانت کا مرتکب ہوگا جس کے نتیجہ میں وہ معزول ہونے کا مستحق ہو جائے گا۔ اسی قبیل سے یہ مشہور مقولہ بھی ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین اور نقش قدم پر چلتے ہیں)۔ اس لیے جب بادشاہوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو لوگوں میں فساد و بگاڑ خود بخود پیدا ہوتا ہے (اس لیے سربراہوں اور بڑوں کو محتاط رہنا چاہیے کہ قولاً یا فعلاً دوسروں کے لیے کوئی بری مثال قائم نہ کریں)۔

رسموں کے اختیار کرنے یا ان کی پابندی کرنے میں لوگوں کے مختلف طریقے

اور مراسلے ہیں۔

ایک مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو اپنی رسموں میں اجرام فلکیہ، نجوم وغیرہ کے خواص و آثار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے نومولودوں کے نام ستاروں کے خواص و اثرات کو ملحوظ رکھ کر رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کا لباس و پوشاک بھی ان اثرات کے مطابق بدلا اور پہنا جاتا ہے، جیسے کہ اہل ایران کے نزدیک یہ مسلمہ رسم ہے چنانچہ بہرام و دلآرام کی داستان ہائے عشق سے ظاہر و واضح ہوتا ہے۔

دوسرا مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو ارواح مجردہ یا عقول (عشرہ و منیرہ) کے خواص اور ان کے سامنے انقیاد کو پیش نظر رکھ کر رسم اختیار کرتے ہیں جیسے کہ مجوس و آتش پرست کیا کرتے ہیں۔

اور تیسرا مکتبِ فکر ان لوگوں کا ہے جو خالص توحید الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حسنِ عبادت اور خلوص نیت کی بنیادوں پر رسموں کو اختیار کرتے ہیں (یہ انبیا اور مفہمین کا گروہ ہے)۔ انشاء اللہ اس کی مزید تشریح و تحقیق ''الملل'' کے ضمن میں کریں گے۔

اکیسویں فصل

نظمِ ارتفاقات کے وجوہ فساد و اصلاح

ان ارتفاقات میں دو وجہوں سے خرابی پیدا ہوتی ہے

ایک تو یہ کہ جو ہستی نظام ارتفاقات کو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے وہ ان کے قائم رکھنے میں اہمال (تساہل) اور غفلت برتے۔

دوسری یہ کہ ارتفاق ثانی کے نظام پر لوگوں کی رسم و رغبت بڑھ جائے اور ارتفاق اوّل کو نسیاً منسیا کر کے کلی طور پر پس پشت ڈال دیں یا ارتفاق ثانی کے آداب واصول کو پس پشت ڈال کر ارتفاق ثالث کو اس بھروسہ پر اختیار کریں کہ ارتفاق ثالث کا محافظ (حاکم) ارتفاق ثانی کے آداب واصول کو بہ جبر رائج کر سکے گا۔ بہر حال جو بھی وجہ یا سبب ہو، (ہر اونچے درجے کے ارتفاق کے فساد کے وقت اس سے نچلے درجے کے ارتفاق کا اہتمام ضروری ہے)۔ اگر ارتفاق رائج کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے تو لوگوں کی صلاح و خیر اس میں ہے کہ وہ نچلے درجے کی تہذیبی منزل یعنی ارتفاق ثالث کو اور خصوصاً اس کے ان آداب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں جو ارتفاقِ رابع کی اصولی حقیقت پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ شکل وصورت میں اس کا انعقاد نہیں ہوا۔ مثلاً جب کسی قوم کے افراد آپس میں کسی سنت عادلہ کی پابندی پر متفق ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی مخالفت کرنے سے فتنے برپا ہوتے ہیں اور آپس میں خوں ریزی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور اپنی توقعات سے زیادہ اُن پر مصائب وآلام ٹوٹ کر آپڑتے ہیں۔ قانون وسنت عادلہ سے انکار واعراض کے یہ نتائج دیکھ کر ان کے دل ودماغ اس بات پر پوری طرح مطمئن وآمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی خیر و بھلائی اسی سنت کی

پیروی میں ہے۔ اور خلیفہ اس نظام کا نگراں اور مشخص شکل اور پیکر ہے۔ جب اس مشخص پیکر میں خرابی واقع ہو جائے تو ضروری ہے کہ سنّت عالی کی بنیاد کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھیں۔ اسی پر ارتفاق ثالث کے نظام کو قیاس کیجئے کہ جب وہ خراب ہو جائے (اور کوئی حاکم نہ رہے تو) اس صورت میں ارتفاق ثانی کے آداب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنا چاہیے کہ او نچے درجے کا ارتفاق ثانی دراصل ارتفاق ثالث پر مشتمل ہوتا ہے۔ گو کہ تعبیر و تفسیر یا شکل وصورت میں ارتفاق ثالث ظاہر نہیں ہوا۔ اگر بفرض محال ارتفاق ثانی خراب ہو جائے تو ارتفاق اول کے آداب واحکام پر کاربند ہونا مناسب ہے۔ مثلاً جس قسم کا کھانا ارتفاق ثانی کے مطابق آدمی کو کھانا چاہیے اگر وہ میسر نہ ہو تو قرین مصلحت یہ ہے کہ دیر یا سخت اور موٹا کھانا ذخیرہ کر لیا جائے جیسے ملک حجاز میں ردّی کھجوریں اور ہمارے ہاں براعظم ہندوستان میں گاجر وغیرہ وقت ضرورت کے لیے جمع کر کے رکھے جاتے ہیں۔ جب ارتفاق تام یعنی ارتفاق ثانی کے مطابق کھانا میسر نہ ہو تو اسی (ذخیرہ شدہ خشک وردّی اشیائے خوردنی) پر اکتفا کیا جائے۔ سمجھ دار شخص تو ایسا ہی کرے گا لیکن کسی میں عقل کا فقدان ہے تو وہ جس ارتفاق کا عادی ہے اس کی نایافت کے وقت بھی اسی ارتفاق (مثلاً بہترین طعام) کی طلب کرتا پھرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پریشان وسرگرداں رہ کر آخر فاقہ کی موت مرے گا۔

اسی طرح ایک شخص فطرتاً قیادت وامامت کے لائق ہوتا ہے مگر کسی ظالم کے ظلم یا تمدن کے دوسرے عوارض کی وجہ سے وہ امامت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اپنی تدبیر معاش میں سمجھ دار ہے تو وہ بلا تاخیر ارتفاق ثانی کی سطح پر آ کر زندگی بسر کرنے لگے گا اور اس وقت کا انتظار کرے گا جب وہ دوبارہ زمام خلافت ہاتھ میں لے سکے۔ لیکن اگر وہ عقل وفراست کا مالک نہیں تو نامساعد حالات میں گھر کر بھی منصب پر فائز ہونے کی طمع میں مبتلا رہے گا اور امامت اس سے کوسوں دور بھاگتی ہوگی وہ اسی حالت طمع میں بھوک و پیاس اور دیگر مصائب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔ یہی کیفیت اس شخص کی بھی ہوتی ہے جس کا پیشہ جہاد اور سپہ گری ہے بسا اوقات سامانِ جنگ اس کے پاس مہیا ہوتا ہے لیکن ارتفاق ثالث کے مطابق ابھی جہاد اور جنگ کا موقع نہیں آیا۔ یہ مجاہد اگر صاحب عقل ودانش

ہے تو یقیناً وہ ارتفاق ثانی کی سطح پر آجائے گا اور ارتفاق ثانی کے صنائع وحرف پر مائل ہوگا۔ اور وقتِ مناسب کا انتظار کرے گا لیکن اگر وہ سمجھ دار نہیں تو (ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر) جہاد میں جانے کی تمناؤں میں ڈوبا رہے گا اور جہاد کا میدان اس سے دور ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ وہ اسی امید میں بھوک اور پیاس سے دوچار ہوکر جان دے دے گا۔

عربی میں کسی شاعر حکیم نے یہ مشہور شعر کہا ہے

اذا لم تستطع امرا فدعه

وجاوزه الی ما تستطیع

جب تو کوئی کام نہ کر سکے تو اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کر جسے تو آسانی سے کر سکے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی ایک کام کا موقع نہ ہو تو بہ مجبوری کسی اور ذریعہ معاش کو اختیار کرنا مناسب ہے۔

یاد رکھو یہ نہایت غلط رسم اور فاسد خیال ہے کہ ایک پیشہ کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرنا اور اپنے عادی طریقۂ معاش میں تنگی کرنا باعث شرم وعار ہے۔ اپنے پروردگار کے فضل سے مرد دانا عار اور بھوک سے بچنے کے لیے معقول تدبیریں اور دلیلیں اختیار کرتے رہتا ہے۔

خرابی کی اصل جڑ یہ ہے کہ لوگ سوائے اپنے ایک معیّن پیشہ کے دوسرے انواع صنعت وحرفت سے ناواقف ہوں اور اپنے آبائی پیشہ پر شدت کے ساتھ جمے رہیں۔

بائیسویں فصل

انسانی طبائع کا بیان

کیا تم امزجہ انسانی، طبائع اور ان کے اندر باہمی اختلاف کو چشم بصارت وبصیرت دونوں کے ذریعہ ایسا مشاہدہ وملاحظہ کر سکتے ہو کہ ہر ایک طبیعت ومزاج کے خواص واحکام تمہارے سامنے نمایاں ہو کر سامنے آئیں؟

اس سلسلہ میں ہم تمہیں استقرا ومشاہدہ کا آسان طریقہ بتا کر تمہاری مناسب رہنمائی ومدد کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل چند باتیں بطور نصیحت پیش کرتے ہیں:

۱۔سب سے پہلے تم کو نظر تفتیش عناصر ترکیبیہ کی سختی وصلابت اور حسن وصفائی کے معیار پر مرکوز کرنی چاہیے۔اور اس انداز وپیمانہ پر خوب غور کرنا چاہیے جس انداز سے اخلاق ان عناصر ترکیبیہ سے جنم لیتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کامل مزاج آدمی وہ ہوگا جو ظاہری شکل و صورت میں مکمل اور ہفت گانہ اخلاق اور ان کے اصول میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔

دوسرے درجہ پر وہ شخص ہوگا جس کے اکثر ظاہری محاسن اور معنوی اوصاف مکمل ہوں اور جو محاسن واوصاف مکمل نہ بھی ہوں ان میں بھی وہ کامل مزاج کے بیشتر محاسن سے مشابہت رکھتا ہو۔

تیسرے درجہ میں وہ شخص ہوگا جو اکثر حیثیتوں سے کامل اور باقی حیثیتوں میں (مشابہ بھی نہ ہو بلکہ) ناقص ہو، اور چوتھے درجہ پر وہ شخص ہوگا جو اکثر حیثیتوں سے ناقص ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی محاسن واوصاف ہوں جن میں اگر چہ وہ کامل نہیں ہوتا، ہم کامل سے تھوڑی بہت مشابہت ضرور رکھتا ہے۔

ان قسموں میں سے ہر قسم کی جزئیات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی تعداد ایک لاکھ

سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے پھر ان میں سے ہر ایک مزاج کے مخصوص آثار و خواص ہیں جو انسان سے طبعی ضرورت کے تقاضے کے تحت مجبوراً صادر ہوتے ہیں اور وہ آثار و خصوصیات گویا انسانی مزاج کے لوازم ہیں۔ جس طرح پتھر زمین کی طرف (کشش ثقل کی وجہ سے) مجبوراً گرتا اور آگ (اور اس کا دھواں) خود بخود اوپر آسمان کی طرف اٹھتا ہے۔ ہم نے ان آثار وخواص میں سے بعض کا ذکر اخلاق (ہفت گانہ) کے باب میں کیا ہے ان پر غور و خوض کرو۔ مثلاً (ہم نے تنبیہ کی ہے کہ) جو شخص بہادر و شجاع ہے وہ بے ساختہ دوسروں سے ٹکرا کر ثابت قدم رہتا ہے۔ اور کشت و خون پر اقدام کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا اور ہر حال میں مدمقابل کو شکست دے کر خود فتح و غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بزدل وڈرپوک ہے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے اور کبھی حملہ میں پہل اور پیش قدمی نہیں کرتا اور جہاں اسے موت و ہلاکت کا خطرہ محسوس ہوتا ہے وہاں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ ان ایک لاکھ مزاجی کیفیتوں میں ہر مزاج کے خاص خاص آثار و خواص ہیں جو ان کے مناسب حال اعمال وحرکات کی طرف لے جاتے ہیں اور انسان سے صرف انہی اعمال کا صدور ہوتا ہے جو اس کے مزاج کے خواص کا تقاضا ہیں۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ تم نے ارتفاقات کے اقسام اور ان کے مناسب حال امزجہ انسانی کو بنظر تفتیش و تحقیق دیکھنا ہے۔ مثلاً یہ کہ ارتفاق ثالث و رابع میں نظام حکومت چلانے اور قیادت وسیادت کے عنان سنبھالنے کے لیے کون قابل ہے؟ ہر مزاج و ہر انسان تو لائق و قابل نہیں ہوسکتا کیونکہ امامت کبریٰ کے عہدہ پر صرف وہ شخص فائز ہوسکتا ہے جو مزاج کے لحاظ سے جملہ اوصاف کمالیہ سے متصف ہو، اور اخلاق ہفت گانہ کے زیور سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہو شجاعت و بہادری کے ساتھ ساتھ دور اندیش اور دوررس نگاہ بھی رکھتا ہو، آہنی گرفت رکھتا ہو لیکن ساتھ ہی شفقت و رحم دلی سے اس کا قلب و صدر لبریز ہو، تحقیر نفس اور غرور ذات میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے مقام عالی اور شان و شوکت پر فخر کرتا ہو، اسی طرح امامت کبریٰ یا خلافت عظمیٰ کے ذیلی شعبوں مثلاً نقابت و قضا وغیرہ کو سنبھالنے کے لیے جس مزاج کے اشخاص و افراد موزوں ہیں ان کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

سیاست منزلی کو بہتر طریقے پر چلانے کے لیے ضروری یہ ہے کہ گھر کا سربراہ کم از کم نسبتاً متوازن انسانی اخلاق و آداب زندگی سے بے بہرہ نہ ہو۔ جہاد، تجارت، ہنر و صنعت اور دیگر شعبہائے زندگی کو بھی اسی پر قیاس کیجئے کہ ہر ایک فن کے لیے مناسب مزاج ہوتے ہیں اس لیے (ہر مردے و ہر کارے) کے اصول پر عمل کر کے اپنے مناسب پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ علو ہمت اور پست ہمتی کے مختلف درجوں میں نظر تفتیش سے کام لینا چاہیے۔

میں اپنی قوت متخیلہ میں ہمت کو، لوہے کا بنا ہوا ایک گنبد سمجھتا ہوں جس کے پار نہ تو نظر جاتی ہے اور نہ کوئی اشارہ مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً چھوٹا بچہ جب وہ کسی قدر صاحب عقل وہوش بن جاتا ہے تو اس کی ہمت کھانے پینے اور کھیلنے تک محدود ہوتی ہے۔ اس کو والدین سے محبت ودل بستگی ہوتی ہے وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں کے پاس اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے دامن سوال نہیں پھیلاتے، بلاشبہ یہ بچہ دیکھتا ہے کہ بادشاہ سریر مملکت پر بیٹھا ہوا ملک میں شان وشوکت دکھا رہا ہے اور گھر کا بزرگ اہل خاندان پر اپنا حکم چلا رہا ہے اور اسی طرح گرد وپیش کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی احوال زندگی کو دیکھتا ہے مگر بنظر امعان نہیں بلکہ بنظر لعب یعنی یہ سب باتیں اس کی نظروں سے گزرتی ہیں مگر اس کی نظر میں قابل اہتمام نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ اس کے قبہ ہمت سے ہی خارج دباہر ہیں۔

لیکن جب وہ بالغ ہو جاتا ہے (اور اس کی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو تکمیل کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے) تو عہد طفولیت سے نکل کر بلندتر درجہ یعنی درجۂ شباب ورشد میں قدم رکھتا ہے اس میں جسمانی قوت شجاعت و بہادری حکمت ودانائی اور عشق ومحبت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اگرچہ اس کیفیت میں کمال وثبات کا فقدان ہوتا ہے مگر وہ اپنی ان جبلتوں کا مناسب حال اظہار ضرور کرتا ہے۔ عنفوان شباب میں جوانی کے (جسمانی، جنسی، ذہنی اور نفسیاتی) تقاضوں کے مطابق اعمال وافعال کا صدور بالکل فطری امر ہے۔ تاہم ابھی اس کی ہمت میں عدم ثبات اور کسی قدر نقصان ہوتا ہے اور جب وہ رشد وہدایت کے درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے یعنی ادھیڑ عمر کا دور شروع ہو جاتا ہے تو اس کے جملہ کمالی اوصاف کی تکمیل

ہوتی ہے۔اور (گزشتہ دونوں عہدوں کے خلاف) اس میں خلافت یا نظام خلافت کے کسی شعبے کی سربراہی یا تمدنی زندگی کے دوسرے مدارج وارتقاقات کی اہلیت ابھر آتی ہے اس لیے میری رضا وخوشنودی اس میں ہوگی کہ تم میری یہ نصیحت گوش دل سے سن لو کہ ان مدارج ثلاثہ (عہد طفولیت، عہد شباب، عہد کہولت) میں سے ہر ایک کی قبہ ہمت اور جملہ خواص کو اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر چہ وہ رسم ورواج کے پردوں اور اکتسابی علوم وفنون کے لبادہ میں نظروں سے اوجھل بھی رہیں کیونکہ بعض اوقات ایک بچہ ہی ہوتا ہے اور اس کی سربراہی اور شیخوخت دراصل قبہ صبیان کے اندر ہی رہتی ہے۔اور اسی طرح بعض اوقات ایک بوڑھا بہ تکلف کثیر بچوں یا جوانوں کی سی حرکتیں شروع کرتا ہے مگر حقیقت الامر یہی ہے کہ اس کے اس مصنوعی بچپنے میں بھی شیخوخت وبڑھاپے کا رنگ پایا جاتا ہے اور وہ قبہ شیخوخت سے باہر نہیں جاسکتا۔

یہی صورت اہل المنازل کے ان بھولے بھالے بے نفس قانع اشخاص کی ہے جن کو کلام پاک میں ''غیر اولی الاربۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ان کا بھی ایک مخصوص قبہ ہمت اور دائرہ پرواز ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ پیٹ بھرنے اور ستر عورت کے انتظام سے آگے نہیں بڑھتا۔ پھر ادنیٰ درجے کی معیشت رکھنے والے نچلے طبقہ کے لوگوں کا قبہ ہمت غیر ''ذی الاربۃ'' قانع سے وسیع تر ہوتا ہے اور اس طرح قبہ ہمت کے آفاق ودوائر میں بتدریج اضافہ ووسعت ہوتی رہتی ہے حتی کہ ہمتوں کے دائرے ملوک اور شہنشاہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔(ہم دیکھتے ہیں کہ) کتنے بادشاہ ہیں جو عام لوگوں میں دولت مندترین انسانوں سے دو چند سہ چند زیادہ مالدار ہوکر بھی قانع نہیں ہوتے۔اور عام لوگ ان کی اس ملک گیری اور ہوس زر طلبی کی وجہ سے ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قناعت کیوں نہیں کرتا۔وہ فلاں فلاں فارغ البال زندگی بسر کرنے والے اور مالداروں کو دیکھ کر اپنی حالت پر راضی کیوں نہیں ہوتا؟ مگر یہ لوگ اپنے اس اعتراض میں یقیناً غلطی پر ہیں کیونکہ بادشاہ اپنے قبہ ہمت کی وجہ سے فطری طور پر مجبور ہے کہ وہ زر طلبی اور ہوس ملک گیری کے جذبہ سے سرشار ہوکر زیادہ سے زیادہ ممالک فتح کرے۔اور خزانے بھر دے۔یہی حال ہر صاحب ہمت شخص کا ہوتا ہے۔اس کے علوم، ترجیحات اور شواہد ودلائل اس کے قبہ ہمت کے مطابق

ہوتے ہیں۔ اور ان کے باہم مناظروں اور مناقشوں کی بھرمار ہوتی ہے اور آزمودہ کار حکیم جس کو قبۂ ہمت اور دائرۂ کار کی حقیقت صاف نظر آتی ہے اور وہ ان کے سلوک کو ان کے قبہ ہمت کے مطابق سمجھتا ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ملحوظ رہے کہ تیری نظر تحقیق انسانی فطرت پر مرکوز رہے، جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسان تین مختلف صورتوں سے مرکب اور بنا ہوا ہے۔

(۱) حیوانی (۲) انسانی (۳) شخصی یا انفرادی

لیکن با ایں ہمہ اشتباک ان تینوں میں سے کبھی ایک کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی دوسری اور تیسری کا۔ اگر صورت حیوانیہ اپنی دوسری بہنوں (یعنی انسانی اور شخصی صورتوں) پر غالب آجائے تو اس کو مزاج آدمی (منسوب بہ حضرت آدم علیہ السلام) کہیں گے۔ اس کا راز عقلی استدلال سے دریافت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کی حقیقت (ذوق وجدان اور) مکاشفہ کے ذریعہ عیاں ہوسکتی ہے۔ ہاں اس مزاج کے کچھ مناسبات اور آثار ہیں جن کو مرد عارف اس مزاج والے شخص اور اس کے اعمال میں جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اگر صورت انسانیہ کا غلبہ ہو تو اس کے مزاج کو مزاج ادریسی کہیں گے اور صورت شخصیہ کے غلبہ کی صورت میں اس کا نام مزاج نوحی ہوگا۔

ہم کسی موقع پر تمہیں یہ بھی سکھا چکے ہیں کہ انسانی وجود مختلف حیثیتوں میں رہتا ہے۔ ایک وجود روحی کہلاتا ہے دوسرا وجود مثالی اور تیسرا وجود خارجی۔

پھر یہ وجود یا تو کامل ہوگا (اور یا ناقص) اور یا فولادی ہوگا (اور یا دوسرے عناصر مادّی سے ترکیب یافتہ ہوگا)۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ جس وجود انسانی پر روح کا غلبہ ہوگا وہ مزاج ابراہیمی کہلاتا ہے جس پر "مثال" کا غلبہ ہوگا۔ اس کو مزاج عیسوی کہتے ہیں۔ جس پر فولاد ولوہے کا عنصر غالب ہو کر اس میں شدت کی تیزی پیدا کرے اس مزاج کو مزاج موسوی کہتے ہیں اور کامل وسائع وجود انسانی پر جب زمینی عناصر کی مدد غالب ہو تو وہ مزاج داؤدی کہلاتا ہے اور جب اس پر آسمانی عناصر کی مدد غالب ہو تو وہ مزاج محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ

یہ ایک ایسا علم ہے جس کی تفصیل لکھنا بے سود ہے۔اس کا تعلق مشاہدہ اور مکاشفہ سے ہے۔

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری مراد حدت سے یہ ہے کہ جس نوعیت کے اخلاق اسی قسم کے عام مزاج کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔اور وہ اخلاق پوری شدت وصورت میں کسی میں پائے جائیں تو ہم اس کو "حدت" یا تیزی مزاج کہتے ہیں۔اولاً "سبوغ" (کمال) کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے اخلاق اس کے بدن کے عناصر ترکیبی اور اس کے امداد ساوی کے مطابق ہوں۔کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نسمہ (روح ہوائی) سے اخلاق پیدا ہونے کا انحصار نسمہ کی اس کیفیت پر ہے جو اس میں بدن کے عناصر ترکیبی اور اعضائے جسمانی کے مناسبات سے بغل گیر ہونے پر پیدا ہوتی ہے چنانچہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جس شخص کا سینہ فراخ وکشادہ ہو تو لامحالہ وہ بہادر وشجاع ہوگا اور ہمیشہ پُر امید رہے گا لیکن جس شخص کا سینہ تنگ ہو وہ بلاشبہ بزدل وڈرپوک ہوگا اور ہمیشہ شکستہ خاطر اور نا اُمید ہوگا۔

جب اخلاق ، جسمانی اعضا اور نسمہ تک پہنچنے والی امداد اپنے اندازوں میں اور دوسری کیفیات میں پوری طرح ہم آہنگ اور متوازن ہوں تو ایسی ہم آہنگی کو "سبوغ" یا "کمال" کہا جائے گا۔لیکن جب اخلاق پیش رفت کریں اور اعضائے جسمانی اور امداد نسبتاً پیچھے رہ جائیں اور ان میں ہم آہنگی نہ ہو تو اس صورت کو ہم "حدت" یا تیزی مزاج سے موسوم کرتے ہیں۔چنانچہ اگر تم اپنی نظر کو تھوڑی سی وسعت دے کر مشاہدہ کرو تو استقرا سے معلوم ہو جائے گا کہ بعض اوقات نہایت کمزور عناصر ترکیبی اور ضعیف بدن والا آدمی جوہر شجاعت میں اپنے سے دو چند یا سہ چند جسیم اور مضبوط جسم والے سے قوی اور بہادر ثابت ہوتا ہے اس قسم کا نحیف وکمزور شخص اگر بوڑھا ہو جائے یا بیمار پڑ جائے تب بھی جوہر شجاعت کا بڑا حصہ باقی رہتا ہے اور اس کی شجاعت وبہادری میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔بعض اوقات اس کے مقابلہ میں ایک بالکل دوسرا شخص دیکھو گے جس کی بدنی ترکیب اور اعضائے جسمانی بالکل درست ہیں اور وہ نہایت قوی ومضبوط بھی ہے اور اس کی شجاعت بھی صرف اسی نسبت سے ہے زائد نہیں۔اس قسم کا شخص جب بوڑھا ہو جائے یا بیمار پڑ جائے یا زندگی کی تدبیروں میں درماندہ ہو جائے تو اس کی شجاعت وبہادری میں بھی اسی نسبت سے کمی واقع ہوتی ہے۔

تئیسویں فصل

لوگوں میں نظام ارتفاقات کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم تنبیہ

علوم اخلاق اور ارتفاقات فطرت انسانی کا خاصہ ہیں

علم اخلاق اور علم ارتفاقات کے متعلق جو کچھ ہم نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے اس کی صحت بدیہی ہے محتاج دلیل و برہان نہیں، یہ باتیں بطریق اجمال انسان کی فطرت میں اس طرح مرکوز ہیں جس طرح جملہ چوپاؤں اور پرندوں کی طبیعتوں میں معیشت و معاش اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کے الہامی علوم ودیعت رکھے گئے ہیں۔ فطرت انسانی میں ان علوم (اخلاق وارتفاقات) کے ودیعت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے بارے میں عمومی اور اصولی طور پر اقوام عالم میں سے کسی قوم کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ تمام اقوام ان لوگوں کے مدح خواں ہیں جو ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں جو ان کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ علوم موروثی نہیں ہیں

میں نے بعض نادانوں کو جنہیں عقل سلیم سے کوئی بہرہ نہیں ملا، کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ نظام ارتفاقات اور مدارج تمدن میں اپنے اسلاف اور بزرگوں سے ملے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ہمیں اس کا کچھ پتہ نہ ہوتا۔ اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ انسان کی تہذیبی زندگی کی دوسری منزل (ارتفاق ثانی) اس سے قبل گزری ہوئی منزل (ارتفاقِ اوّل) پر مبنی ہے تو بلاشبہ یہ درست ہے اور اس کی معقول وجہ (ماضی و حال کا باہمی ربط و تسلسل یا سبب و مسبب کا سلسلہ ہے۔ لیکن اگر اس کی مراد یہ نہیں ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے اور اس کے غلط

ہونے کی دلیل ونشان یہ ہے کہ فرض کیجئے کوئی آدمی کسی دور و دراز صحرا یا جنگل میں پیدا ہوا اور وہاں کسی دوسرے انسان کو ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تب بھی وہ مذکورہ اخلاق وارتفاقات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس کی آواز میں بہر صورت تقطیع حروف اور اس کے بعد تشکیل الفاظ و جملہ ہوگی اور ارتفاق اول کی تمام شاخوں کا وہ محتاج وطلب گار رہوگا۔ مثلاً اگر اس کے جنس سے مادہ اس کے پاس نہ ہو تو وہ تکلیف محسوس کرے گا اور جب رفیقۂ حیات ساتھ ہو تو انس ومحبت اور سکون وقرار کے ساتھ رہے گا۔ اس کی عدم موجودگی کی حالت میں اس کی طلب میں سرگرداں پھرے گا اور اگر اسے مل جائے تو طبعاً اس سے مانوس ہوگا اور لازماً اس سے ہم کلام ہوگا اور بات چیت میں افہام وتفہیم کے پہلو کو مدنظر رکھے گا۔ (اس طرح ان کی ازدواجی زندگی اور منزلی دورِ حیات شروع ہو جائے گا۔ اور آہستہ آہستہ پیدائش وافزائش نسل کے ذریعہ مختلف گھر اور خاندان معرض وجود میں آجائیں گے) پھر مختلف خاندان ایک دوسرے مل جائیں گے۔ اور باہمی معاملات اور تمدنی تعلقات کا سلسلہ جاری ہو جائے گا اور پھر اسلاف سے اخلاف کو وہ سب طریقے منتقل کر دیئے جائیں گے۔

ہم نے پہاڑوں اور صحراؤں میں لوگوں کو زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو نہ تو کسی الہامی یا غیر الہامی دین سے وابستہ ہیں اور نہ کسی مذہبی فرقے سے ان کا کوئی تعلق رہا ہے اور نہ وہ اپنے آباواجداد کے مقرر کردہ قوانین اخلاق اور ضوابط کے پابند ہیں۔ بلکہ وہ کسی ضابطہ اور قانون کے پابند ہی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تمدنی زندگی میں عملی مفید تدبیروں اور اجتماعی اداروں کی تشکیل کرتے ہیں اور معاملات واخلاق کے بہترین اصول وآداب کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کے ارتفاقات اور اخلاق کے اصول اور ان کے بنیادی آداب میں رفعت وکمال نہیں ہوتا۔

اخلاق وارتفاقات کے فطری ہونے سے انکار کرنے والے دو گروہ

پس یہ ثابت ہوا کہ ارتفاقات اور اخلاق کی تحصیل کا ملکہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس نظریہ سے انکار کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں:

ایک وہ جو نرے بے وقوف ہیں جن کی تمدنی زندگی بہائم اور چوپایوں سے بدتر نہیں تو اچھی بھی نہیں ہوتی ۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان علوم اخلاق وارتفاقات کے اصولوں پر کسی حد تک کاربند ہیں اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے لیکن بہ تکلف انکار اور اصرار علی الانکار کرتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی مثال اس شخص کے انکار کی ہے جو آنکھ، کان، اور عقل رکھتا ہے اور ان کے وجود و آثار کو ملاحظہ بھی کرتا ہے مگر ان کے وجود سے پھر بھی منکر ہوتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ ''سوفسطائی'' ہیں جو علوم ارتفاقات و اخلاق کے اصول سے بتکلف انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ ان علوم کے ساتھ وابستہ ہیں۔

خبردار یہ دونوں فرقے انسانی مزاج کے لحاظ سے ناقص مزاج رکھتے ہیں اور ان دونوں کی مثال اس چوپایہ کی ہے جو ناقص الخلقت اور خالی از عقل ہے اور جو تدبیر ناقص کی وجہ سے معاشی زندگی میں ناقص ثابت ہوتا ہے اور مثلاً وہ پیدائش وافزائش نسل کے فطری تقاضوں سے خالی ہو کر جوڑے کی تلاش نہیں کرتا اسی طرح تمدنی زندگی میں ارتفاقات واخلاق کے اصولوں کی پابندی سے گریز اور منزلی تدبیروں سے فرار اختیار کرنا اس سوفسطائیوں اور بیوقوفوں کا شیوہ ہے۔(کہ وہ بھی عام انسانوں کی بہ نسبت ناقص پیدا ہوئے ہیں)۔

نظام تمدن کی صحت و بیماری

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح جسم انسانی کی صحت اور بیماری کی حالتیں ہوتی ہیں اسی طرح) انسان کی تمدنی زندگی پر یہ مختلف کیفیتیں وارد ہوتی ہیں۔ اس کی ایک کیفیت تو صحت کاملہ ہے۔ دوسری حالت صحت ناقصہ (یا بیماری) کی ہے اور تیسری حالت مرض مدنف کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے صحت مکمل گر جاتی ہے۔ انسانی تمدنی وعمرانی زندگی کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ اس کی صحت کامل ہو، مگر جب اس ڈھانچہ میں انتشار کے خارجی اور داخلی عوامل اثر کر جاتے ہیں تو اس وقت اس کی صحت ناقص ہو جاتی ہے۔ اور بعد ازاں

تمدنی فسادوں کی وجہ سے موذی اور مدنف مرض کی شکل رونما ہوتی ہے۔ جس کے بعد شر ہی شر پر خاتمہ ہوتا ہے۔

معاشرتی زندگی کے مدارج اور ارتفاق ثالث کے مراتب

چنانچہ زمین کا کوئی گوشہ جہاں انسان آباد ہو، ارتفاق اول سے خالی نہیں ہو سکتا اور اسی طرح دنیا کے اکثر ممالک اور قوموں میں تمدنی زندگی کی دوسری ارتقائی منزل (ارتفاق ثانی) کا متوسط درجہ ضرور پایا جاتا ہے۔

ہاں بعض اوقات و بعض مواقع میں سوء المزاجی اور صحت معاشرت میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ارتفاق ثانی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی حال ارتفاق ثالث اور تمدنی زندگی کی تیسری اعلیٰ منزل کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود بخود لازماً وجود و ظہور میں آتا ہے۔ اور اس کے ظہور میں لانے کے مندرجہ ذیل طریقے ہوتے ہیں:

۱۔ ظہور خلیفہ الٰہی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا شخص ظہور میں آتا ہے جس پر اس کا الہام ہوتا ہے اور اس کی روح میں ارتفاق ثالث کی مصلحتوں کا راز رکھ دیا جاتا ہے جس کے مطابق وہ ارتفاق ثالث کی تنظیم کرتا ہے۔

۲۔ ظہور خلیفۂ خلیفہ الٰہی: یا کوئی ایسا شخص اس نظام کو سنبھالتا ہے جو خلیفہ الٰہی (پیغمبر وغیرہ) کا جانشین کامل اور خلیفہ ہو اور اس کی ہمت عزیمت اس پر مرکوز ہو کہ اس کے نقش قدم پر چلے اور اس کے علوم اخلاق و ارتفاقات کی تقلید اور پیروی کرے۔

۳۔ ظہور ملوک و سلاطین عادلہ: یا پھر اس نظام کو ایسے ملوک و سلاطین کے ہاتھ میں دیدیتا ہے، جو انصاف پسند اور عادلانہ اصول حیات پر کاربند رہتے ہوں اور انتظام مملکت اور انصرام حکومت کے لیے عالموں، داناؤں اور تجربہ کار لوگوں کو مشیر و وزیر بنا دیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے مملکت میں صلاح پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ ظہور ملوک و سلاطین جابرہ: یا پھر اس نظام کو ان لوگوں کے حوالہ کر دیتا ہے جو مقتدر اور جابر ہوں۔ لیکن ان کی طبیعت میں یہ میلان ہوتا ہے کہ صرف مباح کاموں کی طرف

آگے بڑھتے ہیں اور پرانے بادشاہوں کے جاری کردہ رسموں کی پیروی کرتے ہیں۔ان کی اس جدوجہد کے نتیجہ میں وہ نظام ظہور میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تدبیر میں مضمر ہوتا ہے ان لوگوں کے نفوس فساد کی طرف مائل نہیں ہوتے اور مرنجان مرنج زندگی گزارنے اور اقتدار نہ بڑھانے کے عادی ہوتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں عدل وسکون اور اطمینان کی فضا قائم رہتی ہے۔

تمدن کی موت

اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں ارتفاق ثالث (ہوتو ان صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں ہوگا،اور) درجہ بدرجہ ان سے خالی نہ ہوگا) یہ تمام صورتیں ایسی ہیں جن کے بغیر نظام تمدن قائم ہی نہیں ہوسکتا اور جو قوم وملک ارتفاق ثالث کے اس آخری مرتبہ یعنی وجودِ طبقۂ جابرہ سے بھی خالی ہوتو سمجھ لیجئے کہ نظام تمدن کا اعتدال صحی برقرار نہیں رہا اور وہ ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوگیا جس کا نتیجہ بحران کی صورت میں ظاہر ہوگا(اور بحران کے بعد یا دوبارہ صحت نصیب ہوتی ہے اور بیماری فنا پر منتج ہوتی ہے)۔

دوسرا مقالہ:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

(۱) یہ مقالہ امام الانسان کے اُن احکام سے بحث کرتا ہے جو ابنائے آدم کی فطرت وشرست میں اس لیے ودیعت رکھے گئے ہیں تاکہ وہ ان کی بدولت علم وعمل کے شعبوں میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرکے اپنے آپ کو ہر قسم کے شرور، فتنۂ قبر، عذاب النار اور دیگر تکلیفات متعلقہ سے بچانے کی صلاحیت واستعداد پیدا کریں۔

(۲) اس مقالہ میں ہم، (مسئلہ کو دو طریقوں سے بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

(الف) براہین اور دلائل عقلیہ کے ذریعہ ماخوذ طریقہ۔

(ب) عقل معاشی (روزمرہ کے معاملات کی سمجھ بوجھ) کا تجرباتی طریقہ اس لیے تجھے اس بحث میں اپنی بصیرت (اور نظر ذہنی) سے کام لینا ہوگا۔

پہلی فصل

معرفت باری تعالیٰ کا بیان جو فطرتِ انسانی میں ودیعت رکھی گئی ہے

یہ حقیقت نا قابل تردید عقلی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ اس عالم وجود میں ایک واجب الوجود ہستی ہے جو تمام ممکنات اور موجودات عالم کے ظہور و بقا اور حیات و قیام کا اصلی سبب اور علت العلل ہے۔ نفس انسانی اور اس کی عقل کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی وحدانیت اور اس کی دوسری صفاتِ کاملہ کی معرفت دلائل و براہین سے حاصل کرے اور یہ یقین پیدا کرے کہ کائنات میں جو بھی تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے وہ تنہا خدائے رحمٰن کی کارفرمائی ہے، جو خود ہر طرح کے انقلاب و تحول سے منزہ اور بالاتر ہے۔

ہم یہاں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس طریق معرفت کی تفصیل بیان کریں۔ جو اللہ رحمٰن نے انسانوں کی سرشتوں میں ودیعت رکھا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے فارغ کر کے اپنے اللہ تعالیٰ (اور اس کی صفات) کو پہچانتے ہیں، کان لگا کر سنو!

رجحان بلا مرجع واقع نہیں ہوسکتا اور نوع حیوانی اور نوع انسانی دونوں کو یہ جبلی علم حاصل ہے کہ کائنات میں وجود اشیا اور تحول و تصرف علت مؤثرہ کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے۔

تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے فیضان عنایت سے نوع حیوانی اور نوع انسانی کی فطرتوں میں یہ علم جبلی طور پر ودیعت رکھا کہ رجحان بلا مرجع واقع نہیں ہوتا۔ اور نیست سے ہست میں آنے والی ہر چیز کا وجود اور موجود اشیا میں ہر قسم کا تغیر و تبدل کسی علت مؤثرہ اور سبب موجد اور موجب کے بغیر ہر گز نہیں ہوسکتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی جانور کوئی غیر مانوس و غیر معمولی آواز سنتا یا کوئی غیر معمولی حرکت یا حادثہ دیکھ لیتا ہے تو وہ چوکنا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی اس حالت تنفر کا ناقدانہ جائزہ لو اور تنقیح کرو تو تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ (اس کی تہہ میں شر سے بچنے کی تدبیر اور شعور حیوانی کا فطری احساسِ بچاؤ مضمر

ہے) اور حیوان یہ جانتا ہے کہ کوئی واقعہ بغیر علّت مؤثرہ کے ظہور میں نہیں آتا۔ (اس لیے ضرور کوئی نیا حادثہ ہوا ہے پھر وہ اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے چوکنا ہو جاتا ہے اور کان کھڑے کر کے ادھر اُدھر دیکھتا ہے)۔

اسی قضیہ کے عدم اعمال کی استثنائی صورت اور اس کے وجوہات

یہ الگ بات ہے کہ بعض حالات و اوقات میں قضیہ کلیہ من وعن کے ساتھ پوری طرح عمل پذیر نہیں ہوتا جیسے کہ دوسرے قضایائے کلیہ کی بھی یہی حالت ہے۔ مگر عمل پذیری نہ ہونے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو کسی خاص جزئی پر اس کلیہ کا حاوی ہونا اس عالم کے دائرہ علم و تنبیہ سے باہر ہے یا اس خاص جزئی کے متعلق چھان بین نہیں کی جاتی (ورنہ چھان بین کے بعد اس کا حاوی ہونا واضح ہو جاتا) اور یا بعض اوقات اس کو اس کلیہ کا خیال ہی نہیں ہوتا (حاوی ہونے یا نہ ہونے کا تو ذکر ہی نہیں)۔

جانوروں کی طرح انسان میں بھی رجحان بلا مرجح کے ناممکن ہونے کا فطری علم کلی پایا جاتا ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو لوگوں کے اکثر و بیشتر خیالات اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ (اور وہ سبب و مسبب اور علّت و معلول کے سلسلے پر نظر رکھتے ہیں)۔

حیوانوں پر انسانوں کی فوقیت کی دو وجہیں

(اسی اصل شعور میں تو انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں لیکن) انسان کو دیگر حیوانات پر دو وجہ سے فوقیت و برتری حاصل ہے۔

ایک یہ کہ انسان اس نظریہ کو بہت دور دور تک لے جاتا ہے۔ اور اسے ایسی صورتوں پر چسپاں کرتا ہے۔ جہاں تک پہنچنے سے چوپایہ کی سمجھ قاصر رہتی ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان حیوان کے مقابلہ میں بہت زیادہ بیدار مغز اور تیز ذہن کا مالک ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اس نظریہ کو مہمل اور غیر کارآمد رہنے نہیں دیتا ہے اور نہ حیوان کی طرح اس سے صرف یہ کام لیتا ہے کہ اپنی معیشت اور زندگی کے کاروبار کو سمجھ لے وہ اس شعور و علم کے ذریعہ (زندگی کی تعمیر و تحسین کے علاوہ) اپنی ذات کی تکمیل بھی کرتا ہے (اور دیگر علوم و فنون کی تکمیل، حربی علوم و فنون اور دفاعی آلات اور ساز و سامان کی ایجاد وغیرہ

بھی اسی شعور کے نتیجہ میں کرتا ہے) چوپایہ مغایرت شخصی کا احساس رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ذات کو اور اپنے بچوں کو اپنے جنس کے دوسرے جانوروں سے متمیز کر سکتا ہے اسی طرح اس کو مغایرت صنفی کا بھی احساس ہوتا ہے وہ نر اور مادہ میں تمیز کر سکتا ہے اور نر، مادہ سے صنفی تعلق قائم کرتا ہے اور کسی نر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ مغایرت نوعی کا بھی علم رکھتا ہے چنانچہ وہ اپنے نوع کے جانوروں کو دوسرے انواع حیوانات سے متمیز کر کے پہچان سکتا ہے اور صرف اپنی نوع کے چوپایوں کے ساتھ انس و محبت کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرے انواع سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کو یہ بھی علم ہوتا ہے کہ درندے کون سے جانور ہیں اور غیر درندے کون سے۔ چنانچہ چرندہ جانور یہ جانتا ہے کہ بھیڑیا اور شیر درندہ جانور ہیں اور وہ اس کے دشمن ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی جنس کو دوسری جنسوں سے علیحدہ کر کے پہچان لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نباتات اور جمادات کی شان یہ ہے کہ وہ بالارادہ حرکت اور دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام مختلف صورتوں (جنسوں، نوعوں، صنفوں اور شخصوں) میں وہ فرق کر سکتا ہے لیکن اس کے اس علم و معرفت کا اثر صرف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اس کو کوئی ایسی ضرورت پیش آئے جو بغیر اس علم کے حل نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ اور صورتوں کے متعلق اس کا علم اجمالی رہتا ہے اور اس کا کوئی خارجی اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ اس علم اجمالی میں نظر تحقیق و امعان سے کام لیتا ہے۔

انسانوں میں اس کی مثال ایک بادیہ نشین عرب کی ہے۔ جو بولتے وقت جملہ کے فاعل و مفعول اور ان کے لوازم و خواص تو یقیناً جانتا ہے اور اس لیے وہ اعراب اور قواعد عربیہ کے صحیح استعمال میں کبھی غلطی نہیں کرتا، لیکن بایں ہمہ وہ قواعد صرف و نحو میں کمال ذاتی حاصل کرنے اور ان میں تحقیقی نظروں سے کوشش کرنے کو غیر ضروری سمجھتا ہے برخلاف اس کے ایک نحوی عالم کے ذہن میں قواعد عربیہ کا جو علم مرکوز ہو چکا ہے وہ اس میں مزید غور و فکر کرتا ہے اور اس کے جملہ اصول و فروع کو تنقیح کر کے ان کو اپنی عقل و ادراک کا نشانہ بناتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چوپایہ عالم ناسوت اور عالم خارج ناسوت (یعنی ملکوت) کے درمیان تمیز کر سکتا ہے لیکن اس ادراک کا کوئی ظاہری اثر اس پر نمایاں نہیں ہوتا ہاں اگر عالم غیب کے اثرات نظام متعارف و رائج میں کوئی خارق عادت کیفیت پیدا کریں تو اس

صورت میں چوپایہ کو بھی اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کے ذہن میں وقت ضرورت پیش آئے بغیر بھی متغایر اشیا اور ان کی صورتوں کا علم اور نقشہ ہر وقت محفوظ رہتا ہے۔ اور عالم ناسوت اور عالم ملکوت متمیز رہتے ہیں۔

انسان کے مخصوص اعمال میں سے حکمت و دانائی کا ایک عمل جو دوسرے چوپایوں میں نہیں پائی جاتی، یہ ہے کہ وہ زمانہ کی مقدار کو طول اور کمی کے لحاظ سے پوری طرح جانتا ہے اسی طرح اطراف وجہات اور مسافتوں کے پیمانوں پر بھی اس کا علم حاوی ہے اور سیاروں اور آسمانوں کے متعلق بھی اس نے بڑی طویل کوشش، پوری محنت اور لمبی عمر صرف کر کے حقائق دریافت کر لیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وہ اپنے علم سے کائنات کے ان گوشوں کو بھی مسخر کرنا چاہتا ہے جو اس کے ابنائے نوع (ابنائے جنس) کے دسترس اور احاطہ سے باہر ہیں۔

استعداد خدا شناسی انسانی فطرت میں ودیعت ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب اس طرح انسان نے اپنے علم کا دائرہ وسیع کیا اور اس نے دیکھا کہ خود اس کی ذات اور اندرونی باطنی اور جسمانی دنیا میں اور اس کی ذات سے خارج تمام کائنات میں ایک منظم تدبیر اور پُر حکمت نظام موجود ہے، اور یہ بھی معلوم کیا کہ تمام عوالم سماویہ اور ارضیہ کا نظام مقررہ قوانین پر چل رہا ہے جس میں ذرہ برابر بھی خلل نہیں آتا۔ (اور تمام اشیائے کائنات طوعاً و کرہاً ان حکیمانہ قوانین کی اس حد تک پابند ہیں کہ سر مو اس سے انحراف اور اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے)۔ تو وہ اپنی فطرت سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اس نظام کے لیے وجود میں لانے والا موجب کوئی اور ہے۔ جو اس عالم سے خارج ہے۔ یہ اجمالی معرفت نوع انسانی کے تمام افراد کی جبلّت میں مرکوز ہے لہٰذا مشرق و مغرب میں کوئی بھی سلیم الطبع، قوم نہیں جس کا یہ عقیدہ نہ ہو۔

اختلاف خدا شناسی میں نہیں تعیین خدا میں ہے

یہ اور بات ہے کہ ان میں اس موجب اور مدبر کی تعیین میں اختلاف پیدا ہوا۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض کا علم اس نظام کے متعلق محدود و نامکمل رہا چنانچہ ان کو صرف یہ ضرورت

محسوس ہوئی کہ موالید ثلاثہ اور کائنات الجو کا جو نظام ان کے مشاہدہ میں آرہا ہے اس کے اندر ایک فعال قوت کا اثبات کریں کیونکہ اسی نظام مرئی ومشاہد کے اسباب ومسببات کا علم ان کے نزدیک حقیقی اہمیت کا حامل ہے۔اس کے برعکس نظام غیر مرئی اگرچہ ان کے نزدیک اجمالی طور پر ثابت شدہ امر ہے۔لیکن یہ خیال ان کے دلوں میں اس قدر راسخ نہیں ہوا کہ اس کی حقیقت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے اسباب کی طلب کے لیے مضطرب و بے قرار ہوں۔اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عام بازاری آدمی بادشاہوں کے تمدنی تنعم اور پُر لذت زندگیوں سے اجمالی طور پر واقف ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔لیکن کبھی کبھی وہ یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ اس کا دل بھی ان کے درجہ تنعم تک پہنچنے کی طلب وسعی کرے اور اس کے بغیر اطمینان کا سانس نہ لے۔اس لیے وہ اپنے اس سادہ طریق زندگی پر قانع رہتا ہے جس پر اس کے دوسرے ہم رتبہ اور ہم طبقہ ہوتے ہیں۔اس کے برخلاف شہزادوں اور عالی ہمت لوگوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تنعم پسندی کے جذبے کے تحت پُر تکلف زندگی کے حصول کے لیے موروثی خواہش اور بے قراری رکھتے ہیں۔اور جب تک وہ اس کو حاصل نہ کرلیں رات کی نیند اور دن کے آرام سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔خلاصہ یہ کہ جو لوگ وسیع النظر نہیں ہیں اس مسرتی وخوشنما مگر نا مکمل نظام کائنات کے اندر ایک فعال قوت کے متلاشی ہیں۔ان کی نظر ظاہری اسباب اور علل قریبہ سے ماوراء علۃ العلل کی طرف متجاوز نہیں ہوتی چنانچہ ان میں سے بعض تو عناصر کے قوائے طبیعیہ کو تخلیق وتحویل کا منبع سمجھتے ہیں اور ان کو قوت فعال سے موسوم کرتے ہیں۔بعض لوگ اس کو سیاروں اور اجرام فلکیہ کی حرکتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعض دوسروں کا یہ خیال ہے کہ دنیاوی حوادث کچھ صلحا کی روحوں اور ان کے علاوہ دیگر برگزیدہ لوگوں، دیوتاؤں، قدوسیوں اور اولیا کے دستِ تصرف میں ہیں۔ اس لیے کہ ان کے قدس (اندازہ) اور بحث ونظر نے جو ان کے پیمانہ علم کے مطابق تھے، اتفاقیہ طور پر ان کے تجربہ ہی چند ایسے امور مشاہدہ اور وہ ان اولیاء وصالحین کو سید وآقا کی حیثیت دے کر ان کی ربوبیت کے قائل ہوئے اس نتیجہ پر ان کو آمادہ کرنے والا انکا توبہ تو جہل ہوتا ہے (جو ان کو اللہ واحد وقہار کی معرفت تک پہنچنے نہیں دیتا)۔ایسے لوگوں کا انجام دو طرح سے ہوتا ہے یا تو وہ اسی قبیح اعتقاد پر مرجاتے ہیں جبکہ چاروں طرف سے جہالت کی تاریکی ان کو

گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ مخلوق الٰہی میں حق کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملہ سے دور ترین مخلوق رہ جاتے ہیں۔ اور یا دوسری صورت یہ ہے کہ خدائے رحمٰن عزّ و جلّ ان پر نظر عنایت فرمالے۔ ان کے ذہن میں وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو اور وہ نظام کائنات کو اپنے اس تصور سے زیادہ وسیع شکل میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اپنے پہلے غلط اعتقاد کو مٹا دیں اس طرح ہوتے ہوتے ان کا دائرہ علم وسیع ہوتا جائے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے وہ مسلسل غور و فکر کرتے رہیں۔ ایسے لوگ مسلسل حیرت میں رہتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو معرفت الٰہی کے حاصل کرنے کا انحصار صرف اپنی عقل و رائے پر کرتے ہیں۔

معرفت الٰہی کے حصول کا ذریعہ عقل نارسا نہیں بلکہ قلب سلیم ہے

اس کے برعکس وہ شخص جو دین حنیف کا قائل اور شرک و بت پرستی کی ساری نجاستوں سے پاک اور خدائے واحد کے لیے دنیا اور دنیا والوں سے یکسر ہو کر تلاش حق کر رہا ہے اس کے قلب سلیم سے یہ صدا اٹھتی ہے لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ (یعنی اگر میرا پروردگار مجھے ہدایت نہ دے تو میں گمراہوں کے زمرے میں شامل رہ جاؤں گا) اس لیے وہ اپنی فطرت کے تقاضوں اور ضمیر کی صداؤں کی طرف گریبان میں منہ ڈال لیتا ہے تو اسے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ پروردگار عالم نے اس کی سرشت میں معرفتِ الٰہی کا ٹھیک علم ودیعت رکھا ہے۔ اور اس کو اس کی انسانی فطرت کے عین مناسب سچی معرفت کی استعداد سے بھی نوازا ہے۔

باب ہذا کی تفصیل

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو دو قسم کی عقل مرحمت فرمائی گئی:

ایک تو عقل حیوانی ہے جو امور معاش میں کام آتی ہے اور جس میں جملہ حیوانات اس کے شریک و سہیم ہیں پھر بھی اس کی عقل معاش کو دوسرے چرند پرند پر خاص فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی ترکیب جسمانی میں صفائی، صلابت اور اتصالِ عناصرِ حیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

دوسری عقل انسانی ہے۔ جو عقل حیوانی سے اس قدر مختلف ہے گویا کہ وہ اصلاً اس کی جنس میں سے نہیں ہے۔ یہ انسان کو اس وقت عنایت ہوتی ہے جب وہ ناسوتی (مادی) حالت کو فنا کر کے عالم جبروت میں قدم رکھتا ہے۔ معرفت الٰہی جس کا تخم انسان کی فطرت میں موجود ہے اور جس کے ذریعہ اس کو دنیا و آخرت کی نجات و سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ عقل معاشی کا نتیجہ ہے، جس میں حیوانات بھی اس کے ساتھ شریک ہیں، مگر انسان کو قدرے زیادہ عقل معاشی دی گئی ہے۔

خداشناسی بذریعہ عقل معاشی

دین حنفی (یعنی اسلام کا لب لباب) یہ ہے کہ تم اپنے رب کو عقل معاشی کے ذریعے اس طرح پہچان لو جس میں کسی قسم کا شک وارتیاب نہ رہے۔ اور جو کچھ تم نے اپنے رب کے کمال اور صفاتِ حسنیٰ کو اپنی عقل سے سمجھا ہے، تمہاری زبان کی تعبیر اس ادراک کے مطابق ہو یعنی تصدیق بالجنان واقرار باللسان ہو۔ اپنے رب کی معرفت عقلِ معاشی کے ذریعہ حاصل کرنا مستبعد اور تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ جس حد تک وہ رسائی حاصل نہیں کر سکے گا وہاں وہ اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کر کے نور ایمان سے منور ہو جائے گا اور جہاں وہ تفصیلی معرفت تک نہیں پہنچ سکے گا وہاں اجمالی پر اکتفا کرے گا اور اپنے مطلب (باری تعالیٰ) کا کوئی نہ کوئی ذہنی تصور باندھ کر اپنے رب کو پہچان لے گا اور اس موثر اجمالی مقدمہ کے ذریعے کہ "اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنی عقل سلیم کو سر اطاعت ختم کرنے پر مجبور پائے گا۔ جب وہ معرفت الٰہی کی اس ذہنی صورت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے گا اور کسی وقت اس پر حق واضح اور منکشف ہو جائے خواہ یوم آخرت میں کیوں نہ ہو تو اپنے پہلے سے قائم کردہ ذہنی اور اجمالی صورت کو چھوڑ کر اور اس اجمالی مقدمہ کی بدولت کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں، ایک اور حقیقی معرفت تک عروج کر جائے گا اور معرفتِ الٰہیہ کے بلند ترین مدارج پر فائز ہو گا۔ یہ اجمالی معرفت اللہ تعالیٰ کا ایک مخفی راز ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دریائے معرفت کو عقل معاشی کے کوزے میں اس طرح بند کر دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کا اختلاط نہ ہو۔ ان دونوں (معرفت اجمالی فی الدنیا والآخرت اور معرفت حقہ)

کے درمیان فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے (جس طرح تخم میں درخت کا برگ و بار جو بعد میں تفصیلاً عالمِ وجود میں آتا ہے پہلے سے تخم میں اجمالاً موجود ہوتا ہے۔

توضیح مطلب بذریعہ دلیل منطقی

اسی کو ہم ایک اور مثال کے ذریعہ بیان کر سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذہن انسانی ہر چیز کا تصور باندھ سکتا ہے اور ایک گونہ اس کا ادراک کر سکتا ہے خواہ وہ چیز موجود ہو یا معدوم ممکن ہو یا ممتنع یا واجب الوجود۔ جس وقت ہم معدومِ مطلق پر حکم لگاتے ہیں مثلاً یہ کہتے ہیں کہ معدوم مطلق یا ممتنع (کا وجود محال ہے یا وہ) ایسا ویسا ہے تو ہم نے اس طرح معدوم کا تصور باندھ لیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں تو ہم اس پر محال یا ایسے ویسے کا حکم کیسے لگا سکتے کیا یہ تصور ذہنی معدوم محض کے مطابق، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مطابق ہے کہ اس صورت میں معدوم محض نہیں ہوگا یا کیا تصور معدوم محض کے مطابق ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس صورت میں ہم اس پر وہ احکام کیسے لگا سکتے ہیں جو صرف معدوم کے لیے مخصوص ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم اس تصور ذہنی پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے معدومِ محض کے وہ سب احکام ہماری نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں جو معدومِ محض پر ان قضایا میں لگائے جاتے ہیں جن کی صحت حتمی طور ثابت شدہ ہوتی ہے اور وہ تمام قضایا حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس جیسے احکام میں حقیقت یہ ہے کہ ذہن میں جن امور کے ادراک کی فطری قوت رکھی گئی ہے ان کے ادراک کی استعداد اور سامان بھی اس کو فراہم کیا گیا ہے۔ وہ جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے، تو اس چیز کی ایسی تصویر اپنے نہاں خانۂ دل اور اس کا ایسا تصور اپنے سینہ میں بنا لیتا ہے۔ جو امر مطلوب کے ادراک کا آئینہ ہوتا ہے۔ اپنے اس تصور کی ماہیت کو بعینہٖ اسی چیز کی ماہیت سمجھتا ہے۔ اور اس کے احکام بھی اس پر جاری کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ اجمالی قاعدہ بھی جانتا ہے کہ کسی معدوم محض کے مشابہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اور اس طرح وہ جہل مرکب سے نجات پاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر معدوم محض تک پہنچنے اور اس سے پردہ خفا ہٹانے کو بھی فرض کر لیں تب بھی وہ کسی وجہ سے اسے اپنے تصور کے خلاف نہیں پائے گا۔ یہی حال ان سب امور و احکام کا ہے جو انسان کی قوت ادراک کی

رسائی سے باہر ہیں۔(کہ اگر اس کے ذیلی تصور کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی شامل ہو کہ اس کے ذہنی تصور اور اس چیز کی اصل تصویر میں بڑا فرق ہے۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں تو اس کو بھی ہم معرفت کہیں گے)۔

یہ بھی یاد رہے کہ معدوم کے لیے ذہن میں ایک مخصوص صورت کا قائم کرنا خود انسان کا اکتسابی کمال نہیں ہے اور نہ یہ اس کے فکر و نظر کے استعمال کا نتیجہ ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جو انسان کی جبلّت میں بطور استعداد کے رکھی گئی ہے جیسے کہ شہد کی مکھی اور چڑیا وغیرہ کو معاش اور مرافق حیات حاصل کرنے کی فطری تلقین کی گئی ہے۔

معرفت باری تعالیٰ بذریعہ عقلِ معاشی اور اخلاق و علوم

اسی طرح رب تعالیٰ کی معرفت کماحقہ کسی فرد بشر کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ پروردگار کی ذات انسان کی عقل نارسا سے ماورا ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تصور ایک اجمالی آگہی، بیداری، اور اس کی طرف التفات فکر و نظر سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب وہ اس کلّیہ کو عمل میں لانے کی طرف ملتفت ہو کہ ہر موجود کے لیے کوئی نہ کوئی موجود ضرور ہوتا ہے اور ہر نئی صورت گری کسی محول کی مرہون منت ہوتی ہے۔ معرفت الٰہی کا یہ درجہ اسے ذاتی محنت و اکتساب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ تو پروردگار عالم کی بخشش وعنایت ہوتی ہے جو بندے کی فطرت کے ذریعہ جاری ہوتی ہے۔ اکتساب کو اگر دخل ہے تو صرف اس قدر کہ فطرت کو بیدار کیا جائے اور اس فطرت کو اپنا کمال سمجھا جائے۔ کیوں کہ اخلاق اور علوم کے ذریعے کمال حاصل کرنے کا شوق انسان میں فطری ہے۔

معرفت خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کو مذکورہ قاعدہ کلّیہ (لکل موجود موجد) سے مستنبط کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کارخانہ ہستی میں جو نظام ہم دیکھ رہے ہیں، یا جس کی صحت پر عقل سلیم کے دلائل قائم ہیں، اس کا کوئی موجد اور بنانے والا ضرور ہے۔ جس نے اس کو نیست سے ہست کر دیا ہے۔ وہ ایجاد کنندہ ہستی عالم مادّی سے خارج (مستقل اور مطلق) بالاتر وجود رکھتی ہے۔ اس کے اوصاف مخلوقات کے اوصاف سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کی مثل کہیں نہیں۔ اس کی حقیقت کے ادراک سے سب لوگ

قاصر ہیں اور وہ بالفعل اس کی معرفت تک رسائی نہیں رکھتے۔ وہ پروردگار و مربی ہے اور وہ سب امور میں تصرف کرتی ہے اور وہ کسی طرح اس نظام کائنات کے مشابہ نہیں ہے۔ پھر جب وہ محسوس سے ترقی کر کے تخیل یعنی عالم مشہودات و موجودات سے عالم خیال میں قدم رکھتا ہے تو نظام کائنات کے چلانے والے کو واہمہ اور متخیلہ کے سب تصوروں اور تصویروں سے منزہ کر لیتا ہے اور جب وہ عالم شہادت سے ترقی کر کے عالم غیب میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے رب کو عالم غیب کی ہیئتوں سے اسی طرح منزہ سمجھ لیتا ہے۔ جس طرح عالم شہادت کی ہیئتوں سے پاک و منزہ سمجھا تھا۔ (اور لیس کمثلہ شئی کو اپنے ذہن میں قائم رکھتا ہے) اور اس طرح جب ارتقا کی بلند ترین منزل پر پہنچ کر جملہ کائنات اور اس کے اندر کارفرما نظام کا احاطہ کر لیتا ہے تو وہاں بھی ذہنی تصور الٰہی کے ساتھ ساتھ لیس کمثلہ شیئی کو قائم رکھتا ہے۔ غرض وہ ذہنی ارتقا کی جس حالت میں بھی پہنچتا ہے وہاں اسے معرفت اولی یعنی اجمالی معرفت سے رجوع یا اس کی تکذیب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس ہمہ گیر نظام میں جو آثار و ظہورات اسے باہم منظم نظر آئیں گے وہ ان کو اسی ایک ذاتِ اقدس کے حکیمانہ تصرف کے کرشمے سمجھے گا اور اسی طرح بعد کے تمام منظم انکشافات کو بھی ذات الٰہی کی تدبیر کی طرف راجع کرے گا اور اس کی یہ معرفت اس کی پہلی اجمالی معرفت کی تفصیل ہوگی۔ (بعینہٖ جس طرح درخت کی شاخیں اور اس کے پتے اور پھول پھل سب اس کے تخم کے اجمال کی تفصیل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے الدنیا مزرعة الاخرة کے ایک معنی یہ بھی ہوں) اور پہلی معرفت میں ذرہ بھی گڑ بڑ اور تخلیط نہیں ہوگی اور نہ اس میں جہل کی آمیزش ہوگی۔

سوء معرفت کے اسباب و اقسام

وہ لوگ جنھوں نے پورے نظام کائنات کو نہیں سمجھا تو (وہ سوء معرفتِ الٰہی کے شکار ہو گئے اور) انھوں نے اس نظام کے ظاہری اسباب کو علۃ العلل سمجھ کر خدائے خالق و مدبر کی پہچان میں غلطی کی چنانچہ علما طبعیات نے اس نظام کو عناصر کے طبائع سے منسوب کیا۔ صائبین نے اس کو سیارات اور اجرام فلکیہ کی گردش کا نتیجہ قرار دیا اور وہ ان سیاروں اور ستاروں کی ربوبیت کے قائل ہو گئے۔ اور مشرکوں نے اس نظام کے بعض آثار کو اپنے

اسلاف کے عظما اور مقدس ہستیوں سے جن کو وہ اللہ تعالیٰ کے شریک سمجھتے ہیں منسوب کیا۔ ان سب کے جاہلانہ نظریۂ معرفت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خالص فطرت انسانی کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور ان کے سینوں میں جو مکمل معرفت مرکوز تھی اس کو نظرانداز کر کے اس کے ساتھ دوسری اشیا مخلوط کر ڈالیں، محسوسات کے ساتھ اور مالوف عادتوں کے ساتھ معرفت الٰہی کے اختلاط اور موروثی عقائد و رسومات کی تقلید نے ان کو ورطہ ضلالت میں ڈالا۔

یہ خیال تمہارے ذہن و دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب اجمالی طور پر معرفت حقہ ان کی فطرت میں موجود تھی تو تفاصیل میں انھوں نے کیوں غلط راستہ اختیار کیا؟ میں تمہارے سامنے ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص کو ڈاکٹر یا حکیم کے کہنے سے یا اپنے تجربہ کی بنا پر یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ کڑوی اور تلخ دوائی میری بیماری کا علاج ہے بشرطیکہ وہ اسے کھالے لیکن وہ اپنی طبعی نفرت کی وجہ سے وہ دوائی نہیں کھاتا۔ اسی طرح انسان بعض ان اخلاق حسنہ کے حسن و کمال کا جبلی طور پر قائل ہوتا ہے، وہ جسم کے عناصر ترکیبیہ کے کمال اتصال و صلابت سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بعض خارجی عوامل اور گرد و پیش کے حالات کی وجہ سے وہ ان اخلاق کی خوبیوں کا قائل ہو کر بھی ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ شاید اس کا راز یہ ہے کہ انسانی طبیعت، عادات و تقالید اور محسوسات و مشہودات سے وابستگی انسان کے دل و دماغ اور فطرت سلیمہ کے تقاضوں پر غالب آتی ہے اور وہ اپنی نظر عقلی کو اس معرفت پر مرکوز نہیں کر سکتا جو فطرتاً اس کے ذہن کے اندر محفوظ ہے۔

الغرض یہی معرفت اجمالی تسبیح بحمدہ کی تفسیر ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے ابنائے جنس (حیوانات و نباتات و جمادات) میں ممتاز ہے۔ یہ معرفت ہر آدمی کے ذہن میں مرکوز ہے یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو اس فطری معرفت اجمالی کے خلاف عمل کرتے ہوئے دیکھا جائے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مادیات کی طرف جھک کر انہیں میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور کبھی اندرون سینہ مخفی داعیۂ توحید کی طرف یکسو ہو کر دھیان نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن نظریوں کی بنا انسان کے وجدان پر ہوتی ہے، وہ علم حصولی کی طرح (ہر وقت پیش نظر اور ادراک پر مسلّط) نہیں ہوتے۔

دوسری فصل

اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات کا اجمالی اثبات اور زبان متعارف میں ان کی کیفیت تعبیر سے آگاہی

وجودِ حق پر کلی وجزی کا اطلاق نہیں ہوسکتا وہ کلی وجزئی سب پر محیط ہے

کیا دلیل قطعی سے یہ بات ثابت نہیں ہو چکی کہ وجوب قطعی (جو اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے) نہ تو کلی ہے اور نہ جزئی کیونکہ (درحقیقت) وہ تمام موجودات وکائنات کا مبدا حیات ہے۔ سب کی نسبت اس سے برابر ہے اور سب کو اس کی وحدت نے گھیر رکھا ہے۔ وہی وجود حق تقرر ناجز اور ثبات دائم سے متصف ہے وہ ناتمام وناقص کلیات اور مقید وتنگ بلکہ پوری طرح محدود جزئیات سے ہر لحاظ سے مختلف ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کلی اور جزئی کا مفہوم عقل کی ایجاد اور قوت مدرکہ کا اختراع وصنعت گری ہے۔ جس حقیقت سے بالاتر کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں وہ ان دونوں کے ساتھ موصوف ومتصف ہونے سے مبرا ہے۔

خدائے رحمٰن جل وعلا کا فیض کلی ہے جو سب پر محیط ہے۔ کوئی موجود خواہ وہ جوہر ہو یا عرض اور کوئی حادث شے جو ظہور میں آئے یا اور کسی حالت کو چھوڑ کر دوسری حالت میں تبدیل ہو (غرضیکہ کائنات کی جملہ تصریفات اور تبدیلیاں) اسی ہمہ گیر فیض کے سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہیں۔

اس معرفت تفصیلیہ کے ادراک کے دو رخ

اس حقیقت کا ادراک کرنے کے دو رخ ہیں:

ایک یہ کہ اس کو اوپر کی جانب سے دیکھا جائے اور اس وجدانی حقیقت کو چشم بصیرت سے مشاہدہ کیا جائے جو مظاہر مختلفہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کو نیچے کی طرف سے دیکھا جائے اور ہر ایک مظہر کو مستقل طور پر اس طرح مشاہدہ کیا جائے کہ اس میں فیض رحمانی کی جھلک صاف نظر آتی ہو۔

اب ہر ایک مظہر میں ظہور فیض کی جو حالت ہے اس کو جداگانہ نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جتنے مظاہر ہوں گے اتنے ہی اسما ہوں گے تفصیلی معرفت الٰہی کے لیے دوسرا رخ زیادہ مناسب ہے۔

واجب الوجود کا علم اشیا ذاتی، مقدس اور محیط ہوتا ہے

''واجب و مطلق'' سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے اس کا اس کو علم ہوتا ہے اور اس کا یہ علم اس کے علم ذات میں مندرج ہوتا ہے اور ہر ایک معلوم کے تمام صفات و متعلقات پر حاوی ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو؟ سب اس کے معلول اور اس کی ذات اقدس کے شئون اور کمالات نفسی کے پرتو ہی تو ہیں۔ اس کا علم ہمارے علم کی طرح نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم حواس کے ذریعے عوارض اور ظاہری صورتوں کو دیکھ کر کسی چیز تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اسی طریق سے اس کو پاتے ہیں جس طریق سے ہم اس تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واجب تعالیٰ ہر چیز تک اس چیز کے علل اور اس کے وجود کے پیدا کرنے کے اسباب سے متعلق اپنے علم مقدس کی جانب سے آتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس کا علم مقدس تمام معلومات پر محیط ہے۔ خواہ وہ معلومات کلیات ہوں یا جزئیات ہوں لیکن یہ نکتہ ہر وقت ملحوظ رہے کہ اس کا علم مقدس ہمارے علم حواس و ناسوت کی طرح نہیں ہوتا۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح اس کی دیگر صفات عالیہ اصول و مبادی میں ہماری مادیت کی گندگی سے آلودہ ناسوتی صفات سے کسی قسم کی مماثلت و مشابہت نہیں رکھتیں ہاں نتائج اور آثار کے لحاظ سے دونوں کی صفات میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس نظریہ کو فلاسفہ اور اہل ملت سب یکساں طور پر مانتے ہیں۔ ان کے درمیان اختلاف لفظی نزاع سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور وہ نزاع

لفظی تحقیق کے وقت مضمحل (اور نابود) ہوجاتا ہے۔

الفاظ مستعملہ کی حقیقت

تم جن الفاظ کو روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہو کبھی تم نے ان کے حقائق پر غور وفکر کیا ہے؟ اگر کرتے تو تمھیں یہ معلوم ہوتا کہ ہر اسم اور صفت کا اطلاق تم کسی چیز پر اس وقت کرتے ہو جبکہ تم ایک قسم کے آثار وعلامات اس سے ظہور میں آتے ہوئے دیکھتے ہو جن پر اس اسم اور صفت کی بنیاد ہوتی ہے۔ جن کی بنا پر اس وقت یہ اطلاق وتسمیہ درست ہوتا ہے لیکن اس کے بعض آثار وعلامات اور نشانیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کو تم کسی اسم یا وصف کا اطلاع کرتے وقت ملحوظ نہیں رکھتے۔ مثلاً قتل کا وقوع جس طرح تلوار کے مارنے سے ہوتا ہے، اس طرح گلا گھونٹنے یا کسی اور مہلک ہتھیار کے استعمال سے بھی موت واقع ہوسکتی ہے۔ جس کو قتل ہی کہیں گے۔ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کے اطلاق میں ان مختلف شکلوں کے تصور کو دخل نہیں قتل کا اطلاق روح کو جسد عنصری سے جدا کرنے پر ہوتا ہے جب بھی کسی کی روح کسی آلۂ جارحہ سے یا کسی غیر کے فعل سے جسم سے پرواز کرے گی اس فعل کو قتل کہا جائے گا۔ بالفاظ دیگر قتل ازہاقِ روح کا نام ہے۔

اس طرح لفظ ''الرحیم'' ہے اس کا مفہوم حقیقی یہ ہے کہ جس ذات کو اس اسم سے پکارا یا موسوم کیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی خبر گیری کرتا اور ان کی ضروریات وحوائج پورے کرتا ہو اس کی مثال ایک مشفق باپ کی ہوتی ہے جو اپنے بیٹے پر شفقت فرماتا ہے۔ رحمت کا نام درحقیقت رافت ورقت قلب کے معنی کے لیے وضع نہیں کیا گیا ہے لیکن بعد میں جب ماہرین لغات نے ''رحمت'' کی جامع ومانع قسم کی توضیح کی طرف توجہ دی تو رقت کے سوا کوئی دوسرا لفظ قریب ترین مفہوم کے ساتھ ان کو نہیں ملا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی متکلم رحمت کا لفظ یا اس لفظ کے مشتقات استعمال کرتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں رقت قلب کا مفہوم آ بھی جائے تو وہ صرف اس لیے ہوگا کہ اس سے عام طور پر رحمت کا تصور واضح ہوجاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ رحمت رقتِ قلب ہی کا نام ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص بغیر اس

کے کہ دل میں رقت پیدا ہو مشفقانہ طریقہ پر اور پدرانہ محبت کی صورت میں لوگوں کے حوائج اور ضروریات پوری کرتا ہے تو رحیم کے بغیر اور کسی لفظ کا اطلاق اس پر موزوں نہ ہوگا۔

الغرض الفاظ کو وضع کرنے کی ضرورت مختلف حقائق کا مفہوم ذہن نشین کرنے کی وجہ سے پیش آئی اسی طرح ہم کو حقائق میں تعدد اور کثرت کا احساس بھی ان کے آثار و علامات اور نشانیوں کی کثرت کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔ ہم ہر حقیقت کو اپنے آثار و علامات کے ذریعے پہچان لیتے ہیں اور ہر لفظ کسی ایسی حقیقت کے لیے وضع کیا جاتا ہے جس سے مخصوص آثار رونما ہوتے ہیں۔ اس تحقیق سے میں اس حقیقت پر پہنچا ہوں کہ مادیات سے بالاتر حقائق کے لیے ان اسما وصفات کا استعمال کرنا جو ہماری معاشی زبان میں انہی جیسے حقائق کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ نتائج اور آثار ہی کے لحاظ سے ہے۔ اور مبادی کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ استعمال حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اور زبان کے محاورہ کے عین مطابق ہے۔ خواہ مخواہ مبادی کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ان لوگوں کی فضول موشگافی ہے جو اپنے آپ کو علما کہتے ہیں اور جو غیر متعلقہ گفتگو میں پڑ کر متکلمین کہلاتے ہیں۔ خالص اہل زبان کے نزدیک اس قسم کی لغو باریک بینی پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر (متکلمین کو اپنی بات پر اصرار ہو اور) ہم ان کی خاطر کچھ نیچے اتر کر بات کریں تو ہم کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا اطلاق (یعنی رحیم کا اطلاق اس ذات پر ہے جس سے رحیمانہ افعال صادر ہوں) کلام متعارف میں جائز اور مقبول سمجھا جاتا ہے اور کوئی بھی اس کو قابلِ اعتراض خیال نہیں کرتا۔

لسانی اور عقلی علوم کے ساتھ باری تعالیٰ کو متصف کرنے میں کوئی حرج نہیں

کیا تم نے اپنی اس عقل اور قوت مدرکہ کے متعلق تحقیق کی ہے جس کی مدد سے تمہاری زبان بنی ہے؟ اگر اس سلسلہ میں تم تحقیق سے کام لو تو جان لو گے کہ تمہارے ادراک کی باطنی آنکھ کی بینائی میں عالم لاہوت کے خدوخال کو دیکھتے وقت نقص اور بھینگا پن پایا جاتا ہے۔ جب تک تم صرف اس عالم مشہود کے نظام کو پہچانتے اور اسی سے مانوس ہو اس وقت تک تم اپنے موجودہ انداز اور علم کے ساتھ اپنے پروردگار کا وصف بیان کر سکتے ہو۔ اس میں

کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ معرفت الٰہی تمہارے لیے کافی ہے اور جب آخرت میں تمہارا بھینگا پن دور ہو کر سب حقائق اپنی اصلی شکل میں جلوہ گر ہوں گے تو تمہاری یہ معرفت بعینہٖ علوم حقہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ کاش کہ میرے پاس کوئی ایسی مثال ہوتی جو میرے اس کلام کے مضمرات کو پوری طرح واضح کر سکتی۔ (بہر حال ایک مثال سن لیجئے) جو شخص دور سے درختوں کے جھنڈ پر نظر ڈالتا ہے تو وہ جھنڈ اس کو ایک مبہم شکل اور سیاہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے کچھ سیاہ اور کوئی شکل دکھائی دیتی ہے (درخت کا ذکر نہیں کرتا) تو وہ اپنے اس کلام میں کاذب اور جھوٹا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو زبان کے محاورہ کے مطابق آنکھوں میں سیاہی کی تصویر کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ جو ظاہراً درست ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے، اگر کوئی شخص جنوب کی طرف بہت دور چلا جائے اور قطب شمالی اس کی نظروں سے غائب ہو جائے تو وہ اس حالت کو قطب شمالی کے سقوط یا غروب سے تعبیر کرے گا۔ حالانکہ کرہ زمین سے قطب شمالی کی نسبت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، اس میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا فرق اگر ہے تو وہ جنوب کی طرف جانے والے کا اس حد تک بڑھنا ہے جہاں پر اس کو ستارے حالت غروب میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تمہارا یہ قول کہ سورج بادلوں کے اندر چھپ گیا، حقیقت کے خلاف ہے کیوں کہ حق تو یہ ہے کہ آفتاب تو بادلوں کے اوپر ہے اور بادل تمہارے اوپر لیکن تم کو سورج بادلوں کے نیچے دکھائی دیا ہے تو اس قسم کی غلط بیانی، خلاف واقعہ اور جھوٹ کو محاورات زبان میں درست سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال سرخ گلاس کی ہے جس میں سے ہر ماوراچیز سرخ نظر آتی ہے اس قسم کا ادراک کرنے والے کے سامنے دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ مدرک (بفتح الرا) پر نظر رکھے اور نفس ادراک کو وہ مقصود اولین خیال نہ کرے چنانچہ خالص اہل زبان ایسا ہی کرتے ہیں اس قسم کا ادراک رکھنے والا اگر اس دنیوی حالت سے نکل جائے یا علم کامل کے درجہ پر فائض ہو جائے تو اس کو اپنے پہلے نظریہ کی تغلیط و تنقیص نہیں کرنی پڑے گی (کیوں کہ وہ نظریہ اگرچہ حقیقت سے بہت دور تھا لیکن بظاہر جو صورت حال تھی اس کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشبہہ و متکلمین کی طرح اس کی نظر اور توجہ مدرک پر نہ ہو بلکہ نفس ادراک پر مرکوز ہو وہ اس کو ذریعہ نہیں بلکہ مستقل چیز خیال کرے۔ اور اس کو غیر متبدل عقیدہ کے طور پر مان لے تو اس قسم کا شخص جہل متراکم میں مبتلا ہوتا ہے اگر اس کو اس دنیوی حالت سے نکل کر آخرت میں قدم رکھنے کا موقع ملے یا علم کامل کے درجہ پر فائز ہو کر ترقی کرے تو اس کو اپنا پہلا نظریہ لازماً جھٹلانا پڑے گا۔

پس مومن اگرچہ اس کا عقیدہ ہے کہ ''الرحمٰن علی العرش استوی'' اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں جانب فوق کا تصور بھی آتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے رب کو مادیات کی ہر ایک وصف مدنس سے منزہ اور مبرا سمجھنا ہے۔ لیکن خالص تنزیہہ کا تصور کرنے سے وہ قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو جانب فوق میں تصور کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اسی تصور کو وہ اصل حقیقت کے قائم مقام سمجھتا ہے۔ تاہم تنزیہہ کا اعتقاد اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور فوق کا تصور اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کے علو اور تصرف فی العالم کا وہ کسی اور طریقہ پر تصور کر ہی نہیں سکتا اس لیے وہ مجبوراً اس خیال کو اپنے ذہن میں آنے دیتا ہے ایسے شخص کا علم جب کامل ہوگا اور اصل حقیقت اس کے سامنے جلوہ گر ہوگی تو وہ اس کو اپنے پہلے علم کے مناقض نہیں پائے گا۔ (اور اس لیے اس کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا) برخلاف اس کے وہ شخص جو (اپنے آپ کو عالم متکلم کہتا ہے اور اس کا تعلق) فرقہ مشبہہ سے ہے اور وہ علما کے ساتھ بحث و جدال میں پڑ کر تشبیہہ کے عقیدہ کو بزعم خود قطعی دلائل سے ثابت کرتا ہے اور اسی کو غیر متبدل حقیقت سمجھتا ہے۔ اس قسم کا نام نہاد عالم متکلم جہل متراکم کی تہ بر تہ تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے بنی اسرائیل کے ایک فاسق و فاجر کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ ''جب میں مر جاؤں تو میرے جسم کو آگ میں جلا کر اور راکھ بنا کر ہوا میں اڑا دو''۔ اس شخص کے دل میں خوف تھا کہ مرنے کے بعد اگر اللہ نے دوبارہ اس کو زندہ کیا تو اس کو عذاب سے نجات نہیں ملے گی، صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر

دیا جائے تا کہ اس کے منتشر اجزا کو یکجا نہ کیا جا سکے (اللہ تعالیٰ نے اس کو اس عقیدہ کی بنا پر بخش دیا حالانکہ یہ حقیقت الامر کے خلاف تھا) اسی طرح ایک سیاہ فام لونڈی کے ایمان ونجات کا قصہ بھی ہے جب وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ تو لونڈی نے جواب میں آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مومن ہے اس تصور کا ثبوت سورۃ الملک کی آیت اَءَ مِنتُم مَّنْ فِي السَّمَآءِ سے بھی ملتا ہے) الغرض تحقیق کا دامن پکڑو اپنے عقیدہ میں نور بصیرت سے کام لو۔

معرفت الٰہی کی وجوہ تعبیر

جب تم تحقیق کے اس عظیم درجہ تک پہنچ جاؤ تو پھر یہ کیوں کر نہ ہو کہ تم اس نتیجہ پر بھی پہنچ جاؤ کہ عقل معاشی اپنے رب کی تفصیلی معرفت اور اپنی معرفت کے مطابق اس سے تعبیر حسب حال مختلف طریقوں سے کرتی ہے (ان میں سے مندرجہ ذیل طریقے اور وجوہ قابل ذکر ہیں)۔

ایک تو یہ کہ تم کو کئی ایک آثار ونتائج متفق المعنی نظر آئیں، تو تم ان آثار کے ظہور کے وقت مافی الضمیر کو اپنی ناسوتی زبان میں خاص الفاظ سے تعبیر کرتے ہو۔ اسی طرح رحمٰن خدائے عزو جل کے فیض کا جو جلوہ تمہیں انہیں آثار ونتائج کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اپنے مبلغ علم کے مطابق اس کو بھی انہی الفاظ سے تعبیر کرو۔ مثلاً تخلیق کائنات اور اجسام اشیا کی صورت بندی دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو مصور کے اسم سے موسوم کرلو۔ اپنی مخلوق کو جس طرح اور جن اقسام وانواع کے ذرائع سے روزی پہنچاتا ہے اور کمزوروں کو قوت بخشتا ہے اس کا جلوہ ملاحظہ کر کے اللہ کو رزاق اور مقیت کے اسما سے یاد کرو۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس دوسرے آثار کو دیکھ کر اسما سے موسوم کرلو۔

دوسری صورت تعبیر یہ ہے کہ تو عالم مادی کی نجاستوں اور گندگیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ عزّ وجل کو ان ادناس، انجاس سے مبرا سمجھنے کے لیے کوئی تعبیر استعمال کرتے ہو، مثلاً یہ کہتے ہو کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ (نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور کوئی اس کا ہم سر و برابر نہیں)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پھٹے پرانے کپڑے پہننے اور ردّی

قسم کا کھانا کھانے اور بھوک سے بے قرار ہونے کی کیفیتوں سے دوچار ہونے سے منزہ سمجھا جائے (کیونکہ یہ مالکِ دوجہاں کی شان کے شایان نہیں ہے)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ تواپنی (ناسوتی) زبان میں بہترین خوبصورت ترین اور عظیم ترین کلمات اور مدح وتعریف دیکھ لو اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار کی تعریف و توصیف کرتے رہو۔ ان الفاظ سے تمہارا مقصد ناسوتی مقاصد کا استعمال نہ ہو بلکہ صرف حسن و رونق اور جلالتِ شان ہی ہو۔ بس تم یہ کہو کہ **اللّٰہ عزّ و جل العظیم العلیٰ الکبیر الواسع** (وغیرہ) ہے یہ بھی اسماحسنیٰ میں سے ہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ تم اپنی عقل وادراک کے مطابق نظام کائنات کا ملاحظہ کرو، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی دیکھو تو تم اس نظام کے مناسب اللہ تعالیٰ کو کوئی نام دے دیتے ہو۔ لیکن اگر تعمق وامعان کے ساتھ تحقیق کی جائے اور آدمی کا علم نظام کامل کے تمام اطراف وجوانب پر حاوی ہو تو اس وقت وہ اس کو کسی دوسرے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

مثلاً عام طور پر قدرت کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے پر برابر اختیار رکھے، عقل معاشی نے قدرت کا یہ مفہوم سمجھ کر ایک عمیق مسئلہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہ ممکن کے دو پہلوؤں میں ایک پہلو "واجب" ہوتا ہے اور یہ ایک امر واقع ہے کہ جو چیز بھی معرض وجود میں آتی ہے اس کی علت فاعلیہ حتماً اس کا سببِ وجوب ہوتا ہے۔ سلسلۂ اسباب کے بغیر اشیا کا وجود میں آنا متصور ہی نہیں جو لوگ الہامی مذاہب وشرائع کے قائل ہیں کیا وہ تقدیر اور قضائے مبرم کا انکار کر سکتے ہیں جس کے اثبات میں سینکڑوں آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ موجود ہیں؟ اور کیا وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل و ہر تصرف کسی نہ کسی ایسی حکمت بالغہ پر مبنی ہوتا ہے جس کو نظر انداز کرنا جہل و بیوقوفی کی دلیل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خداوند عزّ وجل کے ہر فعل میں حکمت بالغہ کار فرما ہے۔

الغرض عقل معاشی میں قدرت کا مفہوم اس سے زائد نہیں کہ فعل اور ترک سے اس کی نسبت مساوی ہو۔ لیکن اس نے الرحمٰن کے تجلیات افاضہ کو ملحوظ نہیں رکھا جو کسی فعل کے صدور کو واجب بنا کر چھوڑتی ہیں۔ اس لیے عقل معاشی کو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کام کیا

حالانکہ وہ اس کو ترک بھی کر سکتا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو اس نے قدرت الٰہی سے موسوم کیا ہے۔ بہر حال اس قسم کی (اجمالی) معرفت سے غافل نہ رہنا۔ کیونکہ جو لوگ مدارج حیات اور منازل زندگی (دنیوی و اُخروی) کا عرفانِ حقیقی رکھتے ہیں وہ اس معرفت کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں۔لیکن وہ لوگ جن کی جبلتوں میں ایک ہی استعداد پائی جاتی ہے (اور ان کو ماوراالعقل یا مابعد الدین کیفیات کا علم نہیں دیا گیا)۔ان کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس اجمالی معرفت کو چھوڑ دیں جو نسمہ (روح ہوائی) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔حالانکہ یہ دنیاوی زندگی میں سب سے قریب ترین یا اونیٰ ترین درجہ ہے۔اور اس کا حصول اسی فانی زندگی میں ممکن ہے۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (اجمالی معرفت کے ساتھ ساتھ) تفصیل معرفت بھی انسان کی اصل فطرت میں ودیعت رکھی گئی ہے۔اور اس کا حصول صرف اس بات پر منحصر ہے کہ آدمی خالص اپنی فطرت کی طرف رجوع کرے (اور معرفتِ اجمالی کے ذریعہ معرفتِ تفصیلی حاصل کرنے کی کوشش کرے)۔

تیسری فصل

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کی تفصیلی تشریح

مؤمن کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اس عقیدہ کو اپنے دل ودماغ میں راسخ کرے کہ اللہ تعالیٰ مستقل ہستی، متعین وجود اور متحقق ومتقرر ذات ہے۔ تاکہ صفاتِ کاملہ سے اس کے موصوف کرنے اور اس کے احکام کے سامنے سراطاعت خم کرنے کا مفہوم بھی اس کی سمجھ میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحِ ہوائی اشیا کا علم صرف دو ہی محدود مفہوموں کے ساتھ حاصل کرتی ہے کسی تیسری صورت سے نہیں۔

ایک ناقص اور ادھوری ''کلّی'' جس کا فی ذاتہ مستقل علیحدہ وجود ہی نہیں۔

دوسرا مفہوم ''جزئی'' ہے جس کا اگرچہ مستقل وجود ہے لیکن اس کا مفہوم مقیّد ومحدود ہے۔

اس لیے نسمہ کو اپنے رب کی معرفت کا اظہار کرنے میں کچھ ایسے ہی الفاظ شامل کرنے پڑتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ ایک موجود مستقل ہستی کا مالک ہے۔ جو واحد لاشریک ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اپنے جملہ اوصاف میں بے مثل اور بے مانند ہے۔ حتی کہ وحدت کے وصف میں بھی اس کو بے نظیر ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کلّی کا اطلاق سب سے بڑا کلمۂ کفر اور اس کی شانِ کبریائی کے لیے سب سے بڑا عیب ہے۔ جس سے وہ یقیناً منزہ ومبرا ہے۔ (اسی طرح اس کو جزئی بھی نہیں کہا جاسکتا) حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ تو کلّی ہے نہ جزئی بلکہ اس کی ذات دونوں سے برتر وبالاتر ہے اور اس کی شانِ کبریائی ان دونوں سے بلند تر ہے۔

اپنی اس بات کو بغور ملاحظہ فرمایئے جب تم کہتے ہو کہ یہ زندہ ہے وہ مردہ ہے۔ وہ جماد وپتھر ہے تو تمہارا مقصد ہی (زندہ) سے یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز حساس ذی علم اور متحرک

بالا رادہ ہے اور میت سے مراد ایسی چیز ہوتی ہے جس میں موجودہ حالت میں احساس و شعور اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے حرکت پذیری نہ ہو حالانکہ پہلے وہ ان اوصاف سے متصف ضرور تھی اور جماد تم اس چیز کو کہتے ہو جس میں سرے سے یہ اوصاف و استعدادات موجود ہی نہ ہوں۔ اب جب تم اللہ تعالیٰ کے افعال و تصرفات اور اوصاف پر نظر ڈالتے ہی تو ان کے آثار و نتائج تم کو زندہ چیز کے افعال و تصرفات کے آثار و نتائج کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ میت اور جماد کی طرح نہیں، اور چونکہ تمہاری محدود زبان میں ان تین الفاظ کو چھوڑ کر اور کوئی لفظ ہی وضع نہیں ہوا اس لیے جب تم اپنے رب کی صفات کاملہ بتانے لگتے ہو تو اس کو حی کے نام سے یاد کرتے ہو، اور میت و جماد کے اطلاق سے اس کو منزہ و مبرا سمجھتے ہو لیکن تمہارا اس کی ذات اقدس پر حی کا اطلاق کرنا ان افعال و تصرفات کے لیے ایک عنوان ہے۔ جو اس سے صادر ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایسا حسن و خوبی رکھتے ہیں۔ کہ جن کا صدور تم اپنے رب تعالیٰ سے مستحسن سمجھتے ہو اور یہی خیال مخاطب کے دل میں بٹھانا چاہتے ہو۔ لیکن اگر کوئی حیات کا یہ مفہوم سمجھتا ہے کہ وہ ایک صفت عارض ہے جو اللہ تعالیٰ کو اسی طرح پیش آتی ہے، جیسے دوسرے اعراض اپنے محل کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔ تو اس مفہوم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو اس سے موصوف کرنا یقیناً باطل ہے۔ اس سے اس کے قائل کی جہالت ثابت ہوتی ہے اور وہ اس مسلّمہ نظریہ کے منافی ہے جس کا اقرار وہ خود زبان سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کاملہ اور مخلوق کے اوصاف میں کوئی مماثلت نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ)۔

اسی طرح جب تم کہتے ہو کہ فلاں شخص کو اس بات کا علم ہے تو اس سے تمہاری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی صورت اس کے ذہن میں مرتسم ہے لیکن غالباً اس خاص ادراک کو علم سے موسوم کرنے کا راز صرف یہ ہے کہ وہ شخص اس بات کی طرف تنبیہ اور اس سے باخبر ہے باقی اس کی ذہنی تصویر و تصور کا اس تسمیہ سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ علم کی یہ خصوصی تعریف کہ وہ ''حصول صورۃ الشئی فی الذہن'' ہے۔ یہ متکلمین کی جدت ہے۔ چنانچہ تم اپنے رب کو اسی بنا پر علیم کہہ سکتے ہو کہ وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے اور کسی چیز سے غافل و بے خبر

نہیں۔ بلکہ وہ غفلت، سہو اور جہل سے بالکل پاک ہے۔

اسی طرح سمع کی حقیقت ہے۔ جس کا مفہوم ہے ''تمام مسموعات کا کامل طور پر انکشاف اور بصر کے معنی ہیں'' جملہ مرئیات کا کامل طور پر انکشاف'' اس کے علاوہ آنکھ کھولنا مرئی چیز کا سامنے ہونا اور ایک خاص فاصلہ پر ہونا وغیرہ وغیرہ اشیا اس انکشاف کو ابصار کا نام دینے میں دخیل نہیں یہ فاضل باتیں ہیں (ان کو ابصار کے لوازم سمجھنا متکلمین کی جدت طرازی ہے۔ اصل مفہوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

ذرا اس پر بھی غور کیجئے جب تم کہتے ہو کہ فلاں شخص نے ارادہ کیا تو اس کے معنی اس وارد علم کے ہوتے ہیں جو قلب میں اتر کر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عزم مصمم پیدا کرتا ہے۔ اب اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ خدائے رحمٰن عز وجل کے افعال جو پہلے ظہور میں نہیں آئے ہوتے، ظہور میں آجاتے ہیں تو کیا ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا فعل اور تصرف بغیر علم کے ہوتا ہے یا یہ کہ اس کے ظہور میں آنے کے لیے جو شروط سنت اللہ میں مقرر ہیں اور جو استعداد حادث شے میں اس کے لیے شرط ہے وہ فعل ان شروط و استعداد کے بغیر رونما ہوتا ہے تو پھر تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل پر ارادہ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ متکلمین نے ارادہ اور ایجاب کی جو بحث چھیڑ رکھی ہے، اور اس کلامی مسئلہ میں اختلاف کیا ہے تو یہ تو عقلی اشکالات اور ذہنی مسائل تصورات میں سب سے آسان ترین اشکال ہے، جس ایجاب سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو منزہ کرنا مقصود ہے وہ ایجاب ہے جو خارجی اثر کی بنا پر آئے اور اس کے ارادہ اور فعل پر اثر انداز ہو لیکن اگر ایجاب خود اس کی طرف ہو اور اس کا اپنا ذاتی فعل ہو تو اس میں کوئی قباحت و برائی نہیں۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ ایسی کھلی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے۔

ذرا پہلے اس قول پر غور کیجئے کہ فلاں شخص اس بات پر قادر ہے، اس سے تمہاری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ اس کے کرنے اور نہ کرنے میں اختیار رکھتا ہے اور اس کے مطابق دونوں میں سے جس پہلو کو پسند کرے، اختیار کرسکتا ہے خارج سے کوئی اس کو اپنی پسند و اختیار سے روک نہیں سکتا۔ اگر قادر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اپنی مرضی کے مطابق اس پر عمل پیرا ہوجاتا ہے تو یہ بات اس کی قادریت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ورنہ کوئی قادر شخص جب کوئی کام

عمل میں لاتا اس وقت اسے قادر نہ کہہ سکتے (اس لیے کہ اس وقت تو فعل واجب ہوتا ہے اور ترک و فعل برابر نہیں رہتے)۔ بحالیکہ اس حالت میں بھی تم اپنی زبان میں اس کو قادر کہتے ہو (عاجز کا اطلاق اس پر نہیں کرتے)۔ اس کا راز اچھی طرح سمجھ لو اور یقین کر لو کہ فریقین کا اختلاف صرف نزاع لفظی ہے۔ جو تحقیق کرنے پر مضمحل ہو جاتا ہے۔

خداوند قدوس کی صفت کلام کے بارے میں ہم اس آیت کریمہ کو حتمی اور وافی شافی سمجھتے ہیں کہ مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا۔ یعنی کسی فرد بشر کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہو سوائے اس کے کہ (الف) اس پر وحی نازل ہو جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول عالم غیب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تفہیم ہوتی ہے اور اس کے باطن میں اس بات کا علم ڈال دیا جاتا ہے جس پر اس نے اپنی توجہ مرکوز کی تھی۔ یا عالم رویا (خواب) میں اس کو کسی نہ کسی طرح حقیقتِ حال اور مراد مطلوب سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

(ب) اومن وراء حجاب۔ یا یہ کہ اس کے ساتھ پس پردہ کلام کیا جائے۔ اور بنا بنایا کلام اس کے کانوں اور قوتِ سامعہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (جس پر اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ خدائے عزّ وجل کا مقدس کلام ہے لیکن) اس کو کلام کہنے والا نظر نہیں آتا۔

(ج) اویرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے (کسی فرشتہ کو) رسول و پیامبر (بنا کر) بھیج دے۔ اور وہ رسول بشری کو خدا کے پیغام و کلام کے ساتھ کسی شکل میں نمودار ہو جائے اور اس کے قلب و سمع میں امرِ الٰہی اور روحِ ایزدی کا القا فرما دے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صفتِ کلام کے بارے میں بھی وہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھو جو صفتِ رحمت اور غضب اور دیگر صفاتِ کاملہ الٰہی سے متعلق (بار بار بیان کیا گیا) ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ان صفات کا اثبات مبادی کے لحاظ سے نہیں بلکہ غایات (آثار و نتائج) کے لحاظ سے ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ متکلمین کس چیز کو کلامِ نفسی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں تو کلام نفسی کا علم اور ارادہ سے علیحدہ اور مغایر کوئی اور واضح معنی نہیں۔

چوتھی فصل

اسمائے حسنیٰ کی مزید مختصر تشریح

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

لفظ "اللّٰہ" اس ذات اقدس کا اسم علم اور خاص نام ہے جس نے نظام کائنات کو واجب اور اس کا ایجاد کیا۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس بات پر اختلاف کبھی نہیں ہوا کہ اس ذات اقدس کا نام اللہ ہے اور اس نام کا اطلاق صرف اس ایک ذات پر ہوتا ہے

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کے یہ معنی ہیں کہ تخلیق عالم اور تنفیذ قضا میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں ۔ برخلاف اس کے دنیا کے شہنشاہوں کو نظامِ سلطنت درست رکھنے کے لیے اعوان وانصار اور مددگاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان کے ہم سر دوسرے مدمقابل بھی ہوتے ہیں نیز لَا اِلٰهَ اِلَّا هُو کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ صرف وہ ذات اقدس ہماری عبادت کو مستحق ہے اور صرف اس کی انتہائی تعظیم کرنا ہے اور اس کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم تمام موجودات وکائنات کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے اور اس کی مثال اس آقا کی ہے جو اپنے غلاموں پر بے حد مہربان ہو۔ (اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لے آتے ہیں ان پر الرحیم اور خصوصی طور پر نوازش فرمانے والا ہے)

"الملک" تمام مخلوقات (ارض وسما) اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے وہی ان کے امور کی تدبیر فرماتا ہے اور اسی کا ان پر حکم چلتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے حکم سے ذرّہ بھر سرتابی نہیں کرسکتا۔ جس طرح نہایت محدود پیمانہ پر یہ اختیار دنیا میں ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کو ہم اپنی زبان میں بادشاہ کہتے ہیں۔

"القدوس" مادیات کی آلودگیوں سے پاک ومبرا ہے۔

"السلام "ضرر،ضرورات اور آفات وعیوب سے سالم ومحفوظ ہے۔

"المُؤمِن المُهَيمِن" بسا اوقات انسان کو ہر طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آتی ہے، وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو وہ مناظر دیکھتا ہے جو اس کے حق میں مضر ہیں اور اسے ان سے کسی طرح مخلص اور چھٹکارا نظر نہیں آتا اس حالت میں اللہ تعالیٰ غیبی طریقہ پر اس کی مدد اور سامانِ نجات مہیا فرماتا ہے۔ یا کسی کو اس کی دست گیری کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور پھر وہ بے خوفی اور امن وامان سے ہمکنار ہو کر فزع وخوف سے نجات پالیتا ہے۔

"العَزِيزُ الجَبَّارُ المُتَكَبِّر" بسا اوقات ہم اپنے دل ودماغ میں منصوبے باندھتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی مکمل کامیابی میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہوتا اور اپنے آپ کو ان کی تکمیل پر پوری طرح قادر محسوس کرتے ہیں لیکن جب عملی قدم اٹھاتے ہیں تو ہزار میں سے ایک منصوبہ بھی پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زبردست روکنے والی اور طاقتور ہستی نے ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے ضروری تاثیر کو روک لیا ہے۔ اور وہ اپنی مخلوق میں سے ہر ایک کے ارادوں اور تدبیروں پر غالب وجابر ہے جس طرح (محدود پیمانہ پر) زبردست جابر بادشاہ اپنی رعیت کے کمزور فرد کے حق میں اپنا ارادہ نافذ کرسکتا ہے۔

"الخَالِقُ البَارِئُ المُصَوِّرُ" جب کوئی بچہ پیدا ہو اور تم یہ کہو کہ اس کی تخلیق و پیدائش اس کے والدین کے قوائے تولید کا نتیجہ ہے تو تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہوگا۔ اسی طرح تمہارا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں اس کو پیدا کیا کیونکہ اس عالمِ کون وفساد میں جو کچھ بھی ظہور ووجود میں آتا ہے وہ خدائے پاک جل وعلا کی رحمانیت کا فیض اور اس کا مظاہرہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس عالم کے اجزا میں مضبوط ربط وتعلق اور سبب ومسبب کا سلسلہ پایا جاتا ہے اس لیے ان دونوں اقوال میں کوئی تناقض نہیں۔

"الغفّار" بہت ایسے بندگان خدا ہیں جو اپنی روح ہوائی کو فسق وفجور کی گندگیوں سے آلودہ کر چکے ہیں مگر ان پر عنایتِ الٰہیہ کی نظر کرم اور التفات ہوتا ہے تو وہ رشد وہدایت کی راہ پر لگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عفو وبخشش کر کے ان کو دنیا اور آخرت کے عذابوں سے

نجات دلاتا ہے، جو ان گناہوں کی پاداش میں ملنے والے تھے۔

"القھار" وہ متکبروں اور منکروں کی سرکش گردنوں کی کج روی کو توڑ کر انھیں جھکا دیتا ہے اور وہ کافروں اور نافرمانوں کو مختلف انواع کی شدائد و تکالیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

"الوھّاب الرّزّاق الفتّاح" دنیا اور آخرت کی کوئی بھی ایسی بھلائی نہیں جو اس کے فیضان رحمت اور بخشش سے نہ ہو۔

"العلیم" یہ مرتب نظام کائنات عبث اور فضول پیدا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ہر ایک چیز اس وقت (دنیا میں) معرضِ وجود میں آتی ہے جب اس کا وجود واجب قرار پاتا ہے تو یہ پورے کا پورا نظام کائنات اپنے کل پرزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے اور اس کا ایک ذرّہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں۔

"القابض الباسط الخافض الرافع المعزّ المُذِلّ": قبض وبسط، خفض ورفع، اعزاز اور اذلال اللہ تعالیٰ کے متقابل افعال وتصرفات ہیں جو اس عالم میں ظہور میں آتے ہیں۔ کچھ اشیا میں ایک صفت ظاہر ہوتی ہے تو کچھ اور میں اس کی مقابل دوسری صفت۔ انہی افعال وتصرفات کو ملحوظ رکھ کر اس کو ان اسماء حسنیٰ سے موصوف کیا گیا ہے۔

"السمیع البصیر" جب کسی مرئی چیز کا کامل انکشاف ہو جائے تو کہیں گے کہ وہ چیز دیکھی گئی اسی طرح مسموعات کے انکشاف تام کو سمع کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر سمیع وبصیر کا اطلاق اسی لیے کیا گیا ہے۔

یہ جائز نہیں کہ اس پر ذائق (چکھنے والا) اور لامس (چھونے والا) کا اطلاق کیا جائے کیونکہ ان دونوں اسماء سے ناسوتی ضرورت واحتیاج کی بو آتی ہے۔ اور عالم جبروت کے مناسب معانی کا انتزاع ان سے بہت مشکل ہے۔ اس لیے ان دونوں (اور ان کی طرح دوسرے اسما) سے اللہ تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازمی ہے۔

"الحَکَمُ العَدْل" وہ عادل اور حکم ہے۔ اور اپنے بندوں کے معاملات میں جملہ فیصلے عدل وانصاف کے ساتھ کرتا ہے۔ اور احکام اور فیصلوں کے نفاذ میں حکمت ودانش کو ملحوظ رکھتا ہے۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح (چھوٹے پیمانے پر) عادل بادشاہوں کا وطیرہ

ہے کہ ان کے فیصلے عدل وحکمت کے قوانین کے خلاف نہیں ہوتے۔

"اللطیف" کبھی اس کے معنی رحیم کے ہوتے ہیں اور کبھی علیم کے۔

"الخبیر" اس میں باریک بینی اور مبالغہ کا وہ مفہوم ہے جو علیم سے متبادر نہیں ہوتا۔

"الحلیم" بہت سے ظالم وسرکش ہیں جو اس کے غضب وعقوبت سے بچے ہوئے ہیں اور وہ ان سے انتقام نہیں لیتا۔ بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔

"العظیم" اس سے بڑھ کر شرف اور جلالتِ قدر والا زیادہ خوبیوں والا اور بڑی قدر و منزلت والا کوئی بھی نہیں ہے۔

"الغفور" اس کے معنی الغفار کے ہیں۔

"الشکور" جس طرح کوئی بادشاہ یا آقا اپنے خدمت گاروں اور نوکروں سے خوش ہو کر ان کو انعام واکرام سے سرفراز کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے فرماں بردار بندوں کی قدر دانی فرماتا ہے۔ ان کو انعام واکرام سے نوازتا ہے اور بلا اجر وثواب کے نہیں چھوڑتا۔

"العلی الکبیر" اس کی شان عالی اور بڑی ہے۔

"الحفیظ" حافظ ونگہبان ہے۔

"المقیت" روزی رساں اور رزق دینے والا ہے۔

"الحسیب" اپنے بندوں کی حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔ (الیس اللہ بکاف عبدہ)۔

"الجلیل" بہت بڑی قدر وشان رکھتا ہے صاحب جلال وجلالت ہے۔

"الکریم" اپنے بندوں کے احوال کا نگراں ہے، ان سے غافل نہیں ہوتا اور ان کے اعمال کی جزا وسزا دینے میں سستی نہیں کرتا۔

"المجیب" جب کوئی بندہ اخلاص کے ساتھ اس کی بارگاہ اقدس میں اپنی حاجت پیش کرتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

"الواسع" اس کا علم و دولت لامحدود ہیں۔

"الحکیم" اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ یا اس کے معنی العلیم کے ہیں۔

"الودود" جوکوئی اس کی اطاعت کرتا ہے وہ اس کے ساتھ محبانہ سلوک کرتا ہے اور اس پر احسان وانعام فرماتا ہے۔

"المجید" سب سے بڑھ کر شرف وبزرگی رکھتا ہے۔

"الباعث" اپنے بندوں کو دوسری زندگی بخشے گا۔

"الشہید" وہ ہر جگہ حاضر وناظر اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

"الحق" اس کا وجود حقیقی اور ثابت ہے۔ بتوں کی طرح نہیں جن کے اسما ہیں لیکن حقیقی مسمیات نہیں۔

"الوکیل" اپنے بندوں کے تمام امور کا کارفرما ہے۔

"القوی المتین" اپنے ارادے کو نافذ کر کے رہتا ہے کوئی اس کے فیصلے کی تنفیذ کو روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے وہ قوی ہے۔

"الولی" یہ کبھی ودود کے معنی میں آتا ہے اور کبھی وکیل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

"الحمید" مستحق ستائش ہے اس کی کسی بات کو معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے نظام خیر کے سوا اور کوئی چیز صادر نہیں ہوتی۔ وہ عیوب سے پاک وبرتر ہے اور اس پر کسی قسم کی آفت طاری نہیں ہو سکتی۔

"المحصی" اپنی مخلوقات کے جملہ احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔

"المبدی المعید المحی الممیت" دونوں جہاں میں اس کا تصرف ہے۔ حیات اور موت اس کے تصرف کے بعض مظاہر ہیں۔

"الحیّ" اس پر نہ تو میت کا اطلاق ہو سکتا ہے اور نہ جماد کا۔

"القیوم" عالم بالا اور عالم اسفل کی ابتدا وبقا اسی کی ذات اقدس سے ہے یا اس کی صنعت اور کاریگری ہے۔

"الواجد" غنی ہے۔

"الماجد" شرف وبزرگی کا مالک ہے۔

"الواحد" جس ذات پر اللہ کا اسم علم اطلاق ہوتا ہے وہ ایک ہے ایسا نہیں کہ دو اشیا مشترک ہوں اور ان دونوں پر اللہ کا اطلاق ہوتا ہو۔

"الصمد" آقا اور مالک ہے۔

"القادر المقتدر" ہر چیز پر قادر ہے۔

"المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن" کوئی موجود نہیں جس سے آگے اور پیچھے وہ موجود نہ ہو، وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے کہ اس کے افعال ظاہر اور اس کے وجود کے دلائل واضح ہیں۔ جن کے ذریعہ اس کی پہچان ہو سکتی ہے اور وہی باطن ہے کہ عقل وحواس کے ذریعہ اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ ماورا العقل والحواس ہے۔

"الوالی" بادشاہ ہے۔

"المتعالی" سب سے برتر اور مقدس ہے۔

"البر" اپنے بندوں کے ساتھ احسان کرنے والا ہے۔

"التواب" (توبہ قبول کرنے والا ہے) جب کوئی بندہ اس کے دربار میں دست بدعا ہوتا ہے۔

"المنتقم العفو" کبھی مناسب مناسب وقت پر انتقام لیتا ہے اور کبھی عفو و درگزر فرمانے والا ہے۔

"الرؤوف" رحیم ومہربان ہے۔

"مالک الملک ذوالجلال والاکرام" المقسط: اس کے سب تصرفات میں جلال واکرام اور عدل وانصاف کی جھلک ہوتی ہے۔

"الجامع" یوم حشر میں لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔

"الغنی" غنی ہے آسمانوں اور زمین کے سب خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اسے کسی چیز کی کمی وفقدان کی تشویش نہیں ہوتی۔

"المغنی (غنی کرنے والا) المانع" مانع اس کو کہتے ہیں جو دینے کی قدرت رکھتا

ہواور کسی وجہ سے نہ دے۔

''الضار النافع'' (ضرر و نفع دینے والا ہے)

''النور الہادی'' (وہ منبع نور اور سرچشمہ ہدایت ہے جو) اپنے بندوں کو حق کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

"البدیع" کبھی فاطر (پیدا کرنے والے) کے معنی میں آتا ہے اور کبھی نرالی شان والے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے کہ کوئی اس کی مانند نہ ہو۔

"الباقی" اس پر زوال طاری نہیں ہوتا۔

"الرشید" اس کے احکام واوامر سب حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔

"الصبور" حلیم کے معنی میں ہے۔

پانچویں فصل

"وَكَمْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی تفسیر

آیت کی تعریف

آیات (جمع آیۃ) قدرت الٰہیہ کی ان کھلی نشانیوں کو کہتے ہیں جن کو دیکھ کر انسان کی طبیعت وفطرت اور اس کا دل ودماغ مغلوب ہو کر سر اطاعت خم کرنے پر مجبور ہو۔ ان نشانیوں کو دکھانے کی دو وجہیں ہوتی ہیں:

یا تو (۱) طبیعت انسانی کا عدم انقیاد اور اس کی سرکشی ہوتی ہے، جو ان آیات الٰہیہ کے بغیر مقہور ومغلوب نہیں ہو سکتی۔ جن کو دیکھ کر سرکش طبیعت متحیر وحیران ہو جاتی ہے اور پھر اپنی بے بسی کو دیکھ کر عالم جبروت کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس کی ہیبت سے متاثر ہو کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عالم خوف ودہشت میں ذکر وفکر الٰہی میں مشغول ومنہمک ہو جاتا ہے۔

اور یا (۲) ان آیات باہرہ کو دیکھ کر خود بخود اس کے دل میں ان کی عظمت بیٹھ جاتی ہے۔

آیات الٰہیہ کے اقسام اور فوائد

آیات الٰہیہ کی کئی قسمیں ہیں۔ سماویہ: ارضیہ، نفسیہ (یا آیات کونیہ اور آیات نفسیہ) ان شواہد کونیہ، براہینِ عقلیہ، حقائق تاریخیہ اور آیات نفسیہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عالم جبروت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یا ان کو دیکھنے کے بعد خالق ومالک کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل وحقیر سمجھتا ہے۔ اس مقصد سے ہٹ کر آیات کو دیکھنا یا مشاہدہ

کرنا چنداں مفید نہیں (بلکہ اس قسم کا مادہ پرستانہ مشاہدہ جو عصر حاضر میں یورپ کے سائنس داں کررہے ہیں، انسان کو کفر والحاد اور مادہ پرستانہ زندگی کا قائل کر کے انسانیت کو اصل مقصدِ حیات سے دور لے جانے کا باعث اور دنیا وآخرت میں باعثِ ہلاکت ہوتا ہے۔ایک مسلمان کے مشاہدہ آفاق والنفس اور غیر مسلم کے مشاہدہ میں یہی بنیادی فرق ہے)۔

یہ بات انسانی فطرت کے خواص میں سے ہے، کہ وہ جب کسی غیر معمولی اور بڑے حادثہ کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر بیداری ضمیر اور آگاہی باطن کے آثار رونما ہوتے ہیں۔اور وہ اس واقعہ یا حادثہ (کے اسباب، واقعات اور نتائج) اور اس کے خالق و باری پر غور و خوض کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ (اپنے رب کے ساتھ ذہنی وابستگی، قلبی تعلق اور نفسیاتی نسبت میں منسلک ہو کر) الہیاتی حال کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور عالم مادیات سے بیزاری ولاتعلقی سے پیدا ہو جاتی ہے۔(اور یہی راہ ہے معرفت تفصیلی کے حاصل کرنے کی) یہ بات یاد رکھو کہ (یہ کارخانۂ ہستی اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے) آیاتِ الٰہیہ کا ظہور نظامِ عالم کی مخالفت کے لیے نہیں ہوتا، ہاں جس نظام سے ہم مانوس ہو چکے ہیں، آیات الٰہیہ کا ظہور کبھی اس سے مخالف ہوتا ہے۔اور کوئی حادثہ خلافِ معمول پیش آتا ہے۔جس سے اصل نظام زندگی اور علت و معلول کے سلسلہ کو ختم کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ قدرتِ کاملہ کا اظہار اور مصلحتِ مخلوق کی تکمیل ہوتی ہے۔مثال کے طور پر سورج گرہن (یا چاند گرہن وغیرہ) کے جو غیر معمولی واقعات وحادثات پیش آتے ہیں ان کو آیاتِ الٰہیہ قرار دینے میں ہمارے علمائے الٰہیات وعقلیات ایک دوسرے کے اختلاف بلکہ باہمی نزاع میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ اس کا ظہور حسب معمول نوامیس فطرت کے مطابق ہوتا ہے، اس لیے قدیم علما ہیئت بھی اور عصر حاضر کے ہیئت داں بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقوع کی قبل از وقت اطلاع دیتے رہے ہیں ان حوادث کا وقوع اسباب و مسببات کے دائرہ میں آتا ہے) اس لیے ان کو آیاتِ الٰہی میں شمار کرنا بے معنی ہے۔مگر دوسرا گروہ کہتا ہے کہ (ظہور کے اسباب سے قطع نظر کر کے نفس کسوف الشمس (یا خسوف القمر) آیت خارقہ ہے۔(مگر ان کا اختلاف جو تعجب خیز ہے یقیناً لفظی

نزاع سے زیادہ نہیں۔ہاں میرے نزدیک فریق ثانی کا نظریہ زیادہ درست اور ثابت شدہ ہے)اور یہ کہنا کہ یہ معمول کے مطابق ہے فاسد ہے۔میری دلیل یہ ہے کہ خود شارح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعوں پر فزع وگھبراہٹ کا اظہار فرمایا ہے(حسب عادت،اور مطابقت نوامیس طبعیہ" کی دلیل کو اگر تسلیم کیا جائے تو)ممکن ہے کہ یہ لوگ رات اور دن کو بھی آیات کہنے سے گریز کریں(حالانکہ خود قرآن کریم میں تصریح ہے کہ ومن آیاته اللیل والنهار والشمس والقمر"اور"جعلنا اللیل والنهار آیتین فمحونا آیة اللیل الخ)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آیات الٰہیہ میں تفکر وتدبر کرتے ہیں۔اوراس کے ذریعہ اپنے رب کے ساتھ وابستگی پیدا کرتے ہیں۔اگر تمہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر وتدبر کا موقع وفرصت ملی ہے اوراس کے نتیجہ میں طبیعت کی باغیانہ سرکشی کا استیصال کر چکے ہو تو یہ بہت بڑی غنیمت ہے مگر جو لوگ آیات الٰہیہ پر کوئی توجہ نہیں دیتے اور وہ اعراض وروگردانی کا شیوہ اختیار کر کے اس کو ہیچ سمجھتے ہیں اور صرف مادّی زندگی میں مستغرق رہتے ہیں ان کی حالت پر سخت افسوس ہے۔

چھٹی فصل

ایمان بالقدر کے ثبوت

اثبات تقدیر کی فطری اور عقلی دلیلیں

تقدیر ایک امر حق اور واقعی حقیقت ہے، جس کو مشرق و مغرب کے تمام لوگ اور تمام اہل مذاہب وادیان یکساں طور پر مانتے ہیں۔ انسان کے علوم نسمیہ اور فطریہ کے بموجب تقدیر کے اثبات کی فطری دلیل یہ ہے کہ کبھی لوگ کسی امر متوقع کے سلسلہ میں عالم غیب کی طرف قلبی رغبت اور فکری توجہ مرتکز کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی الہام ہو جاتا ہے۔ یا اس متوقع امر کی صورت عالم رویا میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر حوادث عالم کا فیصلہ پہلے مقدر نہ ہوتا، تو کبھی ایسا نہ ہوتا اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایک کام کے کرنے کا مصمم ارادہ اور پختہ عزم کر لیتا ہے لیکن وہ (باوجود استعمال ذرائع اور ارادۂ مصمم کے) اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ گویا کہ کسی غالب و جابر طاقت نے روک کر اس کے دست تدبیر کو توڑ دیا ہے۔ اور اس کی تدبیر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے سے کوئی فیصلہ کر چکا تھا جسے فعلاً نافذ کر کے چھوڑا ہے۔

عقلی دلیل

تقدیر کے اثبات کی تسلی بخش عقلی دلیل ہے کہ اس عالم میں جو چیز بھی معرض وجود میں آئی ہے یا آئے گی اس کو اوپر نیچے سب اطراف سے ایسے اسباب وعلل نے گھیر رکھا ہے کہ ان اسباب کی وجہ سے اس چیز کا موجود ہونا واجب قرار پاتا ہے اور اس کے وجود کے بغیر کوئی چارہ نہیں، یہ نظریۂ اسباب و مسببات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اب بات یہ ہے کہ ہر

ایک سبب اور علّت بجائے خود گویا ایک امر حادث ہے۔ اس لیے اس کو معرض وجود میں لانے کے لیے بھی اسباب وعلل ہوں گے جن کی وجہ سے یہ سبب اور علّت لامحالہ وجود میں آئی اس طرح علل واسباب کا یہ سلسلہ لزوم ووجوب باہم مربوط اور مضبوط بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ اگر ان کا وجوب ثابت نہ ہوتا تو یہ وجود میں نہ آتا۔ اگر تم اس سلسلہ کے حلقہ حاضرہ اور موجودہ کڑی پر نظر ڈالو اور اس کے اطراف وجوانب پر غور وخوض کرلو تو تم کو اس کے ساتھ ملحقہ کڑی کا حال معلوم ہوجائے گا۔ وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے اور تیسرے حتیٰ کہ لامتناہی کڑیوں کا سراغ حقیقت لگالو گے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمام واقعات ایک دوسرے سے نہایت مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور کوئی چیز سبق اسباب وعلل کے بغیر ظہور میں نہیں آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا نئی چیز میں استیناف نہیں، اور وہ دوسری کڑیوں سے جدا ہوکر نئے سرے سے ظہور وجود میں نہیں آئی۔

بعض لوگ جسارت کرکے کہتے ہیں کہ تقدیر اور مجازات عمل میں تناقض ہے۔ اور تقدیر ماننے کی صورت میں مجازات کو گویا ظلم سمجھتے ہیں۔ مگر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ان کے افعال واعمال اور ان پر جو جزا وسزا مرتب ہوتی ہے سب تقدیر کی کڑیاں ہیں۔ یہ نہیں کہ بندگان خدا اور ان کے افعال کی کوئی جدا مستقل ہستی ہے جس کے ساتھ جابر اور مجبور کرنے والی تقدیر ٹکرا رہی ہے۔ اور ان سے افعال کے صدور کو واجب ولازمی قرار دیتی ہے۔ اگر تم عالمِ مثال کا مطالعہ امعان وتعمق کے ساتھ کرو تو تم وہاں پر ایک ایسی حقیقت پاؤ گے جس کی بنیاد وہ راز ہے جو خدائے رحمٰن جلّ وعلا کی وحدت میں مضمر وپوشیدہ ہے۔ اور اس کے تحقق مثالی کو لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے۔

ساتویں فصل

حقیقت انسان کی تحقیق یا ایمان واحسان کا فرق

ہر چیز اپنی نوع کے مطابق خاص معیارِ کمال رکھتی ہے۔ انسان کے کمال کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ اس کو ایسی قوت مدرکہ اور استعدادِ علمی وعقلی عطا کی گئی ہے کہ اس کے لوح قلب پر وہ الٰہی تصورات منقوش ہوتے ہیں جن کا نقش قبول کرنے کی استعداد بنی آدم کے بغیر کسی مخلوق میں نہیں ہے۔ یہ تصور اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کی سچائی کا انسان کو یقین ہوتا ہے (اس کیفیت قلب کو ایمان کہتے ہیں)۔

دوسرے یہ کہ اس کے قلب میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ وہ صبغۃ اللہ میں ڈوب جائے اور لاہوتی رنگ میں رنگا جائے جس طرح قلب پر ناسوتی احوال اور مادی عوامل کا اثر پڑتا ہے اور وہ پریشانی، غصہ، خوشی وغم اور دیگر کیفیات وجذبات کا شکار اور ان سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس پر الٰہی احوال کا رنگ بھی چڑھ جاتا ہے اور وہ لاہوت کے احوال کی نقل اور پیروی کرتا ہے اور لاہوت کی طرف متوجہ ونگراں رہتا ہے۔ اس حالت کو ہم احسان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور پہلی کیفیت کو ایمان کہتے ہیں۔ احسان ایمان کا مغز وجوہر اور غایت ونتیجہ ہے اور ایمان اس کا مقدمہ اور سنگ بنیاد ہے۔ اگر تم مومن ہو تو میں تمہارا دامن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم نے احسان کا درجہ حاصل نہیں کیا۔ تمہارے نفس، باطن وروح کی تکمیل کامل اسی درجۂ احسان پر فائز ہونے میں ہے۔ عالم لاہوت کے مالک کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اسی کا رنگ اختیار کرو، اور دیگر تمام عاجل وآجل اغراض کو اس کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دو۔ قلب پر اُن کا رنگ نہ چڑھنے دو۔

درجۂ احسان پر فائز ہونے کا طریقہ

جو شخص درجۂ احسان پر فائز ہونا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب و دماغ کو خارجی پریشانیوں اور طبعی تشویشوں سے پوری طرح خالی رکھے اور اپنے ایمان کو ٹھیک طور پر درست کرے، بعدازاں پوری ہمت کے ساتھ لاہوت کی طرف متوجہ ہو اور دوسری سب اشیا سے توجہ ہٹا کر صرف لاہوت پر ایمانِ کامل رکھے۔ اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور لاہوت کی عظمت اور انعامات و اکرامات پر دلالت کرنے والی آیات اور نشانیوں میں تفکر و تدبر کی طرف منعطف ہو اور اپنے اعمال خیالات اور افکار کے ان آداب کی طرف متوجہ ہو جو لاہوت سے مطابقت اور مناسبت رکھتے ہیں۔ ان ریاضتوں اور مراقبوں میں ایک زمانہ گزار دے گا تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت اور توجہ پیدا ہو جائے گی۔ اور اس پر ایک ایسا حال طاری ہو جائے گا جس میں وہ اللہ کو دور سے دیکھتا ہوا پائے گا۔ اور وہ اسی حالت میں جب خدا کی عبادت کرے گا تو حالت ایسی ہوگی گویا کہ وہ خدائے پاک کو اپنے آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور اس کے حضور میں کھڑا ہے اور جب وہ کائنات پر نظر ڈالے گا تو ہر چیز سے پہلے اس کے ساتھ متصل اور اس کے بعد ہر سو خدا ہی خدا نظر آئے گا۔ اس کے دل میں باری تعالیٰ کی طرف توجہ و تطلع بعینہٖ وہی شکل اختیار کرلے گا، جیسے آنکھ میں قوتِ بصارت اور کان میں قوتِ سماعت رہتی ہے۔ اس قلبی کیفیت کے ساتھ جب بھی اور جدھر بھی اس کی نگاہ اٹھتی ہے اس کی سمت خدا کی طرف ہوتی ہے۔ اس کا دل سب امور و قضایا میں حق کی طرف متوجہ رہنے کا حق ادا کرتا رہے گا۔ اور اس کا شیوہ توکل و رضا بقضا اور سپردن بخدا ہوگا۔ اس کی زبان اور اعضائے جسمانی سے یہی قلبی کیفیت مترشح ہوگی۔ اور اس پر انوارِ الٰہیہ اور سکینہ و اطمینان کی بارشیں ہوں گی۔ نورِ خدا ہر چہار سو سے اس کو ڈھانپ لے گا۔ جب کسی کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھ لو اس کو پوری کامیابی اور سعادت حاصل ہوگئی۔ اور اگرچہ وہ ظاہر میں ایک دنیاوی آدمی ہے لیکن باطن و حقیقت میں وہ "باخدا" آدمی ہے۔ اسی کو خدا رسیدہ انسان کہا جاتا ہے۔

احسان کے مراتب ثلاثہ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احسان کے تین درجے ہیں جس کا اجمالی ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں، یعنی ابتدائی، درمیانہ، آخری۔

درجۂ احسان پر فائز ہونے والا جب عالم قدس کی نقل اتارتے ہوئے دور تک چلا جاتا ہے تو اس سے ایسے افعال واعمال اور نتائج وخواص ظاہر ہونے لگتے ہیں جو احسان سے محروم شخص کے خیال میں بعید از عقل ہوتے ہیں اور صاحبِ احسان کی نظر میں وہ قابلِ تعظیم ہوتے ہیں۔

محسنین کے کئی مراتب ومدارج ہیں: ان میں سے بعض (اونچے درجے پر پہنچ جاتے اور) اس عالم ناسوت ومادّی سے کلّی طور پر لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اُن سے کچھ کم درجہ پر علائق دنیویہ سے تعلق توڑتے ہیں۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس ان کے مدارج ومراتب احسان میں تفاوت وباہمی فرق ہوتا ہے۔

ادنیٰ ترین درجۂ احسان درجۂ ایمان کے قریب ہوتا ہے اس درجہ میں بھی دل پر اذعان وانقیاد کی کوئی نہ کوئی کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے۔ اور احسان کے اعلیٰ ترین درجہ کی بلندی ومحویت کی انتہا نہیں ہوتی۔

فطرتِ انسانی کا مفہوم

اس دنیا کی مثال لوہے کی بنی ہوئی گنبدِ بے در کی ہے۔ جس میں انسان کو ہر طرف سے محبوس ومقیّد کر کے رکھا گیا ہے۔ اور اس کے لیے نکلنے کی کوئی راہ اور دروازہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ اس صورت حال میں جو شخص عمر کے کسی حصہ میں بھی تھوڑے ہی اوقات میں بھی احسان (اور توجہ الی اللہ) کے ادنیٰ مرتبہ پر عمل پیرا ہو جائے تو اس قبۂ بے در میں اسی درجہ کے مطابق روزن کھل جاتا ہے۔ اور وہ عالم لاہوت کی طرف پہنچنے کے لیے کسی قدر چھٹکارا پا لیتا ہے اسی چھوٹے سے روزن کا اثر بھی اس پر دارِ آخرت میں ظاہر ہوگا لوگوں پر بالعموم جو بات فرض کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا میں احسان کے مراتب میں سے کوئی نہ کوئی درجہ ضرور حاصل کر لیں جس کا اثر اُن کے اعمال وجوارح اور باہمی معاملات میں نمایاں ہو اسی کا نام فطرت ہے (جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی الْفِطْرَۃِ ہر بچہ فطرت کے مطابق پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا ماحول اسے بگاڑتا ہے)۔

آٹھویں فصل

معرفت الٰہی اور فطرت انسانی کی راہ میں حجابات ثلاثہ

اس وجدانی کیفیت اور فطرت انسانی کے ظہور میں تین چیزیں مانع ہوتی ہیں جن کو حجب (جمع حجاب) سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلا : حجاب طبیعت کا ہے۔

دوسرا : حجاب رسم کا ہے۔

تیسرا : حجاب جہل (عدم معرفت یا سوءمعرفت) کا ہے۔

حجاب طبیعت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بقائے جان اور حفظ نفس کے ساتھ ساتھ پیدائش وافزائش نسل اور حفظ نوع کے لیے بالطبع کھانے پینے اور صنفی تعلق وغیرہ پیدا کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں عموماً نفس انسانی انہی خواہشات کے تابع ہو کر رہتا ہے اور ان اعمال کی محبت اپنی سرشت میں مضمر و پوشیدہ رکھ کر اپنی اصلی خصوصی فطرت جس میں لاہوت کی طرف توجہ اہم عنصر ہے کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ شخص جو تقاضائے طبیعت کے تحت مغلوب و مقہور ہو جب اس کے دل میں کسی خاص لذیذ خوراک کے کھانے یا خوشگوار شربت نوش کرنے یا کسی خاص طریقہ سے صنفی خواہش پورا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اپنی شہوت نفسانی پورا کرنے کے راستہ میں شرع ورسم کو کبھی حائل نہیں سمجھتا اور کسی قید وبند کی پروا نہیں کرتا۔ اگر بالفرض معاشرہ اس کے اس فعل کو ہزار بار معیوب سمجھے اور اس کی قوم میں کسی ایک فرد واحد نے بھی کبھی ایسا جرم نہ کیا ہو (یا شریعت میں اس کا کرنا حرام اور ممنوع ہو) تب بھی وہ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے اپنی خواہشات نفسانی اور

مقتضیات طبیعت کو پورا کر کے رہتا ہے۔ایسے شخص کے حق میں یہ کہا جائے گا کہ معرفت خداوندی اور فطرت انسانی کی تحصیل و تکمیل میں حجاب طبیعت مانع اور سنگ راہ ثابت ہوا۔ اس سے پہلے اس کی توضیح ہو چکی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ طبیعت کو دل ودماغ پر حیرت انگیز تسلط حاصل ہے۔اور جب بھی خواہشات نفسانی اور مقتضیات طبیعت غالب آجاتے ہیں تو دل ودماغ شیوۂ تسلیم ورضا اختیار کر لیتے ہیں۔

ایسے مغلوب الطبیعۃ لوگ اپنے قلبی احوال وظروف اور دماغی افکار وخیالات میں طبیعت کی تاثیر سے بچ نہیں سکتے۔ویسے تو ہر فرد وبشر میں طبعی تقاضے اور نفسانی خواہشات موجود و کارفرما رہتی ہیں لیکن ہم اس کو محجوب طبیعت اس وقت تک نہیں کہتے جب تک کہ اس پر خواہشات کا پورا تسلّط اور غلبہ نہ ہو۔اور جب تک اس کے بدن کی سب قوتیں خواہشات کے زیر اثر اور مطیع ومنقاد نہ بنیں۔

حجاب رسم: اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم گفتگو، لباس و پوشاک کھانے پینے اور شادی بیاہ وغیرہ میں ایک خاص وضع اور روش کی پابند ہوتی ہے۔

پھر مذہبی احکام آتے ہیں اور اس مانوس وضع اور روش پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر (جو شخص حجاب رسم میں محبوس ہوتا ہے وہ اس قومی وضع وروش کو اس قدر محبوب اور منظور نظر رکھتا ہے کہ اس کا نفس اس کے سوا کسی دوسری روش زندگی اور طریقہ حیات کو صمیم قلب سے اپنانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔اور اس کی خوگری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس کو نفسا ونفیسا آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اسی وضع ورسم کی طرف مائل ہوگا۔اور اس کے برخلاف کسی اور چیز کو قبول نہیں کرے گا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جس شخص پر رسم ورواج غالب آجائے تو بسا اوقات وہ اس کے مقابلہ میں اپنی نفسانی خواہشات حیوانی جذبات اور جسمانی تقاضوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا مثلاً بعض اوقات اس کو سخت بھوک لگی ہوتی ہے یا صنفی خواہش کی تسکین کے لیے بے قرار ہوتا ہے مگر رسم ورواج اس کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور طبعی خواہشیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

حجاب جہل اور عدم معرفت یا سوء معرفت: اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کو ویسے نہیں پہچانتا جیسے کہ وہ ہے کیونکہ اس کی قوت فہم وادراک محسوسات ومشہودات سے ماورا مجرد حقیقتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی اور اس کی عقل ودانش اور اندازہ وحدس کا دائرہ کار محدود اور ناقص ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کو مجرد عن المادہ متصور ہی نہیں کر سکتا یا یہ کہ وہ کسی دوسری ہستی کو انہی صفات سے متصف سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں یا اس کو اسی طرح عزت وشرف کا مالک سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے یا خدا کی ہدایت، امر ونہی اور سخط ورضا کو کسی خاص شخص مطاع کے اقوال میں منحصر سمجھ کر حق کو انہی میں مقید ومنحصر سمجھے جیسے کہ مذاہب فقہ اور مکاتیب فلسفیہ اور علمائے اہل کلام کے جامد مقلدین اور اندھی پیروی کرنے والوں کا طریقہ ہے) اس کا راز یہ ہے کہ انسان کے طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ جب وہ کسی کے ہاتھ پر ''خوارق عادت'' ظہور میں آتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو (کسی مصدر کی طرف منسوب کیے بغیر) بیکار نہیں چھوڑتا بلکہ اس کو اس قوت غیبی کا مظہر سمجھتا ہے جو ایسے خوارق کی مصدر ہو سکتی ہے۔ پھر جب اس شخص اور اس قوت غیبی کے درمیان نسبت قائم کر لیتا ہے تو اس سے بیکراں قلبی محبت اور تعظیم اختیار کرتا ہے۔ (یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ) اس مقام پر پہنچ کر وہ اس کو اس کی شان سے بعید وبالا مقام عطا کرتا ہے جو دراصل اللہ کا مقام ہوتا ہے (اور اس طرح وہ شرک وبت پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اسی ہستی کی عبادت شروع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف التفات ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی اس کی طرف توجہ کرتا بھی ہے تو وہ بالکل غیر مفید ونا کافی ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ معبود حقیقی کی عبادت اور ذکر وفکر بھی کرتا ہے اور اس کے احکام وفرامین کے سامنے سر تسلیم بھی خم کرتا ہے مگر اس شرط پر کہ خداوند بذات خود اس شخص میں حلول کر کے نمودار ہو جائے جس سے وہ خوارق عادت کے بعد عقیدت رکھتا ہے۔ عدم معرفت الٰہی یا سو معرفت خداوندی کی یہ بڑی بڑی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ جہل کی اور بھی بیشمار صورتیں ہیں۔ (جھوٹے پیروں اور جعلی درویشوں کی خانقاہوں میں شرک وبت پرستی کی بدترین صورتیں آنکھوں سے مخفی نہیں ہونی چاہئیں)۔

حجب کو ان حجابات ثلاثہ میں منحصر سمجھنے کا راز:

حجابات کو ان تین کلیات میں منحصر سمجھنا چاہیے کیونکہ انسان کی حالت ابتدائی عمر میں چوپایوں جیسے ہوتی ہے اور بہیمیت وحیوانی تقاضے اس پر غالب ہوتے ہیں اس لیے وہ حجاب طبیعت میں مبتلا ہوتا ہے۔ بعد ازاں جب وہ ترقی کرتا ہے اور اس میں ذرہ عقل اور تمیز پیدا ہوتی ہے تو اس کی نظر گردوپیش اور ماحول پر پڑتی ہے اور وہ اپنے آباواجداد اور رفقاواحباب کو دیکھتا ہے تو انہیں رسم ورواج کے طوق وسلاسل میں مقید پاتا ہے، اب اگر وہ اپنی عقل خداداد سے بہتر رسم ورواج اور مفید تر تدبیر اختیار کرے یا اپنی رند مشربی اور بیباکی مزاج کی بدولت راہ ورسم کی پروا کیے بغیر تیشۂ خودی سے جادۂ خویش تراش کر رسم ورواج کی مخالفت کرے تو یہ اور بات ہے ورنہ وہ یقیناً رسوم کا پابند ہوگا۔ اور حجاب رسم اس کی معرفت میں سدِ راہ ثابت ہوگا۔ بعد ازاں جب وہ رشد وعقل کے درجۂ کمال تک پہنچ جائے گا اور اپنی ساخت اور تخلیق میں غور وخوض کرے گا یا اپنے کسی رفیق حیات سے باری تعالیٰ کا علم تقلیداً حاصل کرے گا یا روزمرہ کے بول چال اور محاوروں میں کسی سے یہ سن لے کہ ہمارا رب یوں ہے یوں ہے اور پھر اپنی عقل خداداد سے عالم تیقظ وبیداری میں اس کی موافقت ومطابقت پر یقین کامل رکھے گا تو وہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے گا۔ مگر اس عالم میں وہ حجاب جہالت اور سوء معرفت سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی کو یہ توفیق خداوندی عطا ہو کہ اس حجاب سے نکلنے پر قادر ہو جائے وہ بلاشبہ مومن صادق رہتا ہے اور اس فطرت انسانی پر باقی وقائم رہتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

حجت ثلاثہ کا ازالہ:

بہرحال ان حجابات سہ گانہ کا چاک کرنا لازمی ہے (حجاب طبع کا علاج یہ ہے کہ) اعتدال کے ساتھ روزے رکھنے، کم خوابی وکم خوری اور کم گوئی کے ذریعہ نفسانی خواہشات کی شدت وسرکشی کو توڑا جائے اسی طرح پریشان کن اشیا اور الوان کی طرف سے بے توجہی وبے اعتنائی اختیار کرنے اور بیہودہ اور گندی باتیں سننے سے احتراز کیا جائے۔

حجاب رسم کا علاج یہ ہے کہ رسم کی نوعیت کو دیکھنا چاہیے اگر وہ رسم صالح ہے تو اس کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ مگر اس پابندی میں اخلاص و نیک نیتی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب و مقصود ہو نہ کہ رسم ورواج کی بقا، ہاں اگر رسم فاسد اور بری ہے تو اس کو یکسر چھوڑنا چاہیے اور اس کے بدلے میں کسی اور رسم صالح کو اختیار کرنا چاہیے۔

سو معرفت کا علاج یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور تکرار ذکر و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کا تزکیہ کرے اور اس پر دوام اختیار کرے کیونکہ ذکر الٰہی سے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے اور وہ عالم جبروت کی طرف پیش رفت کرتا ہے اور اس پر لاہوت کا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ اسی طرح تدبیر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنا آیات قدرت میں صحیح طریقہ پر غور وخوض کرنا اور پند و نصیحت سننا بھی سو معرفت کی بیخ کنی میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔

نویں فصل

احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا مجمل بیان

جب انسان اپنے رب کو صحیح طریقہ پر پہچان لیتا ہے اور یقین حاصل کر لیتا ہے کہ تمام چھوٹی بڑی نعمتیں اس کے ظاہر و باطن پر اسی کی طرف سے فائض ہوتی ہیں اور یہ کہ اس کا منعم جل شانہ جو اپنے انعام و اکرام سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے۔ شرافت و بزرگی کے لحاظ سے تمام دوسرے محسنوں اور منعموں سے اس قدر بڑھا ہوا اور بالاتر ہے کہ انسان کے لیے اپنی محدود عقل سے اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے تو اس کے دل میں خود بخود اپنے منعم حقیقی کی محبت پیدا ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کی عاجزی و انکساری اور اس کے دل میں اپنے رب کی پوری تعظیم اور کامل ادب شامل ہوتا ہے۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان بلکہ سب بہائم اور چوپائے بلا استثنا اپنے منعم، خبر گیری کرنے والے اور چارہ وغیرہ کھلانے والے سے جبلی اور فطری محبت رکھتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ شکاری لوگ جنگلی وحشی اور درندہ جانوروں کو کس طرح احسان وانعام سے رام کر لیتے ہیں (چڑیا گھروں اور سرکسوں میں نگراں عملے اور درندہ حیوانوں کا حال ملاحظہ کیجیے) بعینہ اسی طرح وہ شخص جو تام مزاج رکھتا ہے اس کو اپنے منعم سے محبت اور وفائے کامل ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے جان و مال کی گراں بہا قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ یہ سب کچھ قربان کر دیتا اس کے لیے اپنے محسن و ولی نعمت کو ذلیل دیکھنے یا اس کی ہستی کے مٹ جانے کے مقابلہ میں نہایت آسان معلوم ہوتا ہے۔ (یعنی اپنے ولی نعمت کی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے زندگی کی سب آسائشوں اور راحتوں سے دستبردار

ہوتا ہے) اگر یہ حقیقت نہ ہوتی کہ انسان فطرتاً اپنے محسن و منعم کا غلام بے زر رہنا پسند کرتا ہے تو کوئی شخص دوسرے کی امداد وحمایت کے لیے کبھی کھڑا نہ ہوتا (مگر تاریخ انسانی اس پر گواہ ہے کہ لوگوں نے اپنے محسنوں اور مربیوں کی حمایت کے لیے جان، مال اور عزت ہر قسم کی قربانی دی ہے)۔

جب انسان اپنے محسن و مربی کی محبت میں سرشار ہوتا ہے اور یہ محبت ودل بستگی اس کے رگ وپے اور خون میں روح کی طرح دوڑنے لگتی ہے تو وہ ایک حال کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو بے ارادہ اور بغیر استدلال وفکر ونظر کے قلب پر طاری ہوتا ہے۔ راہ محبت اور منزل عشق میں منطقی دلیل وبرہان اور عقلی توجیہ کا سہارا لینا کج روی اور منزل مقصود سے گمراہی کے مترادف ہے اور اس فطرت سے انحراف واعراض ہے جو قلب کی واردات اور احوال کا تقاضا کرتی ہے اور وہ عبارت ہے اس سے کہ عملی استدلال سے جو صورت ذہنی حاصل ہو وہ فطری نہیں ہوتی بلکہ وہ قلبی یا حقیقی صورت حال سے بعید ترین صورت ہوتی ہے۔ (مثلاً ایک شخص کو کسی مرض کی کیفیت کا علم ہے لیکن اگر وہ خود مریض نہیں تو اس کو صاحب حال نہیں کہیں گے)۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان دوسرے حیوانوں کی طرح اندرونی واردات اور باطنی احوال سے متصف ہے۔ نہ یہ کہ اس نے علمی اور ذہنی صورتوں کا احاطہ اپنے علم سے کیا ہے۔ کسی چیز پر اپنے علم سے احاطہ کرنا اور بات ہے اور کسی حال سے موصوف ہونا دوسری بات ہے ان دونوں میں نمایاں ظاہری فرق پایا جاتا ہے۔ الغرض جب منعم کی محبت انسان کی حال بن جاتی ہے تو اس کے اثرات اس کی زبان اور جسم کے دیگر اعضا پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ ''فصاحت'' اور ''دیانت'' کی تشریح کرتے ہوئے ہم کہہ چکے ہیں کہ زبان اور دل کے درمیان بلکہ قلب وجوارح کے درمیان ایک عجیب رابطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ جب دل میں بلندی ہوتی ہے تو زبان وجوارح میں بھی علو کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور جب دل میں پستی وانحطاط پیدا ہوتا ہے تو زبان اور اعضائے جسمانی بھی گواہی دینے لگتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب جانور میں تکبر وغرور پیدا ہوتا ہے تو وہ گردن اٹھا دیتا ہے اور اکڑ کر چلتا ہے برخلاف اس کے ذلت اور انقیاد کی حالت میں

گردن جھکا دیتا ہے۔ انسان پر جب غصہ غالب آتا ہے تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور زبان پر سب وشتم اور گالی گلوچ کے بے ربط الفاظ جاری ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھ سے اس حالت میں قتل صادر ہوتا ہے۔ یا اپنے حریف سے مشت گریباں ہوتا ہے۔ اسی طرح نفسانی شہوت کے غلبہ کے وقت وہ اپنی محبوبہ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے اور اس سے بوس وکنار اور پیار ومحبت میں مشغول ہوتا ہے۔

جب محبت کے ساتھ تعظیم کا عقیدہ بھی شامل ہو جاتا ہے تو تم دیکھو گے کہ انسان محبوب کے سامنے عاجزی وانکساری کرتا ہے اور اس کے قدموں میں اپنا سر نیاز اور جبین عجز رکھتا ہے۔ (یہی عبادت کی بنیاد ہوتی ہے)۔

طبائع، ذہنیتوں اور معبودوں میں اختلاف کے باوجود دنیا کے تقریباً سب لوگ عبادت کے قائل ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ جب اپنے محسن ومربی کے پاس اپنی حاجت پیش کرتے ہیں یا ان نعمتوں کی طرف نظر دوڑاتے ہیں جو ولی نعمت نے اسے عطا کی ہوتی ہیں تو خواہ مخواہ عبادت کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور حصول مقصد کے لیے مختلف انواع عبادات اور دینی طریقے ایجاد واختراع کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر رگڑتے ہیں یا قدم بوسی کے بعد اپنے ہاتھوں کو تعظیماً سر پر رکھ لیتے ہیں گویا کہ وہ زبان حال سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو سر اور آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی یہ کیفیت پرندوں اور چوپایوں کی طرح بالکل فطری ہوتی ہے۔

اور جب یہ تعظیمی کیفیت کسی نہ کسی درجہ میں حال تک پہنچ جاتی ہے تو فطرت ان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے حال کو مطابق ومناسب حرکات وسکنات سے ظاہر کرے۔ ہر ایک حال کا یہی حال ہے کہ فطرت میں اس کے اظہار کے لیے خاص صورتیں ودیعت رکھی گئی ہیں۔ جیسے کہ نفسانی شہوت اور ہم بستری کی خواہش جبلی ہوتی ہے کہ جب یہ خواہش پیدا ہوتی ہے تو پرند وچرند میں نر اپنی مادہ کے گرد چکر کاٹتا ہے اور اس کے قریب ہوتا ہے اور یہ سب اس کی جبلّت وفطرت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے (اسی طرح پروانہ شمع وغیرہ کو ملاحظہ کریں)۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

ایک یہ کہ کسی کی عظمت دل میں سما جائے جس کے ساتھ محبت وعقیدت اور تعظیم شامل ہو، جس کے نتیجہ میں خود بخود اپنی کم مائیگی اور عجز وانکسار کا اظہار ہو۔

دوسری یہ کہ کسی کو قاضی الحاجات سمجھے اور اس سے اپنی حاجت پوری کرنے کی استدعا کرتا ہو۔ کیونکہ یہ بھی انسان کی سرشت میں ہے کہ جب اس کو کوئی حاجت اور ضرورت ستاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی استعداد وقوت ہے اور وہ اپنی صفت جود وکرم کی بدولت احسان وانعام بھی کرتا ہے تو وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو انتہائی تذلیل وانکساری پر مجبور پاتا ہے۔ تو معبود کی عظمت جب بھی دل میں محسوس ہوگی یا بندہ کے دل میں کسی مقصد کے حصول کی تمنا بھی پیدا ہوگی اور وہ اپنے معبود کے سامنے اظہار تذلیل اور عبادت پر اپنی طبیعت سے مجبور ہوگا۔

دسویں فصل

احسان سے عبادات کے پیدا ہونے کا تفصیلی بیان

عبادتوں کے انواع اور تعظیم تعبدی کے اصناف تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے مشہور اور کثیر الوقوع صورتیں جن کو انسان بہ تقاضائے فطرت وضمیر عمل میں لاتے ہیں اور جو مسلم اور غیر مسلم قوموں اور ملتوں میں یکساں طور پر مروج ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) صلوٰۃ (نماز): اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا دل و دماغ اپنے معبود کی تعظیم یا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے جذبے سے معمور و سرشار ہوتے ہیں یا وہ اپنے محسن و مربی کے سامنے اپنی کسی ضروری حاجت کو جس کی نفس کو طلب ہوتی ہے پیش کر کے حاجت براری کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنی اس انتہائی نیازمندی اور معبود و منعم کی انتہائی تعظیم کا اظہار چند افعال اور ہیئتوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کو صلوٰۃ یا نماز کہتے ہیں۔

نماز، دعائیں اور دوسری عبادات کیفیت ایمانی اور حالت انقیاد و تعظیم کے لیے اسی طرح لازم ہیں جس طرح غصہ کے ساتھ ضرب وشتم (یا رنگ میں تغیر) لازم ہوتا ہے۔ یا شہوت نفس کے ساتھ مناسب حال ہیئتیں ہوتی ہیں۔

عبادت کرنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) یا ان میں سے کسی پر کیفیت ایمان کا فیضان ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں حقیقت نماز کے مناسب افعال اور ہیئتوں کا صدور لازماً ہوتا ہے۔

اور یا (۲) وہ اس ہیئت ایمانیہ کا طالب ہوتا ہے اور اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ نماز کے افعال وہیئات کو اختیار کر کے ان پر پوری طرح کاربند ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حال تعبدی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کی سرشت میں ہے

کہ وہ لازم سے ملزوم کی طرف اور ایک ہم جواز سے اس کے دوسرے ہم جواز کی طرف جا کر نتائج اخذ کرتا ہے[1]

جن افعال وہیات سے انسان کا تذلل اور اس کی نیاز مندی ظاہر ہوتی ہے ان میں کامل ترین اور بہترین صورت جبین نیاز کو زمین پر لگانے اور خاک آلود کرنے کی ہے کیونکہ جسم انسانی میں شریف ترین عضو چہرہ ہے۔ اور اسی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ (معرفت الٰہی کے) ذرائع حسیہ یعنی (قوت بصارت قوت سماعت، قوت ذائقہ، قوت شامہ وغیرہ) سب یا اکثر حواس اس میں جمع ہو چکے ہیں۔ نیز انسانی فطرت میں یہ بات بھی رکھی گئی ہے کہ جب وہ اپنی لڑائی کا اظہار کرتا ہے یا غرور وتکبر کرتا ہے تو گردن کو اٹھاتا اور اکڑتا ہے۔ برخلاف اس کے جب کسی کے سامنے اپنی عاجزی، نیاز مندی اور ذلت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنا سر جھکا لیتا ہے۔ یہ طریقہ اپنے مواقع ومظان میں لامحالہ بلا استثنا اختیار کرتا ہے۔ (تذلل اور نیاز مندی کی انتہائی صورت اور عبادت واخبات کی اعلیٰ ترین شکل سجدہ ہے) اس سے کم تر یعنی دوسرے درجہ پر رکوع آتا ہے جس میں (زمین بوسی تو نہیں ہوتی البتہ) جھکاؤ پورا کا پورا ہوتا ہے اور تیسرے درجہ معبود کے سامنے دست بستہ اور باادب ہو کر کھڑے ہونے یعنی قیام کا آتا ہے۔

بہترین نماز:

وہ نماز جس میں یہ تینوں مذکورہ صورتیں (قیام، رکوع اور سجدہ) پائی جائیں اور جس میں ترتیب یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کا خیال رکھا جائے (یعنی سب سے پہلے دست بستہ یا خشوع قیام کے بعد انحنا کامل سے متصف رکوع اور سب سے آخر میں جبین

---

[1] محسوس ومقرون سے مجرد کی طرف جانے کا اُصول نہ صرف نفسیات کا مسلمہ اصول ہے بلکہ دنیا کے سب ماہرین تعلیم اس کو بنیادی اصول کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ نیز تصبر (صبر کے تکلف) سے صبر کی صفت پیدا ہوتی ہے اور تشجع (شجاعت کے تکلف) سے شجاعت کا ملکہ ظہور میں آتا ہے۔ آنحضرت کے دو قول اس سلسلہ میں بہت ہی قابل غور ہیں ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ "مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ" اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" ممانعت بالغیر کا فلسفہ یہی ہے کہ تشبہ سے ملکہ سیئہ پیدا ہوتا ہے اس لیے تشبہ سے بچنا چاہیے۔

نیاز کو زمین پر رگڑنا یعنی سجدہ کرنا، یہ ترتیب فطری ترتیب ہے) تو وہ نماز سب سے اچھی نماز کہلائی جائے گی۔

نماز میں مشغولیت اگر ''حال'' کے تقاضے کے تحت ہے (اور ایسا حال نمازی پر طاری ہو چکا ہے جس کا تقاضا نماز ہی سے پورا ہو سکتا ہے) تو اس ''حال'' کے وارد ہونے کا وقت ہی اس نماز کا وقت ہوگا اور اگر نمازی کے قلب وسینہ میں کسی چیز کی آرزو وخواہش کی تکمیل کے لیے بے قراری اور حاجت براری کی طلب موجزن ہو تو قلق وتطلب کے وارد ہونے کا وقت نماز ودعا ہے۔ ہاں اگر مقصود اس قسم کا ''حال'' حاصل کرنا ہے جو مشغولیت صلاۃ کے لیے لازم ہے یا تحصیل حال کے بعد اس کو قائم رکھنا ہے تو رات دن میں تقریباً ایک ایک پہر یا اس کے برابر وقفہ کے بعد نماز کا تکرار واعادہ مناسب ہے اور اسی طرح کی نماز طہارت ونظافت، ترکیز توجہ و جمع ہمت اور حضور قلب واقبال خاطر کے بعد ادا کرنا چاہیے۔

(۲) دعا (اس کی حقیقت وصیغے):

عبادت کا ایک طریقہ دعا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے رب کی عظمت اور جلالت شان کی معرفت حاصل کرتا ہے اور یا وہ حصول نفع اور دفع ضرر کے سلسلہ میں اپنے محسن اور ولی نعمت کے حضور جس کو وہ کامل تصرف کا مالک سمجھتا ہے خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی حاجت پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو اس کی زبان سے خود بخود کلمات والفاظ نکلتے ہیں۔ ان کلمات واقوال کو دعا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غور کرنے پر تمھیں معلوم ہوگا کہ اعضا کے ذریعہ جس تعظیم اور تذلیل ونیاز مندی کا بھی اظہار ہوتا ہے اس کے مماثل زبان کے پاس بھی الفاظ ہوتے ہیں جو وہی اثرات رکھتے ہیں جو اعضا کے افعال کرتے ہیں۔

استقرا اور تلاش سے دعا کے اظہار کے دس صیغے یا دس صورتیں سامنے آتی ہیں۔

(جو درج ذیل ہیں):

نظری (۱) لَآاِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ (۲) اَللّٰهُ اَکْبَر۔ ان دونوں سے حقیقت ایمان میں جلا اور قوت پیدا ہوتی ہے اور محبت آمیز انقیاد وتسلیم کا جذبہ ابھرتا ہے۔

تذکیری (۳) سُبْحَانَ اللّٰه (۴) اَلْحَمْدُلِلّٰه۔ ان دونوں میں عظمت تنزیہہ

اوراعتراف نعمت الٰہیہ کی ترجمانی ہےاور جیسے کہ پہلے گزر چکا ہےان دونوں کے ذریعہ معبود حقیقی سے محبت اور ان کے احکام کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ (اوران پر مواظبت سے ان کو تقویت پہنچتی ہے)۔

استمدادی (۵) تعوذ (۶) سوال وطلب: ان دو کا تعلق احتیاج وضرورت کو پورا کرانے سے ہے۔اوراحتیاج وضرورت ان دو محرکات میں سے ایک محرک ہے جوانسان کو عبادت پر ابھارتے ہیں۔

فطری (۷) توکل علی اللہ۔یہی انسانی فطرت سے جو رفع احتیاج کے لیے انسان کو خداوند عزیز وقادر پر بھروسہ رکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

تعبیری (۸) خشوع وخضوع۔عاجزی وانکساری اور عبودیت وبندگی کو ظاہر کرنے والے اقوال واوصاف جو عبادت کی روح وحقیقت کی تعبیر اور عبودیت کے اقرار کی دلیل اور نشانی کے مترادف ہوتے ہیں۔

رجوع (۹) استغفار۔توبہ وانابت وغیرہ: درحقیقت یہ اقوال نامناسب ونا موافق امور سے انسان کے اختلاط اور ناسوتی آلائشوں سے ملوث ہونے کے بعد لاہوت کی طرف رجوع کا کام دیتے ہیں۔

تبرکی (۱۰) اسمائے حسنٰی سے تبرک حاصل کرنے کے لیے ان اسما کا استعمال جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس طور پر انسان اپنے پروردگار کی عظمت وتنزیہہ کا اعتقاد کامل رکھتا ہے اوران اسما مبارکہ ومنزیہ کے ذریعہ پروردگار کو جائے پناہ مانتا ہے۔

بہترین اوقات دعا:

دعا کا بہترین وقت یا تو وہ ہوتا ہے جس میں تجدد نعمت خداوندی کا یقین ہو، یا وہ جس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو چکی ہو۔اور یا وہ جس میں انسان اپنی بے بسی کو روئے اور پروردگار سے ضروری حاجت پوری کرانے کی درخواست کرے۔ لیکن اگر ’’حال‘‘ کا حاصل کرنا مقصود ہے تو ضروری ہے کہ صبح وشام دعا میں مصروف رہے۔ صبح کو اس لیے کہ اس وقت انسان دنیاوی دھندوں میں مصروف ہونے سے پہلے فارغ

اور مجتمع الہمت ہوتا ہے اور اپنی توجہ کو خدائے واحد کی معرفت پر مرکوز کر سکتا ہے اور شام کا وقت اس لیے کہ دن بھر دنیا کے دھندوں میں مصروف رہ کر اس کا آئینہ دل غبار آلود ہو جاتا ہے جس کا غبار اتارنے کے لیے دعا صیقل کا کام دیتی ہے۔

روزہ اور اس کا فلسفہ وغرض وغایت:

عبادت کا ایک طریقہ روزہ ہے۔ روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے لیے شدید وثقیل مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان جب کسی سے سخت دل بستگی اور قلبی محبت کرتا ہے تو پھر اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی اپنی زندگی اور مرافق حیات درست ہیں یا نہیں اور وہ عیش وآرام میں ہے یا تکلیف ورنج میں بلکہ ہمیشہ ایک ہی خیال اس کو دامن گیر رہتا ہے کہ وہ تن من دھن غرض ہر عزیز ترین متاع زندگی اپنے محبوب کی خوشنودی کے لیے قربان کرے۔ اس علم کے ساتھ کہ اس کا محبوب اس کے اس ایثار اور قربانی کو پسند کرتا ہے اور اس کی اس تکلیف کو وہ دیکھ رہا ہے اور (اگر زبان سے وہ کچھ کلمات ادا کر رہا ہے تو محبوب انہیں) سن رہا ہے۔

انسان کی جبلت ہے کہ اس کو کسی سے والہانہ عقیدت ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں اس کا یہ پختہ اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا سنتا اور دیکھتا ہے۔ اور اگر تم نے لوگوں کے افعال وحرکات کا استقرا کر کے ان کا مطالعہ کیا تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جب کسی شخص پر کسی غائب محبوب کی محبت غالب ہو جاتی ہے تو وہ اسے حاضر مانتا ہے اور اس کو اس میں لذت محسوس ہوتی ہے کہ اپنے عیش وعشرت اور آرام وراحت کو اس کی خاطر قربان کر دے، خصوصاً جب اس کو یقین ہو کہ اس کے محبوب کو اس کا علم ہے۔ اور وہ اس کو دیکھ اور سن رہا ہے۔ اور یہ کہ اس کے ایثار اور قربانی سے محبوب کو یہ قطعی ثبوت ملے گا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور سے اس کی محبت نہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ ایک مومن جو نور ایمان سے منور اور زینت احسان سے مزین ہے اور اپنے پروردگار سے والہانہ محبت وعقیدت رکھتا ہے، اپنے حاضر وناظر محبوب حقیقی کو خوش کرنے کے لیے بھوک پیاس اور دیگر خواہشات سے دستبردار ہوتا ہے۔ اور روزہ کی جسمانی شدائد ومصائب کو برداشت کرتا ہے)۔

خوشنودی محبوب حقیقی حاصل کرنے کے مختلف طریقے:

محبوب حقیقی کی رضا (روحانی سعادت) حاصل کرنے کے لیے اقوام عالم نے مختلف مسالک اختیار کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے سخت سے سخت جسمانی تکلیف اٹھانا موجب سعادت اور باعث رضائے الٰہی سمجھتا ہے اور اپنے متاعب شاقہ کو ضروری سمجھا ہے۔ جن میں فطرت انسانی اور خلق اللہ کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ مثلاً (بدھ مت کے بھکشوؤں، ہندو دھرم کے سادھوؤں، عیسائیت کے راہبوں وغیرہ نے نفس کشی اور ترک علائق کا جو طریقہ اختیار کیا ہے کہ) وہ کسی عضو شریف مثلاً ہاتھ، پاؤں وغیرہ کو ایک ہی حالت میں رکھ کر اس کو خشک کر دیتے ہیں۔ (یا کانٹوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ یا برہنہ جسم جوہڑوں اور دلدلوں میں کھڑے رہتے ہیں) یا عمر بھی تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ عضو تناسل کو کاٹ ڈالتے ہیں اور قوت مردمی کا کلی استیصال کرتے ہیں یا اس قسم کی اور بے شمار دوسری باتیں جو (ایک طرف) سنت الٰہی کے خلاف ہیں، (اور دوسری طرف نوع انسانی کی تہذیبی، تمدنی اور عمرانی ترقی سے متصادم ہیں)۔ **وللناس فیما یعشقون مذاهب**۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔

یہ یاد رکھو کہ یہ سب طریقے جاہلانہ طریقے ہیں۔ اور ان پر عمل پیرا ہونے والے عابدوں کو (حقیقی سعادت و نجات اور) معبود حقیقی کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان سے خلق اللہ اور سنت الٰہی کی تغیر و تبدیلی آتی ہے۔

بہترین طریقہ:

اس کی سب سے اچھی اور بہترین صورت وہی ہے (جو اسلامی روزے کی ہے) جس میں بڑی بڑی نفسانی خواہشات و لذات مثلاً کھانا پینا اور صنفی تعلق کو اتنی دیر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جو نہ تو بہت کم ہو جس کا کچھ اثر ظاہر و محسوس نہ ہو۔ اور نہ اتنی دیر تک خواہشات مذکورہ کو ترک کیا جائے کہ ریاضت کرنے والے کے جسم اور اس کے قوائے بدنیہ پر مضر اثر پڑے اور فساد مزاج کا باعث ہو (چنانچہ شریعت اسلامیہ نے متوسط راہ یعنی طلوع صبح سے غروب آفتاب تک کا وقت اس کے لیے اختیار کیا ہے اور چونکہ ایک یا دو دن کے

روزہ رکھنے سے مطلوبہ اثرات پیدا نہیں ہوتے اس لیے ایک مہینہ تک اس عمل کو جاری رکھنے کا حکم دیدیا گیا ہے)۔

روزہ کے لیے مناسب وقت وہ ہے جب انقیاد وتسلیم کا جذبہ غالب ہو یا وہ وقت جب نفس کی سرکشی کو کم کرنے کے لیے روزہ رکھنا ضروری قرار پائے (جیسے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ومن لم يستطع فعليه بالصوم الخ) یا شکر نعمت کا اظہار مقصود ہو، یا کسی نعمت کے حصول کی تمنا ظاہر کرنا ہو یا اگر انقیاد وتسلیم اور تشابہ باللاہوت وغیرہ کیفیات کا پیدا کرنا مقصود ہو (اور وہ کس خاص وقت میں پیدا ہوتے ہوں) تو مقررہ وقت اس کا وقت ہوتا ہے۔

(۴) زکوٰۃ۔ اس کی حقیقت وفلسفہ:

عبادت کا ایک طریقہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کی خوشنودی کی خاطر مال ودولت خرچ کرنے کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہو جائے اسی طرح معبود کی خاطر غلاموں کو آزاد کرنا اور ذبیحہ کی قربانی دینا وغیرہ بھی زکوٰۃ کے ملحقات میں سے ہیں۔ جب آدمی کو کوئی تکلیف ومصیبت پیش آتی ہے، اور اس کو دور کرنے کے لیے اپنے معبود حقیقی کی طرف گھبرا کر رجوع کرتا ہے تو پہلے بارگاہ اقدس میں صدقہ یا اعتاق یا قربانی پیش کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اموال میں حق معلوم اور حصہ مقرر ہو۔ یا شارع اس کی تجدید وتعیین نو کے لیے مبعوث ہو[1]

انسان کے اموال واملاک میں بنیادی چیزیں یہ ہیں: (۱) نقدیں (سونا چاندی) (۲) مویشی (۳) اشیائے تجارت اور (۴) زراعت اور کھیتی باڑی۔ ان اموال میں نصاب کا تعین بھی ضروری ہے۔ جس کی مقدار اتنی قلیل بھی نہ ہو جس کے نکالنے میں تکلیف وحرج ہو اور نہ اتنی زیادہ ہو کہ لوگوں کے پاس اس مقدار کے نصاب کا اکٹھا ہو جانا بہت نادر ہو۔ اسی طرح میعاد کا بھی خیال رکھنا چاہیے اس میں بھی اوسط مقدار ملحوظ رکھنی ہوگی۔ یہ سب کچھ

---

[1] اصل عبارت یہ ہے "اما يعينه او الشارع يحث للتجديد" (غالباً اس عبارت میں کاتب سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ صاحب مال سے زکوٰۃ لینے کا کام آسان ہو جائے اور اس کے فوائد زیادہ سے زیادہ رہیں۔

(۵) حج: اس کی حقیقت و فلسفہ:

عبادت کا ایک طریقہ حج کرنا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے حق میں اپنے داخلی شوق اور قلبی اشتیاق کو پورا کرنا چاہتا ہے اور اس کا وسیلہ یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے معبود کے ان مقامات کی زیارت کرے جہاں اس کی صفات کاملہ کا ظہور ہوا ہے۔ مثلاً اس کی خاص برکتیں اور رحمتیں وہاں پر نازل ہوئی ہوں اور اپنے بندوں کو مغفرت و بخشش سے نوازا ہو یا وہاں پر ایسے آثار ہوں جن کو دیکھ کر معبود کی یاد فوراً دل میں اتر آتی ہو یا اس کے حکم سے اس جگہ کا تعین کیا گیا ہو۔ (جیسے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ الحرام)۔

ہر قوم حج کے لیے مخصوص جگہ پر جاتی ہے کسی کے لیے کوئی مکان مخصوص ہے۔ (جیسے بیت المقدس اور بیت اللہ الحرام، بنی اسرائیل اور مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں) کسی نے دریا اور سمندر کو پسند کیا ہے۔ (مثلاً ہندو لوگ دریائے گنگا کی یاترا کے لیے حاضر ہوتے ہیں) بعض لوگوں کا قبلہ مقصود کوئی درخت (جیسے بدھ مت میں بڑ کا درخت) یا صحرا یا قبر یا استھان یا چبوترہ یا زاویہ وغیرہ ہوتا ہے۔ جہاں اچھے آثار اور مظاہر واقع ہوئے ہوں یا متبرک اجتماعات واقع ہوئے ہوں (اور ان مظاہر حسنہ اور برکات کثیرہ کی وجہ سے وہ اپنے خیال میں انہیں مقدس و متبرک سمجھتے ہوں۔ حالانکہ عام طور پر زمانہ کے دستور اور عادات کے مطابق ایسے آثار اور مظاہر ہر جگہ ظہور میں نہیں آتے۔

اور ہر آدمی جس کو کسی سے بحیثیت معبود یا محبوب والہانہ دل بستگی ہو وہ تمام اطلال و آثار اور مقامات کو مقدس و متبرک خیال کرتا ہے جو اس کے خیال میں اس کے محبوب سے کسی قسم کا اختصاص رکھتے ہوں۔ یا وہ حج و زیارت کے لیے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے جہاں پر کوئی قوم ایسی رہتی ہو، جس کا وقت ذکر و فکر میں بسر ہوتا ہو اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کی برکت سے اس کی عبادت بھی شرف قبولیت حاصل کرے گی، چنانچہ اسی بنا پر حلقہ

ہائے ذکر میں شامل ہونا اور مساجد اور عبادت گاہوں اور دعا کے مقامات میں حاضری دینا بھی حج کی فروعات میں سے ہے۔

بہترین صورت حج:

حج کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی ایسی مسجد (عبادت گاہ) کا قصد کرے جس میں معبود حقیقی کی آیات باہرہ نمایاں ہوں، اور اس کو کسی ایسی صالح شخصیت نے خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے تعمیر کیا ہو جس کے برگزیدہ بندۂ خدا ہونا امم واقوام کے نزدیک مسلمہ ہو اور اس کا محل وقوع بے آب وگیاہ اور لق ودق صحرا ہو جس میں آباد ہونے کی استعداد اور گنجائش نہ ہو۔ اس کی تفصیل بحث ملل میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ)۔

(۶) ایمان ونذور (قسمیں کھانا اور منت ماننا):

عبادت کا ایک طریقہ ایمان (جمع یمین) ونور ہیں۔ یمین (قسم) کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے افعال واقوال اور اعمال میں معبود حقیقی کا مقدس نام لے کر اپنے عزم وارادہ کی تاکید وپختگی کا اظہار کرتا ہے، انسان کی جبلت یہ ہے کہ جب وہ اپنے معبود یا کسی قابل احترام ہستی کا نام لے کر کوئی عزم کرتا ہے تو اس کی مخالفت اس کے لیے ناگوار ہوتی ہے (پھر وہ نہ جھوٹ بولنے کی جرأت کرتا ہے اور نہ ہی اس فعل کے کرنے میں کوتاہی کرتا ہے) کیونکہ قسم کھا کر جھوٹ بولنا اور معبود کا نام لے کر کسی فعل کا عزم بالجزم کرنا اور پھر اس میں تساہل کرنا معبود کے تقدس کے خلاف اور اس کی اہانت سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ عزم پر معبود کا نام لینے کے بعد اسے پورا نہ کرنا محبوب کی بے قدری، اس کی محبت سے انکار واعراض اور دوسروں کو اس پر ترجیح دینے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے معبود ومحبوب کے نام کی قسم کھا کر اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے وہ بطور عادت یا خارجی رسم وراہ کے تحت نہیں بلکہ فطری تقاضوں کے تحت ایسا کرتا ہے۔

نذور اور منتوں کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کو کوئی مشکل پیش آتی ہے جس سے وہ گھبرا جاتا ہے تو ایسے موقع پر وہ مال کو ہیچ سمجھ کر قربان کرتا ہے

اور اعمال شاقہ کا بجالانا اس کو آسان معلوم ہوتا ہے۔ اب اگر اس کے دل میں معبود کی تعظیم مفرط موجود ہے تو وہ اپنے مال وزر کو راہ معبود میں (حج وزیارت وغیرہ کے لیے) بخوشی صرف کرتا ہے اور اپنا سب کچھ اس کے دربار میں (بطور صدقہ خیرات وغیرہ) پیش کرنے کا عزم وارادہ کر لیتا ہے۔ اور پھر اس ارادہ سے منحرف ہونا اس کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔

(۷) استماع اخبار و تلاوت کتاب معبود:

معبود کی یاد میں مشغول ہونا، اس کے بارے میں مواعظ وقصص سننا اور اس کتاب کی تلاوت کرنا جس میں معبود کی صفات اور اس کے شئون وآیات کا تذکرہ ہو۔ یہ بھی انواع عبادات میں سے ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی اپنے محبوب کی محبت میں ہیجانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے تو وہ قدرتی طور پر اپنے محبوب کی یاد اور ذکر وفکر میں مشغولیت پر مجبور ہوتا ہے اور اس کا دل محبوب کے محاسن، اوصاف اور کمالات سننے کے لیے بے قرار و مضطر ہوتا ہے (کیونکہ بقول شاعر:

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ سات قسم کی عبادات ایسی ہیں کہ تم دنیا میں ہر ایک قوم اور امت کو ان کا معتقد اور ان طریقہ ہائے عبادت پر عمل کرتے ہوئے پاؤ گے۔ اگرچہ ان کے معبود الگ الگ ہوں اور ان عبادات کے ادا کرنے میں ان کے طریقے ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں۔

گیارھویں فصل

شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام

سو معرفت کے باب میں ایک لاعلاج اور مزمن بیماری جس کی ہلاکت آفرینیوں میں دنیا کی تقریباً ہر قوم مبتلا رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم ناسوت کے مادی اشیا میں سے کسی شے کو شریک ٹھہراتا ہے۔ یہی شرک کی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کو مادیات کے مشابہ سمجھا جائے۔

اگر انسان خالی الذہن ہو کر اپنی ذات وفطرت کی طرف رجوع کرے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کسی صفت کے کمال اور معیار فضیلت کے دو درجے ہیں:

ایک وہ جس کو وہ اپنے ابنائے جنس (ابنائے نوع) کے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ نوع انسانی کا کوئی فرد چاہے کتنا ہی فضل وکمال کا مالک ہو اس کی ایک حد مقرر ہے۔ جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔

دوسرا درجہ وہ ہے جو عالم ناسوت سے بالاتر ہستی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ (اور کوئی فرد بشر اس درجۂ کمال پر فائز ہونے کی استعداد وصلاحیت ہی نہیں رکھتا) ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ناسوتی اور ناسوت سے بالاتر ہستی کے درجۂ کمال کو معین کرنے کے بارے میں لوگوں کو اپنے اپنے معیار علم کے مطابق مختلف راہیں اختیار کرنا پڑی ہیں۔ لیکن بہر حال ہر شخص کے ذہن میں یہ فطری نظریہ راسخ ہو چکا ہے کہ ناسوت سے بالاتر ہستی اس شرف اور کمال کی مالک ہے کہ ان کی نسبت عالم ناسوت کی اشیا کے ساتھ قائم ہی نہیں کی جا سکتی اس بالاتر ہستی کی عظمت کا یہ تصور کرنے کے بعد وہ اپنی جانب سے ایسا اظہار عجز کرتا ہے اور اس

کی اس درجہ کی تعظیم کرتا ہے۔ جو اس کی شایان شان ہے۔ کوئی ناسوتی ہستی اس کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

وہ سب معانی جو کائنات میں تاثیر قدرت کی غمازی کرتے ہیں مثلاً خلق و ابداع (اشیا کو بغیر سبب اور سلسلہ اسباب کے ذریعہ نیست سے ہست کرنے) شفا بخشی، برکت نوازی اور عظمت جبروتی وغیرہ۔ ان تمام معانی کے (حسب مندرجہ بالا) دو درجے ہیں (ایک وہ جس کا تصور انسان اپنے ابنائے جنس میں کر سکتا ہے اور دوسرا وہ جو ناسوت سے بالاتر ہستی کے لیے مخصوص ہے) مثلاً:

ایک درجۂ عظمت وہ ہے جس کا اعتقاد انسان اپنے ماں باپ استاد و مربی کے حق میں رکھتا ہے اور اس لیے ان کے سامنے سرنیاز خم کر کے آتا ہے۔ اس نیاز مندی کا اصل راز یہ ہے کہ اگرچہ باپ اور بیٹا استاد اور شاگرد ایک جیسے انسان ہیں اور دونوں عالم ناسوت سے تعلق رکھتے ہیں مگر استاد اور والد کو قدرے زیادہ کمال اور تقدم حاصل ہے۔ کیونکہ باپ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے بیٹے کی تربیت و پرورش کی اس کے بوجھ اٹھائے، اسی طرح استاد کی فوقیت کا سبب اس کا علم و فضل ہے اور وہ اپنے شاگرد سے علم و فضل میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہے۔ یہ تمام ناسوتی صفات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر بہت سے متناسب برتری عطا فرمائی ہے۔ یہ تفاضل درجات بالکل امر طبعی ہے اور اس کی مثال بعینہٖ ویسی ہے جیسے قدرت نے جسمانی قد و قامت میں لوگوں کے باہم تفاوت کو برقرار رکھا ہے۔ کسی کو لمبے قد و قامت سے نوازا ہے۔ تو کسی کو کوتاہ قد دے کر پیدا کیا ہے (اس لیے استاد و والدین دونوں کمال ناسوتی قسم کا ہے۔ جس پر شاگرد اور بیٹا دونوں فائز ہو سکتے ہیں) تاہم بچے اور شاگرد نے جب اپنے باپ اور استاد میں اس قسم کی فضیلت پائی تو ان کے سامنے عاجزی اختیار کی ان کے مقابلے پر اپنے کو ناچیز کے برابر سمجھا اور ان کے سامنے جھک گئے کیونکہ پرورش اور علم کے سامنے خضوع اور تذلیل بالکل فطری امر ہے۔

دوسرا درجۂ عظمت تعظیم الٰہی کا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ناسوت سے بالاتر ہے۔ اور ذاتِ اقدس اور عالم

ناسوت میں کسی قسم کی مماثلت ومشابہت نہیں ہے۔حق تعالیٰ کی برتری انسانی عقل وقیاس سے ماورا ہے۔اوران دونوں کے درمیان برتری کا موازنہ ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ کی برتری ایسی نہیں جس کا کوئی اندازہ لگایا جاسکے(چہ نسبت خاک را باعالم پاک) اس لیے اپنے اس فطری عقیدہ کے نتیجہ میں اسی ہستی بالاتر کے سامنے انتہائی تذلل وعاجزی اورانقیاد و تسلیم اختیار کرنا اس کے لیے ضروری ولازمی ہوتا ہے۔اس انتہائی تذلل واظہار عجز کو جو بالاتر ہستی کی اس معرفت کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں عبادت کہتے ہیں۔عجز وانقیاد کا یہ اعتقاد و یقین ایک اندرونی کیفیت ہے جو ایسے حالات میں متحقق ہوتا ہے کہ انسان ظاہر میں اپنے اعضا سے کوئی عمل بھی اس قسم کا نہ کرے جس سے معبود کی انتہائی تعظیم اور خود اس کا اپنا انتہائی تذلل ظاہر ہو بہر حال ظاہری اعمال اندرونی اعتقاد اور قلبی اذعان کے لیے بمنزلۂ شواہد اور علامات کے ہیں۔اور کسی شخص میں ظاہری اعمال کا پایا جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے۔کہ اس کا قلب عجز وانقیاد کی کیفیت سے آراستہ ہے۔اسی طرح (یعنی سمع وبصر اور علم وارادہ پر قیاس کرکے)روزی دینا اور شفا بخشنا بھی دو درجے رکھتا ہے۔مخلوق سے بھی ان کو نسبت دی جاسکتی ہے اور خالق کو بھی اُن سے موصوف سمجھا جاتا ہے۔مثلاً کہا جاتا ہے کہ''رزق الامیر الجند'' یعنی امیر نے اپنے لشکر کو روزینہ دیا۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو مال امیر نے ناسوتی ذرائع اور طاقتوں سے جمع کیا تھا اس کو اس نے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیا۔یا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ 'شفی الطبیب المریض'یعنی طبیب نے بیمار کو شفا بخشی۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ طبیب نے اسی انسانی قوت فکر کو جو مریض کو بھی دی گئی ہے استعمال کرکے بیماری کی تشخیص اور اسباب معلوم کیے اور ادویہ کے خواص وآثار کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور پھر عالم ناسوت کے مناسب حال خواص حرارت وبرودت وغیرہ وغیرہ کو معین مقدار میں استعمال کیا جس کے نتیجہ میں بیمار شفایاب ہوا۔(بذاتِ خود نہ تو امیر رازق ہے اور نہ طبیب شافی) لیکن اگر انہی دو الفاظ رزق وشفا کی نسبت ہم اللہ تعالیٰ کی طرف کریں اور کہیں:''رزق اللّٰہ تعالیٰ خلقه و شفی اللّٰہ تعالیٰ عبده''تو اس کے معنی کچھ اور ہوں گے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب اور خواص پیدا کیے بغیر جن سے ناسوتی اعمال کی ملابست ہوتی ہے یا اس سے مشابہت ہوتی ہے بغیر اسباب

ظاہری کے یہ ارادہ فرمایا کہ اس پر مخلوق کے پاس مال جمع ہو اور وہ مال اس کے پاس آ گیا، یا یہ کہ اس بندہ کا مرض زائل ہو جائے اور مریض کو شفا حاصل ہو گئی اور جو ارادہ ذاتِ اقدس کا تھا اسی طرح ظہور میں آیا (اس کے تنفیذِ امر میں کسی قسم کی روکاوٹ نہیں آتی مگر انسان کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا اور یہی فرق ہے عبد و معبود میں)۔

بعینہٖ اسی طرح کسی چیز کو حلال کیا یا حرام کیا کہ اصطلاح دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے:

ایک یہ کہ حلال یا حرام بتانے والا تحلیل و تحریم کے کسی حکم کو رسول سے سنے یا اپنی قوت فکر و نظر سے اجتہاد کے ذریعہ معلوم کر لے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام یہ ایسا کام نہیں جسے کوئی دوسرا انسان نہ کر سکے)۔

دوسرے یہ کہ خود اس نے کسی چیز کو حلال قرار دیا یا حرام ٹھہرایا اور اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے گا تو ماخوذ ہو گا۔ گویا اس کی حیثیت ناقل یا مجتہد کی نہیں۔ حالاں کہ ایسا شارع تو اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔

شرک کی حقیقت اور اسباب

یہ بھی نفس ہوائی یا نسمہ کی فطرت میں سے ہے کہ وہ حقائق اشیا کے دریافت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اور ہر ایک چیز کے امتیازات اور خواص معلوم کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں قوتِ علمیہ ودیعت رکھی گئی ہے۔ اب اگر اس کی کوئی خارق عادت عجیب و غریب تاثیر نظر آئے جس کی معقول توجیہ کرنے سے اس کی عقل عاجز ہے تو جس سے وہ صادر ہوئی ہے اس کے حق میں وہ غیر معمولی شرف اور عظمت کا اعتقاد قائم کر لیتا ہے۔ اور اس ہستی سے اس کو زبردست دل بستگی اور محبت پیدا ہوتی ہے اس کا اعتقاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس قسم کے خوارق کا اپنے ابنائے جنس سے صادر ہونا بعید یا ناممکن خیال کرتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں اس مظہر کے شرف مقدس اور غیر متناہی فضیلت کا عقیدہ اور اس کے ساتھ کامل محبت خود بخود وجود میں آتے ہیں۔ اور جب وہ خارق یا خوارق بار بار اس مظہر سے صادر ہوں یا وہ ان کی

یاد بار بار تازہ کرنے کی محنت کرتا ہے تو وہ محبت اور تعظیم جو اس نے اس مظہر کو خدا کے ساتھ وابستہ کر کے اس کے ساتھ قائم کی تھی۔ اس کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے (اور وہ اس ہستی سے وہی سلوک کرنے لگتا ہے جو ذات اقدس کے لائق اور شایان شان ہوتا ہے) اس طرح نادانستہ طور پر شرک باللہ اس کے عقیدہ اور رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی خداشناسی کا دارومدار یہ ہے کہ انسان ان دونوں (انسان اور خدا) کے جنس کی علیحدگی کا یقین رکھے جس کے نتیجہ میں وہ یہ جانتا ہو کہ عالم ناسوت غیر ناسوتی فطرت رکھنے والی قوتِ قاہرہ کے سامنے مقہور و مغلوب رہتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی ہستی کی عظمتِ مقدسہ کا اعتقاد پیدا کر لیتا ہے اور اس سے مقدس محبت کرنے لگا ہے تو اس کے ضمن میں اس ہستی کی جنس ناسوتی سے تفوق و برتری کا غیر شعوری طور پر اقرار کرتا ہے۔

مشرکین کے اقسام

اس بیماری (شرک) میں مبتلا مریضوں کی کئی قسمیں ہیں:

۱۔ مجوس و صابی:

ان مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا ہے اور اس کی عظمت و محبت مقدسہ کو دلوں سے نکال لیا ہے۔ اور اس کی عبادت اور احکام و فرامین سے پوری طرح غافل ہیں۔ وہ جب بھی عبادت کرتے ہیں (تو اس کو چھوڑ کر) صرف اپنے ان معبودوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا دیے ہیں۔ وہ جب حاجتیں پوری کرنے کے لیے دامن سوال اور دست استعانت پھیلاتے ہیں تو ان شرکا کے پاس جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لحظہ کے لیے بھی التفات و توجہ نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ نظری طور پر عقل انسانی اور دلیل برہانی کے ذریعہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ موجوداتِ عالم کا سلسلۂ تخلیق کسی ایک نقطۂ آغاز اور خالقِ واحد کا متقاضی ہے لیکن عملی زندگی میں وہ اس ''ایک ہستی'' کے تصرف کو مطلقاً معطل سمجھتے ہیں۔ اس صنفِ شرک کے حامل مجوسی اور صابئین کا ایک فرقہ ہے۔

۲۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب:

ان مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں صاحب شرف وفضل اور آقا و مالک ہے۔ اور وہی ذات ہے جو مدبر کائنات ہے مگر (وہ کہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ بعض ہستیوں کو لباس شرف اور خلعتِ خدائی پہنا دیتے ہیں، اور ان کو کائنات کے ایک عالم میں متصرف اور تدبیر کنندہ بنا دیتے ہیں جیسے کہ کوئی شہنشاہ اپنے بعض خدمت گزاروں کو خلعتِ بادشاہت سے نواز کر اپنی سلطنت کے کسی حصہ پر اسے اپنا نائب و حکمراں بنا دیتا ہے۔ وہ خود شہنشاہ ہوتا ہے اور اس کی طرف سے مامور سلطان اور بادشاہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو الہٰ الالٰہہ اور معبودِ معبودان کی حیثیت اور ان شرکا کو چھوٹے خداؤں کا درجہ حاصل ہے۔ معبودِ اعظم اور الٰہ الالٰہہ کے نزدیک ان چھوٹے خداؤں کی بڑی عزت وتوقیر ہوتی ہے۔ اور وہ معبود اعظم کی طرف سے کارخانۂ ہستی اور عالم کون ومکان میں تصرف بھی کرتے ہیں۔ اور خدائے عزّ وجلّ کی بارگاہ میں سفارش کا حق بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کو بندگانِ خدا کے نام سے موسوم کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور ان کی زبانیں یہ نہیں کر سکتیں کہ ان کو دوسروں کے ساتھ مساوی درجۂ مدحت پر فائز رکھیں اس لیے انھوں نے ان کو ابناء اللہ (اللہ تعالیٰ کے فرزند) محبوب اللہ (اللہ تعالیٰ کے محبوب) معشوق اللہ (اللہ تعالیٰ کے معشوق) وغیرہ مقدس ناموں اور لقبوں سے موسوم کیا۔ اور باقی سب لوگوں کو ان کے بندوں کی حیثیت اور مقام دیدیا۔ اس لیے انھوں نے اپنے اور اپنے بچوں کے نام عبدالمسیح غلام فلاں، غلام فلاں اسفندیار (آتش پرستوں کے دیوتا اسفند کا ساتھی) وغیرہ رکھ کر اپنے انتہائی تذلل کا اظہار کیا۔ اس صنفِ شرک میں یہود و نصاریٰ مشرکین عرب اور عصر حاضر میں امت محمدیہ کے غالی منافق بری طرح مبتلا ہیں۔

۳۔ متوغل پیر پرست:

ان مشرکوں میں بعض لوگ وہ بھی ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ کا

ہی تصرف ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ: اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے فنا فی اللہ ہو کر یہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کی رضا مندی میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مضمر اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا میں ان کی رضا مضمر ہوتی ہے اور ان کا کوئی فعل ایسا نہیں جس میں خدائے پاک کے فعل وتصرف کی جھلک نہ ہو (بالفاظ دیگران کا فعل خدائے عزّ وجل کا فعل ہے)۔ یہ لوگ اگر جانتے کہ یہ عقیدہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا تو وہ ایسا اعتقاد رکھنے سے یقیناً اجتناب کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ (اور وہ حق کو اپنی اصل حقیقت وحسن کے ساتھ دیکھنے سے قاصر ہیں)۔

یہ بھی جاننا چاہیے کہ شرف مقدس اور شرف ناسوتی دونوں کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ قریب قریب ایک جیسے ہوتے ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا: ''تم طبیب نہیں ہو، طبیب تو اللہ تعالیٰ ہے تم کو رفیق کہنا چاہیے''۔ لیکن دوسرے معنی یعنی ناسوتی معنی میں طبیب کا اطلاق بھی بنی آدم کے کسی فرد پر جائز ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ''سید وآقا تو اللہ تعالیٰ ہے، لیکن ناسوتی معنی میں یہی فرمایا کہ انا سید ولد آدم (میں بنی آدم کا سردار ہوں) بہر حال اگرچہ الفاظ میں اشتراک پایا جاتا ہے پھر بھی انبیا کی تاریخ میں ہر پیغمبر نے جو اپنی قوم میں مبعوث ہوا شرک کی سب صورتوں سے زجر وتوبیخ کے ساتھ سختی سے منع کیا۔ اور اپنی امت کے دلوں کو شرک کی آلودگیوں اور آسائشوں سے پاک کیا۔ چنانچہ وہ الفاظ کے اشتباہ کے باوجود مقدس شرف کی حقیقت کو پہچاننے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اس پیغمبر کے بعد جب اس کے رفقا کار میں سے اصحاب حلقہ، حواریوں، دین کے وصیوں اور علمبرداروں اور علم سماوی کے حاملوں کا عہد زرّیں گزر گیا، اور لوگوں کے دلوں میں امامت ودیانت کا جذبہ باقی نہ رہا تو نااہل جانشین مسند دین وعلم پر آ کر بیٹھ گئے جنھوں نے (دین کے بنیادی اصول وشعائر اور) نظام صلوٰۃ وعبادت کو تباہ کیا اور وہ خواہشات نفسانی اور شہوات حیوانی کے درپے ہو گئے اور اس پیغمبر کے کلام وپیغام کو اصل مقام سے ہٹانے کے لیے تحریف وتبدیل کی مذموم کوششیں کیں اور شفاعت ومحبوبیت وغیرہ کو جو پیغمبر نے اپنے اور اپنے خواص امت کے لیے ثابت

مخصوص کردیئے تھے دوسرے معنی پہنا دیئے۔ اس طرح اصل دین الٰہی مسخ ہوگیا اور ایک بار پھر جاہلیت کا عہد عود کر آیا۔ (اور ہر طرف ظلم وفساد برپا ہوا۔ اور زمانہ ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس کا مصداق ٹھہر گیا)۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ ایک اور پیغمبر کو مبعوث فرما دیتا تھا۔ جو شرک (وبت پرستی) سے منع فرماتا اور شرک کی جملہ مروجہ صورتوں سے لوگوں کو روکتا اور اس راہ میں زبردست سعی وکوشش کرتا اور مزاحم فرقوں سے جنگ وجہاد کیا کرتا تھا۔

جہاں تک اسلام اور شریعتِ محمدی کا تعلق ہے (تو اگرچہ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں مگر) برابر اس میں وصیِ نبی (اور علما) موجود ہیں جو علم دین اور پیغام وحی کو اپنی شکل وصورت (اور اپنی اصل عربی زبان) میں محفوظ رکھتے ہیں۔ (اور دین کی تجدید اور اصلاح امت کا فریضہ ادا کرتے ہیں) اور حق وباطل کی باہم تخلیط واقع ہونے نہیں دیتے۔ اگر لوگ ان مجددین اور اوصیا کی باتوں پر کان دھرتے رہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہیں تو وہ کامیاب وکامران رہیں گے لیکن اگر انہوں نے ان کے وعظ و نصیحت کو پس پشت ڈال کر اعراض کا شیوہ اختیار کیا تو دنیا وآخرت میں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ چنانچہ رسول اکرم خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پیشین گوئی کے مطابق اس کی امت میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی جو دین کو اپنی اصلی شکل وصورت میں محفوظ رکھتی ہے اور مخالفوں کی مزاحمت ومخالفت ان کو کسی قسم کی گزند نہیں پہنچا سکتی[۱]۔ اس طرح دین محمدی میں جاہلیت عود نہیں کر سکتی ہے۔ اور نہ اس میں کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم باسرارہ۔

۱؎ جنھیں مجددین کہتے ہیں، (قاسمی)

بارھویں فصل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی تاویل

صادق مصدوق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مخاطب ہوکر پیش گوئی کے طور فرمایا تھا کہ "تم پہلی قوموں کے نقش قدم پر چلو گے اور ہر شعبۂ زندگی میں قدم بہ قدم دست در دست اور بالشت بر بالشت پوری تقلید کرو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں۔ تو تم بھی اس میں داخل ہو گے۔" صحابہ نے عرض کیا: "پہلی قوموں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں"؟ حضور نے فرمایا: "تو اور کون"؟ (حضور کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہو چکی ہے) میں تمہارے سامنے کہاں تک یہ رونا روؤں کہ امتِ محمدیہ کے منافقین نے کیا کیا شوشے[1] دین میں پیدا کیے ہیں اور کن کن صورتوں کے ساتھ شرک میں مبتلا ہیں۔ اور عصر حاضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی (غالباً مراد شاہ صاحب کی اپنی ذات ہے) کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دی ہے اور حضور کے علم و وحی کے حامل (شاہ صاحب) کے سینہ میں ضیق و تنگی پیدا کر لی ہے۔ ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ضعیف الایمان مسلمانوں نے مشائخ اور دینی پیشواؤں کو ارباباً من دون اللہ ٹھہرا لیا ہے اور ان کی قبروں سے مسجدیں بنا رکھی ہیں۔ اور ان بزرگوں کی قبروں آثار و تبرکات اور ان کی نشست گاہوں کے آثار اور زاویوں کو زیارت گاہوں کی حیثیت دیدی ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح امت محمدیہ سے پہلے کی امتیں یہود و نصاریٰ ایسے اعمال کیا کرتے تھے، (اور تحلیل و تحریم اور استعانت و عبادت کے جو طریقے یہود و نصاریٰ کے ہاں

---

[1] الہام و القا

مروج تھے۔ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں بھی رائج ہو گئے ہیں۔ یہ تو براعظم ہند کے کمزور ایمان والوں یعنی عام مسلمانوں کا حال ہے) ان کے علما کا حال یہ ہے کہ) ہم نے ان کے کئی افراد کو دیکھا ہے کہ وہ (علما یہود کی طرح دنیاوی اغراض ومقاصد جاہ ومنصب، مال وزر وغیرہ وغیرہ کی خاطر) کلام پاک میں تحریف کرتے ہیں مثلاً ان سے بعض کہتے ہیں: "الصالحون للہ والطالحون لی" نیک وصالح لوگ تو اللہ کے بندے ہیں اور گنہگار میرے لیے ہیں" (گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ شفیع مذنبین ہیں۔ اور گنہگاروں کو آتش دوزخ سے نجات دلانے والے ہیں) ان کا یہ کہنا بعینہٖ یہود علما کے اس دعویٰ کے مشابہ ہے۔کہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً" کہ آتش دوزخ ان کو چند دنوں کے علاوہ زیادہ نہیں چھو سکتی۔ان علما سو نے شفاعت اور محبوبیت کے معنی اختیار کرنے میں پیش رو یہودیوں اور مسیحیوں کی پوری پوری اندھی تقلید کی ہے اور ان دونوں لفظوں کو الٹے معنی میں استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ان مسلمانوں نے بدقسمتی سے یہود اور مجوسیوں کی ملت سے (اور غالباً ہندوؤں سے بھی) بہت سی باتیں اخذ کی ہیں اور ان پر پوری مضبوطی کے ساتھ کاربند ہیں۔انھوں نے مختلف ٹولیاں بنا رکھی ہیں۔(اور اس نص قرآنی کے مصداق ٹھہر گئے ہیں: فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ زُبُرًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ انھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے اور ہر گروہ اپنے عقائد واعمال پر نازاں ہے) ان کے علما و مشائخ نے ان احکام کے مقابلہ میں جن کی تصریح کتاب وسنت میں ہوئی ہے اپنے قیاس سے احکام بنائے ہیں (اور پھر ان کی کتابوں میں رطب ویابس جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے اس کو دینِ منزل سمجھا ہے) نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی راہ راست سے بھٹک گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا ہے۔

کیا تم نے اس حقیقت کی جستجو کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو جب انھوں نے احبار ورہبان کو اربابا من دون اللہ ٹھہرایا کافر کیوں قرار دیا؟ کیا اس وجہ سے کہ ان یہود ونصاریٰ نے کسی ایسے آدمی کو قدیم اور ازلی الوجود کہا ہے جس کے ماں باپ کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں یا کیا اس وجہ سے کہ انھوں نے کسی ایسے شخص کو واجب الوجود سمجھا ہے جس

کا پہلے نام ونشان ہی نہ تھا اور وہ نیست سے ہست ہو گیا؟ یا اس وجہ سے کہ وہ سلسلۂ وجود کی انتہا کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کے بارے میں وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے وجود سے پہلے کئی صدیاں اور لوگ گزر چکے ہیں؟ یقیناً یہ اس قسم کے گھٹیا متناقض ناگفتہ بہ نظریات ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے ایسا عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ (اس سے زیادہ قبیح بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان یہ اعتقاد رکھے کہ ایک دوسرا اس کی طرح کا انسان ازلی الوجود ہے)۔

تم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہود ونصاریٰ حلول کے قائل ہیں۔ اگر وہ حلول کے قائل ہوتے تو یہ کیوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو مبعوث فرمایا۔ یا اس پر فلاں وفلاں وحی نازل فرمائی، یا فلاں بزرگ مر گیا۔ یا فلاں ولی خدائے پاک کے ہاں ہماری شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت منظور کی جائے گی یہ یا اس قسم کے دوسرے الفاظ وکلمات جو وہ اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان انبیا سے بالکل جدا مانتے ہیں۔ (اگر یہ یہود ونصاریٰ اپنے علما ومشائخ کو واجب الوجود یا حقیقی خدا مانتے تو بایں ہمہ عقل ودانش یہ باتیں کہہ کر خود اپنے کلام میں تناقض پیدا نہ کرتے) حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے انبیا اور صالحین کی قبروں کو مساجد کی طرح جائے عبادت و استعانت ٹھہرا لیا تھا۔ اور شیطان نے ان پر غلبہ حاصل کر کے اور ان کو راہ راست سے بھٹکا کر خدائے واحد کے ذکر وفکر کو ان کے دلوں سے بھلا دیا تھا۔ اور مقدس ہستیوں کی الوہیت اور شرف تقدس (اور استعانت بالغیر) کی اعتقادی کیفیت نے یہ عالم اختیار کر لیا تھا کہ ان کی زبانیں یہ گواہی دینے سے ہچکچاتی تھیں، (اور اسے وہ گستاخی اور بدعقیدگی سمجھتے تھے) کہ کہیں کہ:

"فَمَنْ یَمْلِکُ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُهْلِکَ الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" (اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ کو اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارادے کے آڑے آسکے) حالانکہ (ان کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ) وہ تو بشر ومخلوق سے زیادہ حیثیت نہیں

رکھتے۔ اگر ان پیغمبروں کو دوسرے ابنائے بشر پر کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں وحی ونبوت سے نوازا گیا ہے اور لوگوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان پیغمبروں کے احکام ونواہی کے سامنے سر اطاعت خم کر کے اوامر کی تعمیل کریں اور نواہی سے اجتناب برتیں کیونکہ پیغمبروں کا گفتہ گفتہ اللہ ہی ہوتا ہے۔ ان انبیا اور پیغمبروں کو جو شرف وعظمت حاصل ہوئی ہے وہ اسی منصبِ نبوت ورسالت سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی اور بالذات طاقت وقوت یا بالاتر از ناسوت سے نہیں ہوتی ہم نے شرک کی تردید اور اپنے بیان کی تائید وثبوت کے لیے روشن دلائل وشواہد پیش کر دیئے جن کو دیکھ کر اور سن کر کسی انسان کو شرک میں مبتلا ہونے کے کسی عذر کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی خواہ وہ اپنے لیے کتنے بہانے کیوں نہ تراشے۔ اس بیان کو اچھی طرح سمجھ لو۔

مشرکین مکہ اللہ کو واجب الوجود اور خالق کون ومکان مانتے تھے مگر تصرف وعبادت میں دوسروں کو اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔

کیا تمھیں یہ تاریخی حقیقت معلوم نہیں کہ مشرکین مکہ (بھی اپنے معبودوں کو واجب الوجود اور خالقِ کائنات نہیں مانتے تھے اور نہ ہی اس بات کے منکر تھے کہ زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اور نہیں وہ بھی) یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ سلسلۂ وجود اللہ تعالیٰ پر منتہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا ہے:

"وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (اگر تو ان مشرکین عرب سے یہ پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا کون ہے، اللہ یا اس کے معبودانِ باطل؟ تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ "اللہ تعالیٰ") لیکن باجود اس عقیدے کے وہ خداوند تعالیٰ کی نظروں میں مشرک ہیں (کیونکہ توحید کے ان دو عناصر یعنی وجود مطلق اور خالقیت کے علاوہ کچھ اور عناصر بھی ہیں جن کا ماننا ضروری ہے اور وہ تدبر وتدبیر کائنات اور استحقاق عبادت وتسلیم قانون بھی ہیں)۔

شاید تم نے واقعات وحکایات میں جو لوگوں کی زبان زد ہیں یہ حکایت بھی سنی ہوگی کہ قیامت سے پہلے علم اٹھا لیا جائے گا حتیٰ کہ دو شخص اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے طریق ادا میں

اختلاف کریں گے۔ایک کہے گا: یہ اِیَّاکَ سِتِّیْنَ ہے دوسرا کہے گا: نہیں یہ اِیَّاکَ سَبْعِیْنَ ہے جب وہ دونوں اپنا مقدمہ کسی عالم کے پاس پیش کریں گے تو فیصلہ یوں صادر ہوگا نہ تو یہ اِیَّاکَ سِتِّیْنَ ہے اور نہ اِیَّاکَ سَبْعِیْنَ ہے بلکہ اِیَّاکَ تِسْعِیْنَ ہیں۔(جہل ونادانی کا یہ عالم ہوگا کہ بر خود غلط عالم خود حقیقت حال اور اصلِ صورت علم سے واقف نہیں ہوں گے۔اور جہالت عام ہو جائے گی) میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ عصر حاضر میں دوسری آیات کریمہ میں جہال اور برائے نام علما کا اسی قسم کا اختلاف فی الواقع رونما ہو چکا ہے۔اور اب تو ایسا عالم طاری ہو گیا ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں شرک میں مبتلا ہے۔اور ہمارا معاشرہ اس آیت کی عملی تفسیر پیش کر رہا ہے۔وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔ان میں اکثر لوگ جو اللہ کے واجب الوجود ہونے اور خالق کل ہونے) پر ایمان رکھتے ہیں۔ان کا حال یہ ہے کہ وہ (تصرف وتدبیر اور عبادت میں) شرک کی کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہیں۔(تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ) عرب میں ایک سخی اور فیاض آدمی تھا جو حج کے موسم میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلاتا تھا۔(اس لیے وہ لات یعنی ستو گھولنے والا کہلاتا تھا) مکہ کے مشرکوں نے اس کو الوہیت کا مظہر قرار دیا (اس کا مجسمہ بنایا) اور تکلیف ومصیبت کے وقت میں اس کو پکارنا شروع کیا اور اس بنا پر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا۔

آمدم برسر مطلب

صادق ومصدوق حضرت محمد علیہ افضل الصلوٰۃ وایمن التحیات سے جامع ترمذی میں ایک روایت ہے جس میں عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ جس کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ’’اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود ونصاریٰ اپنے علما مشائخ کو پوجتے نہیں تھے بلکہ یہ بات تھی کہ جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تو وہ لوگ اس کو حلال سمجھتے اور جس چیز کو حرام کہتے اس کو وہ بھی حرام کہنے لگے‘‘۔(اس توضیح سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ شرک صرف اس کو نہیں کہتے کہ کسی کی عبادت کی جائے بلکہ اس طور پر کسی کی تحلیل وتحریم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے منسوب کیے بغیر شرعی نصوص کی طرح قطعی اور اٹل سمجھا جائے تو یہ بھی شرک کی ایک صنف ہے)۔

تحریف کا صحیح مفہوم

ممکن ہے کوئی عریض القفا (بیوقوف اور موٹی سمجھ والا شخص) یہ کہہ دے کہ اس کو شرک کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے جبکہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ تحلیل وتحریم کا مالک ہے۔ میں اس کو سمجھانے کی غرض سے کہوں گا کہ اچھا پہلے تو معلوم ہونا چاہیے کہ عام طور پر تحریف سے جو معنی مراد لیے جاتے ہیں یعنی ایک لفظ کے بدلے میں دوسرا لفظ رکھ دینا یا کسی عبادت کو دوسری عبادت سے بدل دینا، وہ کچھ زیادہ وسیع نہیں تحریف کا مفہوم اس سے زیادہ خطرناک ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں اور سب سے زیادہ اور کثیر الوقوع قسم یہ ہے کہ کسی لفظ یا کسی جملے یا کسی عبارت کا ایسا معنی ومفہوم لیا جائے جو آدمی کے اپنے نفس کی خواہشات اور اس کے اشارات وہوا جس کے مطابق ہو (اور کلام کا مفہوم متعین کرنے میں مخاطبین کلام کے فہم یا عرف محاوروں، قرینوں اور سیاق وسباق کا لحاظ نہ رکھا جائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث شریف میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:
آخر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو شراب اور زنا کا نام بدل کر کچھ اور ناموں سے پکاریں گے اور پھر یہ فتویٰ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں ان ناموں کی چیزوں کو حرام نہیں ٹھہرایا۔ اس لیے ان کے استعمال پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔" کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ کہتے ہیں کہ وہ نشہ آور شراب جو (انگور کے سوا) شہد یا شہد کی طرح دوسری چیز سے کشید کی گئی ہو وہ خمر نہیں اور اس لیے اس کا استعمال حلال ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں حضور نے (مذمت اور توبیخ کے انداز میں) بہت کچھ کہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کی لونڈی سے ہم بستری کرے

تو یہ اس کے لیے جائز ہے (گویا وہ "انت ومالک لا بیک "تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے" کی غلط تاویل کر رہے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو منہ کے بل گر پڑے ہیں۔ اور ان کی آرزوؤں نے جو سبز باغ انھیں دکھائے تھے، وہ ان کے دھوکے میں آ گئے ہیں (اس دنیا میں تو سمجھانے والوں کو لام کاف کہہ کر دھتکار دیتے ہیں لیکن) عنقریب کل قیامت کے دن جب حقائق بے نقاب ہوں گے تو انھیں معلوم ہوگا (کہ کون حق پر تھا، اور کون باطل پر اور) کہ جھوٹا متکبر کون تھا۔

اندھی تقلید باعث شک ہے

پھر تم دیکھتے ہو کہ (ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں) جاہل مسلمان ان علما سو کے اقوال کو سند سمجھتے ہیں اور سچ مچ ان چیزوں کو حلال و جائز سمجھتے ہیں جو انھوں نے شریعت حقہ کی تحریف کر کے ان کے لیے حلال اور جائز ٹھہرائی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کے سامنے کلام مجید کی آیات پڑھی جائیں تو وہ ان کے مقابلہ میں آ کر مشت وگریبان ہوتے اور آستینیں چڑھا لیتے ہیں (جیسے کہ قرآن کریم میں مشرکوں کے بارے میں آیا ہے۔ "وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا" جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو تمہیں ان کافروں کے چہروں میں بگاڑ کے آثار محسوس ہوں گے کہ وہ قریب قریب حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں ان لوگوں پر جو ان کو ہماری آیات سناتے ہیں)۔

اور کیا تو نے ان کی کتاب وسنت سے اعراض کرنے کی یہ حالت نہیں دیکھی کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے اقوال بلاسند کو چھوڑ کر قرآن کی طرف اور صادق ومصدوق علیہ السلام (کی بیان کردہ وحی غیر متلو) کی طرف آؤ کیونکہ دوسرے لوگ اپنے اجتہاد میں غلطی اور درستی دونوں سے متصف ہو سکتے ہیں تو جواب میں کہتے ہیں "اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا عَلٰى اُمَّةٍ وَاِنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ" (ہم نے اپنے آبا واجداد کو اسی مذہب پر عمل پیرا پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہیں)۔

اگر ان کا بس چلے تو اس قول کے قائل کو (جو ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف بلاتا ہے۔ جھٹلانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس کو قتل کر دیں۔ یہ لوگ یقیناً مشرک ہیں۔

اور میرے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہوئے جب میں نے یہ کہانی سنی کہ ایک صاحب جس کی فضیلت ان لوگوں میں مسلّم ہے یہ کہتے ہیں کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (میرے پیر و مرشد) فلاں کی صورت میں نہیں بلکہ کسی اور شکل و صورت میں جلوہ نما ہو، تو میں اس کو دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ اگر یہ روایت جو مجھے پہنچی ہے درست ہے تو اس کے قائل نے اللہ تعالیٰ کے درجہ کو اپنے پیر سے نیچے رکھ دیا ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور نہیں ہے جس کو معاف کر دیا جائے۔

---

(۱) سورۂ زخرف کی آیت سے اقتباس ہے۔

تیرھویں فصل

قیامت سے پہلے پیش آنے والے فتنوں کی کیفیت اور قیامت کا اثبات

کوئی چیز تصرف الٰہی کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی

کیا دلیل عقلی اور برہانِ فکری نے تمہارے اندر یہ جزم و یقین پیدا نہیں کیا کہ سلسلۂ علل و معلولات کا یہ ثابت نظام جو اس عالم کو قائم رکھنے کے لیے آسمانوں سے زمین پر اترتا ہے اور عناصر حیات کے وہ طبعی خواص جو ان سے متصاعد ہو کر نظام مذکور کی تکمیل کرنے میں مدد دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مستقل بالذات باعث تخلیق و تکوین نہیں۔ بلکہ ہر صورت کا، جو ہر یہ ہو یا عرضیہ ظہور میں آنا اس بات پر منحصر ہے کہ اس وہابِ مطلق کا فیضان اس پر نازل ہو جو عالم ناسوت کے جواہر اور اعراض سے مقدس منزہ اور بالاتر ہے۔ اور تمام صورتوں سے اس کی نسبت یکساں ہے۔ چنانچہ جب ماں کے پیٹ میں والدین کے مادہ اور قوائے تولید سے بچے کی تخلیق ظہور میں آتی ہے تو یہ اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس پر نفس انسانی فائض ہو جب تک خدائے رحمٰن جلّ وعلا کا اس پر فیضان جود و رحمت نہ ہو۔ اس نظریہ کی دلیل و برہان اور اس کے نتائج کے لیے اپنا دل و دماغ (دوسرے غلط نظریات سے) فارغ کرلو اور اس طرح تم یہ علم حاصل کرلو گے کہ کائنات میں ہر حادثہ اور تغیر اور اس عالم کے تمام تحویلات اور اشیا کی مختلف صورتوں میں ظہور (خروج بالفعل الی مالم یکن یعنی) ہست سے نیست کی طرف عملی خروج ہے اور کائنات میں یہ تغیر و تبدل یا تصرف اس وہابِ مطلق کا فیضان جود و رحمت ہے جس کی ذاتِ اقدس مادہ اور مادّیات سے مبرا ہے اس عقیل پر مضبوطی کے ساتھ قائم و مستقیم رہو۔

فیضانِ الٰہی مناسب اور مشابہ استعدادات پر منحصر ہے

اور کیا اہل علم نے تم کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی خاص مادّہ پر کسی ایک صورت کا فائض ہونا اور دوسرے مادّہ پر دوسری صورت کا فائض ہونا وہاب جلّ وعلا کی تخصیص بخشش وسخاوت سے نہیں۔ حاشا وکلا الرحمٰن کی نسبت تو سب سے یکساں ہے۔ یہ فرق استعدادِ مادہ کے تنوع اور اختلاف سے پیدا ہوتا ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

رحمٰن جلّ وعلا کے بے شمار شئون وکیفیات ہیں، اسی طرح مادّہ کی بھی مختلف استعدادات (بہ لحاظ ترکیب) پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا مادہ کی استعداد جس شان رحمانی سے مناسبت رکھتی ہو، اسی شانِ خاص کا فیضان اس پر نازل ہوتا ہے، مثلاً جو مادہ بہ لحاظ اپنی استعداد خاص کے اس تجلی الٰہی سے مشابہت رکھتا ہو، جس کا نام ہم نے انسانِ اکبر یا ایام نوع الانسان رکھا ہے تو اس پر انسانی صورت فائز ہوتی ہے مادّہ کی مشابہت نوع فرس کے امام سے پائی جائے تو اس کو گھوڑے کی صورت عطا ہوتی ہے وعلیٰ ہذا القیاس فیضان رحمٰن کا ایک کسی خاص شکل میں صادر ہونے کے لیے شبکہ (جال اور سبب) مادے کی استعداد کی وہ مشابہت ہے جو وہ شئون رحمٰن میں سے کسی خاص شان کے ساتھ رکھتی ہو اور یہ تمام تنوع اور اختلاف جو کائنات عالم میں دکھائی دیتا ہے استعدادِ خصوصی اور شانِ خاص کی مشابہت کا نتیجہ ہے (یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشابہت کا اصول مسلّم لیکن استعدادات میں تنوع اور اختلاف کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ "وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا")۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر تم پانی کی حقیقت کو ہوا میں بدلنا چاہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ پہلے پانی کے ترکیبی ہیئت اور اس کے خواص دریافت کرو۔ اسی طرح ہوا کی ہیئت ترکیبی اور خواص بھی دیکھ لو۔ خواص مادّہ کے ان صورتوں کے لوازمات ہیں۔ جہاں خواص ولوازم میں تبدیلی نظر آئے گی وہاں شکل وصورت میں بھی تغیر وتبدیلی رونما ہوگی۔ اور پانی کے خواص وہیئتوں کو ہوا ہیئت ترکیبی اور خواص سے ہم آہنگ کردو اور جب یہ ہم آہنگی اور مقادیر خواص

اپنے مقرر نصاب وحد مقررہ تک پہنچ جائیں تو پانی ہوا میں بدل جائے گا۔ اور ہوا کے خواص، حرارت، لطافت، پانی کے مقابلے میں کم رطوبت اور تخلخل (بھربھراہٹ)[1] ہیں پانی میں یہ خواص بتدریج پیدا ہونے چاہییں۔ یہاں تک کہ یہ خواص ہوا کہ خواص کے معیار تک پہنچ جائیں پھر تم مشاہدہ کرو گے کہ پانی ہوا میں تبدیل ہو گیا۔ اسی ایک مثال پر اکتفا کرلو اور موجب بالذات (علیم وقدیر) کی جملہ تصریفات وتقلیبات عالم کو اسی قاعدہ کی جزئیات میں شمار کرلو کہ وہ اشیا کے خواص وہیئتوں کو بدل کر اشکال وصور کا ظہور فرماتا ہے۔

اسی طرح اگر تم کسی چیز میں حیات پیدا کرنا چاہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ کوئی ایسا تریاق تلاش کرو جو قوت حیات کے موافق ہو اور لازماً وہ تریاق رحمٰن جلّ وعلا وہاب صور کی شان خاص یعنی شانِ احیا سے مشابہ ہوگا (اگر ایسا تریاق ہاتھ آجائے تو حیاۃ کا نمو ضرور ہوگا) اسی طرح اگر تم کسی زندہ چیز کو موت دینا چاہو تو ایسا زہر ڈھونڈو جو قوتِ حیات کے مخالف و متضاد ہو۔ چنانچہ حیات قائم رکھنے کے لیے رطوبت اور حرارت کا ہونا لازمی ہے اس لیے جو دوا انتہا درجہ کی گرم خشک ہوگی وہ یقیناً زہر قاتل ہوگی۔

یہی حال اس نظام انسانی کا ہے جو الرحمٰن سے صادر ہوتا ہے جس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ تجلی الٰہی جو ہماری اصطلاح میں امامِ نوع انسانی کہلاتا ہے اور وہ شان من شئون الرحمٰن ہے کی فیض یابی کے لیے مادہ میں مناسب استعداد اور مشابہ صلاحیتیں پیدا ہونی چاہییں (مراد یہ ہے کہ جس نوع کا فیضان چاہو اسی کے مناسب اور مشابہ استعدادات پیدا کرنے کی سعی وکوشش کرو بلکہ) میں تو اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گا جب تک تم ان مناسبات اور مشابہات کی طلب نہ کرو جن پر نظام انسانی اور نظام عالم کے بقا کا دارومدار ہے، اور جن کے فوت ہونے سے پورے نظام میں فساد توڑ پھوڑ اور انفکاک پیدا ہوگا۔ اگر جستجو میں کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ اور ان استعدادات کی حقیقتوں کا علم تجھے حاصل ہو جائے تو یقیناً تم طبیب الٰہی کہلانے کے مستحق ہو جاؤ گے اور یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

---

[1] Rarefication

اللہ سے جو چیز صادر ہوئی وہ خیر مطلق ہے شر اضافی شے ہے

کیا تم کو علمارا سخون کے اس نظریہ کا یقین محکم اور علم یقین حاصل ہوا ہے کہ علیم اور خبیر تام اللہ تعالیٰ سے جو نظام صادر ہوگا وہ نظام خیر ہوگا۔ اس میں اگر شر کا کوئی شائبہ ہے تو وہ مقصود بالذات نہیں ہوگا۔ بلکہ بالعرض اور اضافی ہوگا، کیا تم مشاہدہ و ملاحظہ کرنے کی یہ استعداد رکھتے ہو کہ تمھیں یہ بات معلوم ہو جائے کہ انسانی نظام کا ایک حقیقی اعتدال ہے۔ جو تقریباً ناممکن الوجود اور ممتنع الوقوع ہے۔ اس سے کم درجہ کا ایک اعتدال ایسا ہے جس کا وقوع ممکن ہے پھر اس کے بعد تیسرا درجہ ضعف کا ہے۔ اور پھر چوتھا درجہ فسادِ نظام کا ہے اور پانچواں درجہ فکِ نظام اور تباہی کا ہے۔ اور تمھیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ کون سے عوارض ہیں جن کے نتیجہ کے طور پر اپنے وقت پر نظام میں ضعف کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور کن عوارض کے نتیجہ میں اپنے وقت پر فساد پیدا ہوتا ہے۔

اور کیا تم میں یہ استعداد ہے کہ تم یہ یقین کر لو کہ نظامِ انسانی پر کتنا ہی ضعف اور فساد طاری کیوں نہ ہو جائے پھر بھی خدائے بخشندہ وہاب اپنی نظر جود و عنایت سے اس کو محروم نہیں فرماتا۔ اگر خیرِ مطلق اس نظام میں باقی نہ رہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے جود و کرم سے اس پر اس کے ہر مرتبہ کے مطابق اس زمانے کے حالات کے موافق خیر اضافی کا اضافہ فرماتا ہے۔ اسی تدبیر کا نام "حق" ہے (وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ) میں غالباً یہی معنی مراد ہیں اور اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: (بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ) یہ حق ہمیشہ باطل کو مٹاتا اور مغلوب و مقہور کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب باطل پورے طور سے مقہور و مغلوب ہو جاتا ہے تو وہ کسی دوسری بری شکل میں ظہور کرتا ہے لیکن حق کب اس کا پیچھا چھوڑتا ہے اس کو مٹانے کے لیے ایک دوسرا حق نازل ہوتا ہے اسی طرح حق برابر باطل کو مٹاتا رہتا ہے (تاہم نظامِ انسان میں بتدریج ضعف و فساد بھی پیدا ہوتا رہتا ہے)۔ جب تک نسل انسانی صفحۂ ہستی پر باقی ہے حق و باطل کے تصادم کا سلسلہ قائم رہے گا اور اللہ تعالیٰ کا بندوں سے یہی سلوک قائم

رہے گا۔ بالآخر نسلِ انسانی منقطع ہو جائے گی۔ زمین کو کچھ مدت تک سکون و قرار ملے گا، تم اس وقت تک آفاق رسیدہ طبیب الٰہی نہیں بن سکو گے جب تک یہ معلوم نہ کرو کہ ہر درجہ کے معدات اور ہر مرتبہ میں نزول حق کی نوعیت کیا کیا ہوتی ہے اور ہوگی اور جب تک ابتدائے آفرینش سے نوع انسانی کا خاتمہ ہونے تک کا وہ پورا دور اور نظام جس کا وجود اور تحقق الٰہی کیفیات کے ساتھ لازم ہے۔ اور ارادۂ ازلیہ اس کے واجب الوقوع ہونے سے مغلوب متعلق منعقد ہو چکا ہے اور اس کی تفصیلات مع اس کی حکمت ہائے بالغہ کے تمہاری آنکھوں کے سامنے متمثل نہ ہو جائیں۔

اسباب و مسببات کا نظام حکمت پر مبنی ہے

اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ روزمرہ کے حوادث اور واقعات کے لیے ایسے اسباب و علل کا ہونا ضروری ہے جن کے تام ہونے کی وجہ سے ان کا معلول ان سے پیچھے اور مختلف نہیں ہوتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قدرت کے افعال مبنی بر حکمت نہیں اور ترجیح بلا مرجح جائز ہے اور بغیر علتِ موجبہ کے بھی کوئی چیز وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ ان حوادث کو محض اتفاق پر وہ شخص محمول کرتا ہے جس کے سامنے یہ نظام ذرا قاصر شکل میں آتا ہے اور اس نظام قاصر کے لحاظ سے وہ اس کے لیے کوئی نام تجویز کرتا ہے۔

اب یہ ممکن نہیں کہ روزمرہ کے حوادث اور ان کے ظہور اور وقوع کی علتِ تامہ خود رحمٰن تعالیٰ شانہ کو قرار دیا جائے کیونکہ مختلف صور و انواع اور مختلف مقامات اور مختلف اوقات کی نسبت اس کے ساتھ مساوی ہے۔ اس لیے تحقیق کے لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس تنوع اور اختلاف کے لیے مادہ کی مختلف استعدادوں اور قابلیتوں کو اور انواع و اقسام کے شرائط کو تلاش کیا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے عناصر کی طبائع اور مادّہ پر طاری ہونے والے مختلف احوال پر نظر ڈالی تو انھیں معلوم ہوا کہ کسی نئی چیز کے حادث ہونے اور کسی نئی حالت کے پیدا ہونے میں ان کو دخل ضرور ہے۔ بعض دوسروں نے سیاروں کی مختلف حرکتوں اور ان کے گوناگوں اتصالات پر غور کیا تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ عالمِ محسوسات میں

ان کے کچھ کے اثرات تو نمایاں ہیں۔ چنانچہ آفتاب کے مختلف بروج ہیں جن کی وجہ سے گرمی وسردی کا اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اور رطوبات کے مائع یا منجمد ہونے پر چاند کا اثر پڑتا ہے۔ البتہ بعض باتیں ایسی ہیں جن کا اثبات حدس اور فراست کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً زحل، مریخ، مشتری، اور دوسرے سیاروں کی حرکات لوگوں کے اخلاق، طبائع اور ان کے حالاتِ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں بہر حال انھوں نے اپنے ان نظریوں اور مشاہدوں کو علوم کی شکل میں مدون کیا (اور اس موضوع پر کتابیں لکھیں)۔

اسباب ومسببات کے متعلق اہل معرفت کا نظریہ

لیکن علما اہل معرفت اس سلسلے میں خاص امعانِ نظر اور دقتِ تفکر رکھتے ہیں۔ اور مشاہدہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر صورت جوہریہ اور عرضیہ کو شئون مقدسہ رحمانیہ میں سے کسی ایک شان کے ساتھ مشابہت حاصل ہے اور جو فیض رحمانی کا نزول اسی کے مطابق ہوتا ہے بعد ازاں جب انھوں نے اس تشبہ کی شرح وتفصیل بیان کرنی شروع کی تو انھیں معلوم ہوا کہ بعض کا تعلق عالم مثال سے ہے۔ اور مشابہت کی بنا ان اعتبارات اور تامناسبات کے ملحوظ رکھنے پر ہے جو عالم مذکور سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض مشابہتوں کی بنا افلاک وسماوات پر ہے (۱)۔ بعض کی علت وہ خواص اور طبائع ہیں جو عالم کون وفساد کے عناصر ترکیبی میں ودیعت رکھے گئے ہیں۔ بعض کی نوعیت افعال، اعمال اور ہیئات کی ہے۔ اور بعض مشابہتیں ان قوائے الٰہیہ کا نتیجہ ہیں جو اس عالم میں کسی اسم جزئی کی تفاصیل کے طور پر پھیلی ہوئی ہیں جس کا نزول رحمٰن تعالیٰ وتقدس سے ہوتا ہے اور جس کی جڑیں شئون الٰہی میں سے کسی ایک خاص شان کے اندر مستحکم ہوتی ہیں۔ اس کی بنیاد تو جود رحمانی کے مطابق اس کی ایک شان سے پڑتی ہے۔ اور پھر اس کا ثمرہ اور نتیجہ اس منظم اور مرتب شکل میں ظہور پاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسم مذکور اجمال ہے اور یہ منظم نتیجہ اور ترتیب اس کی تفصیل ہے۔ اس نزول اور تفصیلی صورت اختیار کرنے کے بعد اس کا عروج پھر رحمٰن تعالیٰ وتقدس کی طرف ہوتا ہے (۱) اور پھر اسی طرح دوسرا اور تیسرا اسم الٰہی نازل ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر متجلی ہوتا ہے

اوران سے یہ قوی اطراف واکناف عالم میں پھیلتے رہتے ہیں۔ اشخاص مثالیہ الفاظ اور امکنہ ومقامات میں ان کی قرارگاہ ہوتی ہے جس کو عارف باللہ پہچانتے ہیں۔ اب اگر خداوند قدوس کا کوئی عارف بندہ (جو قرارگاہ کو پہچانتا ہو) اس قرارگاہ کو کسی چیز کی طرف مائل کردے تو وہ قوت (جس کی وہ قرارگاہ ہے) بھی ادھر مائل ہوگی۔ اور جب بھی کسی مادّہ پر انسان کی صورت فائض ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مادہ نے ان امور کے لحاظ سے انسان الٰہی یعنی اس تجلی کے ساتھ مشابہت پیدا کرلی ہے جو اس خاکی انسان کے ظہور میں آنے کا سرچشمہ ہے۔ اور وہی انسان الٰہی اس نوع انسانی کے احوال، اخلاق اور خواص کے نظام کا معیار ہے جو اس کرۂ ارض پر آباد ہے۔

اہلِ معرفت نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قوائے سماویہ اور ارضیہ کو بھی اس میں دخل ہے اور دونوں قسم کے قوی یعنی قوائے الٰہیہ اور قوائے طبعیہ کے مؤثر ہونے میں کوئی تناقض نہیں، ہر ایک میں سے ایک خاص قسم کا فعل ظہور میں آتا ہے جس کے اجتماع سے کوئی چیز حادث ہوتی ہے۔ یا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ جس طرح آئینہ میں جب کوئی صورت دکھائی دیتی ہے تو آئینہ کی استعداد اور دیکھنے والے کی قوتِ بصارت دونوں کے اجتماع سے یہ رویت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان قوتوں میں سے کوئی ایک قوت علّت موجبہ ہو، دوسری اس کی مساعد ہو۔ اور علّت موجب کی حد تک نہ پہنچی ہو یہی وجہ ہے کہ عارف باللہ کبھی تو کہتا ہے کہ یہ حادثہ قوت الٰہی سے ظہور میں آیا اور کبھی کہتا ہے کہ فلاں عمل اور فعل کا نتیجہ ہے۔

ظہور واقعات کے بارے میں اہل معرفت اور سائنس والوں میں اختلاف نہیں ہے

اس تمام تقریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ علما باللہ اور لوگوں (سائنس دانوں) کے درمیان کوئی تناقض اور تضاد نہیں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ ایک فریق (اہل معرفت) کی نظر وسیع ہے اور اس کو مزید تحقیق اور تفصیل کی توفیق ملی ہے۔ اور دوسرے فریق یعنی سائنس

دانوں کی نظر مشہودات ومحسوسات کے دائرے کے اندر محدود ہے اور ان کو ماوراالعقل حقائق کی تحقیق ومشاہدہ کے مواقع نہیں ملے۔ لیکن ہم تو یہاں ان اعمال کی بابت گفتگو کررہے ہیں جو یکے بعد دیگرے افراد انسانی سے صادر ہوتے ہیں۔ اور انہی کی مطابقت اور مشابہت سے جود الٰہی تعالیٰ شانہ کا نزول ہوتا ہے۔ جس سے نظام کے استحکام یا اس کی تحلیل اور انتشار اجزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ سب اس زبان زدِ عوام مقولہ کی تفصیل ہے کہ احوالِ انسانی کو واقعات کے نزول میں دخل ہے۔

یہ بات کہ فیضان جود الٰہی کا دارومدار استعداد ومشابہت پر ہے اور انسان کی ہیئات اور افعال کو اس میں دخل ہے، یقینی ہے۔ تاہم اگر مزید توضیح وتشریح چاہتے ہو تو اس پر غور کرو کہ رحم میں مادّہ منویہ قرار پاتا ہے تو یکے بعد دیگرے وہ علقہ اور مضغہ کے مدارج تخلیق اور منازل ارتقا سے گزرتا ہے تب اس پر انسانی صورت فائض ہوتی ہے۔ اس طرح آدمی غصہ سے مغلوب ہوتا ہے تو گالی دینے پر اتر آتا ہے اور جب وہ شخص جس کو گالی دی جاتی ہے اس کے سبّ وشتم کو سنتا ہے تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ (اول الذکر صورت میں والدین کے مادۂ منویہ اور قوائے تولید کو جنین کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں اور یہ کہ مؤخر الذکر صورت میں) سب وشتم کو سر پھوڑنے میں کوئی دخل نہیں۔ (یقیناً ایسی باتوں کا انکار کرنا سفسطہ ہے اور بدیہی باتوں سے انکار کے مترادف ہے) ہمارے نزدیک تو حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ارادہ ایک گونہ طبعی ایجاب اور لزوم ہوتا ہے جس پر انسان اس وقت خود بخود آمادہ ہوتا ہے۔ اور جب انسان کے قوی میں اس ارادہ کے اسباب کی بنا پر اس کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو انسان اس ارادہ پر خود بخود (گویا بلا اختیار) آمادہ ہوتا ہے (میری یہ بات سمجھ لیجیے اور) خبط میں مبتلا لوگوں (کی طرح حقیقت سے بعید رایوں) کے ساتھ کوئی سروکار نہ رکھیے۔

چودھویں فصل

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس جو خیر محض ہے کس طرح شر کا مصدر ہو سکتی ہے

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ انسان کے جسم میں پھوڑے پھنسیاں اور زخم کے دانے کیوں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور بخار اور دوسری بیماریاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں؟ تحقیق اور غور کرنے کے بعد تمھیں معلوم ہوگا کہ جسم میں ایک طبیعتِ مدبرہ ہے، لیکن اس کی یہ تدبیر ارادی واختیاری نہیں ہے۔ بلکہ ایجابی ہے۔ (جس طرح نباتات کی قوت نامیہ بغیر ارادہ کے ایجاب کے طور پر ان کے نشو ونما کا باعث ہوتی ہے) جب تک جس میں رمق حیات باقی ہے طبیعت کی یہی تدبیر اس کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے کارفرما رہتی ہے اس کا فعل اس طبیعت کی طرح ایک ہے لیکن یہی فعل واحد جب بدن کے اخلاط پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ مختلف افعال کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ طبیعت کی اس تدبیر اور اس عمل کا مقصد یہ ہے کہ جسمانی ترکیب کو محفوظ اور اس کے نظام کو قائم رکھے اور ہر قسم کی مضرتوں سے اسے بچائے اور چوں کہ جسمانی ترکیب میں اعضا واوضاع مختلف ہیں اس لیے ہر عضو اور اس کی وضع خاص کو قائم رکھنے کی نوعیت لامحالہ مختلف ہوگی۔ مثلاً دماغ کی حفاظت اور اس کو مطلوبہ کیفیت پر قائم رکھنے کے لیے اس کے مناسبِ حال رطوبت اور برودت کو پہنچانا لازم ہے۔ اسی طرح قلب کو غیر صحی حالت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی حرارت اور خشکی کو خاص معیار پر قائم رکھا جائے وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے اعضائے بدن کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب اور وضع خاص میں رکھنے کے لیے عناصر کو خاص ترکیب اور مقدار کے ساتھ رکھنا ہوگا)۔

جب بدن میں مطلوب تناسب ومعیار ومقدار کو چھوڑ کر اخلاط کسی ایک مقام پر جمع ہوجاتے ہیں تو حتی الامکان طبیعت کی قوت مدبرہ اس کی اصلاح وعلاج کر لیتی ہے لیکن اگر ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر وہ کسی طرح نکسیر یا قے یا دست واسہال یا پسینہ یا ادرار بول کے

ذریعہ خلط زائد کو نکالنے کا انتظام کرتی ہے اور اگر ترکیب جسمی یا خلط زائد اس کی تدبیر کو قبول نہ کرے تو پھر اس کو پھوڑوں، پھنسیوں کی صورت میں باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہے اگر یہ تدبیر بھی ناکام ہو جائے تو پھر وہ حرارت جو خالصتاً انسان کے فائدہ کے لیے اس کے بدن میں ودیعت رکھی گئی ان اخلاط زائدہ کو متعفن وگندہ کر دیتی ہے اور آدمی کو بخار چڑھ جاتا ہے۔ بعبارت دیگر وہ چیز جو خیر محض تھی فاسد اخلاط کے اجتماع سے اور قوت مدبرہ کی تجویز کردہ راہ سے عصیان وانحراف کی وجہ سے شر کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اس عفونت اور بخار کی حالت میں طبیعت سے عجیب وغریب افعال ظاہر ہوتے ہیں جن میں سے ایک مشہور کیفیت بحرانوں کی ہے (یعنی مرض کی وہ انتہائی حالت جس میں انسانی طبیعت کا تصادم اخلاط فاسدہ سے ہو، اسے سخت بخار ہو اور اس کی زبان سے بے قابو بے لگام غیر مربوط کلام غیر شعوری طور پر صادر و سرزد ہو)۔

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی بھی صاحب عقل ودانش انکار نہیں کر سکتا۔ اور باوجودیکہ طبیعت ایک ہے۔ اور اس کا فعل بھی ایک ہے (مگر اخلاط کی موجودگی میں اس کا امر مختلف اعضائے جسمانی سے مختلف صورتوں میں رونما ہوتا ہے) اسی کو مثال کے نمونہ کے طور پر پیش نظر رکھو اور طبیعتِ کلیۂ انسانیہ یعنی انسانِ کبیر کے افعال کو حفظ اشخاص کے بارے میں اس پر قیاس کرو کیونکہ انسان کے افراد بحیثیت مجموعی اس طبیعت کلیہ انسانیہ کے لیے بمنزلہ اعضائے جسم کے ہیں جن کو سوء مزاج سے محفوظ رکھنا ہے اس (طبیعت کلیہ انسانیہ) کا فرض ہے۔ اور ہر ایک فعل جو ہر مرتبہ میں اس انسان کبیر سے صادر ہوتا ہے اسے ہم حق نازل عن الانسان الکبیر یعنی انسان کبیر سے صادر ہونے والے حق کا نام دیتے ہیں اگر افراد انسانی کے نظام کو بطور اجمال من حیث المجموع اس طبیعت کلیہ سے منسوب کیا جائے تو ہمیں کہنا ہوگا کہ یہ نظام اس (انسان کبیر) سے بغیر ارادہ کے بطریق ایجاب ذاتی صادر ہوا ہے (جس طرح آفتاب سے حرارت اور روشنی بغیر اس کے ارادے کے بطریق ایجاب صادر ہوتی ہے) لیکن اگر افعال جزئیہ کے اس کی نسبت دیکھی جائے جو ہر ایک مرتبہ وجود میں اس سے صادر ہوتے ہیں تو ہم یہی کہیں گے کہ حق کا نزول بالارادہ ہوا ہے۔ کیونکہ ارادہ کا مفہوم عرف عام میں یہی ہے کہ کسی فعل جزئی کے عمل میں لانے کی رغبت پیدا ہو، یہی ارادہ یقیناً اس فعل جزئی کے

صدور کا موجب ہوتا ہے علاوہ ازیں وہ امور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں (جن میں سے ایک انسان کبیر بھی ہے) علم حضوری سے خالی نہیں۔

الغرض انسان کبیر کے جسم (وشخص) کو (افراد انسانی کی طرح کئی قسم کے امراض از قسم بثرات (پھوڑے پھنسیاں) وحمیات (بخار) لاحق ہوتے ہیں مگر سب سے بدترین مرض بخار ہے جو تعفن کی شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔ جب اس کا علاج کیا جاتا ہے یا اسے بحران کی کیفیت پیش آتی ہے تو اس کے تعفن کی شدت اور علاج کے باوجود اس کی بیماری اور بخار کی تکلیف اور بھی بڑھ جاتی ہے (نہ علاج اثر پذیر ہوتا ہے اور نہ بحران کا خاتمہ بخار کے اٹھ جانے پر ہوتا ہے) اس صورت میں موجودہ نظام انسانی کی مشابہت انسان الٰہی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت اللہ تعالیٰ کسی اور مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کر سکتا ہے۔ اور اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ انسان کبیر کے امراض کا کائنات جو یہ سے بھی تعلق ہے۔ اور جس طرح انسانِ صغیر کے جسم میں بعض اوقات معدہ کمزور پڑ جاتا ہے لیکن جس کی نظر دقیق وغائر نہ ہو وہ اس کو محسوس نہیں کر سکتا اسی حالت میں وہ کوئی ثقیل غذا کھالیتا ہے اور اس کو ہیضہ ہو جاتا ہے اور وہ ضعف جو پہلے غیر محسوس تھا، نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عارف کو محسوس و معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کبیر مرض میں مبتلا ہے لیکن بادی النظر میں وہ مرض دکھائی نہیں دیتا صرف اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ خف ومسخ اور کلی بگاڑ و فساد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ پورا کا پورا ہلاک و برباد ہو جاتا ہے یا اس کا کوئی ایک حصہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے ابتلا کی پہلی صورت کو شرع کی زبان میں لعنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں قوم پر اللہ کی پھٹکار پڑ گئی ہے۔ اور وہ ہلاک ہونے والی ہے۔ مؤخر الذکر حالت کا نام عذاب ہے۔ جو اعمال مذکورہ پر مرتب شدہ نتیجہ ہے۔ اپنے اعمال پر انسانِ کبیر کے تمام افراد یا بعض افراد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا دینے کی مثال ایسی ہے کہ ایک آقا کو اس کے غلام (اپنی نافرمانیوں سے غصہ دلاتے ہیں اور وہ برداشت کیا کرے اور بالآخر جب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے ان کو مارا اور ان کے سر پھوڑ دیئے۔

تیسرا مقالہ

پہلی فصل

ملتوں اور شریعتوں کا بیان

ملت کی حقیقت اور اس کے ظہور میں آنے کے اسباب

ملت کی حقیقت وتعریف

کیا تم یہ جاننے کی قدرت رکھتے ہو کہ وہ ارتفاقات خصوصاً ارتفاق ثانی وارتفاق ثالث اور وہ اقترابات جن پر نوع انسانی کی اجتماعی اور انفرادی زندگی قائم ہے اور جو (انسان کی اکتسابی فضیلت وکمال نہیں بلکہ) بنی نوع انسان پر عنایت الٰہی کا احسان بے کراں اور عطیہ عظیمہ ہیں کہ یہ سب عطیاتِ ربانی انسانی طبیعتوں اور سرشتوں میں ودیعت رکھے گئے ہیں بالخصوص قرب الٰہی کے ذرائع اور طریقے مثلاً احسان، عبادت، معاصی سے پرہیز وغیرہ وغیرہ سب امور کلیہ جو مختلف صورتوں اور شکلوں میں رونما ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک نکاح اور عقد ازدواج کو لے لیجئے جس کو دھوم دھام سے منانا، دف اور ساز وآواز کے ذریعہ خوشی کا اظہار کرنا، قیمتی اور بیش قیمت کپڑوں کا پہننا جو عقد نکاح کے علاوہ کسی اور موقع پر بہت کم پہنے جاتے ہیں اور لوگوں کو (طعام وولیمہ پر دعوت دے کر) کھانا کھلانا جو عموماً اس قسم کے تقریبات پر کھلایا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تمدنی زندگی کے دوسرے بلند درجہ کے تقاضوں کے تحت لوازم نکاح سمجھے جاتے ہیں، جو اسے اس طرح ادا کرے اس نے بھی اس کا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح عقد نکاح میں الفاظ کے ساتھ ایجاب وقبول اور گواہوں کی موجودگی بھی ایسی شرطیں ہیں جن کو ارتفاق ثانی نے لازم قرار دیا ہے۔ یہ صورتیں دراصل نکاح کی شرطیں اور ظاہری صورتیں ہیں۔ مقصد حقیقی اور اصولی طور پر لازم بات تو یہ ہے کہ

نکاح کے ذریعہ منکوحہ کی تعیین ہو جائے جس میں بہ لحاظ زوجیت اور کسی کی شرکت نہ ہو۔ اور نہ ہی کسی بھی صورت میں شرکت کا احتمال ہو۔ اور عقد ازدواج کو مہتم بالشان تقریب سمجھا جائے جیسے کہ تدبیر منزلی کے فصل میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ مقصد اصلی اور غایت حقیقی ان دونوں مذکورہ صورتوں سے حاصل ہوتی ہے اس لیے ان صورتوں میں سے کسی ایک کو لوازم نکاح قرار دینے اور ان کو برقرار رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے کئی ظاہری طریقے اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان سب بشری تقاضوں کو پوری طرح ترک کرے اور دنیوی علائق کو چھوڑ کر تجرد اور تنہائی کی راہبانہ زندگی اختیار کرے (جو بدھ مت، مسیحیت، جدید اور غالی متصوفین کا پسندیدہ طریقہ ہے)۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ اصل انسانیت اور اس کے (نوعی و جنسی) خواص کو برقرار رکھ کر اعضاء و جوارح کو ان عبادات اور ان اعمال میں لگایا جائے جو ذات باری تعالیٰ سے قریب کرنے کے موجب ہیں۔

اسی پر ارتفاقات اور اقترابات کے دوسرے بنیادی مسائل کو قیاس کیجئے وہ بھی مختلف صورتوں میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم نے گزشتہ ابواب و فصول میں اس قسم کے مسائل کو ملّت حنیفیہ یعنی دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق بیان کیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان امور کے مقاصد اور لازمی اصول کا حصول انہی صورتوں، طریقوں اور کیفیتوں تک محدود ہے۔ ہم نے تو ان کو فقط تمثیل و نظیر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی ملّت ایسی نہیں ہو سکتی جو ان اصولی عبادات سے متعلق بنیادی لوازم کو نظر انداز کر دے اور نہ کوئی سلیم الطبع بشر خواہ وہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو ان سے انکار کر سکتا ہے۔ سب ابنائے آدم اس واجب اصلی پر متفق ہیں ان کا اختلاف و نزاع اس اصل میں نہیں، بلکہ خاص صورت اور خاص شکل کی تعیین میں ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس صورتِ معیّنہ اور وضع خاص کو ملّت کہتے ہیں جس کے ذریعہ ارتفاقات اور اقترابات کی اصولی باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ (ملّت عربی میں نظام حیات اور دین کو کہتے ہیں۔ اور شاہ

صاحب اسے اسی معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔قوم کے لیے ملّت کے لفظ کا استعمال ایرانی اختراع ہے)۔

ملتوں کے ظہور کے احکام

چونکہ اکثر آدمیوں کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ ارتفاقات واقترابات اوران کے اصول درست طور پر حاصل کرسکیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ کے لطف وعنایت نے نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے (انبیا اور پیغمبروں کے ذریعہ) ملتوں کو ظاہر و متعین فرمایا۔اور ان کے دلوں میں ان ملتوں میں سے کسی ایک ملت کے سامنے سراطاعت خم کرنے کی فطری استعداد بخشی اور ایسے ارتفاقات اختیار کرنے کی صلاحیت عطا کی جو کسی خاص ملت کی مجملاً پابندی کو لازم قرار دیں۔

ملتوں کے ظہور کی کتنی قسمیں ہیں: جن میں سے مندرجہ ذیل (قابل ذکر) ہیں:

ایک: یہ کہ اس کی اقامت واشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عالم و معلم مبعوث ہوا ہو اور اس (نبی یا رسول) کو ارتفاقات واقترابات کے اصول ومبادی کا پورا پورا علم حاصل ہو اور اس طرح وہ ایک جامع اور ہموار ملّت اور طریقہ عبادت کی تشکیل کرے تشکیل ملّت کی یہ قسم سب میں اعلیٰ وارفع ہے۔

دوسری یہ کہ:

(الف) کسی قوم میں انصاف پسند بادشاہ پیدا ہو جائے جو رعیّت کی فلاح و بہبود کا خیال رکھ کر اپنی عقل خداداد کے ذریعہ عدل وانصاف پھیلائے اور اس کے اصول کو پھیلائے۔اسی قسم کا عادل ومنصف مزاج حکمراں اپنی افواج ورعایا سے جو سلوک کرے گا اور وہ (جرائم کی بیخ کنی اور حوصلہ شکنی کے لیے اور مجرموں کی تادیبی سزا دینے کے لیے) جن حدود وتعزیرات کا نفاذ کرے گا، اور وہ لوگوں کے درمیان مقدمات جس طرح فیصلہ کرے گا اور دشمن کے مقابلہ میں میدانِ جنگ کے لیے فوج (اور ساز وسامان حرب) کو تیار کرنے کے جو طریقے اختیار کرے گا، وہ نہایت ہی مستحسن؛ معقول اور قابل تقلید نمونے ہوں گے۔

جن کی پیروی بعد میں آنے والے ملوک وسلاطین کریں گے۔

(ب) اسی طرح ہر قوم میں ارباب علم ودانش اور غیر معمولی عقل رکھنے والے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو اجتماعی زندگی اور معاشرتی شعبوں مثلاً ازدواج ونکاح، ولیمہ وضیافت وغیرہ وغیرہ میں مخصوص عادات واطوار اور وضع وقطع اختیار کرتے ہیں (جن کی بنا ارتفاقات و اقترابات کے اصول ومبادی پر ہوتی ہے اور) جو ہر لحاظ سے معقول وپسندیدہ ہوتے ہیں، اور لوگ ان کو قابل تقلید سمجھ کر ان کی عادات ورسوم کو اختیار کرتے ہیں۔

(ج) اسی طرح ہر صنعت وحرفت اور دیگر پیشوں میں امام اور سربراہ پیدا ہوتے ہیں (جو عقل، علم اور فن میں دوسرے ابنائے حرفت سے ممتاز ہوتے ہیں اور جو اصول ارتفاقات واقترابات سے مقابلتاً زیادہ باخبر ہوتے ہیں وہ بھی مخصوص پسندیدہ طور طریقے اپنا لیتے ہیں اور) دوسرے ہم پیشہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

(د) اسی طرح بعض اوقات کوئی ایسا صاحب رشد وہدایت پیدا ہوتا ہے جو قربات کی نوعیت اور ان کے اقسام کو بخوبی جانتا ہے اور ان پر عمل کر کے درجۂ کمال حاصل کرتا ہے۔ اس کے آثار کمال اور قربت کے تقاضوں کو دیکھ کر لوگ اسے قابل تقلید نمونہ عمل بنا لیتے ہیں۔ اور ان کے بتلائے ہوئے یا کیے ہوئے طریقۂ عبادت کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس دوسری قسم کے سب اماموں کے علوم ورسوم سے مجموعی طور پر ایسی ملّت کا وجود تشکیل پاتا ہے جس سے انحراف واعراض کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ قسم ایسی ہے کہ جس سے دنیا کا کوئی ملک وقوم اور کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا ہے۔

انقیاد ملّت کا جذبہ فطری ہے

انقیادِ ملت کا جذبہ نوع انسانی کے سب افراد میں فطری طور پر اس طرح ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ ارتفاقات اور اقترابات کی اصولی باتوں کو فطرت کے تقاضوں کے تحت تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی مسلّمہ بات ہے کہ ان میں سے ہر شخص ان اصولوں کو ظہور میں لانے کے لیے خاص وضع اور معیّنہ صورت کی تشکیل پر قادر نہیں ہے۔ (بلکہ یہ تو ان میں سے

منتخب لوگوں کا کام ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نظر عنایت فرماتا ہے۔ ہاں یہ بالکل حقیقت ہے اصول ارتفاقات واقترابات کا علم ہر ایک کو فطرتاً دیا گیا ہے) ان کے قلوب اور سینوں میں ان علوم کا وجود بعینہٖ ایسا ہے جیسے کسی بادیہ نشین خالص عرب کے سینہ میں اعراب اور صرف کے علوم ودیعت ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے کلام و گفتگو میں کبھی اعراب و گرامر کی غلطی نہیں کرتا تو لازمی امر ہے کہ اس کے دل میں ایسا علم جاگزیں ہو جس کے ذریعہ فاعل کو مفعول سے جدا کر کے پہچان سکتا ہو کہ فاعل ہمیشہ مرفوع اور مفعول منصوب ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ روزمرہ کی گفتگو میں غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اسی طرح افراد انسانی کے دلوں میں ارتفاقات واقترابات کا اصولی اور اجمالی علم موجود ہے لیکن وہ اس کی تعبیر وتشریح سے قاصر ہیں۔ ہاں جب کسی ملت کے ظہور کی بنا پر اس کی بلیغ تشریح اور واضح تعبیر سن یا دیکھ لیتے ہیں تو ان کے دلوں میں اس کی وقعت بیٹھ جاتی ہے۔

کسی خاص ملت کی پابندی کے وجوہات

کسی خاص ملت کی پابندی پر مائل وراغب کرنے والی وجوہات وتدابیر یہ ہیں:

(جب ائمہ ملّت (انبیا ورسل، امرا وسلاطین، ارباب علم ودانش اور حکمائے اہل حرف) کی اچھی شہرت دنیا کے اطراف واکناف میں پھیلی ہوئی ہو، ان کے ہاتھوں خوارق (معجزات وکرامات) کا ظہور ہوا ہو وہ دقیق علوم اور باریک مسائل دین میں یدطولیٰ اور مہارت کلیہ رکھتے ہوں ان کے اعمال عجیب وغریب شان والے ہوں اور لوگ ان کی جلالتِ شان کے معتقد ہوں، تو ایسی صورت میں اس ملت کی پابندی خود بخود کی جاتی ہے۔

(۲) حوادث وواقعات کے استقرا سے خواہ یہ استقرا تام ہو یا ناقص مگر اس سے یہ ظن غالب یا یقین کامل حاصل ہو چکا ہو کہ اس ملت سے سرتابی کا نتیجہ دنیا وآخرت میں دردناک عذاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے، یا سرتابی کرنے والی قوم کے اندر لامتناہی لڑائی جھگڑے اور فتنے سر اٹھا لیتے ہیں (جو قوم کی اجتماعی زندگی کو آتش دوزخ کی مانند ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں)۔

ہر ملت کے لیے کسی بنیادی دستور و آئین کی ضرورت ہے

یہ بھی جاننا چاہیے کہ ہر ملت کی حیاتِ ملّیہ کی تعمیر و تحسین کے لیے بنیادی دستور اور آئین ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی قوم میں ملت کا بانی اور قائم کرنے والا شخص واحد ہے تو جو علوم اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے کمال استعداد کے مطابق حاصل کیے ہیں ان کا ایک خاص میزان اور معیار ہوگا اور وہی علوم (اپنے اسی میزان و معیار کے مطابق) ملت کے لیے دستور حیات ہوں گے۔ لیکن اگر ایک سے زیادہ امام اور پیشوا موجود ہیں اور ہر شعبہ زندگی کے لیے علیٰحدہ پیشوا و مقتدی کام کر رہا ہے تو ان میں سے ہر ایک پیشوا کے علمی یا عملی کمال کا ایک خاص درجہ ہوگا اور اس درجہ کو اس شعبہ سے متعلق لوگوں کے لیے دستور حیات بنا دیا جائے گا اور کوئی شخص کامل حکیم نہیں ہو سکتا جب تک وہ مختلف ملتوں کے ان علوم سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ جو ان کی دساتیر حیات کا لازمی حصہ ہیں اور بعد ازاں سب ملتوں میں بہترین دستور حیات کی حامل ملت کا انتخاب نہ کرے (کیونکہ علوم اور دساتیر اقوام کا جاننا کافی نہیں ہے بلکہ مقارنہ کے بعد بہترین کا انتخاب کر کے ارتفاقات و اقترابات صحیحہ کے مطابق زندگی بسر کرنا ضروری ہے)۔ جو باتیں ہم نے تم کو ابھی بتائیں اگر ان میں سے کسی ایک بات کو بھی نظر انداز کرو گے تو ممکن ہے کہ دین و دنیا میں بھٹکتے پھرو گے۔

دوسری فصل

ملت عالیہ کا بیان

اس بارے میں تحقیق اور قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سب ملتوں میں ایک ایسی ملت ضرور ہو جو تمدن عالی وتہذیب ارفع کی علمبردار ہو، جس کے ہر شعبۂ حیات کی بنیاد دوررس اور عمیق علوم پر رکھی گئی ہو۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اس سلسلہ میں اپنی تحقیق ازسرِ نوع کرلو اور خود فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ عالم بالا اور عالم اسفل کے سب موجودات میں سے کسی چیز کا تقرر یا وجود بالفعل متحقق نہیں ہوتا جب تک اوپر اور نیچے سے اسباب وعلل اس پر محیط ہوکر اسے گھیر نہ لیں۔ اس لیے اس چیز کی اصل حقیقت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ اس کے تمام علل کا علم حاصل نہ ہو۔

نیز یہ بھی جان لو کہ قلب انسانی پر جو بھی حال وارد ہوتا ہے اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہر اور دوسرا اس کا باطن۔ اس کا باطنی پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے علل کی وجہ سے وجود میں آتا ہے جس شخص نے اس کی حقیقت علل کے ذریعہ معلوم کی تو بلاشبہ اس نے اس کے باطنی پہلو کا ادراک کرلیا۔

اس کے ظاہری پہلو میں اس کے وہ خواص، رنگ اور کیفیات اور صورتیں آتی ہیں جو اس عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لیے جس نے اس چیز کی حقیقت اس کے خواص اور ظاہری علامتوں کے ذریعہ پہچان لی تو اس نے (اس کی باطنی صورت نہیں بلکہ) ظاہری شکل وصورت کا ادراک کرلیا۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے آپ کے سامنے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔
بصارت سے متعلق کوئی شخص گفتگو کرنا چاہتا ہے تو اس کے احوال کی توضیح دو طرح کی جاسکتی ہے:
ایک تو یہ کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو روح (ہوائی) کے اس حصے میں ہے جو

دو خولدار پٹوں کے اندر رواں دواں ہے جو آنکھ کے ڈھیلے میں پہنچ کر نہایت باریک ہو جاتی ہے اور وہ آنکھ کے سات پردوں کے اندر محصور رہتی ہے جب آنکھ کھولی جاتی ہے تو اس سے ایک قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں اور سامنے جا کر جسم مخروطی کے قاعدے کی ہم شکل قاعدے پر جا پڑتی ہیں۔ یا اس[1] میں وہ سب خارجی رنگ اشکال اور روشنیاں جو اس کے سامنے ہوتی ہیں، اس کے پردۂ سیمیں پر اترتی جاتی ہیں۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح صاف وشفاف آئینوں میں عکس اترتے جاتے ہیں۔ بعد ازاں حس مشترک جس میں طبعاً وجبلتاً یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ وہ اشکال اور مرئی اشیا کو ایک دوسرے سے ممیز کر سکتا ہے ان الوان واشکال کا ادراک کما حقہ کر لیتا ہے۔ یہ طرز تحقیق باطنی پہلو سے آنکھ اور بصارت کی حقیقت معلوم کرنے کا طرز ہے۔

دوسرا طرز توضیح یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آنکھ وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ، سرخ سبز اور سفید رنگ کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ اس آنکھ کے ذریعہ روشنیوں کی کمی بیشی معلوم ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کی شکل گول ہے یا مربع ہے یا مسدس ہے۔ اسی طرح آنکھ سے جو علم بھی حاصل ہوتا ہے اس کا احاطہ کیا جائے اور ادراک بصری کے جتنے خواص ہیں ان کو ایک ایک کر کے گنا جائے۔ یہ ابصار یا نظر کا ظاہری وجود کے لحاظ سے احاطہ ہے۔

تمہیں یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا (اس کے بغیر تمہیں چارہ نہیں) کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی انسان عالم ناسوت وماديات کی گندگیوں سے ملوث نہیں ہوا تو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی چیز بھی حجاب نہیں بن سکتی۔ مادی گندگیوں کی کئی قسمیں ہیں: بعض میں زیادہ کثافت ہوتی ہے اور بعض میں کچھ کم۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقرب الٰہی کے راستوں اور طریقوں کی تعداد اتنی ہی ہے کہ جتنی استعدادوں کی تعداد ہوتی ہے (اہلِ معرفت کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ”الطرق الی اللّٰہ

---

[1] شاہ صاحب نے ابصار (نظر) کی حقیقت کے متعلق قدیم فلاسفہ کے دو نظریے پیش کیے ہیں۔ ایک فعلی ہے اور دوسرا انفعالی ہے۔ عصر حاضر صرف دوسرے نظریے کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔

بعد الفاس الخلائق) اور ہر طریقِ تقرب خاص علمی اور عملی عبادت (اور حال) پر مشتمل ہوتا ہے۔

روزمرہ کے پسندیدہ وناپسندیدہ واقعات کے چاہنے یا اُن سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر اس امر کو ہاتھ میں لیا جائے جسے مادہ میں یہ استعداد پیدا کرنے کا دخل ہو کہ اس پر الرحمٰن کی طرف سے جود کا فیضان (کسی رُخ سے بھی) ہو سکے۔ اور ان تمام امور سے استناد اور مدد حاصل کی جائے۔ کسی ایک امر یا شعبہ کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور (اس طرح ان تمام اسباب اور علل کا علم حاصل کیا جائے جن کو اس مقصد کے حصول میں کچھ بھی دخل ہے) خواہ وہ عالم مثال ہے یا طبائع عنصریہ یا قوائے سماویہ یا قوائے الٰہیہ اسمائیہ۔

مختصر یہ کہ ملّت عالیہ جس پر کسی اور ملّت کو فوقیت حاصل نہیں ہوگی وہ ہوگی جس سے ایسے جامع علوم اور ہمہ گیر اور دقیق ملحوظات ظہور میں آتی ہیں۔ اور جو شخص کسی ایسی ملّت کا بانی و قیم ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اور ان قوانین پر جو اس کائنات میں نافذ ہیں۔ اجمالاً اور تفصیلاً ظاہراً اور باطناً بلحاظ تجربہ اور بلحاظ عقل احاطہ کیا ہو، وہ علوم کی تفصیلات پر خوب غور وخوض کرنے والا ہو۔ اور اس کے علوم کا منبع و سرچشمہ قبہ علوم انسانیہ ہو اور وہ اُن علوم پر بھی اور ان کے لواحق وتوابع مشابہہ علوم پر بھی پورے طور سے حاوی ہو۔

ایسی ملّت کے شایانِ شان یہ ہے کہ پہلے ارتفاقات کی اُصولی باتوں پر توجہ دلائے اور کسی خاص صورت اور وضع کی تعیین نہ کرے اس کے بعد دوبارہ اس پر نظر ڈالے اور ان صورتوں اور شکلوں کو مفصل اور بالاستیعاب بیان کرے جو ان اصول کے مظاہر اور مظان میں پھر وہ ان مختلف صورتوں کو افرادِ انسانی پر اُن کی استعدادات مزاج، ان کی عادات اور اُن کی قوتِ اخلاقی کے مطابق تقسیم کردے اور ہر ایک کے لیے اس کی استعدادِ مزاج اور ملکۂ اخلاق کے مطابق طریق عمل بھی متعین کردے۔ شرط یہ ہے کہ وہ ان کی صفات کو کامل طور سے جانتا ہو اور تمام افراد کی حالت کو ایک دوسرے سے ممیّز کر کے سمجھ سکتا ہو۔

الٰہیات کے بیان کرنے میں اس ملت کا طریقہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات عالیہ کاملہ کو ممکن سے ممکن صریح ترین عبارت میں بیان کرے۔ نہ صرف عرفی زبان میں ان باتوں کی توضیح کرے بلکہ دلائل عقلیہ اور براہین منطقیہ کو بھی اپنے بیان میں استعمال کرے۔ کوئی نکتہ یا دقیقہ خواہ وہ خفی ہو یا جلی اس کی نظر بالغ سے اوجھل نہ ہو۔ اور اس کے مالہ، وماعلیہ پر اس کو پورا احاطہ حاصل ہو۔ پھر لوگوں کو یہ بھی سمجھائے کہ ان معارف غامضہ اور حقائق خفیہ سے کن الفاظ میں تعبیر کی جاتی ہے اور مختلف پیرایہ ہائے بیان کو مختلف اشخاص پر تقسیم کرے، ہر ایک کو اس طریقہ کی تعلیم دے جو اس کے مناسب حال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کی معرفت اور اس کی تعبیر و اظہار کا طریقہ جدا گانہ ہوگا۔

قرب باللہ کے جتنے مراتب نسمہ اور روح سے متعلق ہیں ان کی بابت یہ ملت وہ پوری تفتیش کرے۔ اور لوگوں کی استعدادات کے مطابق ان کی ٹولیاں بنا دے۔ کیونکہ ہر ایک سے جس کمال تک پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر ایک ذی استعداد کو تقرب الی اللہ کا وہی طریقہ بتائے، جو اس کے مناسب حال ہو۔ اس کا منصب یہ ہوتا ہے کہ قربات میں سے ہر ایک قرب کے آداب اس کے خواص، اور اس کے حصول کے اسباب بوضاحت تمام بیان کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اشخاص انسانی کی کثرت عدد کے مطابق بیشمار اور قسم قسم کی عبادتیں شروع فرمائے، ان میں سے بعض کی نوعیت روحانی ہو اور بعض کی بدنی اور جسمانی۔

یہ ملت مختلف قسم کی برائیوں ان کے مراتب اور ان کے اسباب وعلل کی تفتیش وجستجو کرتی ہے اور وہ طریقے اور حیلے بتاتی ہے جن سے شرور اور برائیاں وجود میں آتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہے کہ ان برائیوں کو کس طرح مٹایا اور رفع کیا جا سکتا ہے اس بارے میں اس کی تعلیم ہر استعداد اور ہر ماحول و زمانہ کے مطابق ہو۔ اور یہ تعلیم ان امور کو ملحوظ رکھنے پر مبنی ہو۔ اسی طرح اس ملت میں عالم قبر اور عالم حشر کی بھی گہری اور تفصیلی تحقیق ہوتی ہے۔ جن فتنوں کے بارے میں یہ خوف ہوتا ہے کہ بنی آدم کو پیش آئیں گے اور جو امراض اور آفات ان کو پیش آ چکی ہیں اور جن اچھے مقاصد کی طلب بنی آدم کو ہوتی ہے۔ ان تمام کے بارے میں

ان کے فرائض اس ملّت میں متعین ہوں۔

اور اس ملت میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ان حوادث خیر و شر کو وجود میں لاتے ہیں یا ان کو وجود میں آنے کے بعد نابود کرتے ہیں۔ وہ اسباب بھی بتائے گئے ہوں جو مؤثر ہوتے ہیں اور وہ اسباب بھی بتائے گئے ہوں، جو متاثر ہوتے ہیں اور وہ اسباب بھی جو تاثیر اور اثر پذیری کے موجب بنتے ہیں۔

ملّت قصوی کے جو اوصاف ہم نے ابھی بیان کیے ہیں وہ صرف اپنے مجمل اور محدود علم کی بنا پر بیان کیے ہیں ورنہ ؏

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

الغرض ملّت عالیہ اور ملّت قصوی (جو ہر لحاظ سے مکمل ہو) وہ ہے جو نوع انسانی کے امام کی جامع شرح ہو اور اس کے تمام احکام ہر ایک فرد کی حالت و استعداد کے مطابق امام انسان کے جو احکام ہوں ان تمام احکام پر یہ ملّت مشتمل ہو۔ (بہر حال) ایسی ملّت عالیہ کا موجود ہونا اور عالم خارج میں ظاہر ہونا ناممکن ہے اور اس کی کئی وجہیں ہیں۔

ایسی ملّت کا بانی لازی طور پر ایسا شخص ہونا چاہیے جس کا ہر ایک کمال بہمہ وجود بالفعل متحقق ہو چکا ہو اور وہ ہر ایک کمال میں انتہائی درجہ تک پہنچ چکا ہو اور اب اُس کے اور اُس کے رب تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب یا پردہ نہ ہو، بنی آدم میں ایسے شخص کا وجود تقریباً مستحیل و ناممکن ہے۔

(۲) وہ لوگ جو ہر زمانے میں اس ملّت کے بانی سے روایت کرتے ہوں یا اس ملّت (کے بنیادی اور کلی احکام) سے دوسری جزئی اور خصوصی ملّتوں کا استخراج کرتے ہوں اور وہ لوگ جن کے سپرد خصوصی ملتوں میں فتویٰ دینے کا منصب ہو، ان سب کے لیے ضروری ہے کہ جملہ درجات ارتقا کے عالم اور تمام علوم پر ان کو کامل احاطہ حاصل ہو اور یہ بھی ناممکن ہے۔

(۳) یہ بھی ضروری ہے کہ تمام لوگ ذکی القلب ہوں جو اس راوی اور مفتی سے ان کے علم کو ٹھیک طریقے پر اخذ کر سکیں۔

پس خلاصہ یہ کہ اس قسم کی ملت عالیہ شخص کبیر اور نوع انسانی کے نظام اجمالی کے لیے بمنزلۂ صحت حقیقی ہے۔ اور جس طرح انسان صغیر میں صحت جسمانی حقیقی کا وجود محال ہے۔ اسی طرح انسان کبیر کے لیے بھی صحت حقیقی کا وجود ممتنع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں اور اس کی عنایت بیکراں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی ملت عالیہ جامعہ کو (صرف) عالم مثال میں محفوظ رکھا جائے جس کو شرع کی زبان میں امام مبین کہتے ہیں اور عالم جبروت الٰہی میں اس کے لیے ایک اسم کلّی مختص ہو (اور اس کی جزئیات اور تفاصیل دوسری تدابیر عالم کی طرح اسما جزئیہ کے واسطے سے صادر ہوں کما مرّ)۔ پھر ہر ایک عصر کے لیے اس کا ایک جامع حصہ مخصوص ہو۔ جس کو ملت خاصہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ ملت خاصہ یا تو لوگوں پر بطریق عموم مترشح ہوتی ہے بشرطیکہ ان میں کوئی اس قسم کا مانع نہ پایا جائے کہ وہ شیطان کے منقاد ہوں یا ان کی فطرت میں برائی ہو بصورت دیگر کسی ایک شخص کامل پر اس کا نزول ہوتا ہے جس کے علوشان اور ارتفاع منزلت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لوگ شوق سے اس کی طرف رجوع کرتے ہوں۔ اس کے علوم اس سے اخذ کرتے ہوں، اور اس طرح ان علوم کی روایت کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ اس حالت کا ذکر ہے جبکہ مصلحت کا تقاضا بدستور اسی طرح قائم ہو، ورنہ بعض اوقات یہ ملت خصوصی متعدد اشخاص پر ہر ایک کی استعداد کے مطابق مترشح ہوتی ہے۔ اور ان سب کے مجموعہ اس عصر کے لیے ملت قرار دیا جاتا ہے۔ ملت خاصہ یا کسی ایسی حالت کے ساتھ ظہور میں آتی ہے جو بہ لحاظ اصل معنی مذکورہ صورتوں کے مشابہ ہو۔

جو اصول ہم نے آپ کو سمجھائے ان کو سمجھ کر اپنے آپ کو سیدھا رکھو، اور ان پر استقامت کرو۔

تیسری فصل

واجب الاتباع ملّت اور ماہیات ثلاثہ کا بیان

کوۂ اسلامیہ (روزن) جو علوم وجدانیہ کا سر چشمہ ہے

اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی عنایت ہے کہ اس نے ہر انسان کی فطرت میں ایک روزن رکھا ہے، جس سے وہ جھانک کر ملّت حنیفیہ خصوصاً اس ملت خاصہ کا مشاہدہ کر سکتا ہے جو امام مبین میں محفوظ ہے۔ اور اس پاک الٰہی کے ضمن میں موجود ہے۔ یہ روزن یا روشندان انسان کی صورت انسانیہ اور اس صورت کے خواص و احکام ہیں۔ جو نسمہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی دوسرے خیالات سے خالی الذہن اور الگ ہو کر اپنی توجہ اپنے اسی روزن یا روشندان پر مرکوز کر دے، تو وہ اس میں سے ملت حنیفیہ کا عموماً اور اس ملّت خاصہ کو جو خود اس کے لیے مخصوص ہے خصوصاً ملاحظہ کر سکتا ہے۔ اس علم کی ایک قسم تو وجدانیات کے مشابہ ہے جیسے کہ بھوک و پیاس کا احساس اور طعام اور آب شیریں سے ان کو رفع کرنے کا علم وجدانی ہے اور ہر سلیم الطبع انسان اسے جانتا ہے۔

اس کی دوسری قسم وہ ہے جو عالم بالا سے انسان پر فائض ہوتی ہے، بعینہٖ اس طرح جس طرح رؤیا کے واقعات اور علوم موہوبہ کے ذریعہ انسان علم حاصل کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس روزن کے ذریعہ آدمی ملّت جامعہ (وہ ملّت حنیفیہ عالیہ جو سب ملتوں کی جامع ہے) کا اس حد تک مشاہدہ کر سکتا ہے جو اس کے نسمہ کے علوم کے مناسب حال ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس کی رضا مندی و خوشنودی اس میں ہے کہ ہر ایک آدمی اپنی توجہ کو اس کے لیے مخصوص اور دیگر اطراف سے فارغ کر دے۔

بہر حال اس حقیقت کو جس نے جان لیا، جان لیا، اور جو جاہل رہ گیا وہ جاہل ہی رہے گا۔

ابوالبشر آدمؑ اور دیگر انبیائے کرام کو اسی کوۂ انسانیہ اور کوۂ وجود کے ذریعہ علوم سے نوازا گیا ہے

اس قدر جان لینے کے بعد یاد رکھیے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو نیست سے ہست کر دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اس کی دست گیری اور اعانت کی، اور اس کو عالم تجرد اور اس روزن کی طرف رہنمائی کی جس کے نتیجہ میں اس روزن مذکور سے وجدانیات کی طرح اس پر ارتفاق اول کے علوم مترشح ہوئے اور کچھ علوم ارتفاق ثانی اور ثالث کے بھی اس کو دیدیے گئے۔ برخلاف اس کے عبادات کی علمی و عملی تدبیریں طریقے اور شیطان کے شرور وسوسوں سے اجتناب اور اس قسم کی دوسری باتیں اس کو بذریعہ وحی بتائی گئیں۔ گویا کہ وہ دیگر علوم وہبیہ کی طرح غیر اکتسابی ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں (وجدانی یا جبلی اور وہبی علوم) کا منبع و سرچشمہ کوہ انسانیہ (مذکورہ روزن یا روشندان) ہے۔ (جب حضرت آدم علیہ السلام کو اٹھالیا گیا تو ان کے یہ علوم بطور روایت اور طریقہ تفویض لسانی کے مطابق نوع انسانی تک بحفاظت منتقل ہوتے رہے۔ یہاں تک حضرت ادریس علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اس نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرح پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ کوۂ انسانیہ کی طرف رجوع کیا تو اُن کو وہ علوم بھی عطا ہوئے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔ اور ان کے علاوہ ارتفاق ثانی اور ارتفاق ثالث کے دیگر علوم اور ملائکہ کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے کا علم وغیرہ علوم بھی ان پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں عالم لاہوت میں فنا ہونے کے بعد ان کو ''امام مبین'' اور ''اسم جامع'' کی طرف عروج نصیب ہوا۔ اور جب وہ عالم بیخودی میں جس کو بندگان خدا میں سے صرف خاصان خاص یعنی ''افراد'' (جو اہل معرفت کے نزدیک ایک خاص طبقہ کا نام ہے) ہی جانتے ہیں (دوسروں کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی) فنا فی اللہ کے حال سے متصف ہوئے تو وہ حتی المقدور حسب استطاعت ملّت عالیہ کی علمی تشریح و توضیح میں مصروف ہوئے چنانچہ میں جملہ دیگر علوم کے انہوں نے

لوگوں کو علم نجوم، افلاک میں ان کی سیر و گردش اور اس عالم میں قوائے کواکب و نجوم کے ظاہری آثار سے روشناس کرایا۔ اور یہ کہ مصائب و نوائب کے موقعوں پر ان قوائے نجوم اور آثار کواکب سے کس طریقہ پر فائدہ اٹھایا جائے۔ نیز انھوں نے لوگوں کو علوم طبیعیہ سے آگاہ کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کو علم طب و تشریح اعضائے جسمانی کی تعلیم بھی دی۔ اور امراض بدنیہ وغیرہا، شدائد و نوائب کے موقعوں پر ان سے استفادہ کرنا بھی سکھایا۔ ان علوم ظاہری کی تعلیم دینے کے علاوہ انھوں نے منصب ہدایت و ارشاد کا بھی حق ادا کیا؛ چنانچہ انھیں بتایا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں کس طرح رنگا جا سکتا ہے اور وہ اپنے نفس سے فنا ہو کر بقا باللہ کا مقام کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اور مخلوق الٰہی میں تصرف کرنے کے لیے وہ کس طرح جارحہ حق تعالیٰ بن سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت ادریس نے ان کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے کلیہ و جزئیہ کا علم سکھایا اور ان اسما پاک کا باہمی فرق بیان کیا اور اس قسم کے دوسرے وہ علوم بھی سکھائے جو "امام مبین" میں ودیعت رکھے گئے تھے۔ انھوں نے علوم کی بارشوں کی طلب اور ان سے استفاضہ صرف کوہ انسانیہ کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ وہ کوہ وجود و تحقیق کے راستے سے بھی علوم اخذ کیا کرتے تھے (یعنی انہوں نے علوم وہبیہ کے ساتھ علوم اکتسابیہ کا ذخیرہ بھی حاصل کیا) جب وہ اس مؤخر الذکر کوہ سے جھانکتے تھے تو گویا اُن کو علم انسانی کی کوتاہیوں کا احساس ہوتا تھا، نہ یہ کہ وہ اس علم کو پیچھے سے صرف صرف ظاہری طور پر لیتے رہے۔

جاہلیت اولی اور ظہور آدم ثانی (نوع)

حضرت ادریس کو جن علوم سے نوازا گیا تھا۔ لوگ اس سے وہ علوم حاصل کرتے رہے۔ اور اس کے اٹھائے جانے کے بعد کچھ مدت روایت کے ذریعہ یہ علوم محفوظ رہے۔ (جس کو قرآن مجید نے "اثارۃ من علم" سے تعبیر کیا ہے) کچھ عرصہ کے بعد زمانہ کے حالات میں انقلاب آ گیا۔ اور وہ علم جہل سے بدل گیا اور لوگوں نے علوم کی غلط توجیہیں شروع کر دیں اور خدائے لاشریک کی عبادت متروک ہو گئی اور ارباباً من دون اللّٰہ کی عبادت کو سرمایۂ فوز و فلاح سمجھا جانے لگا۔ اور لوگ ہر طرح سے (عقیدتاً اور عملاً) شیطان

کے مطیع فرمان ہونے لگے۔ اور حالت اس حالت تک پہنچی جس کا نام شریعت محمدی کی زبان میں جاہلیت اولیٰ ہے۔

قریب تھا کہ یہ لوگ (اپنے اعمال کی پاداش میں) ہلاک ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ابر کرم ودریائے جود میں تموّج پیدا ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نوع انسانی پر خاص نظر عنایت ہے۔ اس مرتبہ اس کے جود و رحمت کا مظہر حضرت نوح علیہ السلام کا قلب مبارک قرار پایا، جو اس وقت کے تمام لوگوں میں ظاہر و باطن اور خلق و خُلق کے لحاظ سے کامل ترین تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اُن کا علوّ شان، بلندی مرتبت اور شہرت منظور تھی چنانچہ اُن کو ظہور فتن اور طرق انداز و تربیت کا علم دیا گیا اور یہ کہ ان فتنوں اور مہالک سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے، انھوں نے دعوت الی الحق کا حق پورا پورا ادا کیا۔ (اور اس راہ میں ان کو سخت ترین تکلیفیں دی گئیں۔ اور قوم نے راہ راست پر گامزن ہونے سے انحراف کر کے کفر و شرک پر اصرار کیا) تو اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔ اور (حضرت نوح کی دعا کو قبول کرتے ہوئے) کافروں کو نیست و نابود کیا اور کچھ افراد اور ان کی نسل و اولاد کو زمین کے شرق و غرب اور اطراف و اکناف میں پھیلا کر باقی رکھ دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے حضرت ادریس کے علوم سے نفیاً و اثباتاً کچھ بھی تعرض نہیں کیا۔ اس کا طریقہ اس بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہہ تھا۔ کہ اس کے علوم کا مآخذ فقط کوہ انسانیہ تھا۔ (کوہِ وجود و تحقیق سے اس نے کچھ بھی اخذ نہیں کیا)۔

ملّتِ ہود و ملّتِ صالح کا ظہور

حضرت نوح علیہ السلام کی روایات بھی حضرت ادریسؑ کی روایات کی طرح اس کی وفات کے بعد محفوظ اور باقی رہیں۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لوگوں نے عقائد و اعمال کے لحاظ سے الگ الگ ٹولیاں بنالیں۔ تمدن وارتفاقات میں پست ترین زیادہ عاصی، گنہ گار اور سرکش قوم عاد کی تھی اور اس کے بعد قوم ثمود تھی، جن کے انذار کے لیے بالترتیب حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھیجا گیا۔ ان دونوں پیغمبروں نے حضرت نوح کے نقش قدم پر چل کر حضرت ادریسؑ کے علوم سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا۔

کیونکہ ان کا منصب فقط ڈرانے والے کا تھا۔

دیگر اقوام عالم کا حال

باقی اقوام عالم کی حالت مختلف تھی، ان میں سے بعض تو چوپایوں کی زندگی بسر کرتے تھے، اور انھوں نے تمدنی اور تہذیبی زندگی کے بدائی اور دوسرے درجہ کے کچھ حصہ پر اکتفا کیا ہوا تھا۔ اکثر عجمیوں کی یہی حالت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں حکما اور ارباب رشد و دانش پیدا کیے جنھوں نے ان کو انسانی علوم سکھائے۔

بعض دوسری وہ قومیں تھیں جو اپنی قدیم روایات پر قائم تھیں اور بعض ایسی قومیں بھی تھیں جو شر و فساد میں مبتلا تھیں۔ مگر ان کا شر و فساد اضطراب کن اور متعدی قسم کا نہ تھا۔

ملحدانہ و مشرکانہ ملتوں کا ظہور

بعد ازاں زمین میں ایک بار پھر فساد برپا ہوا اور کئی ایک ملتیں پھیل گئیں۔

ملت ستارہ پرستانہ: منجملہ ان کے ایک ملت ستارہ پرستوں کی تھی، انھوں نے ارتفاق ثانی اور ارتفاق ثالث کے لیے ستاروں کے قوی اور خواص کو ملحوظ رکھ کر اپنی ملت کی بنیاد ڈالی اور اپنے تیوہاروں اور اپنے وضع لباس وغیرہ میں اور اپنے بچوں کے نام رکھنے اور تمام عادات و رسوم میں اس کا لحاظ رکھا، انھوں نے اپنی تمام تر توجہ ستاروں اور ان کے قوی اور خواص پر مبذول رکھی، مستقبل کے واقعات کو انہی کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش کی اور جس حادثہ کے وقوع کا خوف ان کے دامن گیر ہوتا تھا، اس کے رفع کرنے کے لیے ستاروں کے خواص سے مدد لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کے ہاں مختلف طریقے تھے مثلاً یہ کہ اُن کی تمام تر توجہ ستاروں کے خواص ان کی روحانیت اور روحانیت کے ذریعہ کائنات میں تصرف کرنے پر مرکوز رہتی تھی۔ ان کے مقام فنا و بقا کا مرکز ستارے تھے۔ اور ان کو وہ تمام کائنات میں اشرف اور افضل سمجھتے تھے۔ اسی طرح ان کے اعضا و جوارح کے اعمال تعبدی کا مقصد بھی ستاروں کی تعظیم تھی چنانچہ آفتاب و مہتاب اور مشتری کے نام پر ان کے معابد بنانے سے اس مقصد و تعظیم کا اظہار ہوتا ہے۔

ملّت مجوس: منجملہ ان ملتوں کے ایک ملت مجوس کی ہے۔ (جس کا بانی زرتشت کو سمجھا جاتا ہے) اس ملت کے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے ارتفاق ثانی وثالث کے اصول خواص ارواح مجردہ یعنی خواص عقول پر مبنی ہیں۔ ان عقول میں سے بعض ان کے نزدیک عقول کلیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور ان کی مخلوق کے درمیان واسطے ہیں۔ اور بعض عقول جزئیہ ہیں جن میں سے ہر ایک انواع عالم کی ایک ایک نوع کا مدبر ہے۔ (رب النوع اس کو کہتے ہیں) ملت مجوس نے اس "عقل" کے لیے جو نوع انسان کا مدبر ہے کچھ آداب (طریقے اور عبادات) ایجاد اور مقرر کیے ہیں۔ اور وہ اسی مدبر نوع انسانی سے علوم نازل ہونے کی توقع کرتے ہیں۔ ان مختلف عقول کا قرب حاصل کرنے کی وہ کتنی وجوہات بتاتے ہیں۔

مثلاً پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کے مشاہدہ میں اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں چنانچہ ان کے اعمال جوارح انہی عقول کے مظاہر کی مناسبت سے معین کیے جاتے ہیں ان کے ہاں شیطان کے شر سے بچنے کا ایک خاص طریقہ ہے شیطان ان کی اصطلاح میں اہرمن کہلاتا ہے (جو شرور عالم کا مظہر ومنبع ہے) ملت مادہ پرستان منجملہ ان ملتوں کے ایک ملت مادّہ پرستوں کی ہے (جن کو شاہ صاحب طبیعین[1] کہتے ہیں) اس ملت کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے ارتفاقات کی بنا خواصِ طبعیہ اور نوامیس فطرت پر ہے۔ اور ان کے نزدیک ہر ایک شخص کا کمال اس میں ہے کہ جو اس کی طبیعت کا تقاضا ہے، اس کو کما حقہ، پورا کرے۔ قرباتِ الٰہی سے ان کو کچھ بھی سروکار نہیں۔

غرض یہ کہ روئے زمین پر بسنے والے سب لوگ ان مذکورہ ملتوں میں سے کسی نہ کسی ملت کے دائرہ میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے بعض کو اماموں اور پیشواؤں کا مقام حاصل ہوا جنھوں نے ملت کے اصول ومبادی کا استنباط واستخراج کیا۔ اور بعض ان اماموں کی تقلید و پیروی کرنے لگے۔ یہ زمانہ (جس میں کفر والحاد اور شرک وبت پرستی کا چرچا رہا اور پیغمبروں کی عملی سیرتوں اور مقدس کتابوں کے الہامی علوم ضائع ہو چکے تھے) جاہلیت ثانیہ کہلاتا ہے۔ اس عصر کا سب سے افضل شخص وہ ہے جس نے توحید کی تقلید اور اشاعت سے کفر و

[1] Naturist

شرک وسرکشی کی شوکت وسرکشی کو توڑا۔سب کو توحید کا بھلایا ہوا سبق یاد دلایا، اور ان کو خدائے بزرگ وبرتر وحدہٗ لاشریک کی طرف پھیر دینے کی کوشش کی۔

پہلی جاہلیت اور دوسری جاہلیت میں فرق:

جاہلیت اولی اور جاہلیت ثانیہ میں فرق یہ ہے کہ جاہلیت اولی میں لوگوں نے ارتفاقات اور تہذیبی زندگی کے صالح اصولوں اور عملی تدبیروں کو ترک کرنے میں خوب تجاوز کیا تھا اور معاصی اور گناہوں کے ارتکاب میں توغل کیا تھا وہ چوپایوں جیسے (بے لگام، بے قید وقانون) زندگی بسر کرتے تھے۔اور اللہ تعالیٰ (کے بتلائے ہوئے قانون اور طریقہ زندگی) سے اعراض وانکار اور کفر وشرک کرتے تھے۔اور ان امور (نازیبا وناشائستہ) میں شیطان کے تابع تھے۔

جاہلیت ثانیہ کی یہ کیفیت تھی کہ ملت کے بارے میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے استحسان ملت کو نظر انداز کر دیا تھا۔کوہ انسانیہ کے راستہ سے بصیرت حاصل کرنا ترک کر دیا تھا۔غیر اللہ کو الوہیت کا درجہ دے کر ان کے قرب کو نجات اور فوز و فلاح کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا اور انہیں کے فرماں بردار ومطیع بن گئے تھے۔

ملت ابراہیمی کا ظہور

الغرض جب جاہلیت دنیا میں روئے زمین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی، تو اس عہد کے علما نے بھی اس کے اثرات قبول کیے اور دنیا والوں نے انھیں اپنا مقتدا وپیشوا سمجھ کر ان کی اندھی پیروی اور تقلید کی، تو ملت حقہ کے ظہور کے لیے جو دِ الٰہی نے روح ابراہیم (علیہ السلام) جو تخلیق ووجود سے پہلے عالم مثال میں موجود تھی، پر نزول کیا۔ اور ملت حنیفی کے قیام واشاعت کا منصب جلیل اس کے سپرد کیا گیا۔کیونکہ وہ اپنے وقت کے تمام بنی آدم میں ظاہر وباطن کے لحاظ سے کامل ترین انسان تھے۔جب حضرت ابراہیم عمر کے درجۂ کمال کو پہنچے تو ملت مذکورہ کی تلقین واشاعت پر مامور کیے گئے۔آپ نے شرک کا قلع قمع کیا مجوسیوں، ستارہ پرستوں اور مادیین کے گھڑے ہوئے مذاہب اور ملتوں کی

بنیادیں جڑ سے اکھیڑ ڈالیں۔ انھوں نے یکسوئی کے ساتھ توجہ کے ذریعہ کو انسانیہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے ارتفاق ثانی وثالث کی بنا عادات پر نہیں رکھی بلکہ اس کی بنیادیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعظیم وعبادت پر قائم کی۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقے نسمۂ انسانیت کی معرفت کے مطابق مرتب کیے۔ اور الٰہیات کو نسمہ کی تعبیر کے مطابق بیان کیا۔ بالفاظ دیگر عقائد وعبادات کو نسمہ کی مقدار تعبیر تک محدود رکھا لہٰذا کوئی ملت اس کی ملت سے بڑھ کر واجب الاتباع نہیں اور نہ ہی کوئی ملت اس سے آسان تر تم کو ملے گی نجات اور فوز وفلاح کا یہی قریب ترین راستہ ہے۔

ملت موسوی کا ظہور

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب کہ فرعون نے تمرد وسرکشی اختیار کی اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا اور قریب تھا کہ ملت حنیفیہ مضمحل ہو کر مٹ جائے۔ یا سوسمار کی مانند کسی سوراخ میں نظروں سے اوجھل ہو کر چھپ جائے (اس صورت حال کو دیکھ کر رحمت خداوندی ایک بار پھر جوش میں آگئی اور) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا اور ملت حنیفیہ کو (دلائل عقلیہ ونقلیہ اور معجزات اور اعجازی قیادت کے ذریعہ) غالب بنا کر اس کی تشکیل نو فرمائی۔ اس کی حدود متعین فرمائیں، اس کے منتشر اجزا کی شیرازہ بندی کی اور اس کے قوانین کی نئے سرے سے تدوین وتقنین فرمائی اور ارتفاق ثالث کے درجۂ زندگی کے مطابق دین الٰہی اور طریقہ حنیفیہ کو ظاہر ورائج کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ابتدائے دعوت کے لیے بنی اسرائیل کو مختص کر دیا اور (ان کو نبوت کے علوم وقوانین سے نوازا اور آپ علیہ السلام کے بعد حاملانِ دین اور پیشوایان مذہب ملت حنیفیہ کی اس توضیح وتشریح کو جو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تعلیم فرمائی تھی اور ملّت حنیفیہ کی یہ صورت توضیح یہودیت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد ادوار سے روایت کے ذریعہ نقل کرتے رہے اور بنی اسرائیل میں اس قسم کے سربراہ جو گویا حضرت موسیٰ کے بعد اس کے خلفا اور اوصیا کافی مدت تک پیدا ہوتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ علم

اور علما اٹھتے گئے اور بالآخر علم کی جگہ جہالت کا دور دورہ ہوا اور تمام ادیان و مذاہب میں کجی پیدا ہوگئی۔ اور یہ جہالت ثالثہ تھی۔ اس کی حقیقت اور ملخص یہ ہے کہ کوئی قوم اپنی ملت نازلہ پر قائم نہ رہے اور حق اور باطل میں اس قدر آمیزش ہو کہ حق کا باطل سے تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔

مشرکین عرب اگرچہ دین حنیف کے مدعی تھے لیکن (توحید کو انھوں نے قطعاً چھوڑ دیا تھا جو دین مذکور کا طغرائے امتیاز تھا) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ (حقیر مخلوقات کو) شریک ٹھہراتے تھے۔

یہودی نے دین موسوی کی پابندی چھوڑ دی تھی اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور تعلیمات میں بڑی تحریفات کر دی تھیں۔ تحریف سے میری مراد صرف تحریف الفاظ نہیں بلکہ تحریف کی خوفناک ترین صورت یہ ہے کہ الفاظ تو برقرار رہوں لیکن کلام کا غلط مفہوم لیا جائے (اور اس کو کھینچ تان کر انہی معانی پر محمول کیا جائے جو ہوائے نفس کا تقاضا ہے)۔

نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کر کے نجات و سعادت کو ترکِ علائق اور اختیار گوشۂ مراقبت میں مضمر سمجھا تھا اور مسیح علیہ السلام کو معبود بنا لیا تھا۔ اور حلال و حرام نیز تشریع سازی کا مکمل اختیار اپنے رہبان، زاہدوں اور درویشوں اور علما کو دے کر ان کو اربابا من دون اللّٰہ کا درجہ دیا تھا۔

عجم (ایرانیوں، یونانیوں، ترکوں اور ہندوستانیوں وغیرہ) کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی اور انھوں نے ملت حقہ کی جگہ مجوسیوں، ستارہ پرستوں، مادہ پرستوں اور مشرکوں کے آرا و افکار، افعال و اعمال اور طریقوں کی معجون مرکب بنالی تھی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک جلی کے مرتکب ہو کر باہمی ظلم وستم کا شیوہ اختیار کر چکے تھے ان کی باہمی عداوت اور دشمنی کی آگ نے (انسانیت، اخوت اور ملت کے) سب رشتوں کو خاکستر بنا دیا تھا۔

ملت محمدی کا ظہور:

ایسی صورت حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت نے جوش مارا اور تمام عالم کی اصلاح کے

لیے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اور ملت کا ظہور ارتفاق رابع (بین الاقوامی سطح) کے مطابق ہوا اور وہ بات پوری ہوئی جس کا پورا کرنا اللہ کو منظور تھا۔ (یعنی هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ) ۔حضرت محمد مصطفیٰ نے نہایت سادہ واضح اور عام فہم طریقہ پر اور بلیغ اسلوب بیان کے ساتھ دین حق کی تشریح فرمائی اور جاہلیت کی باتوں کا ابطال کیا۔ رسالت مآب کی دعوت رسالت، سب اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

چوتھی فصل

ملت حنیفیہ کی حقیقت (اور اس کی تعلیمات کا ملخص)

ملت حنیفیہ کے ارکان اور اس کے اصول

اگر تم کو ملت حنفی کی حقیقت اور ماہیت معلوم کرنے کی تلاش و جستجو ہے تو (سن لیجیے)

رکن اول:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ ارتفاق ثانی اور ثالث کی بنیاد تین اشیا پر رکھی جائے:

ایک وہ امور جو بنی آدم کے طبعی تقاضے ہیں یعنی ان کے علوم ان کی ضروریات، ان کے حوصلے، ان کا وقار اور فارغ البالی اور خوشحال زندگی بسر کرنے کے متعلق ان کی خواہش وغیرہ۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کے احکام کا احترام، اس کے دین حق کے شعائر کی تعظیم اس کے رسولوں کے ساتھ ان کے اختیار کردہ آداب و اعمال میں موافقت کرنا اور اس کی نشر و اشاعت اور اقامت میں سعی بلیغ۔

تیسرے تجارب حیات ہیں اور جن امور کو تجربہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں ان سے احتراز کرنا اور جن امور کی پابندی تجربہ کے لحاظ سے ضروری ہے ان کا التزام کرنا۔

ان مذکورہ تینوں امور پر ملت حنیفیہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اسے ترتیب دیا جاتا ہے ان اصولوں کو مدنظر رکھنے کے سوا ستاروں کی خصوصیات اور اثرات اور علم نجوم میں تفکر و غور کرنا یا عقول مجردہ سے بحث کرنا اور اسرار طبیعت کا کھوج لگانا سب نا قابل التفات باتیں

ہیں ۔ہاں تجربوں سے جو علوم ثابت ہوں (اور صرف نظری اور ذہنی غور و خوض اور فلسفیانہ اندازے نہ ہوں) وہ ملت حنیفیہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

رکن ثانی:

ملت حنیفیہ کی حقیقت کا دوسرا رکن یہ ہے کہ ایمان کی بنیاد اس معرفت پر اُستوار کی جائے جو نسمہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔اس ایمان میں اللہ کی پہچان اور (جملہ صور شرک اور آلائش تشبہ و تجسیم اور عیوب و نقائص سے) اس کو منزہ و پاک جاننا اور نسمہ انسانی سے ہم آغوش و مطابق (قلبی اذعان کا) اپنی زبان سے اقرار کرنا شامل ہے۔

ملت حنیفیہ کے اصول میں (ایمان صحیح اور توحید کامل کے ساتھ ساتھ) یہ بھی شامل ہے کہ (تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کے ذریعہ) اُن علوم و اعمال کے خلاف محاذ قائم کرے جو لایعنی اور فضول اور تہذیبی زندگی کے لیے بے فائدہ ہے۔اور ان علوم کے خلاف نبرد آزما ہو جو عوام الناس کے ذہنوں میں تشویش اور اشتباہ پیدا کرنے کا ذریعہ اور گمراہ کن ہوں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ اسماء الٰہیہ میں تعدد اور اس تعدد کی وجہ سے نتائج و احکام میں جو اختلافات رونما ہوتے ہیں ان کو یکسر ختم کر دے اور سب صفات عالیہ کو صرف ایک ذات باری تعالیٰ عزّ وجل اور اسی کے ارادہ اور حکمت کی طرف موڑ لیا جائے (اور کثرت سے وحدت کی طرف لی جائے)۔یاد رکھیے وہ اختلاف جو اسمائے الٰہی تعالیٰ شانہ میں واقع ہوسکتا ہے یہ ہے کہ ان میں بہ یک وقت تصادق بھی ہو اور تفارق بھی۔اس سے مراد ہماری یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ جن صفات عالیہ کے مظہر ہیں، ان میں باہم ایک ایسی نسبت عالیہ بھی ہے جو عالم ناسوت کی نسبتوں سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور اس نسبت کی تعبیر تصادق و تفارق سے کی جا سکتی ہے۔لیکن نسمہ جب اس اختلاف کا اثبات کرے گا تو ایسے پیرایۂ بیان میں کرے گا جس سے وہ اختلاف ثابت ہوگا۔جس کا اثبات جناب قدس کے لیے جائز نہیں۔اور اس ذات سے اس کی نفی لازم ہے۔اس لیے نسمہ کا ایمان اسی صورت میں صحیح و درست ہوسکتا ہے اور اس شرط سے حق پر قائم رہ سکتا ہے کہ اس اختلاف سے خاموشی اختیار کرے اور سب

باتوں کواللہ تعالیٰ کے ارادہ اوراس کی حکمت کی طرف راجع کرے۔اس اجمال میں تمام اسما حسنیٰ اوران کے معدات واسباب وقابلات وصلاحیتوں کے اختلاف سے متعلق علوم مندرج ہوجاتے ہیں۔

رکن ثالث:

ملت حنیفیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایمان اور احسان کے مقامات اور عبادات کی تفصیل کوایسی باتوں پرمبنی کرے جونسمہ کے مناسب حال ہیں جبکہ نسمہ اپنی صفات پر باقی ہو،ایسی باتوں پر یہ مقامات اورعبادات مبنی نہ ہوں جواس وقت نسمہ کے مناسب حال ہوسکتی ہیں جبکہ وہ اپنی صفات کوفنا کردے اسی اصل پر ملت مذکورہ نے نماز،روزہ،حج،زکوٰۃ اوراذکارودعوات وغیرہ کےقوانین اورارکان مرتب کیے ہیں۔

رکن چہارم:

ملت حنیفیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے حجب ثلاثہ کے نتائج سیئہ سے نجات پانے کا طریقہ اور علاج یہ تجویز کیا ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں افراط سے پرہیز کرے۔یہ نہ ہوکہ جسمانی خواہشات کی بیخ کنی اوراستیصال کیا جائے مثلاً یہ کہ ہرقسم کا کھانا پینا اور صنفی تعلقات کلیۃ ترک کرائے جائیں۔اپنے آپ کوخصی کردینے یا اعضائے تناسل کو کاٹ کر رکھ دینے یا اس قسم کے دوسرے (رہبانی اعمال و افعال جوترک دنیا اوراستیصال خواہشات نفسانی کا مظہر ہوں)کورواج دیا جائے،ملت حنیفیہ (کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ) سرے سے رسوم کوترک کردینے کا حکم نہیں دیتی بلکہ یہ کہ رسوم باطلہ کوایسی رسوم صالحہ سے بدل دینے کی تجویز کرتی ہے جودنیااورآخرت میں نفع بخش وسودمند ہوں۔اس کی ہدایت یہی ہے کہ شرک کے جملہ اقسام سے سختی کے ساتھ پرہیز کی جائے، براہین اوردلائل عقلیہ میں خوض نہ کیا جائے اورصرف اس نورِ ہدایت اورروشنی وحی پراکتفا کیا جائے جواللہ تعالیٰ نے لوگوں کوہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے (يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْراً مُّبِيْناً) جس کواصطلاح میں ''شرع''

کہتے ہیں۔ معرفت الٰہی، فتن وشرور کی پہچان اوران سے بچاؤ کی تدبیروں کا علم اورمعاد میں اعمال پر سزا وجزا مرتب ہوتی ہے۔ان کی حقیقت سے آگاہی کے لیے نبی اور رسول کی تعلیمات کافی ہوتی ہیں۔ملتِ حنیفیہ کے یہی اصول وارکان ہیں۔

ملت حنیفیہ کی متوارث اشباح وصُور

ملت حنیفیہ کی وہ باتیں جو عہد نبوت تک اہل عرب میں متوارث چلی آتی تھیں حسب ذیل تھیں: جنابت سے غسل وطہارت حاصل کرنا، اور (نماز کے لیے) وضو کرنا، اور ختنہ کرانا اور وہ تمام باتیں جن کو خصال فطرت کہتے ہیں، نماز کو ارکان اربعہ قیام، رکوع، سجود اور دعا کے ساتھ ادا کرنا، مدعیان دین حنیف کے نزدیک متفقہ اور بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا جاتا تھا۔اسی طرح قریش، یہود اور نصاریٰ سب کے نزدیک روزہ رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ دین حنیف کے پیروکار پورے ایک دن کا روزہ خوشنودی الٰہی کے لیے رکھتے تھے۔ اسی طرح گناہوں کی آتش فروزاں کو ٹھنڈا کرنے اور آفات وبلیات کو دفع کرنے کے لیے صدقات دینا بھی متوارث تھا۔اسی طرح حج بیت اللہ بھی ملت حنیفیہ میں متوارث چلا آرہا تھا اذکار مثلاً استغفار اور دوسری دعائیں، قسمیں کھانا، منتیں ماننا اور ان کا احترام کرنا، مُردوں کی تجہیز وتکفین اور قبر میں اسے دفن کرنا، نماز جنازہ یا دعا برائے میت کرنا، جانوروں کو ذبح کرنا اور ان جانوروں اور چوپایوں کا گوشت کھانا جن سے طبع سلیم کراہیت محسوس نہ کرے، مہر اور خطبہ کو لوازم نکاح ماننا، اور ان عورتوں کے ساتھ جن سے نسبی رشتہ یا رضا (دودھ پلانے) کے رشتے کی وجہ سے نکاح مناسب نہیں نکاح کو حرام سمجھنا، یہ تمام باتیں جو مذکور ہوئیں، ملت حنیفیہ کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔اور جو لوگ ملت مذکورہ کے اتباع کے دعویدار تھے وہ ان امور کے پابند تھے۔شرع موسوی اور شرع محمدی نے ان تمام امور کو دین کا جز قرار دیا ہے اور ملت حنیفیہ کے جملہ امور متوارثہ کو بطور دین کے مان لیا ہے۔

یاد رکھو کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا انحصار اسی میں ہے کہ ملت حنیفیہ ہی کی پابندی کی جائے (جس کا دوسرا نام اسلام ہے ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ

اِبۡرَاهِیۡمَ حَنِیۡفًا) کیونکہ اس کی بنا صورت انسانیہ کی موافقت پر ہے۔ اور یہ کہ علوم اور معارف کا مآخذ اسی کو قرار دیا جائے۔ شرِ ثانی اور شرِ ثالث سے احترام کیا جائے۔ لیکن شرِ اوّل سے اجتناب کرنا شرط نہیں۔ کیونکہ جب شیطان معرض وجود میں آچکا اور اس کی ہستی متحقق ہو چکی تو پھر اس سے احتراز کرنا مفید نہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کے اوامر کا احترام کرنے میں سعی بلیغ کی جائے۔ دوسری ملتوں میں شرک کی آمیزش ہو ہی جاتی ہے کیونکہ عوام کی سمجھ اس شرف وعظمت میں جو مقدس اور فوق البشر ہے، اور اس شرف اور عظمت میں جو عالم ناسوت سے تعلق رکھتا ہے فرق کرنے سے قاصر ہے۔ اور دونوں کو ایک سمجھتے ہیں۔ اور مؤخر الذکر کے انقیاد اور اطاعت کو اول الذکر کی اطاعت اور انقیاد سے کم نہیں سمجھتے اور یہی شرک کی بنیاد ہے۔ (اتَّخَذُوۡا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ...... الخ) اسی لیے دینِ حق نے معرفت کی بنیاد معقولات ثانیہ اور براہین کی تفتیش پر نہیں رکھی، اس کی بنا ادراک بسیط اور معقولات اوّلیہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس بات کا علانیہ اظہار کرو کہ نوع انسانی کے حق میں اللہ تعالیٰ کو اسی دین حنیف کی اشاعت اور غلبہ مقصود ہے اور بس۔ جس کا ظہور کبھی تو ارتفاق ثالث کے طرز اور کبھی ارتفاق رابع کے طور پر ہوتا ہے۔

---

[1] یعنی یہ تو ناممکن ہے کہ شر کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ شر کا مقابلہ ایسا کیا جائے کہ نہ تو جاہلیت ثانیہ باقی رہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی لطافت کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کریں اور نہ جاہلیت ثالثہ کا وجود رہے کہ مختلف ملل کی آپس میں خلط ملط ہو جائے۔ اور ملت حنیفیہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہے۔

پانچویں فصل

علم تشریع اور اس کے قوانین

انبیائے کرام علیہم السلام کے مختلف اطوار واقسام مثلاً نبی حکیم، نبی خلیفہ وغیرہما سے جو علوم وفنون متوارث چلے آرہے تھے، ہم نے اس کتاب کے گزشتہ ابواب میں بنیادی مسائل اور جزئیات کے مراجع واصول سے تم کو آگاہ کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا، ہاں صرف علم تشریع اور اس کے قوانین کے متعلق کچھ کہنا باقی ہے اور اگر تمہیں اس کے سننے کا شوق ہے تو توجہ کے ساتھ سنیے اور جاننا چاہیے کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جو خارجی پردے اس کی انسانی فطرت پر جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے چھائے ہوئے ہیں اور اس کے علوم واحکام کے ظہور سے مانع ہیں ان سب کو اٹھانے کا عزم کرتا ہے تو تین موٹے موٹے پردے (حجب ثلاثہ، حجاب طبیعت، حجاب رسم اور حجاب سومعرفہ) اس کے سامنے آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سرشت میں کھانے پینے، لباس وپوشاک، مکان و مسکن کی ضرورت اور عورتوں سے صنفی تعلق کی خواہش رکھی گئی ہے اور شہوانی اور غضبی قوتوں جیسے دو معاونوں کے جو قدرت نے اس کے قلب کو عطا کیے ہیں۔ غیر فطری تقاضا کے نفاذ یا عدم نفاذ کے لحاظ سے مختلف احوال قلب پر طاری ہوتے ہیں، چنانچہ وہ اکثر اوقات تقاضائے طبع کے پورا کرنے اور قوت شہوانی اور قوت غضبی کے آمرانہ احکام کی تنفیذ میں اس قدر منہمک ومستغرق ہوتا ہے گویا وہ کسی قوی الاثر مخدر ومسکر کے نشہ سے مخمور ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ہے۔ اس کو ہم حجاب طبع کہتے ہیں۔ یہ ہمہ گیر حجاب ہے جس میں نوع انسانی

حیوانات کے ساتھ مشترک ہے۔ انسان کبھی ایسا سوجاتا ہے کہ اس کو کسی چیز کی شدھ بدھ نہیں رہتی۔ بھوکا ہوتا ہے تو سوائے کھانے کی چیزوں کے وہ کسی اور چیز کی اہمیت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ پیاسے کو اسی پر قیاس کر لیجئے اسی طرح اس پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی تمام تر توجہ صنف نازک کے ساتھ ہم نشینی اور ان کے قرب پر مرکوز ہوتی ہے۔ غم کی کیفیت اس پر مسلّط ہو جائے تو وہ اس میں مستغرق رہتا ہے اور اگر خوشی کی لہر موجزن ہو جائے تو اس کی تمام تر توجہ طرب و مسرت کی طرف ہوتی ہے۔ الغرض اسی طرح دن رات گزرتے ہیں۔ اور وہ تقاضائے طبع کے کسی نہ کسی شعبہ میں اپنے اوقات عزیز کو گنواتا رہتا ہے۔ کوئی کام کی بات اس سے نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہر وقت ایک خاص طبعی تقاضا آراستہ ہو کر اس کے سامنے آتا ہے اور دوسرے مطالبے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

لیکن اگر وہ عقل کے کمال کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کا دل بیدار اور فطرت جاگ جاتی ہے تو وہ اپنے اوقات میں سے فرصت کا موقع نکال کر طبعی خواہشوں اور جسمانی تقاضوں کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی متوجہ ہوتا، اور شوق سے اپنی قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کی تکمیل کی فکر کرتا ہے پھر وہ عز و جاہ اور فخر و مباہات کا طالب ہوتا ہے، وہ اپنی قوم کے ارباب علم و دانش کو دیکھ کر ان کے لباس و پوشاک فخر و مباہات، ترفہ و خوشحالی اور طرق معاش پر غور کرتا ہے تو ان سب باتوں کا اس کے فکر و نظر اور قلب و ذہن پر بڑا اثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں اس طبقہ کی تقلید کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ عزم بالجزم کر کے ان کے ساتھ شریک کار اور رفیق سفر ہوتا ہے اس کو ہم حجاب رسم کہتے ہیں کیونکہ یہ شوق و جذبہ اس کے دل میں سوسائٹی کے دیگر افراد کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے اور بعض افراد ایسے بھی ہیں جو مرتے دم تک اسی تگ و دو اور تقلید رسم میں مستغرق رہتے ہیں اور ان کا انجام نقصان و خسران پر ہوتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص صاحب دل ہے اور بیدار ضمیر کا مالک ہے اور اس کی عقل دور رس ہے تو اسے لاہوت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور ذات الٰہی کے ساتھ ربط پیدا کرنے اور مقدس

کمال حاصل کرنے کا احساس ہو جاتا ہے۔تب وہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے سعی اور کوشش کرتا ہے اور اپنے سر عجز کو اسی کے آستانہ عالیہ پر رکھ کر اس کی بارگاہ اقدس سے قضائے حاجات کا ملتجی ہوتا ہے۔اس مرحلہ پر پہنچ کر بعض لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنا نصیب ہوتا ہے اور بعض صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں۔اس بھٹک جانے کو ہم حجاب سو معرفت کہتے ہیں۔اگر تم نوع انسانی اور افراد بنی آدم کی اچھی طرح چھان بین کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ بالکل درست ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق و تفاوت نہیں، ہر ایک شخص خواہ وہ کسی دین و ملت کا پابند ہو کسی نہ کسی وقت لزوماً حجاب طبع میں مستغرق ہو ہی جاتا ہے بعض دوسرے اوقات میں وہ حجاب رسم میں منہمک ہوتا ہے اور وہ دوسرے ہمعصروں اور عقلمندوں کے ساتھ دنیاوی مراتب، دنیاوی خوشحالی، بلند اخلاق، فصیح و بلیغ کلام بہتر خوشنما لباس اور اعلیٰ معاشرتی زندگی کے حصول کے لیے مقابلہ میں منہمک ہوتا ہے۔

اس طرح بعض اوقات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ وہ شریعت کے امور کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اپنے فہم اور عقل کے مطابق عالم جبروت اور الٰہیاتی امور (وہ امور جن کے بارے میں وہ پہلے سنتا بھی تھا تو کان نہیں لگاتا تھا) کی طرف کان لگا کر متوجہ ہوتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تشریع اور الٰہی قانون سازی کا دار و مدار[1] اس پر ہے کہ مذکورہ حجب ثلاثہ کو توڑا جائے اور کافی طویل زمانوں میں (پوری تربیت کا ساتھ) اقوام عالم میں سے کسی قوم یا ملت کو ان حجابوں سے پوری طرح پاک کیا جائے۔

صاحبِ شرع کے طرقِ علاج:

ان مذکورہ تحقیقات اور تمہیدی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد تمہارے لیے یہ سمجھنا بھی بہت آسان ہوگا کہ ان حجابات ثلاثہ کو توڑنے کے لیے جو صاحب شریعت تدبیر کرے گا، اس کے لیے تین مقامات یا تین طریقہ ہائے علاج ضروری ہیں۔

پہلا مقام (حجاب طبیعت کا علاج) سب سے پہلے اس کو حجاب طبیعت کا علاج و

---

[1] (Enenteal prerequsets)

اصلاح کرنا ہوگا۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ طبیعت کو اپنی فطرت پر باقی رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ طبیعت کو اپنی فطرت وجبلت سے جدا کر کے اس کی فطرت کے تقاضوں سے قطعاً محروم کر دیا جائے،اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

اولاً یہ کہ طبیعت کو خواہشات وجبلتوں سے یکسر محروم کرنا بہت بڑا (اجتماعی) فساد ہے۔کیوں کہ تم جانتے ہو کہ نوع انسانی کے درمیان معاشرتی روابط واجتماعی تعلقات کا انحصار ومدار طبعی ضروریات اور جبلی تقاضوں پر ہے اور اگر ان ضروریات کی پوری بیخ کنی یا استیصال کیا جائے اور وہ معدوم ہو جائیں تو باہمی انسانی ربط اور اجتماعی بھائی چارگی کا تعلق بھی معدوم ہو کر رہ جائے گا (اور اس سے بڑا اجتماعی فساد دوسرا نہیں ہو سکتا)۔

ثانیاً اس قسم کی تعلیم یعنی نفس کشی یا خواہشات کی بیخ کنی کی ہدایت کو تمام افراد بشری قبول ہی نہیں کر سکتے (اور نہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔اس لیے اگر ان کو طبیعت کے تقاضوں سے باز آنے اور خواہشات کے استیصال کا مکلف اور پابند بنا دیا جائے تو یہ بات کبھی ان سے پوری نہ ہو سکے گی۔نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کی تعلیم سے تشریع کا مقصد فوت ہو جائے گا۔(کیونکہ جو لوگ مزاج کے لحاظ سے مستعد ہوں گے وہ تو قبول کر لیں گے اور جو غیر مستعد ہوں گے وہ پیچھے رہ جائیں گے۔حالانکہ مطالبہ سب سے کرنا اور سب کو ایک قانون کے لیے آمادہ کرنا تشریع کا مقصد ہوتا ہے،تشریع میں ہمیشہ عمومیت پائی جاتی ہے)۔

ثالثاً: مقام نبوت جس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان الٰہی کے ساتھ مشابہت حاصل کی جائے۔دراصل اس قسم کی تعلیم کا تقاضا ہی نہیں کرتا ان تین وجوہ کی بنا پر حجاب طبیعت کے نقصانات ومضار سے بچنے کی مناسب تدبیر یہی ہے کہ طبیعت کو اپنی مقتضیات سے قطعاً جدا کر دینے کی بجائے اس کی تہذیب واصلاح کی جائے اور اس کے تقاضا کو اس حد تک پورا کیا جائے جس سے ایمان میں خلل نہ آئے۔چنانچہ ہر وہ امر جس کا طبیعت انسانی تقاضا[1] کرتی ہے،اس کے لیے مدارج مقرر کیے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہر تقاضا کو پورا

---

[1] کتاب میں عبارت "لایقتضیه الطبیعة" مگر بہ ظاہر یہ کتابت کی غلطی ہے۔اور عبارت "تقتضیه الطبیعة" ہے۔

کرنے میں اعتدال کو مدنظر رکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت غرّا نے پاکیزہ اور لذیذ اشیا خوردونوش کو جائز وحلال قرار دیا ہے اور خوبصورت نوجوان دوشیزاؤں اور عورتوں سے نکاح کو حرام نہیں ٹھہرایا اور اس قسم کے دوسرے حیوانی جذبات اور جبلی تقاضوں کی تسکین کے لیے طریقے اور ذریعے تجویز کیے یہاں تک کہ حسد، بغض، عداوت وتکبر اور سخت گیری کے جذبات کی بیخ کنی نہی کی بلکہ ان کو مختلف مناسب صورتوں کے ساتھ جائز رکھا۔ (خلاصۂ کلام ہے کہ طبیعت کے ہر ایک تقاضا میں افراط سے منع کر کے اعتدال کی تلقین فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت محمدی کے اصول واحکام کی پابندی کے باوجود انسان کو اپنے طبعی تقاضوں اور جسمانی خواہشوں کو پورا کرنے میں کوئی خلش اور خلجان محسوس نہیں ہوتا۔

عدوان طبیعت کے لیے انسدادی تدابیر: طبیعت کے تعدی وعدوان کو روکنے کے لیے دو قسم کی انسدادی تدبیروں اور امتناعی ذریعوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ علمی وعملی اور ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ خارجی وداخلی۔

ا۔علمی ذریعہ اصلاح داخلی: علمی ذریعۂ اصلاح اور تدبیر کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ چند ایسے مقدمات مستحضر ہوں جن سے چند وجوہ (تین) کی بنا پر جوش طبیعت اور عدوان مزاج کی شدت کو مقہور ومغلوب ہونے میں مدد ملتی ہو اور وہ عقل کے نزدیک بھی مسلّم اور مقبول ہوں۔ وہ تین وجوہ یہ ہیں:

(الف) اس (علمی مقدمہ) کے ذریعہ عقل کو حرکت میں لایا جاتا ہے تو وہ (عقل) طبیعت کی گرفت اور بندش حکم سے آزاد ہو جاتی ہے (اور ملکیت کو بہیمیت سے ایک قسم کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے) چنانچہ ہم نے اس حقیقت کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ محض طبیعت (اور بہیمیت) کی حکمرانی اس وقت رہتی ہے جب تک عقل حرکت میں نہیں آتی۔ جونہی عقل میں کسی قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے تو طبیعت اس کے مطابق مقہور ومغلوب ہو جاتی ہے۔

(ب) ہم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ طبیعت کے احکام قلب پر صرف اس صورت میں غلبہ پاتے ہیں، کہ دماغ کے جاسوس اس کی طرف مائل اور اس کے ہمراز ہو جائیں لیکن اگر قوائے دماغیہ کو علوم سے بھر دیا جائے اور وہ ان کا استحضار ہمیشہ کرتے ہیں تو اسی استحضار

کی نسبت سے جو اسپس دماغ کی معاونت میں کمی ظاہر ہوگی اور طبیعت یکہ وتنہا ملکیت کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

(ج) بلاشبہ یہ بدیہی امر ہے کہ مقدمات کے بار بار اور یکے بعد دیگرے استحضار و ادراک کو مناسب حال خاص حالت کے پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے میں دخل ہوتا ہے۔ جب اس مناسب حال خاص حالت کو انسانِ اکبر سے مشابہت حاصل ہو جائے اور اس کا اثر نفسِ انسانی پر نمایاں ہو جائے گا۔ گو کہ وہ اثر حروف، اصوات، خیالات اور اعضائے جسمانی کے مختلف اعمال کے ساتھ مخلوط و ممزوج کیوں نہ ہو، تو بھی اس قسم کا اثر بالخاصیت مفید و نافع ہوگا جس طرح تریاق زہر کا اثر زائل کرنے کے لیے بالخاصیت مفید اور نفع بخش ہے۔

خارجی: (حجاب طبیعت کو دور کرنے کے لیے انبیا کرام کے طریقے مختلف اور جداگانہ ہیں)۔

ان مقدمات اور بنیادی تمہیدی باتوں کی تعیین میں انبیائے کرام کے مسلک جدا جدا رہے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان مقدمات کو ترجیح دی ہے جن میں عقیدۂ توحید کو استحکام حاصل ہو اور شرک اور مشرکانہ ذہنیت کا قلع قمع ہو اور اس کی بدولت عبادات میں مشغول ہونے کا جذبہ دل میں پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر ایسے مقدمات مستزاد فرمائے جن سے قلب میں خوف وخشیتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو اس لیے اس کی نبوت کا جزاعظم تذکیر بایام اللہ[۲] تھا۔

حضرت محمد صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علاوہ چند ایسے مقدمات کا اضافہ فرمایا جن کو پیش نظر رکھنے سے اس حیات فانیہ کی بے ثباتی آنکھوں میں بھر جائے اور یہ بات گویا رای العین سے نظر آنے لگے کہ مرنے کے بعد انسان کا تعلق ان امور سے منقطع ہو جائے گا۔ جن سے وہ اس دنیا میں لطف اندوز رہتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

۲ ایام اللہ سے مراد وہ بڑے بڑے واقعات ہیں جو کسی قوم کی ہلاکت کا موجب ہوئے یا اس پر [illegible] آیا۔ اور جن کا سننا عبرت کا باعث ہوتا ہے۔ تذکیر بایام اللہ ان علوم پنج گانہ میں سے ایک ہے جن کا تفصیلی ذکر شاہ صاحب نے الفوز الکبیر فی علوم التفسیر میں کیا ہے۔

التذکیر بھاذم اللذات (موت) ومابعدہ کومسلک اصلاح بنادیا۔

مستحقین عتاب پر اپنی عقوبت نازل فرماتا ہے اور مقدس حسن وبہا کے اثبات کی طرف رجوع کریں گے۔ وعلیٰ ہذا القیاس دوسری صفات الٰہیہ کی توجیہہ بھی اسی طرح کی جائے گی جس میں ذم کا پہلو بالکل نہ ہو۔ اور یہ علم (معرفت الٰہی) جیسے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں ودیعت رکھا گیا ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں، کہ جب وہ ذات اقدس اور اس کی صفات عالیہ کا اثبات کرنے لگتے ہیں تو وہ اپنے ذہن میں تصدیق کے لیے تجرید وفراغت نہیں پاتے اور وہ ذات اقدس کو تلویثات عالم ناسوت یا بالفاظ دیگر مادّی کثافتوں سے منزہ اور متعالی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ مادّی دنیا میں کسی جلیل القدر ہستی کی عظمت کا تصور کرتے ہیں تو وہ اس کی ذات گرامی کو تقدس اور تا لہ (ذات الہ) کے اوصاف سے متصف خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کو اس خیال (مشرکانہ اعتقاد) کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یا تو وہ طبیعت کے تقاضوں کی تعمیل میں مشغول ومستغرق رہتے ہیں یا رسم ورواج کے علوم واحوال کا رنگ ان پر غالب رہتا ہے۔ اور وہ آزادانہ طور پر قطعی فیصلہ اور استدلال نہیں کر سکتے۔ اس کی مزید تحقیق یہ ہے کہ جس یقین اور عقیدہ کو شرع نے قابل اعتبار اور بنائے تعمیر قرار دیا ہے اس کی تحصیل براہین اور دلائل عقلیہ کے ذریعہ نہیں ہوتی کیونکہ شرع کے نزدیک ان دلائل وبراہین کی کچھ بھی قدر وقیمت نہیں یہ تو ایک ناقص الادراک اور ناقص الایمان قوم (عقلائے یونان اور ان کے ہم مشربوں) کا سہارا ہے اور بس۔ جو یقین واذعان مطلوب ہے وہ کتاب اللہ کی تلاوت وتذکار اور تدبر اور نیک لوگوں کی اچھی صحبت سے فیض یاب ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس یقین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالم لاہوت سے نسمہ پر پختہ یقین کی ایسی ہیئت راسخہ مترشح ہوگی کہ اس کے خلاف کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ اور وہ علم ناقص جس سے قلب کو کما حقہ ارتباط اور وابستگی نہ ہو، اور اس کی نوعیت دوسرے خطرات نفس اور وسوسوں کی سی ہو۔ شرع کے نزدیک ایمان وایقان نہیں، شک اور وہم ہے۔ چاہے اس کے اثبات کے لیے مغز کھپا کر کتنے ہی عقلی دلائل

اور منطقی قیاسات پیش کیے گئے ہوں۔ اس قسم کا شک تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کافروں کو موصوف بتایا ہے۔ اور سورۂ کہف میں واضرب لھم مثلا رجلین کا رکوع اس کا ایک نمونہ ہے۔

تدابیر

اس کی تدبیر یہ ہے کہ طبیعت کو معتدل ریاضتوں مثلاً روزہ، اعتکاف اور نماز کے ذریعہ مغلوب کیا جائے۔ اور ایسے مواد کے اجتماع سے پرہیز کیا جائے جس کے ثوران و ہیجان کے وقت قلب کو طبیعت کے تابع ہو جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو مثلاً شکم پروری اور پُرخوری جس کا علاج یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھوکا رکھے یا مثلاً موادِ منویہ کا غلبہ، جس کا علاج شرعی طور پر نکاح کرنا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ تشویش آفریں صورتوں کو دیکھ دیکھ کر اور فضول گپ شپ اور رسمی واہیات باتیں سن سن کر لوحِ دماغ کو بھر دینا (کہ سنجیدہ باتوں کو سوچنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے) اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کی صحبت کو ترک کر کے خلوت نشینی اختیار کرے۔ اور اپنی آنکھوں کو ضبط میں رکھے اور محسوسات کے روابط سے قطع تعلق کر کے اپنے قوائے عقلیہ کو اضطراب و تشویش سے روکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محسوسات کے علاوہ دیگر حقائق کے ادراک کی صلاحیت و استعداد اس میں قوی تر پیدا ہو جائے گی اگرچہ یہ ادراک تنزیہہ، تسبیح و تقدیس تک محدود کیوں نہ ہو اسی طرح وہ اپنی قوت مدرکہ قوی سے قوی ترک کرتا رہے حتیٰ کہ اس میں ''دیانت'' (ظاہر و باطن کی یکسانگی) کی خلق پیدا ہو جائے اور دوسرے سب اخلاق فاضلہ کا ظہور ہو۔

اگر تم لوگوں کے مختلف طبقوں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرو تو تمھیں ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑے گا کہ جو کچھ علم انھیں ملا ہے اس کی وہ مطلق پروا نہیں کرتے کیوں کہ وہ اپنے مدرکہ کو ادھر متوجہ ہی نہیں کرتے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے علاج یہ ہے کہ وہ دل و زبان سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے رہیں۔ اس ذکر قلب و لسان سے ان کو یہ فائدہ ہوگا کہ محسوسات اور مادیات سے ان کا استغراقی تعلق منقطع ہوگا۔ (اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔

چھٹی فصل

خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے مقاصد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور نظام زندگی کے اسرار ورموز اور حقیقت کے متلاشی کے لیے سب سے پہلے جس چیز کا جاننا واجب وضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور رسالت مآب کو ملت حنیفیہ کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے تا کہ آپ اس کے اندر جو کجی آئی تھی ،اسے درست کریں اور جو تحریفات اور تبدیلیاں لائی گئی تھیں ان کی اصلاح فرما کر اس کی اصلی روشنی اور آب وتاب کو پھیلائیں۔اس لیے ضروری تھا کہ جن مقامات پر ملت حنیفیہ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ایسے ہوں کہ سب کے نزدیک مسلمہ ہوں۔اس کے بعد اس کی تفاصیل میں غور وخوض کیا جائے۔اسی طرح وہ ظاہری اشکال اور صورتیں جو اس ملت کے پیروکاروں کے ہاں متوارث چلی آرہی ہوں سب کے نزدیک مسلمہ ہوں۔

وہ بڑے بڑے مقاصد جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شریعت میں متعین کرنا چاہتے تھے یا (صحیح تعبیر کے ساتھ) جنھیں اللہ تعالیٰ آپ کے لسان مبارک سے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔(مندرجہ ذیل) چند امور ہیں:

ان میں سے ایک ارتفاق ثانی کی اصلاح ہے کیونکہ یہ ارتفاق تمام اقوام عالم میں عموماً اور ملک عرب میں خصوصاً شائع وذائع تھا۔لیکن ان میں جور وظلم اور کجی وبدعنوانیاں پیدا ہوگئی تھیں۔رسالت مآب نے ارتفاق ثانی کو درست کیا اور جور وکجی کا پورا پورا ازالہ کیا چنانچہ ارتفاق کی بنیاد انسانی خواص اور علوم تجربیہ پر رکھی اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی تعظیم کو اس کے ساتھ ملا دیا (اور یہ معجون مرکب اصلاح تہذیب وتمدن کے لیے نہایت ہی نافع ثابت ہوا) اور اس اصلاحی کوشش میں نجومیوں (ستارہ پرستوں) اور طبیعیین (مادّہ پرستوں یا نیچر

پرستوں) اور مجوس (آتش پرستوں) کے مذاہب اور طرق اصلاح سے کنارہ کشی (جو انبیا کا وطیرہ ہے) مجدداً اختیار کی۔ چنانچہ اس طریقہ سے ارتفاق میں چند مفید امور حاصل ہوئے، جو اس ارتفاق کے لیے بمنزلہ ارکان کے ہیں۔ ان امور کی پابندی واجب قرار دی گئی انھیں اختیار کرنے کی تاکید کی گئی اور ان کو چھوڑنا ملت حنیفیہ سے خروج کے مترادف قرار دیا گیا۔ ان ارکان یا ضروریات کے علاوہ بعض دوسری باتیں ایسی تھیں جو ارتفاق ثانی کے نظام زندگی کو تکمیل، تحسین، تعمیر اور تتمیم کے مدارج تک پہنچاتی ہیں۔ اس قسم کے امور کو استحباب کے درجہ میں رکھا جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے ان پر کاربند رہنے کی ترغیب دی لیکن ان کے چھوڑنے کو چنداں قابلِ ملامت قرار نہیں دیا۔ ان دونوں (ضروریات اور تحسینات) کے علاوہ کچھ امور ایسے بھی ہیں جن کے ارتکاب سے نظام مذکور باطل ہو جاتا ہے۔ ان کو حرام قرار دیا اور ان کو ترک کرنے کی سخت تاکید فرمائی۔ بعض دوسرے امور ایسے بھی ہیں جن سے ان مفاسد کے پیدا ہونے کا احتمال ہے جو ارتفاقِ ثانی کو باطل کر دیتے ہیں، اگرچہ وہ براہِ راست ارتفاق کو مٹاتے نہیں۔ اور کچھ امور ایسے ہیں جن سے ارتفاق ثانی میں نقصان پیدا ہونے اور اس میں خلل کے آنے کا اندیشہ اور احتمال ہے۔ ان کو شرع محمدی کی اصطلاح میں مکروہات کہتے ہیں۔ جن امور میں کوئی ایسی بات نہیں تھی ان کو اجازت دیدی اور وہ مباحات کے نام سے یاد کیے جانے لگے، اسی طرح شارح علیہ السلام نے ان امور کا قلع قمع کیا جو مواد فساد کی حیثیت رکھتے تھے، اور لوگوں میں جن باتوں سے جھگڑا فساد پیدا ہوتا تھا، اس کو منع فرمایا۔

ان میں سے دوسرا مقصدِ شریعت رسوم کی اصلاح ہے

جس کا ملخص یہ ہے کہ ان مروجہ رسموں کو ایسی شکلیں دی جائیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی مؤید اور معاون ہوں اور کبھی اس کے مخالف اور نقیض نہ ہوں۔ نیز ان رسموں کو اس طرح بنایا جائے کہ جمہور کے لیے مفید اور نفع بخش بن جائیں اور ان میں توسع اور لچک ہو، تنگی بالکل نہ ہو اور نہ وہ جمہور کے لیے موجب ضرر اور باعث نقصان ہوں۔

ان میں سے تیسرا مقصد ارتفاق ثالث کا قیام ہے۔

یعنی یہ کہ ہر ایک ظلم و دست درازی کے لیے کما حقہ مناسب حال، عقوبت اور سزا مقرر کی جائے۔ لوگوں کو فتنہ وفساد اور لڑائی جھگڑوں سے روکا جائے اور ان کے اندر منازعات اور مقدمات کو عدل وانصاف سے فیصلہ کیا جائے۔ زمین میں فساد پھیلانے والے لوگوں پر ظلم کرنے والوں اور تخریب کاروں اور تفرقہ پردازوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور قوت استعمال کی جائے۔ شعائر الٰہیہ اور دین اسلام کے اظہار اور نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے اور کفر وشرک اور فسق وفجور کی اہانت کی جائے اور ملک خدا کو ان سے پاک وصاف کر دیا جائے۔ تبلیغ دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے اور لوگوں کے وعظ وارشاد اور پند و نصیحت کا انتظام کیا جائے اور علوم وفنون کی اشاعت وترویج کی جائے۔

ان میں سے چوتھا مقصد دین اسلام کو ارتفاق رابع کے مطابق غالب ونافذ کرنا ہے۔

تاکہ روئے زمین پر کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے، جو دین حق سے مغلوب نہ ہو اور یہ غلبہ اس قسم کا ہو جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے (اسلام کے جھنڈے تلے) صرف تین قسم کے لوگ ہوں گے:

(۱) مومن مخلص جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کے احکام کا مطیع وفرماں بردار اور ملت حنیفیہ کا پابند ہو۔

(۲) ضعیف الایمان جو ظہراً اسلام کے احکام سے سرتابی نہ کرتا ہو، اگرچہ اس کے باطن میں ایمان اور ایقان کی روشنی نہیں۔

(۳) وہ جو علانیہ کافر ہے لیکن جزیہ دیتا اور اسلامی حکومت کے تابع ہو کر محکومانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کو اسی طرح کام میں مصروف رکھا جائے جس طرح چوپایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور جس طرح بیل سے کھیتی باڑی اور فصل کی کٹائی اور صفائی وغیرہ کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح اس کافر کو بھی مصروف رکھا جائے۔

چونکہ اس قسم کی اسلامی حکومت وخلافت بعینہٖ سکندر اعظم ذوالقرنین جیسے ذو اقتدار

کی حکومت کی طرح ہے جن کی بدولت ارتفاق رابع کا نظام قائم تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس سے دین اسلام کو مدتوں تک قائم رکھنا مطلوب ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد بھی وہ اسی طرح تر و تازہ ہو جس طرح وہ عہد سلف میں تھا۔

لہٰذا مندرجہ ذیل امور کی ضرورت پڑی: کہ دوسرا کوئی مذہب باقی نہ رہے۔اور مسلمانوں کو دیگر مذاہب کی محرف تعلیمات میں غور وخوض کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور ان کے مطالعہ سے منع کیا جائے۔

ثانیاً یہ کہ:

جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا مندی چاہتا ہو اس کو اسی دین کا پابند ہونا پڑے گا اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں سے کوئی شخص دین ابراہیمی پر اب تک قائم ہے اور اس نے دین ابراہیمی میں عقیدتاً یا عملاً کسی قسم کی تخلیط و آمیزش نہیں کی ہے تو اگرچہ قرب اور کمال حاصل کرنے کی حیثیت سے اس کے لیے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو، اس کے احکام کی پابندی کرے اور اس کی رسالت کا اقرار کرے لیکن اس کے لیے شریعت محمدی پر ایمان و ایقان لانا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو دین حنیفی کا اس طریقہ پر ظہور میں لانا مقصود ہے اس لیے خوشنودی الٰہی اسی دین محمدی کی پیروی اور پابندی میں ہے۔اور اس سے اعراض کرنا معصیت اور مخالفت تصور ہوگی اور اعراض کرنے والا شخص خدائے پاک کی رحمت سے محروم رہ کر لعنت کا مستحق ہوگا۔علاوہ ازیں یہ صورت جو فرض کی گئی ہے (کہ اب بھی کوئی شخص ملت ابراہیمی حنفی پر قائم پایا جائے گا) محض ایک احتمال عقلی ہے۔واقعہ میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا (کیونکہ ملتوں میں اور ان کی روایات میں فساد واقع ہوا ہے) اور تورات، انجیل اور دیگر مقدس کتابوں کا وجود اصلی مفقود ہے اور موجود ہی نہیں ہے تو دین ابراہیمی پر قائم رہنے کا دعویٰ باطل اور خیال غلط ہے)۔اور حق اور روایات ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مخلوط ہو چکے ہیں کہ ان میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کر کے پیش ہی نہیں کیا جاسکتا (اور انسانی آمیزش اور خدائی کلام میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے) اس لیے اللہ تعالیٰ کی رضا

مندی وخوشنودی کو دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی رسالت پر اقرار جلی میں منحصر سمجھا گیا ہے (قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ الخ)۔ (آل عمران)

ثالثاً یہ کہ کسی کی یہ حرکت برداشت نہ کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول یا اس کی کتاب اور دین کے حق میں گستاخی اور بے ادبی کرے خواہ یہ گستاخی اور بے ادبی دل لگی کے طور پر ہو یا پوری سنجیدگی کے ساتھ ہو (قُلْ اَبِاللّٰہِ وَ آیَاتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُوْنَ) نیز کسی کو اس بات کا موقع ہی نہ دیا جائے کہ وہ کسی مشروع چیز میں کسی طرح پر تغیر وتبدل کرے۔ (اور حلال کو حرام ٹھہرا سکے اور حرام کو حلال کہہ سکے) اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کو ایسے نام سے پکار سکے جو تنزیہہ وتقدیس الٰہی کے خلاف ہو، یا اس میں شرک کی کسی صورت کی ایجاد و آمیزش ہو یا کسی غیر اللہ کو مقدس سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے یا کوئی شخص شعائر اللہ کو ترک کرے (یا ان کی بے حرمتی کرے) یا دین حنفی کے ساتھ کسی دوسرے مذہب وطریقے کو ملانے (کی کوشش کرے یا ملانے) کا مرتکب ہو۔ الغرض دینی حنفی کو ارتفاق رابع کے طرز پر قائم رکھنے کے لیے ان مذکورہ امور کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ اس زمانہ میں (بعد از رسالت محمدؐ تا قیامت) اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی انہی امور (یعنی دین اسلام) کی پابندی میں محصور ہے (یہی تقریر بالا کا ملخص ہے)۔

منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد (یعنی پانچواں)

حجب ثلاثہ کو توڑ کر لوگوں کو مقام احسان پر فائز کرنا ہے۔

جس کی تفصیل فصل التشریع (اسلامی قانون سازی) میں گزر چکی ہے نیز (مقربین کے لیے) تسکین وطمانیت حاصل کرنے کے طریقے معلوم کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر ترغیب وتحریص دلانا بھی مقاصد میں سے ہے۔ اسی طرح اصحاب الیمین کو ان کے مناسب حال تلقین کرنا بھی ان مقاصد میں شامل ہے۔

چھٹا مقصد منجملہ ان مقاصد کے "شر ثانی" کے آفات سے لوگوں کو بچانا ہے

اور یہ اس طرح پر کہ شیطان کے القا اور وسوسوں کی مخالفت کی جائے اور ان ہیئتوں

اور طریقوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے جو القائے شیطان کے مناسب حال ہوتے ہیں اور ان ہیئتوں کو اختیار کیا جائے جو ملکی الہام سے موافق اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ (اس دین کو اختیار کرنے والا) ان دونوں ہیئتوں اور ان کے موافق احوال وظروف سے باخبر ہو۔ وحی والہام کی مختلف صورتوں سے بھی اور شیطان ونفس امارہ کے مکائد اور شرارتوں سے بھی آگاہ ہو، پھر اسے ان مکائد سے بچنے کی راہیں، اور شعائر اللہ کی تبلیغ اور ان کی تعظیم کی اشاعت کرنے اور شعائر شرک، فسق وفجور اور نفاق کے اسباب اور لوازم کو مٹانے کے طریقوں سے بھی واقفیت ہو۔

ساتواں مقصد: منجملہ ان مقاصد کے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو فتنہ قبر اور فتنہ محشر اور فتنہ عذاب النار سے نجات دلائی جائے۔

یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو واقعات ہونے والے ہیں شارع ان سے ان کو آگاہ کرے، ان کے اسباب سے ان کو مطلع کرے اور پھر ان سے بچنے کی ان کو تلقین کرے۔ شریعت حقہ کے بڑے بڑے مقاصد یہی ہیں جو اوپر مذکور ہیں۔ اب اگر یہ مقاصد اسی قسم کے اوصاف ہوں جو ضبط میں آسکیں اور بالکل ظاہر ونمایاں ہوں تو شارع ان کو بعینہٖ علل و اسباب کے درجہ میں رکھتا ہے۔ اور انہی پر احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اور ان احکام کے وجود وعدم کا ارتباط انہی علتوں کے وجود اور عدم سے ہوتا ہے۔ اگر یہ اوصاف منضبط اور نمایاں نہ ہوں تو ان کے لیے لوازم اور مظان تلاش کرتا ہے۔ یہاں لوازم سے میری مراد لزوم عقلی نہیں بلکہ وہ لوازم مراد ہیں جن کا لزوم، لزومِ عادی ہے اور مظنۃ سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ علت اس کے ساتھ استقرار تام رکھتا ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اس میں اس مقصد کے حاصل ہونے کا ظن غالب ہے۔

الغرض تم اس وقت تک اپنے آپ کو فقیہ فی الدین نہ سمجھو جب تک تم کو ان مذکورہ مقاصدِ شریعت کا علم نہ ہو۔ اور یہ کہ ان مقاصد کو ظہور میں لانے کا طریقہ کیا ہے۔ احکام کے علل کیا ہیں اور مقاصد کے ساتھ ان کا ارتباط کس طرح ہے۔ جب ان سب باتوں کو تم جان لو، (تو تمہیں اسرار ورموز دین سے واقفیت ہوجائے گی اور) تم اس دین کے صحیح طور پر حامل ہو اور پھر یہ حدیث

شریف تمہارے حق میں صادق ہوگی: اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ لِعَبْدٍ خَیْراً یُفَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرے تو وہ اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السمحة الحنيفية الْبَيْضَاء۔ مجھ کو ملت سمحہ حنیفیہ بیضا کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔ ملّت حنیفیہ کی تحقیق تو تم سن چکے۔ السمحة سے مراد یہ ہے کہ (وہ آسان اور قابل عمل ہے اور) اس کے احکام ظاہر امور پر مبنی ہیں اور امعان اور تعمق کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور ہر عذر کے پیش آنے پر حکم کا دوسرا پہلو رخصت کا موجود ہوتا ہے اور ہر مشکل کو آسان طریقے پر ادا کرنے کی تلقین ہو۔ اور رہبانیت (ترک دنیا علائق اور عزلت نشینی) اور تکلیف دہ عبادتوں کو (غیر شرعی قرار دے کر) مٹایا گیا ہو۔ البیضا (روشن) اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اس کے واضح احکام اور اوامر کو سمجھ سکتا ہے اور اس کے علل اور اسباب احکام کو معلوم کر سکتا ہے اور ان اسباب وعلل کو ان کے مطلوبہ مقاصد شریعت کی طرف راجع کر سکتا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں تم کو مسالک ومسائل کا اس قدر علم دیا ہے کہ اگر تم نے اس کو ٹھیک طور پر سمجھا ہے تو تم کو کسی مسئلہ میں شک وشبہ لاحق نہیں ہوگا لیکن ہم تم پر مزید احسان کرتے ہوئے شریعت محمدی کے اصول وفروع کی مزید توضیح وتشریح کرتے ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ مقاصدِ شریعت اور ان کے اسباب وعلل پر قلم آزمائی کریں گے۔ اس لیے اپنے کام میں عقل ودانش سے کام لو۔

---

۱ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (سورۃ الصف: آیت)

ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم حدیث نهی عمر عن قراءة التوراة

ساتویں فصل

دین اسلام کے اصول

اجزائے ایمان وشرائط دخول اسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ ملت حنیفیہ میں داخل ہونے اوراس کی پابندی قبول کرنے کو چند امور کے ذریعہ منضبط کردیا ہے۔ اس طرح کہ حضور نے (تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ) توحید الٰہی کے اقرار لسانی کو بھی شرط قرار دیا ہے، جس سے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے کی حالت باطنی کا محسوس طریقہ پر اظہار ہوتا ہے۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا ضروری ٹھہرایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات تصرفات ومعبودیت میں واحد ولاشریک ہے۔ تمام عیوب اور نقائص سے منزہ ومبرا اور تمام کمالات اور قابل ستائش اوصاف سے موصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر قسم کے شریک کو ممنوع ٹھہرایا۔ عبادت میں استعانت میں، مطلق ذکر میں، اور حلف یا نذر وذبح وغیرہ میں، (غرض ہر قسم کا شرک حرام ہے) اللہ تعالیٰ کی ذات کو بیوی اور اولاد، عاجزی ولاعلمی، سہو ونسیان اور بخل وظلم کی نسبت سے اقدس، ارفع واعلیٰ جاننا لازم قرار دیا ہے۔ اسی طرح اسی کے اسمائے حسنیٰ کو بھی ایسے معانی کے اظہار سے دور رکھنا واجب ٹھہرا دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حق میں عیب ونقص کا باعث ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ کو توفیقی بنادیا ہے تا کہ ہر کس و ناکس کو من گھڑت اور پرعیب اسما کی ایجاد کی جرأت نہ ہوسکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی تِسْعَةً وَتِسْعِیْنَ اِسماً مَنْ احصاھا دخل الجنّة۔ ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو یاد کرلیا، اور ان کو ضبط میں لایا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

احصا سے مراد اسمائے حسنیٰ کے معانی کا صحیح مفہوم، اور ان اسمائے حسنیٰ سے ثابت شدہ صفاتی مفہومات کی تصدیق قلبی ہے۔

(توحید کے ساتھ ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے) انبیاورسل کی بعثت انزال کتب سماویہ اور وجود ملائکہ کا (تصدیق قلبی کے ساتھ) لسانی اقرار واظہار کرنا بھی ضروری ہے اور شریعت نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ ان کو آلائشوں اور گناہوں سے پاک سمجھا جائے اور ان کے حق میں کسی قسم کی بے ادبی نہ کی جائے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ روزِ قیامت اور آخرت پر ایمان رکھنے کا اقرار کیا جائے۔ یہ دونوں دراصل دین محمدی میں دوزبردست تازیانے ہیں عبرت کے، اور جو کوئی ان دونوں پر ایمان نہیں رکھتا اس کے لیے دین حنیفی کی ظاہری پابندی اور اس ملت اسلامیہ کے اصول ومبادی اور دیگر ضروری امور (ظاہری اقرار کرنا) بے مقصد اور بلا فائدہ ہے۔

ایمان کی دو قسمیں ہیں: چونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ارتقاق رابع کے طور پر ہوئی ہے اس لیے یہ قدرتی امر تھا کہ آپ کے دین اور پیرووں میں مختلف قسم کے لوگ شامل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وجوہ فرق بتادیں۔ نیز جو لوگ سچ مچ ہدایت یافتہ ہیں، اور جو بظاہر تو دین حنیف کے پابند ہیں لیکن ایمان ان کے دلوں کی تہہ (جذب قلوب) تک نہیں پہنچا۔ ان دونوں فریقوں میں بھی خط تمیز کھینچ لیں۔ چنانچہ آپ نے ایمان کی دو قسمیں قرار دیں:

(۱) وہ ایمان جس پر دنیاوی احکام کا دارومدار ہے یعنی یہ کہ اس کے سبب سے آدمی کا مال وجان (معاشرے میں دوسروں کے دست برد سے) محفوظ رہیں۔

آپ نے اس قسم کی ایمانی کیفیت کے لیے احکام شرع کی ظاہری اطاعت وانقیاد کو کافی سمجھا اس لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا وَصَلّٰی صَلاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ بِقِبْلَتِنَا فَذَالِکَ الْمُسْلِمِ الَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تَخْفِرُوْا اللّٰهَ فِیْ ذِمَّتِهٖ۔

جو شخص ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے، ہماری طرح نماز پڑھتا ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس (کے جان و مال اور آبرو) کی حفاظت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ واجب ہے۔ اس لیے (اے مسلمانو! ایسے شخص کی حفاظت کرو اور) اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو مت توڑو"۔

(۲) دوسرا ایمان وہ ہے جس پر احکام آخرت کا انحصار ہے یعنی جس سے کہ آخرت میں نجات و سعادت ملتی اور آدمی بڑے بڑے درجات حاصل کرتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ایمان کا رکن یہ بتایا ہے کہ آدمی کا عقیدہ حق و صحیح ہو اور اس کا عمل اللہ کے قوانینِ رضا کے مطابق صالح اور پسندیدہ ہو اور وہ اخلاق فاضلہ کا مالک ہو۔

الغرض ایمان ایک جامع کلمہ ہے۔ جس کے مفہوم میں خیر اور نیکی کے جملہ انواع اور اقسام شامل ہیں۔ اس میں کمی و بیشی آسکتی ہے اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس کے مفہوم میں (اس کی جڑ) اس کا تنہ، اس کی ٹہنیاں، اس کے پتے اور اس کے پھول اور پھل سب ہی شامل ہیں۔ اگر اس کا میوہ چن لیا جائے اور اس کی شاخیں توڑ دی جائیں تب ہی اس پر درخت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس پر درخت کا اطلاق اس وقت نہیں ہو سکے گا جب اس کے تنہ کو بیخ و بُن سے اکھیڑ لیا جائے۔ اسی پر شجرۂ ایمان کو قیاس کر لیجئے (ایمان کی کمی و بیشی پر تصریح آیات قرآنی سے بھی ملتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔(۲)

"بیشک مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو اس سے ان کا ایمان بڑھ جائے"۔

کفر و نفاق کی حقیقت اور اس کی دو قسمیں

ایمان کی پہلی قسم کے مقابلہ میں (انکار و اعراض) کو (اصطلاحاً) کفر کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کے مقابلہ میں نفاق آتا ہے۔

نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ کسی کے دل میں ایمان سرے سے متحقق ہی نہ ہو بلکہ اس کی جگہ تکذیب اور انکار نے لی ہو۔ اور اس کا لسانی اقرار (توحید و رسالت وغیرہ سے متعلق) کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ صرف خوف شمشیر سے ہو (یعنی اذعان و تسلیم حقیقی کی وجہ سے نہ ہو) اس قسم کے لوگ (جن کے دل ایمان سے خالی ہوں، اور زبان سے اقرار کریں) جہنم کے طبقۂ اسفل میں ہوں گے۔ (جیسے کہ قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ: اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی بلاشبہ منافق فی العقیدہ آتش دوزخ کے سب سے زیریں حصہ میں ہوں گے)۔

دوسرا نفاق یہ ہے کہ دل میں کفر و تکذیب نہ ہو لیکن حجابات ثلاثہ یعنی حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سومعرفت کی وجہ سے قلبی تصدیق اور دلی اعتراف میں ضعف و کمزوری پیدا ہو چکی ہو یا وہ دنیا کی محبت میں اس قدر مستغرق ہو چکا ہو کہ اس کے دل میں یوم آخرت سے ایک گونہ انکار اور یہ خیال سرایت کر گیا ہو کہ اس کا واقع ہونا بعید اور بہ ظاہر نا ممکن ہے۔ اگرچہ اسے اپنے اس انکار کا بھی احساس نہ ہوتا ہو۔ یا اسلام میں داخل ہونے کے بعد راہ دین کے شدائد اور صعوبات کو دیکھ کر اسلام سے اس کی طبیعت متنفر ہو اور اس کا دل (قیود و پابندیوں سے دور) آرام و آسائش کی طرف مائل ہو اور اس طرح دین اسلام کی اہمیت و افادیت کی اس کی نظروں میں وقعت ہی باقی نہ رہے یا یہ کہ کافروں کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات ہوں جو اس کے لیے کلمۃ اللہ کی اعلا اور مجاہدین کی سعی و کوشش سے ہم آہنگی میں مانع ہو۔

علامات نفاق

نفاق کی اس قسم ثانی کی علامتوں میں چار خصلتیں (جو ایک حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں زیادہ مشہور) ہیں جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ کسی سے (بحث و مباحثہ یا مقدمہ میں فریق کی حیثیت) جھگڑتا ہے تو (دین و دانش اور اخلاق کے مسلّمہ آداب کو چھوڑ کر) گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ عہد و پیمان کرتا ہے تو اس کو توڑنے میں تامل نہیں کرتا، اور وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔

علاج مرض نفاق:

جس شخص کو ایمان ایسا محبوب ہو کہ کفر اختیار کرنے کے مقابلہ میں بھڑکتی آگ میں جھونکے جانے کو ترجیح دے اور راہِ خدا میں (دین حق کی حمایت وتائید اور ملت اسلامیہ کی صیانت وحفاظت کے لیے) دارالحرب سے ہجرت کرے اور کفار اور دشمنانِ اسلام سے جہاد کرے اور راہ جہاد میں پیش آمدہ تکالیف وشدائد کو (بخوشی) جھیلے اور مسجدوں میں عبادت گزاری پر مداومت رکھے۔ اور صدقات وخیرات اور داد ودہش کا سلسلہ برابر جاری رکھے تو وہ مرض نفاق سے مامون ومحفوظ رہے گا۔

دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری اصل کاہنوں، منجموں، اور نیچریوں کے تخمینوں اور نیچریوں کے فلسفیوں کی تصدیق نہ کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کاہن[1] منجم[2] اور طبیعی[3] کی تصدیق کو (کلی طور پر) ترک کرنا ضروری ہے اور ان کے علوم کی طرف (اس طرح) مائل ہونا اور ان سے محبت کرنا (کہ وحی ووجدان سے انکار پر منتج ہو) واجب الترک ہے۔ اور شریعت کے ثابت شدہ حقائق میں عقل نارسا کے غور وخوض کو چھوڑنا (بھی) لازمی ہے۔ اختلاف فی الدین سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ ملت حنیفیہ اپنی اصلی صورت میں باقی رہے اور اس میں (غلط آرا وافکار کی آمیزش اور اس کے الفاظ ومعانی میں کوئی) تحریف وتبدیلی واقع نہ ہو۔

دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری اصل

(اعمال کے حسن وقبح اور ثواب وعذاب کا انحصار ومدار نیتوں پر ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک اصل یہ ہے کہ اعمال کا

---

[1] Sooth sayer; Fortnre teller

[2] Astrologer

[3] Naturalist

مدار نیتوں پر ہے۔ حسن نیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ارادہ کرے۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ توحید الٰہی کا عقیدہ (اس کے دل میں) راسخ ہو چکا ہو اور اس کے نتیجہ کے طور پر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادات (واجبہ و نافلہ) میں مشغول رہتا ہو، یا یہ صورت ہو کہ اپنی حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ بارگاہ ایزدی میں دامن سوال پھیلاتا ہو، یا یہ صورت ہو کہ اس کی عبادات اور دیگر اعمال حسنہ کا محرک مصائب دنیا کے پیش آنے کا اندیشہ یا دنیاوی فتوحات میں کامرانی کی توقع ہو یا آتشِ دوزخ سے خوف اور نعیم جنت کی آرزو پیش نظر ہو یا محض شارع کی تقلید سے وہ ایسا کرتا ہو اور اس کا ایمان ہو کہ ان عبادات کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور جس چیز کا شارع نے حکم دیا ہے، اس کا عمل میں لانا لازم ہے۔ یہ سب امور رضائے الٰہی کے ضمن میں آتے ہیں۔

دین محمدی کا چوتھا اصول مشتبہات سے پرہیز کرنا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول دین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: **الحلال بَیِّنٌ والحرام بینٌ وبینهما مشتبهات فمن اتّقی الشُّبهَات فَقَدْ استبرالِدِیْنه۔** (شریعت محمدی میں حلال بھی ظاہر و واضح چیز ہے اور حرام بھی ظاہر و واضح چیز ہے اور ان دونوں کے درمیان چند امور مشتبہ بھی ہیں جن کی حلت و حرمت کے بارے میں شبہ پیدا ہوتا ہے تو جس نے ان مشتبہ امور سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین کو محفوظ رکھا) چنانچہ مشتبہات کو ترک کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

مشتبہ کی قسمیں: شک و شبہ میں ڈالنے والی چیزیں مختلف قسم کی ہیں، مثلاً (الف) جب لفظ کے معنی واضح اور معیّن نہ ہوں تو اس کے مفہوم میں شک لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ اس طرح کہ اس لفظ کے بارے میں تین قسم کے مواقع پائے جاتے ہوں ایک وہ مواقع جن پر یہ لفظ یقیناً صادق آتا ہے۔ دوسرے وہ مواقع جن پر اس لفظ کا اطلاق قطعاً نہیں ہو سکتا لیکن کچھ تیسری قسم کے مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں اس لفظ کا استعمال مشکوک ہوتا ہے۔ ہمارے اس بیان کی توضیح لفظ ''سفر'' سے ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں ''سفر'' یقیناً اس

قطع مسافت کو کہتے ہیں جو کئی مراحل پر مشتمل ہو اور جس کے لیے زادِراہ، سواری اور رفیق و مددگار کی ضرورت ہو اور مسافر کے لیے اس کا بآسانی اختیار کرنا دشوار ہو۔ اس کے برعکس سفر کا اطلاق اس آمد ورفت پر بالکل نہیں ہوتا جو بازار یا منڈی یا شہر کے باہر مضافات میں کسی کام کے سلسلہ میں ہو۔ ہاں سفر کا اطلاق اس آمدورفت پر مشتبہ اور مشکوک ہے جو ایک دن یا ایک دن کے اکثر حصہ کی مسافت کے برابر ہو کیونکہ ہم یقیناً یہ لفظ سن کر اس کے لوازمات کے طور پر زادراہ لینے، مشقت و تکلیف اٹھانے، اجنبی زمین میں قیام کرنے (وغیرہ وغیرہ) کو فوراً ذہن میں لے آتے ہیں جس طرح یتیم کے لفظ سے کسی کی کمائی سے عاجزی اس کا فقر وافلاس اور اس کی بے کسی مفہوم ہوتی ہے۔ اب چونکہ ایک دن کے سفر میں سفر کا اصلی مفہوم تو موجود ہے لیکن اس کے لوازم مفقود ہیں اس لیے ہم اس پر سفر کا اطلاق کرنے میں شک کرتے ہیں کیونکہ لفظ سفر کی ذاتی وضع سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی گھر سے ایسا نکلے کہ اسی روز گھر کو واپسی نہ ہو، کیونکہ جو شخص صبح گھر سے نکل کر شام کو واپس ہوتا ہو اس کے اس آمدو رفت کو سفر نہیں بلکہ تکمیل حاجت کے لیے باہر نکلنا کہیں گے۔ تو جب اس دن واپس نہ ہو (بلکہ دوسرے دن ہو) تو سفر کی ذاتیات تو موجود ہیں اس لیے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سفر کو سفر کہہ سکیں گے یا نہیں (اور پھر یہ اشتباہ احادیث کے ذریعہ رفع ہوتا ہے جہاں سفر کے لیے کم از کم مسافت کی تعیین کی گئی ہے۔

(ب) اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جب کسی حکم کا کسی علّت پر یقینی انحصار ہو اور وہ علّت کسی ثابت شدہ یقینی مقصد کے ظہور میں آنے کا مظنہ سمجھا جاتا ہو، مگر بعض ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں کہ علّت کو علّت ٹھہرایا گیا ہے وہ موجود نہیں اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورت میں بھی علّت کے وجود پر حکم کو جاری سمجھا جائے۔ مثلاً نئی خرید کی ہوئی لونڈی کے لیے استبرا کا حکم تبدّل ملکیت پر منحصر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اختلاط نسب واقع نہ ہو۔ اب اگر وہ مشتراۃ (نوخرید لونڈی) کسی نابالغ لڑکے سے خریدی گئی ہے یا اس کا آقا عرصۂ دراز سے غائب ہے (اور اس سے ہم بستری ہی نہیں ہوئی) تو اس صورت میں اختلاط نسب کا یقیناً احتمال نہیں۔ بایں ہمہ وہ مشتبہات میں سے ہے۔ (اس لیے کہ اصلِ علّت یعنی خرید موجود ہے)۔

دین محمدی کی پانچویں اصل یہ ہے کہ:

متشابہات کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے

اور وہ متشابہات کے بارے میں عقل نارسا سے کلام نہ کرے۔ متشابہات کی صورتوں میں سے چند ایک جن کا ذکر احادیث وقرآن میں آیا ہے یہ ہیں:

(مابعدالموت کے امور مثلاً) میت کا قبر میں بٹھانے، اس سے سوال کرنے، (اس کے جواب کی نوعیت کے مطابق) اس کی قبر کو وسیع کرنے یا اس کو اتنا تنگ کرنے کہ میت کی چیخ وپکار سنائی دے۔ ان سب کی کیفیت وحقیقت عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی اس لیے متشابہات میں سے ہیں۔ حشر ونشر اور بعث بعدالموت کے متعلق جتنی روایات احادیث میں آئی ہیں ان میں تقدم وتأخر واقعات کی وجہ سے اس قدر اختلاف رونما ہوا ہے کہ اس سے تقریباً ایک سو مختلف اقوال یا وجوہ استنباط اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ اس قسم کے ماوراالعقل امور کے بارے میں اپنی طرف سے غیر متعلق گفتگو نہ کرے بلکہ ان کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرے۔ (مذہب تفویض علمائے محدثین اور سلف صالحین کا رہا ہے)۔

آٹھویں فصل

نظافت (جسم ولباس اور مکان کی صفائی کی) تشریح

(انسانی زندگی میں) نظافت وطہارت ایسی غذا کے درجہ میں ہے جو علاج کا کام دیتی ہو۔ یہ شعبہ حیات ارتفاق ثانی کے مطابق بسر کی جانے والی تہذیبی وتمدنی زندگی کا فطری تقاضا ہے۔ شیطانی ہیئتوں کے ازالہ اور ملکی اوصاف کی تحصیل کے لیے نظافت و پاکیزگی ضروری ہے۔ شرع کی زبان میں اس حقیقت کو پیرایۂ کنایہ میں اس طرح یاد کیا جاتا ہے کہ طہارت سے سیئات کا ازالہ ہوتا ہے اور طہارت کے صلہ میں انسان کے نامۂ اعمال میں حسنات لکھے جاتے ہیں۔ قبر وحشر کے فتنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی طہارت لازمی شعبہ ہے اس لیے کہ (ایک حدیث شریف کی رو سے) قبر کا عذاب اکثر پیشاب کے بارے میں بے احتیاطی کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور چونکہ نظافت ظاہری ومعنوی نجاست سے طہارت حاصل کرنے کا موجب ہے اور اس سے جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے اور انسان کی طبیعت میں شگفتگی آجاتی ہے۔ اس لیے وہ حجاب سومعرفت کے لیے مفید علاج ہے۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے (تنظیف جسم اور تزئین لباس کا) پورا پورا اہتمام کرتا ہے۔ (طہارت والا بھی اللہ تعالیٰ کے دربار کے ساتھ وابستگی پیدا کرتا ہے)۔

طہارت کی قسمیں:

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت ونظافت کو جز شریعت بنا کر اس کے لیے حدود اور اقسام مقرر کیے چنانچہ آپ نے طہارت کی دو قسمیں متعین فرمائی ہیں:

(۱) طہارت عن الخبث اور (۲) طہارت عن الحدث۔

طہارت عن الخبث:

خبث ونجاست کے ازالے کو زیادہ تر لوگوں کے عرف وعادت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ البتہ اصول تشریح کے مطابق ان کی رسم وعادت پر ایک نظر ڈال کر آپ نے فاسد رسم ورواج کو باطل قرار دیا۔ اور تشریع کے اصول کے مطابق سقیم اور ناقص رسم کی اصلاح فرمائی۔

اس طہارت کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

استنجا: استنجا میں نجاست کے ازالہ کے لیے یا تو پانی کا استعمال کرنا چاہیے یا ڈھیلے استعمال کیے جائیں۔ بہتر صورت یہ ہے کہ پانی اور ڈھیلوں دونوں کا استعمال کیا جائے کیونکہ طہارت حاصل کرنے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے۔

استنجا کرنے والے کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ لوگوں سے دور چلا جائے اور دیوار وغیرہ کی آڑ لے کر ازالہ نجاست کرے۔ نیز اگر کھلے میدان میں ہے تو قبلہ کی طرف رُخ یا پیٹھ کر کے نہ بیٹھے۔ آبادی اور گھروں اور بیت الخلا میں اس کی پابندی ضروری نہیں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ صحرا میں انسان جدھر چاہے اس طرف منہ کر سکتا ہے لیکن آبادی میں اور بیت الخلا میں عموماً یہ بات نہیں ہوتی (بلکہ انسان ایک خاص طرف رخ کرنے کا پابند ہوتا ہے) علاوہ ازیں صحرا عموماً نجاستوں سے محفوظ وپاک ہوتا ہے اور اس میں نماز ادا کی جاسکتی ہے اس لیے قبلہ کی طرف بحالت قضائے حاجت منہ یا پیٹھ کرنا سوادب خیال کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے آبادی میں یا کسی ایسی جگہ میں جو قضا حاجت کے لیے مخصوص ہے یہ احتمال نہیں۔

استنجا کے آداب:

ایسی جگہ استنجا کرنا (پاخانہ کرنا یا پیشاب کرنا) جائز نہیں ہے۔ جہاں پر اس کی نجاست سے ملوث ہونے کا احتمال ہو یا دوسروں کو اس سے تکلیف وضرر پہنچے مثلاً کسی درخت کے سایہ کے نیچے یا جہاں لوگ بات چیت، کے لیے جمع ہوتے ہوں یا عام گزرگاہ ہو، اسی طرح کھڑے پانی میں استنجا کرنا منع ہے۔ اور کھڑے پانی میں (اور عام گزرگاہوں پر) غسل کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ اس سے پانی خراب وفاسد ہوتا ہے۔ اگر غسل کرنا ہو تو

کھڑے پانی سے کسی برتن میں میں پانی لے کر استعمال کرنا چاہیے۔ تین ڈھیلوں سے کم پر اکتفانہ کرے۔ کیونکہ نظافت انہی (تین) سے پوری ہوتی ہے۔ عدد میں وتر (طاق) کی رعایت برتی جائے کیونکہ عادتاً سب اہم دینی امور میں رسم شریعت نے عدد وتر کو پسند فرمایا ہے۔ کسی قابل احترام اور معزز چیز سے استنجانہ کرے اور نہ دائیں ہاتھ سے عمل استنجا کرے، کیونکہ (شریعت محمدی میں) عادتاً سنت یہی رہی ہے کہ دایاں ہاتھ صرف (وضو میں) تطہیر کے لیے استعمال ہوتا ہے (استنجا میں ازالۂ نجاست کے لیے نہیں)۔

نجاست کی حقیقت اور اس کی تطہیر کا طریقہ

نجاست اس چیز کا نام ہے جس کو انسان کی طبع سلیم گندی اور قابلِ نفرت خیال کرے جیسے خون، گوبر، بول و براز، مذی، منی اور شراب (یا شراب آلود ماکول ومشروب، ان سب کو شریعت محمدی میں نجس قرار دیا گیا ہے)۔

نجاستوں کی تطہیر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عین نجاست بھی زائل ہو اور اس کا اثر مثلاً اس کا ذائقہ، رنگ، اور بو بھی باقی نہ رہے ہاں "ماجعل علیکم فی الدین من حرج " کا اصول بھی پیش نظر رہے (تو جہاں اثر کا مٹانا ناممکن ہو وہاں اصل نجاست کا ازالہ کافی سمجھا جائے گا) انسانی منی اگرچہ محل پیشاب سے خارج ہوتی ہے لیکن بدبوئی اور تغیر رنگ کے لحاظ سے پیشاب سے مختلف ہے نیز اکثر اوقات منی گاڑھی اور مجسم ہوتی ہے (اور پیشاب کی طرح مائع نہیں) اس لیے اگر یہ خشک ہو تو اس کا کھرچ لینا کافی ہے۔ چھوٹے بچے کے پیشاب پر پانی چھڑک دینا اس لیے کافی سمجھنا چاہیے کہ اس کا پیشاب بدن یا کپڑے پر دور دور تک پھیل جاتا ہے لہٰذا اس کے دھونے میں تکلیف ہے۔ برخلاف اس کے بچی کا پیشاب کہ بہت زیادہ نہیں پھیلتا، اور جب پیشاب زمین پر کیا گیا ہو اور وہ خشک ہو جائے حتیٰ کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو زمین پاک سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح اگر اس پر کثرت سے پانی بہہ جائے اور پیشاب کے اثر کو زائل کر دے تو بھی وہ پاک ہو جاتی ہے۔ بدبودار تازہ چمڑا دباغت سے پاک ہو جاتا ہے اور گلیوں کوچوں کے کیچڑ سے آلودہ ہونے کو اس لیے نجس قرار نہیں دیا گیا کہ یہ ابتلائے عام ہے (اور دین کی بنا یُسر و آسانی

پر رکھی گئی ہے) جوتے کی نجاست کو رگڑ کے ذریعہ دور کرنے پر اکتفا کیا جائے۔ ہاں جس نجاست کے دور کرنے میں بہت زیادہ تکلیف ہو اس کا ازالہ ضروری نہیں (شریعت کی رو سے) وہ معاف ہے۔

پانی کو رسم و عادت اور لوگوں کے عرف عام پر رکھا گیا ہے جس پانی کو لوگ ان نجاسات کے اختلاط کی وجہ سے نجس و پلید سمجھیں گے وہ نجس ہے اس کا استعمال جائز نہیں خصوصاً دوسری چیزوں کی تنظیف و تطہیر کے لیے اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اور جس پانی کو عرف عام میں نجس نہیں کہا جاتا اور نجاستوں کی وجہ سے اس کے ذائقہ اور رنگ (و بو) میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تو وہ طاہر اور پاک ہے۔ چونکہ بعض اوقات تغیرِ رنگ و بو کے متعلق اشتباہ واقع ہوتا ہے اس لیے دو بڑے مٹکوں کی مقدار کو مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات پر کہ اتنا پانی اس نجاست سے اثر پذیر نہیں ہوتا جو عام طور پر صحراؤں اور بیابانوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح گھروں میں بڑے بڑے مٹکوں اور مشکیزوں میں بھی کبھی کبھی آ جاتی ہے۔ (بشرطیکہ ذائقہ، رنگ اور بو میں تغیر رونما نہ ہوا ہو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظافت کے سلسلہ میں یہ بھی مسنون قرار دیا ہے کہ ناف کے نیچے بالوں کو (زیادہ سے زیادہ چالیس دن سے پہلے) دور کرنا چاہیے اسی طرح ہر جمعہ کے دن (نماز جمعہ سے پہلے) میل کچیل کو غسل سے دور کرنا سنّت ٹھہرا دیا ہے۔

حدث کا مفہوم اور اس کی صورتیں

حدث ہر اس گندی ہیئت اور نفرت انگیز صورت کو کہتے ہیں جس کی گندگی سے نفس انسانی پر ناپسندیدہ رنگ چڑھ جائے جیسے دونوں شرمگاہوں سے خارج ہونے والی نجاست یا اس سے ملحق و متعلق نجاست (اخراج ہو) یا مثلاً ہم بستری اور جماع سے جو تلویث معنوی اور نفسانی آلودگی حاصل ہوتی ہے وہ بھی حدث کے مفہوم میں آتی ہے۔ صنفی خواہش کی تسکین کے وقت جو حالت انسان پر طاری ہوتی ہے وہ عالم جبروت اور خدائے بزرگ و برتر سے بعد و دوری کی سخت ترین حالت ہوتی ہے (اور اس سے انسانی ذہن اور قوت ملکیہ میں ناپسندیدگی پیدا ہو جاتی ہے) چونکہ جماع اور حیض (ماہواری) کی حالتوں میں عالم جبروت

سے دوری بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کا وقوع بھی عام نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں حالتوں سے طہارت ونظافت حاصل کرنے کے لیے شریعت محمدی نے سارے بدن کے کامل و شامل غسل کو ضرورت قرار دیا ہے۔

ان کے برعکس دونوں شرمگاہوں سے جو نجاست خارج ہوتی ہے وہ عالم جبروت سے کم تر دوری کا باعث ہے اور وہ اکثر واقع ہوتی ہے اس لیے شریعت نے ان اعضائے جسمانی کو دھونے کا حکم دیا ہے جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں۔ اس کی علت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ لباس و پوشاک پسند کرتا ہے اور ایسا لباس پہننا چاہتا ہے جو اس کے بدن کو ڈھانکے مگر وہ اپنے چہرے ہاتھوں اور پاؤں کو ہمیشہ کے لیے ڈھانکنا نہیں چاہتا۔ نیز ان اعضائے ثلاثہ کو کپڑوں میں (ہمہ و ہر وقت) اوڑھے رکھنا باعث تکلیف و تنگی ہے۔ عام طور پر (انسانی معاشروں میں) ملوک و سلاطین کے پاس جانے والوں کا پسندیدہ طریقہ اور محبوب عادت یہی رہی ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر چہروں، ہاتھوں اور پاؤں کو دھو کر صاف ستھری حالت میں پیش ہوتے ہیں۔

شارع علیہ السلام نے ان عذروں کو بھی پیش نظر رکھا جو لوگوں کو اکثر و بیشتر پیش آسکتی ہیں، تو ان حالات (بیماری وسفر وغیرہما) کے لیے (غسل و وضو کے بجائے تیمم کو مشروع بنا دیا۔ پس اس طرح طہارت کی تین قسمیں ہو گئیں (وضو۔ غسل۔ تیمم)۔

وضو کے ارکان وسنن

وضو کے چار ارکان ہیں (جو قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں مذکور ہیں:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (المائدہ:۵: آیت ۶) اے مسلمانو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے (۱) منہ اور (۲) ہاتھ کہنیوں تک دھو لو (۳) سروں پر (آب سے تر) ہاتھ پھیر لو اور (۴) پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو)۔

اور وضو کی صحت و درستی کے لیے نیت شرط ہے اور اس کے مکمل کرنے والے چند امور ہیں جن کے ذریعے پوری طہارت حاصل ہو جاتی ہے ان امور تکمیلیہ میں سے مندرجہ

ذیل (قابل ذکر) ہیں:

ایک مسواک کرنا ہے۔ اس کا فلسفہ وحکمت یہ ہے کہ منہ کو بدبو اور عقل وطبیعت میں فساد وبگاڑ پیدا کرنے والے بلغمی مواد سے صاف کردیا جائے (اور دانتوں کی صفائی ہوجائے)۔

دوسرا وضو کو تسمیہ یعنی بسم اللہ سے شروع کرنا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ زبان پر اللہ تعالیٰ کا اسم پاک جاری کرنے سے قلبی نیت کو استحکام وتوثیق ملتی ہے (اور برکات حاصل ہوتی ہیں)۔[1]

تیسرا استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) استنثار (ناک میں پانی ڈال کر اس کو جھاڑنا) اور مضمضہ (کلی کرنا) بھی ہیں۔ کیونکہ یہ (منہ اور ناک اور گلا) وہ مواضع ہیں کہ جن کی صفائی کے لیے چہرے کی ظاہری طہارت اور دھونا کافی نہیں ہوتا (اس لیے ان میں پانی ڈال کر انھیں صاف کرنا پڑتا ہے)۔ نیز استنشاق اور استنثار سے ناک کی غلاظت اور وہ بدبوئیں بھی دور ہوجاتی ہیں جو حس مشترک کو حضور قلب سے روکتی اور دوسری طرف مشغول رکھتی ہیں۔ ان غلاظتوں کے اس اثر کا ذکر حدیث نبوی میں کنایۃً یوں کیا گیا ہے کہ الشیطان یبیت علی المنخرین یعنی شیطان ناک کے دونوں نتھنوں پر بسیرا لیتا ہے۔"

(ہاتھ دھو لینے سے پہلے) پانی میں ہاتھ ڈبونے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ ہاتھ سے ہر قسم کے کام کیے جاتے ہیں اس لیے ان پر میل کچیل جم جانے اور اس کے نجس ہونے کا ہمیشہ احتمال ہوتا ہے۔ تین تین مرتبہ اعضا جسمانی کو دھونے کا مقصد اچھی طرح صفائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ منہ اور ہاتھ پاؤں کو مقررہ حدود سے زیادہ دور تک دھو لینا بھی یہی معنی رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرنے والے کے لیے دعائے ماثور ومشہور کا پڑھنا سنت قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس پر دو قسم کی خبیث کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔

---

[1] حدیث شریف میں آتا ہے کہ "كُلُّ اَمرِذی بالٍ لم یُبْدَأْ فِیْه بِاسمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَر" یعنی ہر وہ ضروری کام جس کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے تو وہ باعث خیر واجر نہیں ہوگا۔

ایک عملی کیفیت ہوتی ہے جس کا ازالہ وضو سے ہو جاتا ہے۔
دوسری علمی ہیئت ہوتی ہے جس کو دفع کرنے کے لیے ماثورہ دعائیں پڑھی جائیں۔

موزوں پر مسح کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ موزوں کے پہننے کے بعد پیر ظاہری اعضا کی فہرست سے خارج ہو کر اعضا داخلہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے اس کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی: "اَلْحَدَثُ لَمْ یَدْخُلْھُمَا" یعنی "پاؤں پر حدث کا اثر ہی نہیں ہوا۔"

اور چونکہ وضو میں اکثر اوقات پاؤں کو دھویا جاتا ہے اس لیے اس کا قائم مقام مسح قرار پایا تا کہ حتی المقدور شدائد و تکالیف میں سہولت و یسر کا حکم باقی رہے۔ مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات اور مسافر کے لیے تین دن، تین رات کی مدت رخصت مقرر ہوئی ہے۔ یہ مدت تیسیر کے اصول پر مبنی ہے۔ اور ان وقفوں کے بعد دھونے کی طرف مراجعت معقول ہے۔ اعضائے نہانی سے نجاست خارج ہونے پر اس لیے وضو ٹوٹ جاتا ہے کہ نجاست سے عملاً وابستگی اور ملابست نجاست پیدا کرتی ہے اور نفس میں ایک ناپسندیدہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس طرح نیند میں چونکہ اعضائے جسمانی میں سستی اور ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور وہ اعضائے نہانی سے خروج نجاست کا مظنّہ ہے۔ اس لیے اس کو ناقض وضو کے اسباب پر حمل کیا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامستِ نسا اور سینگی لگوانے کے بعد وضو کرنا تکمیل طہارت کے لیے مسنون قرار دیا ہے۔

غسل، اس کے ارکان اور اسبابِ وجوب

غسل کا رکن پورے بدن کو اور بدن کے تمام اعضا کو دھونا ہے۔ کیونکہ غسل کامل طہارت ہے جس سے حدث اکبر (بڑی باطنی نجاست) کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ وضو کی طرح یہاں بھی نیت شرطِ صحت ہے۔ غسل کرنے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا اور ظاہری نجاست کا دور کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو نجاست سارے جسم پر بہہ جائے گی۔ جسم پر تین بار پانی بہانا تکمیل غسل کا موجب ہے۔ جس کی حد ایک صاع (پونے چار سیر پختہ) پانی کا استعمال کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ خون کے اثر (رنگ وبو وغیرہ) کو مشک و کستوری سے مٹائے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مشک (وغیرہ وغیرہ) کے استعمال سے اس کا شوہر اس کی طرف زیادہ راغب ہوگا۔

جنبی (ناپاک اور جنابت سے دوچار) آدمی جب کچھ کھانا پینا یا سونا چاہے تو چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ کیونکہ وضو اور غسل سے مقصود دراصل ازالۂ نجاست حسی نہیں بلکہ ان میں یہ راز مضمر ہے کہ نجاست سے نفس انسانی پر جو کیفیت فاسدہ طاری ہو جاتی ہے (اور وہ عالم جبروت کی طرف کما حقہ، متوجہ نہیں ہوسکتا، وضو اور غسل کے ذریعہ اس کا ازالہ کیا جائے اور طہارت و پاکیزگی پیدا کی جائے۔ اس نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے: "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ "(سورہ التوبہ: آیت ۱۰۸) یا "وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (البقرہ: آیت ۲۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ خوب پاک وصاف رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

پھر شرع کی نظر میں حدث کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

(۱) حدث اصغر اور (۲) حدث اکبر

شریعت کی رو سے ان دو صورتوں میں تقسیم کا طریقہ اس لیے رائج کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر دین میں تنگی اور سختی نہیں رکھی۔ دونوں صورتوں میں مسنون طریقہ کو پیش نظر رکھا گیا کہ "وما جعل عليكم في الدين من حرج" (اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر طاقت سے باہر یا تکلیف میں مبتلا کرنے والے امور کو سرے سے مقرر ہی نہیں فرمایا۔ یُسر اور آسانی کا اصول پیش نظر رکھا)۔ اس لیے حدث اکبر کے پیش آنے پر فوراً غسل کرنے کی فرصت یا موقع نہ ہو تو غسل فوراً ضروری نہیں (کیونکہ یہ اصول حرج کے خلاف ہے) تاہم یہ مناسب ہے کہ طہارت صغیرہ (یعنی وضو) میں تاخیر نہ کی جائے۔ اور یہ حکم وضو اس لیے بھی مصلحت آمیز ہے کہ حتی المقدور انسان کو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے حالتِ حدث میں بے لگام نہ رہنے دیا جائے۔

وجوب غسل کا باعث یا تو حالت بیداری میں جماع ہے یا سوتے وقت صنفی خواہش

کے ساتھ انزال ہے۔ اور یا عورت کے حیض اور نفاس کی بیماری ہے۔ کیونکہ ان صورتوں میں انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جو عالم ملکوت کی کیفیات سے متضاد اور مخالف ہوتی ہے۔

تیمّم: اس کے مقاصد و احکام

تیمّم کا مقصد حصول نظافت و طہارت نہیں بلکہ نمازوں کے لیے طہارت کی صورت کو باقی رکھنا مقصود ہے۔ تا کہ نفس طہارت کے ترک کے ساتھ مانوس نہ ہو جائے اور اس طرح کی نجسی کیفیت کے ساتھ گزارہ کرنا شروع نہ کرے۔ تیمّم کے لیے زمین کے ساتھ ہاتھ لگانا مناسب قرار دیا گیا کیونکہ زمین ایک گونہ بعض اشیا میں اور بعض اوقات میں طہارت کا کام دیتی ہے۔ مثلاً تلوار، شیشہ، پتھر، اور موزوں کو زمین سے رگڑ کر پاک کیا جاتا ہے۔ اس لیے زمین کے مسح کو طہارت کو قائم مقام ٹھہرایا گیا۔ تیمّم کو غسل کا قائم مقام ٹھہراتے وقت تمام اعضا پر گرد آلود ہاتھ پھیرنا اور اس طرح تیمّم کو وضو کا قائم مقام ٹھہراتے وقت چہرہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں (غرض پانچوں اعضا) پر گرد آلود ہاتھ پھیرنا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ مقصود تو طہارت حاصل کرنا نہیں بلکہ سنّت طہارت کو ظاہراً باقی رکھنا مقصود ہے۔

تیمّم جن اعذار کی بنا پر جائز ہے ان کا تعین ضروری تھا۔ چنانچہ تین اعذار میں سے ایک تیمّم کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ اولاً پانی کا موجود نہ ہونا کہ انسان سفر کے وقت نہ پانی کے کنارے پر ہو اور نہ اس کے لیے پانی مہیا کرنا میسر ہو، ثانیاً ایسا مرض جس کو پانی سے نقصان پہنچتا ہو یا یہ خطرہ ہو کہ مریض ہلاک ہو جائے گا۔ یا یہ کہ اس کے کسی عضو میں عیب پیدا ہو جائے گا، یا مرض کے لمبے ہو جانے کا خطرہ ہو۔ ثالثاً یہ کہ مرض کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ ایسی سردی جس سے ضرر پہنچنے کا احتمال ہو تیسری قسم میں شامل ہے۔

مصنف کی اہم مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد اول)	مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	325.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد دوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد سوم)	//	300.00
مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ (جلد چہارم)	//	300.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)	//	200.00
دلی کی تاریخی مساجد (حصہ دوم)	//	100.00
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200.00
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات	//	250.00
الواح الصنادید (حصہ اول)	//	150.00
الواح الصنادید (حصہ دوم)	//	100.00
مولانا عبدالماجد دریابادی۔ خدمات وآثار	//	200.00
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ	//	200.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20.00
ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20.00
نقوش خاطر (قلمی چہرے)	//	300.00
۱۸۵۷ء اور ہریانہ (ہریانہ کے مجاہدین آزادی کا تذکرہ)	//	250.00
المساجد التاریخیہ بدهلی	//	500.00
معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
مرد مومن ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی	//	300.00
شاہ ولی اللہ خصوصی نمبر (ماہنامہ براہین)	//	195.00
الامام الدہلوی خصوصی شمارہ (ماہنامہ براہین)	//	195.00
وقف ترمیمی بل ۲۰۱۰ء منظر، پس منظر	//	زیر طبع
ضمائر القرآن (ضمائر قرآن اور انکے مراجع)	ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی — مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی	300.00
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآن کے مرادف الفاظ اور امثال ونظائر)	//	350.00
وفیات اعیان الہند (امراء وسلاطین کی تاریخ ہائے وفات اور مختصر حالات)	//	300.00
مضامین خالدی (اسلامیات، قرآنیات اور دکنیات پر مشتمل مقالات)	//	300.00
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	150.00

SHAH WALIULLAH INSTITUTE

Adjacent To Kaka Nagar Masjid, (Near NDMC Primary School)
Kaka Nagar, New Delhi-110003
Ph : 9811740661, 9811615455, 26953430
E-mail : shahwaliullah_institute@yahoo.in, swiinstitute26@gmail.com

ISBN : 978-93-84153-04-2